خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

جنوری 2014

سالِ نو نمبر



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

جنوری 2014

جلد 41 شمارہ 9

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مُدیر

کچھ مُسکراتی

جنوری 2014ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
نئے سال کا پہلا شمارہ۔
سحر کے سورج کو ڈھونڈتے ہوئے دن، رات کے اندھیروں میں غروب ہوتے گئے۔ ایک اور سال کی مسافت تمام ہوئی۔ زندگی کی برق رفتاری نے وقت کی رفتار بھی تیز کر دی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسانی ترجیحات بھی بدلتی جارہی ہیں۔ تبدیلی کی خواہش انسانی فطرت کا حصہ ہے اور زندگی کا لازمی امر بھی۔ وقت کا ساتھ دینے والے، وقت کے ساتھ چلنے والے ہی کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ تبدیلی اگر راست فکر اور مثبت سوچ کے ساتھ ہو تو خیر ہے ورنہ بلاشبہ انسان خسارے میں ہے۔
راست نیت اور اچھی سوچ کے ساتھ نیک اعمال ہمارے راستوں کے چراغ ہیں جو تاریک راہوں میں اُجالے بکھیرتے ہیں۔
قارئین کو نیا سال مبارک ہو۔
اس دعا کے ساتھ کہ آنے والا سال ہم سب کے لیے روشنیوں کا پیامبر ہو اور وطن عزیز میں امن، سکون اور سلامتی کی فضا لے کر آئے۔ آمین۔

انشاجی کی برسی،

چاند نگر کے انشاجی کتنے پیارے، کتنے محبت کرنے والے، زندگی جن کے دم سے مسکراتی تھی۔ دھرتی سے رشتہ توڑ گئے۔ دُنیا سے رخصت ہوگئے مگر کیا ان کی زندگی بھی ختم ہوگئی؟ نہیں۔ آج بھی ان کے کالم پڑھیں تو مسکراہٹ لبوں سے جدا نہیں ہوتی۔ کہیں شگفتگی، کہیں طنز کی کاٹ اور کہیں تیکھا پن ان کے سفرنامے پڑھیں، انجانے ملکوں سے شناسائی کا احساس جاگ اٹھتا ہے اور ان کی شاعری بے کلی، اضطراب اور درد کا گہرا احساس دل کو چھو لیتا ہے۔ ان کے خطوط، ان کے بارے میں لکھے گئے مضامین، خاکے پڑھیں، انشاجی اسی طرح جیتے جاگتے ہنستے مسکراتے نظر آتے ہیں۔
انشاجی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی تخلیقات پر وقت اثر انداز نہیں ہو سکا ہے۔ ان کی شاعری آج بھی مقبول ہے اور ایک طویل وقت گزر جانے کے باوجود ان کے کالم آج کی آواز محسوس ہوتے ہیں۔
11 جنوری 1978ء کو ایک ایسے سفر پر نکل گئے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔
قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- سائرہ رضا کا مکمل ناول "سراب کی مری رہ گزری"، ، آمنہ ریاض، نازیہ جمال، گل افشاں رانا اور صائمہ بشیر کے ناولٹ،
- نعیمہ ناز، سمیرا حمید، ثمینہ عظمت علی اور دلشاد نسیم کے افسانے،
- عنیزہ سید اور عفت سحر طاہر کے ناول، ، کچھ اور صفحات پلٹ گئے۔ قارئین سے سروے،
- ٹی وی فنکارہ یاسرہ رضوی سے ملاقات، ، ڈراما سیریل "رخسار" کی آغا عشنا شاہ سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- آپ کا باورچی خانہ، نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور کھدانان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کے مشورے ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ آپ کی تعریف ہمارا حوصلہ بڑھاتی ہے اور آپ کی تنقید پرچے کو سنوارنے میں مدد دیتی ہے۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

مال اور زندگی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"بوڑھے کا دل دو چیزوں کی محبت میں جوان ہوتا ہے۔ زندگی کی محبت میں اور مال کی کثرت کی محبت میں۔" (بخاری)

ابن آدم کا دل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اگر ابن آدم کے پاس مال کی دو وادیاں بھری ہوئی ہوں تو وہ چاہتا ہے کہ ان کے ساتھ تیسری وادی بھی ہو اور انسان کا دل صرف مٹی سے بھرتا ہے، البتہ جو شخص توبہ کرے، اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔"
(ترمذی)

فوائد و مسائل :

1 مال کی محبت انسان میں فطری طور پر موجود ہے جس میں دنیا و آخرت کی کئی مصلحتیں پوشیدہ ہیں، تاہم اس میں حد سے بڑھ جانا گمراہی کا باعث ہے۔
2 مال کی حرص جائز حد سے بڑھ جائے تو حق تلفی، بخل، فرائض میں کوتاہی اور اس قسم کی دوسری خرابیوں کا باعث بن جاتی ہے، اس لیے ان بداعمالیوں سے بچنے کے لیے مال کی محبت کو جائز حد سے آگے نہیں بڑھنے دینا چاہیے۔
3 مال کی محبت کا علاج یہ ہے کہ فرض، زکاۃ اور واجب اخراجات کے علاوہ بھی نیکی کی راہ میں زیادہ سے زیادہ مال خرچ کرنے کی کوشش کی جائے۔
4 مال کی ناجائز محبت سے توبہ کرنا ضروری ہے۔
5 دل مٹی سے بھرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل زندگی بھر سیر نہیں ہوتا۔ جب مٹی میں جائے گا اور قبر میں دفن ہوگا تب اس کی حرص ختم ہوگی اور دل سیر

ہو گا کیونکہ وہاں ثواب و عذاب کا سلسلہ شروع ہو جائے گا جس کے بعد دنیا کی طرف توجہ ممکن نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

امت مسلمہ کی عمریں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستر سال کے درمیان ہوں گی۔ اس سے آگے بڑھنے والے کم ہوں گے۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1 گزشتہ امتوں میں لوگوں کی عمریں بہت لمبی ہوتی تھیں ان کے مقابلے میں اس امت کے افراد کی عمریں بہت مختصر ہیں، اس لیے ہمیں اس مختصر مہلت میں نیکی کا کام کرنے کی کوشش زیادہ کرنی چاہیے۔

2 نبی صلی اللہ علیہ و سلم کا ارشاد گرامی ہے "اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کے لیے کوئی عذر باقی نہیں چھوڑا جس کی موت کو اتنا مؤخر کردیا کہ وہ ساٹھ سال کو پہنچ گیا۔" (صحیح بخاری)

3 جب انسان ساٹھ سال کے قریب پہنچ جائے تو اسے آخرت کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیے، شاید ساٹھ سال سے آگے نہ بڑھ سکے اور ساٹھ سال کے بعد تو یوں سمجھے کہ مجھے رعایتی مدت مل رہی ہے۔ اس کے بعد غفلت اور فسق و فجور نہایت خطرناک ہے۔ ستر سال کے بعد تو ہر دن کو ایک نئی رعایت تصور کرنا چاہیے۔

نیک عمل پر ہمیشگی اختیار کرنا

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

قسم ہے اس (اللہ) کی جو آپ صلی اللہ علیہ و سلم کو (دنیا سے) لے گیا! آپ جب فوت ہوئے تو آپ زیادہ نماز (تہجد) بیٹھ کر ادا فرماتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ و سلم کے نزدیک زیادہ پسندیدہ عمل وہ نیک عمل تھا جس پر بندہ ہمیشگی کرے اگرچہ تھوڑا ہو۔"

فوائد و مسائل :

1 تھوڑی نیکی اگر پابندی سے کی جائے تو وہ طبیعت پر بوجھ نہیں بنتی اور نتیجے کے لحاظ سے اس زیادہ نیکی سے بڑھ جاتی ہے جو چند دن زور شور سے کی جائے پھر چھوڑ دی جائے۔

2 ہمیشگی کا یہ مطلب نہیں کہ انسان بیمار ہو، مجبور ہو یا کوئی اور عذر ہو پھر بھی ضرور ادا کرے، اس طرح یہ نفلی عمل فرض کے مشابہ ہو جائے گا اور نفل کو فرض کا مقام دینا درست نہیں۔

3 نیکی کا جو کام ہمیشہ کرنے کی عادت ہو، پھر کسی وجہ سے وہ چھوٹ جائے، بعد میں جب وہ وجہ ختم ہو جائے تو دوبارہ شروع کر دینا چاہیے۔

4 تہجد میں طویل قیام افضل ہے اگرچہ تھک جانے کی وجہ سے قیام کا کچھ یا اکثر حصہ بیٹھ کر ادا کیا جائے۔

طاقت کے مطابق

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

"میرے پاس ایک عورت (بیٹھی) تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ و سلم میرے پاس (گھر میں) تشریف لائے تو آپ نے فرمایا۔

"یہ خاتون کون ہے؟"

میں نے کہا "فلاں صاحبہ ہے، جو سوتی نہیں۔" (ام المومنین نے اس کی نماز تہجد کا ذکر کیا) تو نبی صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"ٹھہرو! وہی چیز اختیار کرو جس کی تمہیں طاقت ہو قسم ہے اللہ کی! اللہ نہیں اکتاتا یہاں تک کہ تم خود اکتا جاؤ۔" (مسلم)

ام المومنین رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں نبی صلی اللہ علیہ و سلم کو دین کا وہ کام زیادہ پسند تھا جس پر وہ عمل کرنے والا دوام کرے۔

فوائد و مسائل :

1 طاقت سے زیادہ عبادت کرنا منع ہے کیونکہ اس سے بعد میں اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور خطرہ ہوتا ہے کہ انسان عبادت بالکل ہی ترک کر دے۔

2 ہمیشگی والے عمل کا مجموعی ثواب زیادہ ہو جاتا ہے، اس لیے وہ افضل ہے۔

خوف خدا

حضرت حنظلہ (بن ربیع بن صیفی) تمیمی اسیدی رضی اللہ عنہ کاتب وحی سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ہم نے جنت اور جہنم کا ذکر کیا (تو دل کی یہ کیفیت ہوئی) گویا ہم (جنت اور جہنم کو) آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر میں اٹھ کر بیوی بچوں کے پاس (گھر) چلا گیا۔ میں ان کے ساتھ ہنسا کھیلا۔ (حنظلہ نے) کہا پھر مجھے وہ کیفیت یاد آئی جس میں ہم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی مجلس میں) تھے، چنانچہ میں (گھبرا کر) باہر نکلا تو میری ملاقات حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"میں منافق ہو گیا، میں منافق ہو گیا۔"

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے (تفصیل سن کر) فرمایا "یہ کیفیت تو ہماری بھی ہے۔"

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ و سلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ کیفیت عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"حنظلہ! اگر تم (ہمیشہ) اسی کیفیت میں رہو جس میں تم میرے پاس ہوتے ہو تو فرشتے تمہارے بستروں پر یا (فرمایا) راستوں میں تم سے مصافحہ کریں۔ (لیکن) حنظلہ وقت وقت کی بات ہے۔"

فوائد و مسائل :

1 صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اپنے ایمان اور قلبی کیفیات کے بارے میں بہت محتاط رہتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کسی نادانستہ غلطی کی وجہ سے ان کی درجات میں کمی نہ آجائے۔

2 دل کی کیفیات تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

3 بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنا اور شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے دنیا کے معاملات میں مشغول ہونا شرعاً مطلوب ہے۔

4 انسان کو فرشتوں سے (بعض لحاظ سے) افضل قرار دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایسے حالات میں گھرا ہوا ہے، جو اسے اللہ سے غافل کرتے ہیں، پھر بھی وہ اللہ کو یاد کرتا اور اس کی عبادت کرتا ہے۔

بہترین عمل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"اتنے عمل کا بوجھ اٹھاؤ جتنے کی تمہیں طاقت ہو کیونکہ بہترین عمل وہ ہے، جس پر زیادہ پابندی کی جائے اگرچہ تھوڑا ہو۔"

میانہ روی

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ایک آدمی کے پاس سے گزرے، جو ایک چٹان پر نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم مکہ کے ایک حصے میں (کسی کام سے) تشریف لے آئے۔ وہاں کچھ دیر تشریف فرما رہے پھر واپس تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ آدمی اسی طرح نماز پڑھ رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے دونوں ہاتھ جمع کر کے (اشارہ کرتے ہوئے) تین بار فرمایا۔

"لوگو! (افراط و تفریط سے بچ کر) میانہ روی اختیار کرو۔" پھر فرمایا "اللہ تعالیٰ (ثواب دینے سے) نہیں اکتاتا تم ہی (عمل کرنے سے) اکتا جاتے ہو۔"

گناہوں کا بیان

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے' انہوں نے فرمایا "ہم نے عرض کیا اللہ کے رسول! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم سے ان اعمال کا بھی مواخذہ ہو گا جو ہم جاہلیت میں کرتے تھے؟"
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے اسلام لا کر نیک کام کیے اس سے جاہلیت میں ہونے والے اعمال کا مواخذہ نہیں ہو گا اور جس نے (اسلام لا کر بھی) برے کام کیے' اس سے پہلے اور بعد والے (سب اعمال) کا مواخذہ ہو گا۔"

فوائد و مسائل :

1 نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اسلام اپنے سے پہلے (گناہوں) کو مٹا دیتا ہے۔" (صحیح مسلم۔ حدیث ۱۲۱) جو شخص خلوص دل کے ساتھ سے اسلام قبول کرتا ہے اس کے جاہلیت کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

2 جو شخص اسلام قبول کرنے کے بعد بھی جاہلیت کی عادتیں اور بداعمالیاں ترک نہیں کرتا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا' اس لیے اس کے سابقہ گناہ معاف نہیں ہوتے۔

3 جو شخص خلوص سے اسلام قبول کرتا ہے' پھر اس سے بہ تقاضائے بشریت کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے' اس سے زمانہ کفر کے اعمال کا مواخذہ نہیں ہو گا کیونکہ مسلمان کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے کافر نہیں ہو جاتا۔ جن صحابہ کرام سے ایسے گناہ سرزد ہوئے جن پر حد نافذ ہوئی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا جنازہ پڑھا اور ان کے حق میں دعائے مغفرت فرمائی۔

4 مسلمان کو صحیح مسلمان بننے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اس کے گناہ معاف ہو جائیں اور اسے جنت میں اعلیٰ مقام حاصل ہو جائے۔

قاتل و مقتول

حضرت ابو بکرہ نفیع بن حارث ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں سونت کر ایک دوسرے کو (مارنے کی نیت سے) ملتے ہیں (ایک دوسرے کے مدمقابل آتے ہیں) تو یہ قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔"

میں نے پوچھا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! قاتل کا جہنمی ہونا تو سمجھ میں آتا ہے' مقتول جہنمی کیوں ہو گا؟
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!
"اس لیے کہ وہ بھی اپنے (دوسرے مسلمان) ساتھی کے قتل پر حریص تھا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس ارادہ معصیت پر انسان مستحق عتاب الٰہی ہو گا جس کا اس نے اپنے دل میں پختہ عزم کیا ہو گا اور اس کے ارتکاب کے لیے اسباب و وسائل بھی اختیار کیے گئے ہوں گے' گو وہ اس میں کسی رکاوٹ کی وجہ سے کامیاب نہ ہوا ہو۔

2۔ عزم' وسوسے سے مختلف ہے۔ وسوسہ معاف ہے' جب کہ عزم (پختہ ارادہ) قابل مواخذہ ہے' تاہم حدیث میں جو وعید مذکور ہے اس کے مصداق باہم لڑنے والے مسلمان اس وقت ہوں گے' جب وہ دنیاوی حمیت و عصبیت کی بنا پر لڑ رہے ہوں۔ کوئی شرعی معاملہ ان کے باہمی قتال کی بنیاد نہ ہو کیونکہ اس صورت میں ممکن ہے کہ دونوں ہی کا اپنا اپنا اجتہاد ہو جس میں وہ عنداللہ معذور سمجھے جائیں۔

جماعت کی نماز

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آدمی کی جماعت کے ساتھ پڑھی ہوئی نماز' اس نماز سے کچھ اوپر بیس (20) درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے جو وہ اپنے بازار یا گھر میں پڑھتا ہے' اس لیے کہ جب کوئی شخص اچھے طریقے سے وضو کرتا' پھر نماز کے ارادے سے مسجد میں آتا ہے' اسے نماز ہی مسجد کی طرف لے جاتی ہے' تو ایسے شخص کے ہر قدم کے بدلے میں ایک درجہ بلند اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے تا آنکہ وہ مسجد میں داخل ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ مسجد میں داخل ہو جاتا ہے تو جب تک نماز اسے وہاں روکے رکھتی ہے' وہ نماز ہی میں شمار ہو گا (یعنی جماعت کے انتظار یا ذکر الٰہی میں مصروف' جب تک مسجد میں رہے گا' وہ اللہ کے ہاں حالت نماز میں سمجھا جائے گا) اور فرشتے تمہارے ایک آدمی کے لیے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں جب تک وہ اپنی اس مجلس میں بیٹھا رہے جس میں اس نے نماز پڑھی ہے۔ فرشتے کہتے ہیں اے اللہ! اس پر رحم فرما۔ اے اللہ! اسے بخش دے۔ اے اللہ! اس پر رجوع فرما۔ (یہ دعائیں اس کے حق میں اس وقت تک جاری رہتی ہیں) جب تک وہ کسی کو ایذا نہ پہنچائے' جب تک بے وضو نہ ہو۔" (بخاری و مسلم۔ اور مذکورہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔)

فوائد و مسائل :

1۔ نماز باجماعت ادا کرنا فرض ہے اور بلاوجہ سستی یا کاموں میں مصروفیت کی بنا پر نماز باجماعت ادا نہ کرنا گناہ ہے' تاہم صحت نماز کے لیے جماعت شرط نہیں ہے۔ اس حدیث سے نماز جماعت کے عدم وجود کا استدلال درست نہیں ہے۔

2۔ اگر کوئی شخص کسی شدید ضرورت کے پیش نظر گھر یا بازار میں اکیلے نماز ادا کرتا ہے تو اس کی نماز ادا تو ہو جائے گی' البتہ وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی فضیلت سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ فرض کا تارک ہونے کی وجہ سے گناہ گار بھی ہو گا۔

3۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی 25' 26 یا 27 درجے زیادہ فضیلت ہے جیسا کہ دیگر روایات میں ہے۔ نماز' دیگر اعمال خیر سے افضل ہے کیونکہ فرشتے نمازی کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔

4۔ مسلمان کو تکلیف دینے سے بندہ فرشتوں کی ان دعاؤں سے محروم ہو سکتا ہے جن کا ذکر مذکورہ حدیث میں ہے۔

5۔ گھر سے باوضو ہو کر مسجد میں آنے کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے' نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ وضو تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے جیسا کہ حدیث میں ہے فرشتے بے وضو ہونے تک انسان کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔

نیت کے مطابق

ابو العباس عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب تبارک و تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھ لی ہیں۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمائی۔
"چنانچہ جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا لیکن اسے کر نہیں سکا' اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس ایک کامل نیکی لکھ لیتا ہے اور اگر ارادے کے مطابق اسے کر بھی لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک نیکی کے بدلے دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ نیکیوں کا ثواب اس کے لیے لکھ دیتا ہے اور اگر کسی نے کسی برائی کا ارادہ کیا لیکن اسے کیا نہیں تو اللہ تعالیٰ اسے بھی اپنے پاس ایک کامل نیکی لکھ لیتا ہے اور اگر ارادے کے مطابق اس برائی کو کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک ہی برائی لکھتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ جو بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک و تعالیٰ کے حوالے سے بیان فرمائیں اسے حدیث قدسی کہا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو الہام کے ذریعے سے آگاہ فرماتا ہے۔ اس میں اللہ کی اس وسعت فضل و کرم کا بیان ہے جو وہ اپنے بندوں کے ساتھ فرماتا ہے اور قیامت والے دن بھی فرمائے گا۔

2۔ برائی کا اگر صرف ارادہ کیا اور وسوسہ ہے تو وہ قابل مواخذہ نہیں ہے' البتہ پختہ عزم کرنے کے بعد کسی وجہ سے نہ کر سکے تو وہ قابل مواخذہ ہے جس طرح کہ پہلے گزرا ہے۔ لیکن اگر پختہ عزم کرنے کے بعد اللہ سے ڈرتے ہوئے برائی چھوڑ دیتا ہے تو یہ باعث اجر بھی ہے۔



کیسا رویا پگلا چاند

نیمہ بنت سراج

جی ڈوب گیا، بجھ گیا چاند

یہ گیا کہا، یہ کیا سنا، کون مر گیا، کون کوچ کر گیا، یہ کیا دیکھا، کالا حاشیہ، مگر وہی عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی روشن آنکھیں، زندگی سے بھرپور آنکھیں، ایک ذرا رکنا۔ ابھی آواز بھی آئے گی۔

کیسا روشن روشن، ہنستا باتیں کرتا چاند

اور بھی بول سنے تھے، ساز کی سنگت، سروں کے دوش پر۔ نغمہ رہ گیا۔ گانے والا کوچ کر گیا۔ چلتی پھرتی تصویر بھی دیکھی تھی اور بس ملنے کا شوق تھا، آرزو تھی، اتنی جلدی یہ حسرت میں بدل جائے گی، کسے معلوم تھا، ملتے بھی تو کیسے۔ ہماری دنیا اور، اور ادیبوں، شاعروں کی دنیا اور... ہماری دنیا میں نہ ادب کی لطافتیں ہیں نہ اشعار کے گلاب... بس پڑھتے رہتے ہیں، لطف لیتے رہتے ہیں اور اپنی اس روکھی پھیکی دنیا کو سجاتے رہتے ہیں۔ ادبی نشستوں کا ذکر سنتے ہیں۔ دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ وہاں تک رسائی ہو تو کیسے ہو، ہمیں بلائیں تو کس لیے، بن بلائے ہم جائیں تو کیسے، ایسا اونچا مقام پائیں تو کیونکر۔

اردو ہم نے پڑھی تو انگریز بہادر کا راج تھا، جس اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہاں ح، ق، ع صحیح ادا کرنا شرم کی بات تھی۔ بڑی گلتی تھی، کھالس اردو بولنا گناہ، کوم و ملت کا کوئی تصور نہ تھا۔ صبح کو Hymns گاتے اور مدر سپریر کو "گڈ مارننگ" کہتے۔ ہنس کی چال تو کیا آتی، اپنی بھی بھول گئے۔

اردو جو سنی، اماں کی زبانی، جو پڑھی وہ ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری اور ایم اسلم کے قلم سے تھی۔ آس پڑوس میں بھی صاحب لوگ رہتے۔ ان کی آیائیں، بیرے اور خانسامے، مگر اردو زبان کا رشتہ بڑا گہرا، بڑا سچا رشتہ ہے۔ اس کے چاہنے والے خود ڈھونڈ لیتے ہیں اس کے محسنوں کو اور یوں ادیب، شاعر، مزاح نگار، اردو اخبار، زندگی کا لازم و ملزوم جزو بنتے چلے گئے۔

روز اخبار میں کسی نہ کسی کا قلم، اپنے دکھ کا اظہار اپنے درد کا بیان کرتا ہے۔

ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانہ ترا۔

کچھ یادیں، کچھ باتیں، اپنا ناتا تو کالم تک تھا، اس کا انتظار رہتا تھا اور یوں بھی ہوا ہے کہ ایک دفعہ پڑھا، پھر پڑھا اور دوسروں کو سنا سنا کر لطف لیا۔ بڑے فخر سے سناتے، بڑے شوق سے سنتے، انوکھا سوچ کا انداز، اس پر شوخی تحریر کیا کہیے، ایک رشتہ اور بھی تھا...

چاند سے پریت کا، چاند کو دیکھا، چاند کو چاہا، چاند سے پوچھا، چاند سے کہا۔ شیتل اس کی چاندنی، سندر اس کا مکھ، گگن پہ چمکے، آنگن میں اترے یا کسی کی آنکھوں میں جھلکے چاند۔

عجب بات ہے، دعا کے لیے ہاتھ بھی نہ اٹھے۔ دل نے اس بیماری کی اہمیت کو مانا ہی کب تھا۔ اس خبر پر اعتبار ہی کب کیا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھی نہ آئے۔ اخبار ہاتھ میں تھا اور بس۔

امڈے بادل گرجے بادل

بوندیں دو برسا نہ سکے

پھر یوں ہوا کہ دن گزرا، رات آئی، چاندنی چٹکی اور ہمارے آنگن میں اترا چاند۔ ہنستا کھیلتا پورا چاند ایسا روشن روشن چاند، چاندی چاند اور سونا چاند، دیکھا تو رہا نہ گیا۔ دل پر بوجھ تھا اسے ہلکا کیا۔

پوچھا۔ کچھ خبر ہے تجھ کو اے چاند! تھکی چاندنی، تک رکا چاند۔ ہماری خشک آنکھوں میں جھانکا۔ کچھ نہ بولا۔ پر کیا بتائیں۔

کیسا رویا چاند۔



کچھ صفحات پلٹ گئے

امت الصبور

کھلی کتاب کے صفحے الٹتے رہتے ہیں
ہوا چلے نہ چلے دن پلٹتے رہتے ہیں
بس ایک وحشت منزل ہے اور کچھ نہیں
کہ چند سیڑھیاں چڑھتے اترتے رہتے ہیں

کتاب زیست کے کچھ اور صفحات الٹ گئے۔ وقت کے دشت حیرت میں ایک اور سال گم ہوگیا۔ ازل سے ابد کی طرف رواں وقت کے اس سفر میں انسان کی کہانی بہت مختصر ہے اور بہت طویل بھی۔ اس زندگی میں وہ زوال و کمال کی کتنی ہی منزلیں طے کرتا ہے۔ کتنے ہی نشیب و فراز سے گزرتا ہے۔ آخری سانس تک خواب اور امیدیں اس کے ساتھ چلتی ہیں۔ امیدیں، جو اسے زندگی سے جوڑے رکھتی ہیں اور خواب اسے نئی منزلوں کا راستہ دکھاتے ہیں۔

نئی امیدوں کے چراغ روشن کیے، ہم ایک اور سال کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔

حسب روایت نئے سال کے موقع پر ہم نے اپنے قارئین سے گزرے سال کے حوالے سے کچھ سوال کیے ہیں۔ سوال یہ ہیں۔

ناصر بشیر کس کس کی نظر گھر کو کھا گئی
سایہ سا بچھ گیا ہے مرے آنگن میں خوف کا

1 ۔ ملک کے موجودہ حالات کا سب سے بڑا ذمہ دار آپ کس کو سمجھتی ہیں۔ اغیار کی سازشیں، ہماری قومی سلامتی کے ادارے، سیاست دان، میڈیا یا پھر عوام۔ جو اپنے حقوق کے لیے آواز نہیں اٹھاتے؟

2 ۔ 2013ء میں جو تحریریں آپ نے پڑھیں، ان تحریروں کے کون سے کردار تھے جنہوں نے آپ کو متاثر کیا اور وہ آپ کی یادوں کا حصہ بنے؟

3 ۔ 2013ء کی بہترین تحریر اور کس شمارے کا ٹائٹل سب سے اچھا تھا؟

4 ۔ اب تک گزاری گئی زندگی سے آپ مطمئن ہیں۔ اگر نہیں تو کیا تبدیلی چاہتی ہیں؟

5 ۔ 2013ء کے حوالے سے کون سی بات یا واقعہ آپ کے لیے اہم رہا۔ کوئی کامیابی ملی؟ کوئی خوشی؟ یا مایوسی؟

آیئے دیکھتے ہیں، ہماری قارئین نے ان سوالات کے کیا جوابات دیے ہیں۔

رابعہ فیاض قادری.... کراچی

1۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ہمارے ملک کے ذمہ دار سب سے بڑے ہم خود یعنی عوام ہیں، ہماری کم ہمتی اور بزدلی، اتفاق کا نہ ہونا ہی ہمارے ملک کی تباہی کی بڑی وجہ ہے۔ اس کے علاوہ میڈیا کو تو رہنے ہی دیں، ایک چھوٹی سی بات کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ پر سے کوا بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کمال ہے۔ فحاشی اور بے حیائی پھیلانے میں میڈیا بہت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ "بگ باس" جیسے بے مقصد اور بے حیا پروگرام دکھانے کی کیا وجہ ہے؟ اس طرح کی خبریں دیتے ہیں کہ

لگتا ہے کہ ہم بہت بڑے دہشت گرد ہیں کاش چند سکوں کے عوض اپنے ملک کا وقار گرانے والوں کو عقل آجائے کاش کاش۔۔۔

2۔ 2013ء کی ساری تحریریں خاص کر ناولز بہت پُراثر رہے۔ ان میں عنیزہ سید کی "کوہ گراں تھے ہم" فی الحال ٹاپ پر ہے۔ یہ ایک عجیب کہانی ہے۔ جس میں کبھی تجسس ہوتا ہے اور کبھی جھنجلاہٹ اور سائرہ رضا کی ہر کہانی لاجواب ہے۔ رخسانہ نگار اور ثمرہ بخاری نے بالکل نہیں لکھا اور ان کی کمی بہت محسوس ہوتی۔

3۔ 2013ء میں اگست کا ٹائٹل اچھا تھا اور بہترین تحریر سائرہ رضا کی اصل حکایت لگی۔ اس کی تائی کی بچتیں کم کنجوسیاں، گھڑا یا سب کمال کا تھا خاص کر یہ جملہ "کلیم! بیٹیوں کو ماؤں کے دیے گئے جوڑوں کو اسی خاموشی کے ساتھ سر جھکا کر پہن لینا چاہیے، اسی میں بھلائی ہے اور عزت۔ ان کی بھی اور ان سے وابستہ لوگوں کو بھی۔۔۔"

اس کے علاوہ نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" ایک یادگار اور منفرد ناول تھا۔ حور عین کا کردار بہت خوب صورت تھا۔ نگہت عبداللہ کا سلسلے وار ناول بھی خوب صورت تھا۔

4۔ اپنی زندگی سے پوری طرح تو شاید کوئی بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ ہر انسان کی زندگی میں کمی بیشی ہوتی ہی ہے مجھے ابھی صرف یہ فکر ہے کہ میں اپنی اولاد بیٹا اور بیٹی کی تربیت اچھی اور دینی طور پر کرسکوں۔

5۔ ہاں! 2013ء کے واقعات۔ خوشی تو یہی ہے میرے بیٹے محمد علی رضا کا اسکول میں ایڈمیشن ہوا اور وہ اب تک کے تمام پیپرز میں فرسٹ آئے۔ یہ خوشی بھی ہے اور کامیابی بھی۔ میری ایک سال کی بیٹی مجھے ماما اور ان کو پاپا کہتی ہے تو دلی مسرت ملتی ہے، لیکن ایک ایسی بات ہے، جو میں آپ سب سے شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ ستمبر میں میری بیٹی مروہ عائشہ ایک سال کی ہوئی تو ہم نے ایک تقریب قریبی ہال میں منعقد کی جہاں مروہ کی سالگرہ عقیقہ اور میرے سوا چار سال کے بیٹے محمد علی رضا کی رسم بسم اللہ رکھی گئی۔ اس سلسلے میں درس کا اہتمام تھا۔ تمام مہمان آگئے اور ہمارے معزز مہمان اور علما آئے جنہوں نے بیان کرنا تھا اور نعت خوانی اور علی کو بسم اللہ پڑھانی تھی مگر ساتھ ہی لان B میں بھی عقیقہ کی ہی محفل تھی اور ان لوگوں نے بھی ایکو کا انتظام کیا ہوا تھا۔ مگر جب ہم لوگوں کی طرف نعت خوانی شروع ہوئی تو ان لوگوں نے ایکو پر انڈیا کے واہیات گانے شروع کردیے ہماری طرف سے چند مرد

حضرات گئے اور ان سے درخواست کی یہ آپ تھوڑی دیر کے لیے روک دیں پھر بھلے چلا لیجئے گا انہوں نے ایکو بند کر دیا مگر جیسے ہی بیان و تلاوت شروع ہوئی اور سورۃ بقرہ کی تلاوت و ترجمہ پڑھنے لگے انہوں نے پھر فل والیوم میں ایکو پر ایک گھٹیا سا گانا چلایا' نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں اپنی محفل وہیں روک دینی پڑی۔

مدیحہ قیصر.... لاہور

1- ملک کے موجودہ حالات کی ذمہ داری تھوڑی تھوڑی سب پر عائد ہوتی ہے' لیکن میرے خیال میں سب سے زیادہ بگاڑ میڈیا پیدا کر رہا ہے۔ میڈیا وہی کام کر رہا ہے' جو غیر ملکی عناصر اس سے کروانا چاہ رہے ہیں۔

2- 2013ء کی تحریروں میں جو کردار سب سے اچھا لگا' وہ "دیمک زدہ محبت" کی "جمیلہ مائی" اور "اللہ دتا" کا تھا۔ قناعت کا جو سبق انہوں نے دیا وہ بہت خوب صورت تھا۔

3- 2013ء کی بہترین تحریریں بہت ساری ہیں۔ اس میں "دیمک زدہ محبت" 1966ء میں' اور سائرہ رضا کی ایک تحریر تھی اس کا نام بھول گئی ہوں' بہت اچھی لگی اس کے علاوہ افسانے تو قریباً" ہر دفعہ ہی بہت سبق آموز ہوتے ہیں۔ ٹائٹل سارے شماروں کا بس ٹھیک ہی ہوتا ہے۔

4- اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اپنی زندگی سے بالکل مطمئن ہوں۔ کیونکہ اللہ رب العزت نے ساری نعمتوں سے نوازا ہے اور جہاں تک تعلق ہے تبدیلی کا تو جناب مثبت تبدیلی کے لیے ہم ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

5- 21 مارچ 2013ء کو میری بیٹی عائزہ قیصر کی پیدائش ہوئی اور میرے دو دیوروں نے حج کی سعادت حاصل کی یہی سب سے بڑی خوشی ہوئی۔ مایوسی اللہ کا شکر ہے کوئی ایسی نہیں ہوئی کہ پریشانی کا سبب بنے سوائے اس کے کہ میں اپنے خالص رشتوں کے لیے' بہت بچی ہوں۔ اگر وہ دل دکھائیں تو دکھ ہوتا ہے۔

قرۃ العین خرم ہاشمی.... لاہور

1- چشم بے خواب کو سامان' بہت
رات بھر شہر کی گلیوں میں
ہوا ہاتھ میں سنگ لیے
خوف سے زرد مکانوں کے دھڑکتے دل پر
دستکیں دیتی چلی جاتی ہے!
روشنی بند کواڑوں سے
نکلتے ہوئے گھبراتی ہے!
ہر طرف چیخ سی لہراتی ہے
ہیں مرے دل کے لیے درد کے عنوان' بہت!
درد کا نام سماعت کے لیے راحت جاں
دشت بے مایہ کو زر
نقطہ خاموش کو لفظ
خواب بیدار کو مکاں
درد کا نام میرے.....
شہر خواہش کا نشاں!
منزل رگ رواں
درد کی راہ پر تسکین کے امکان' بہت
چشم بے خواب کو سامان' بہت.....!
"ہیں مرے دل کے لیے درد کے عنوان' بہت.....!

ملک کے حالات دیکھ کر ہر حساس دل کے لیے درد کے لاتعداد سلسلے' بنتے ہی چلے جاتے ہیں۔ مجبوری یہ ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے' سمجھتے ہوئے بھی ہم کچھ کر نہیں پا رہے۔ یا کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ شاید ہم لوگ اجتماعی بے حسی کا شکار ہو چکے ہیں۔

پاکستان کے موجودہ حالات میں ذمہ دار کون ہے؟ کیا کسی ایک فرد یا ادارے کو الزام دے دینے سے دوسرا بری الذمہ ہو جائے گا؟

نہیں! میرا نہیں خیال.... اگر دیکھا جائے یا ایمان داری سے تجزیہ کیا جائے تو انفرادی طور پر ہم سب ہی ذمہ دار ہیں اور جن کے پاس پاور ہے' ذرائع ہیں' ہاں!



ان کی ذمہ داری سب سے زیادہ بنتی ہے۔

لیکن ایک یقین ہے' دل کو پاکستان سے محبت کرنے والے' سب ایک تھے' ایک ہیں اور ایک رہیں گے۔ ان شاء اللہ۔

بس ابھی میری چشم بے خواب کو امید کے سامان بہت ہیں۔

2- ہوں.... بعض اوقات کوئی چھوٹا سا جملہ' یا کوئی چھوٹی سی بات' ہمیشہ یاد رہ جاتی ہے۔ مجھے وہ تحریریں اچھی لگتی ہیں جن میں کسی نہ کسی مقصد کا تعین ضرور ہو۔ عنیزہ سید کی تحریر "کوہ گراں تھے ہم" بلاشبہ بہت اچھی تحریر ہے اور اس کے کردار یاد بھی ہیں۔ 12 ماہ کے شمارے چھانٹے جائیں تو اور بھی بے شمار اچھی تحریریں ملیں گی۔ مگر آپ کا سوال "یادوں کا حصہ" ہے۔ سو صرف "یاد" کو چھانٹ کر یہ تحریر ہی فوراً ذہن میں آئی ہے۔ "متاثر" ہونا ایک الگ چیز ہے۔ ہر اچھا لکھنے والا "متاثر" ضرور کرتا ہے۔

3- بہترین تحریر کون سی تھی؟ اس کا جواب وہی ہے کہ ہر اچھی تحریر' اپنی جگہ پر بہترین ہوتی ہے۔ ہاں عنیزہ سید کی تحریر کافی اسٹرانگ ہے۔ اپنے کردار و واقعات کی وجہ سے۔

"زمین کے آنسو" بھی کافی اچھی تحریر تھی۔ کچھ حصے تو اس کے' بہت اچھے اور قابل تعریف ہیں۔

سرورق سب' بہت اچھے اور مناسب تھے۔ فروری' اگست' اپریل' جنوری کے زیادہ اچھے لگے۔

4- زندگی خاک نہ تھی' خاک اڑاتے گزری
تجھ سے کیا کہتے' تیرے پاس جو آتے گزری
اچھے وقتوں کی تمنا میں رہی عمر رواں
وقت ایسا تھا کہ بس ناز اٹھاتے گزری
بارہا چونک سی جاتی ہے مسافت دل کی
کس کی آواز تھی' یہ کس کو بلاتے گزری!

اس کی نعمتوں کا کوئی شمار نہیں ہے۔ اس حوالے سے اگر کہوں تو " I am blessed " الحمد للہ.....

"مطمئن" ہونا' کافی مشکل لگتا ہے۔ دراصل میرے جیسے لوگوں کا مسئلہ "دنیا" یا اس کے "مال و اسباب" کبھی بھی نہیں ہوتے۔ اس لیے پیمانہ کچھ بدل جاتا ہے۔

کبھی کبھی مجھے' بہت شدت سے احساس ہوتا ہے کہ جیسے میری "خاک" بہت اڑنے لگی ہے۔ میرا "وجود" "مٹی" ہو رہا ہے۔ اپنی خاک سے مل رہا ہے۔ مگر "دل"..... نجانے کیوں "دل" آسمان کی وسعتوں کو پکارتا ہے۔ اونچی اڑان بھرنا چاہتا ہے۔ اس کی بلندیوں کو چھو کر اسی میں گم ہونا چاہتا ہے۔

تیرا خمیر اٹھاتا ہوں اپنے ملبے سے
تجھے بناؤں تو پھر، ٹوٹ کر بناتا ہوں!
اس کشمکش میں مطمئن ہونا فی الحال ممکن نہیں ہے۔

اک بوند عشقیا ڈال کوئی تو۔۔۔
میرے ساتوں سمندر جائیں رنگ۔۔۔

5۔ ہاں 2013ء کا سال میرے لیے کافی حوالوں سے یادگار اور اچھا رہا ہے۔ سب سے بڑی خوشی اتنے سالوں کے بعد اپنے بھائی "ثقلین کیانی" سے ملنا تھا۔ ہماری جدائی کا یہ دورانیہ بہت طویل رہا۔ اتنا کہ ہم سب بہت آگے نکل گئے۔ مگر اتنے سالوں بعد مل کر بھی رشتے کی اسی چاشنی اور خوب صورتی کو محسوس کرنا، بہت اچھا لگا۔ خوشی کے لیے مجھے بہت محنت نہیں کرنی پڑتی۔ کوئی احساس، کوئی لمحہ، کوئی خوب صورت یاد، مجھے پہروں مگن رکھتی ہے۔

"مایوسی" ہاں مجھے اس سے خوف آتا ہے۔ چاہے اپنے لیے ہو یا دوسروں کے لیے۔ مگر انسانی زندگی، آس، امید، ناامیدی، خوشی، غمی کے رنگوں سے ہی زندگی کے کینوس میں رنگ بھرتی ہے۔ اور ان رنگوں میں، خواہش صرف اسی رنگ کی ہوتی ہے۔ جو روح کے پیراہن سے ملتا ہو جس سے "عشق" کی تصویر مکمل ہوتی ہو۔

رنگریز میرے، رنگریز میرے
تیرا کیا ہے اصل رنگ
اب تو یہ دکھلا دے!
میرا ایا بھی تو، میری بیج بھی تو۔۔۔
میرا رنگ بھی تو، رنگریز بھی تو۔۔۔
میری نیا بھی تو، منجدھار بھی تو۔۔۔
تجھ میں ڈوبوں، تجھ میں ابھروں
تیری ہر اک بات سر آنکھوں پہ۔۔۔!
رنگریز میرے!!!

سیما ممتاز عباسی۔۔۔۔ لاڑکانہ

اپنوں نے کیا ہے، غیروں کا دوش نہیں
بارود بھر دیا ہے وجود کے حصوں میں

1۔ موجودہ حالات کے لیے کم از کم میں تو میڈیا کو قصوروار سمجھتی ہوں، میڈیا درست رخ کو پینٹ کرنے کے بجائے واقعات اور حادثات کو اپنی مرضی سے ہوا دے کر ماحول کو خراب کرتا رہتا ہے۔ جس سے حالات بہتر ہونے کے بجائے روز بروز بگڑتے رہے اور اب تو اتنا بگڑ چکے ہیں کہ میڈیا کی دکانداری چمک گئی ہے، اپنی اپنی طرف سے عوام کو سچائی بتانے کے بجائے برائی کو چوں چوں کا مربہ بنا دیا گیا ہے، اب میڈیا کو اپنا قبلہ درست کرنا پڑے گا ورنہ عوام کی لائن کٹ جائے گی!

2۔ 2013ء میں بارہ شماروں میں بے شمار تحریریں اپنے اپنے انداز و بیاں میں لکھی گئی جو سحر انگیز بھی تھیں تو فکر انگیز بھی، ان تحریروں کے اکثر و بیشتر محض کردار تھے، وہ تحریروں کے ساتھ ساتھ تو متاثر کرتے رہے ہوں گے بعد میں نہیں! کیونکہ ہماری تحریریں لو اسٹوریز کے وسیع کینوس کو پار ہی نہیں کر سکی ہیں تو کردار محض کردار تھے جس سے یادیں وابستہ ہرگز نہ ہوئیں۔

3۔ رواں سال میں سب سے گہری تحریر یہی بات ہے کہ دسمبر کے پرچے میں میمونہ صدف کی سحر عترت ہے، جو کسی نئی لکھاری کی نہیں بلکہ پختہ ذہن مصنف کی تحریر لگتی ہے۔ مجھے پڑھتے پڑھتے یہ احساس بڑھتا گیا کہ جیسے یہ تحریر سیاہ فام شاعرہ ایذرا پاؤنڈ کی طویل نظموں کا تسلسل ہو جس میں محبتوں کا پاک جذبہ، انسانی قدروں کا کمال و زوال، رومانیت کا تسلسل ہو جیسے۔۔۔ ویل ڈن صدف تم جیت گئیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا سب سے خوب صورت نفیس ٹائیٹل ماہ جون 2013ء کا تھا جس پر دھان پان سی لڑکی سیاہ لباس میں بڑی کیوٹ سی تھی۔

4۔ اب تک کی گزاری ہوئی زندگی سے میں بالکل مطمئن اور پرسکون ہوں۔ کسی بھی تبدیلی کی کوئی خواہش نہیں کیونکہ تبدیلی سے رواں زندگی پر اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس لیے میں اپنی زندگی اور اس کو گزارنے کے ڈھنگ سے خوش ہوں۔

5۔ 2013ء میں میرے لیے سب سے اہم واقعہ اکتوبر کا زلزلہ ہے، جس نے انسانی گھمنڈ، تکبر، بڑائی، بے ترسی، بے رحمی، بے شرمی اور دوسرے انسانی افعال کو قدرت نے اپنی طاقت سے تہس نہس کر کے دکھایا، جب ہم نے زلزلہ کے جھٹکوں سے بجلی کے کھمبوں کو ہلتے دیکھا اور زمین کے ارتعاش کو محسوس کیا تو قدرت کی طاقت کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ بڑا کارساز ہے، ہم کچھ نہیں اور آفٹر شاکس کم از کم میری حالت سکتہ جیسے تھی۔ اللہ توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔!

عائشہ جمیل۔۔۔۔ لاہور

میں ایم بی بی ایس فرسٹ ایئر کی طالبہ ہوں۔ ڈائجسٹ پڑھنے کی رسیا۔ (اب پتا نہیں وقت ملا کرے گا یا نہیں۔ ہائے میرے ڈائجسٹ۔) امی نے بہت پابندی لگائی کہ ابھی نہیں پڑھنا، لیکن نہیں جناب۔ عائشہ کب ماننے والی تھی۔ پڑھ کے ہی دم لیتی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی خواتین نہیں پڑھتا۔ سب ہی لوگ پڑھتے ہیں۔ امی، ابو، میرے بھائی اور بہنیں سب ہی۔ دادی اماں اور پھوپھو بھی دونوں پڑھتی تھیں۔ اب ان کو گھر کی مصروفیات میں وقت نہیں ملتا۔

1۔ ملک کے حالات کے بارے میں سوچیں تو دل کڑھتا ہے۔ سب سے بڑا ذمہ دار تو پتا نہیں کون ہے، مگر تھوڑے تھوڑے ذمہ دار سب ہی ہیں۔ اغیار کی سازشیں، میڈیا کی بے جا آزادی، ہمارے عوام جو بے سوچے سمجھے عمل کرتے ہیں اور کسی کے بھی پیچھے لگ جاتے ہیں۔ ہمارے قومی سلامتی کے ادارے جو ملک کی سلامتی کے سوا باقی سب کام کرتے ہیں جہاں اتنے برے لوگ ہیں، وہیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اچھے لوگ بھی موجود ہیں۔ تب ہی تو ابھی تک ہمارا ملک قائم و دائم ہے۔ خیر مایوسی کفر ہے۔ بقول ناصر کاظمی۔

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

2۔ 2013ء میں پڑھی جانے والی کئی ایک تحریریں ایسی ہیں جن کے کرداروں نے متاثر کیا تھا۔ خاص طور پر "یقین کامل ہی بندگی ہے" کے کردار۔ بخت شاہ، بشائر سجاد، ماموں الصار، مریم۔ کیا خوب کردار تھا بشائر کا۔ بخت شاہ کا۔ یہ کردار تو دل سے بہت اندر

تک اتر چکے ہیں۔ یہ یقیناً "کبھی نہ بھولنے والے کردار ہیں۔

"زمین کے آنسو" کا ایبک فلک شاہ 'اریب فاطمہ' احمد رضا اور مجھے تو رابیل احسان کا کردار بھی اچھا لگا۔ اس نے جس طرح خود کو بدلا اور کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی' وہ اس جیسے مزاج والی لڑکی کے بس کی بات نہیں تھی۔ "اماں کا شفو" کا شفاعت۔ کیا خوب کردار تھا۔ بہت کم اولاد خصوصاً "بیٹے ایسے ہوتے ہوں گے جو اس قدر اپنی ماں سے محبت کرتے ہوں اور پھر اس محبت کا ثبوت بھی اس بھرپور انداز میں دیتے ہوں۔ "جادوگرنی" میں شاہو کی دلہن کا کردار۔ "اصل حکایت" کی زرین کی معصومیت دل کو بھا گئی۔ "روزن" میں ہانیہ کے اباجی کا کردار۔ اگر سب لوگ ایسی سوچ کے حامل ہو جائیں تو کیا کہنے۔ بیٹیوں سے محبت سنت رسول سمجھ کر کرنے والے بن جائیں تو دنیا بھی سنور جائے اور آخرت بھی۔

3۔ یہ کیا جناب؟ صرف ایک تحریر کا نام لکھنا ہے۔ ویسے تو بہت سی تحریریں بہترین لگیں۔ مگر آپ نے ایک ہی کا پوچھا ہے تو مجھے سائرہ رضا کا ناول "یقین کامل ہی بندگی ہے" سب سے بہترین لگا۔ یہ ایک یادگار ترین ناول تھا۔ مارچ کے شمارے میں شائع ہوا۔ میں نے اسے بار بار پڑھا۔ اسی وجہ سے شمارے کا ٹائیٹل بھی یاد ہے۔

اگر اور لکھنے کی اجازت ہو تو بتاتی چلوں نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" سعدیہ عزیز آفریدی کا "اماں کا شفو" اور "بس اک دعا" سائرہ رضا کے ناولز "سیدھی سڑک' آنے والا ہے برف کا موسم 'اصل حکایت' انصاف اور منصف' عائشہ نصیر احمد کا "ساجن کی کیا بات" بشریٰ احمد کا "جادوگرنی" سمیرا حمید کا "خیال یار" ریما علی سید کا "احمد رضا کی گڑیا" اور سعدیہ عزیز آفریدی کا "روزن" یہ تمام ناولز بھی شاندار تھے اور باقی تمام رائٹرز بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ "سحر عزت" میمونہ صدف نے اچھا لکھا۔

اگر صرف ایک شمارے کے ٹائٹل کے بارے میں بتانا ہے تو وہ فروری 2013ء کا۔ کیا خوب صورت تھا۔ لڑکی کا پر تمکنت انداز۔ خوب صورت ساڑھی اور ہلکا سا میک اپ۔ ان سب نے مل کر اس ٹائیٹل کو چار چاند لگا دیے۔ اس کے علاوہ اکتوبر کے شمارے کا ٹائیٹل بھی اچھا تھا۔ دونوں دلہنیں پیاری اور مانوس سی لگیں۔ اور بلیک بیک گراؤنڈ اچھا لگا اور دسمبر کے شمارے کا ٹائیٹل بھی پسند آیا۔

4۔ یہ بھی اچھا سوال ہے۔ جناب میں تو اپنی اب تک کی گزاری گئی زندگی سے بالکل مطمئن ہوں۔ اگر انسان ہر چیز کو اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کرے تو یقیناً" مطمئن ہی رہے گا۔ ہاں لیکن کچھ مثبت تبدیلیاں اپنی ذات میں لانا چاہتی ہوں اور کوشش بھی کرتی ہوں۔

5۔ 2013ء ایک یادگار سال ہے۔ خوشی اور دکھ دونوں کے حوالے سے۔ اس سال کے شروع میں ایک خوشی بڑی بہن کی شادی کی صورت میں ملی۔ 31 مارچ 2013ء کو ان کی شادی ہوئی۔ اسی سال بڑی بہن نے اپنا ایم فل مکمل کیا اور ان سے چھوٹی بہن نے BSIT مکمل کیا۔

28 جون 2013 کو ہمارے دادا ابو چوہدری شہاب الدین نمبردار اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ہمارے خاندان کے لیے یہ ثابت بڑا صدمہ تھا۔ اللہ کی مرضی تھی۔ کامیابی بھی ملی جناب۔ 16 نومبر 2013 کو میرا نشتر میڈیکل کالج ملتان میں نام آگیا۔ ایم بی بی ایس کے لیے میں چونکہ لاہور کی ہوں تو سب گھر والے پریشان تھے۔ ہاسٹل میں کیسے رہے گی۔ مگر اللہ نے یہ پریشانی بھی حل کر دی۔ 22 دسمبر 2013ء کو پی ایم ڈی سی نے لسٹ پر نظر ثانی کی اور کچھ بچوں کی اپ گریڈنگ کر دی جن میں میں بھی شامل تھی۔ یوں میرا نام امیر الدین میڈیکل کالج لاہور میں آگیا۔

مشا تھلہ آصف بھٹی..... خانقہ ڈوگراں



1 پہلے سوال کا جواب تو میرے نزدیک یہ ہے کہ ہم قصوروار ہیں کیونکہ جب تک ہم خود ٹھیک نہیں ہوں گے ہمارے حکمران بھی ظالم ہوں گے۔

2 اماں کا شفو' جی ہاں مجھے شفو کا کردار بہت پسند ہے اور نبیلہ عزیز میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ مجھے اسی تحریر نے متاثر کیا۔ آج بھی یہ کردار میرے ذہن میں گونجتا ہے۔ (مشا تھلہ اماں کا شفو' سعدیہ عزیز آفریدی کا ناولٹ تھا نبیلہ عزیز کا نہیں) "کوہ گراں تھے ہم" میں مجھے کھاری کا کردار بہت پسند ہے اس کی سادہ مگر گہری باتیں بہت کچھ سوچنے پہ مجبور کرتی ہیں۔

3 ۔ واہ کیا سوال پوچھ لیا آپ نے۔ مجھے اس سال کا سب سے اچھا ٹائٹل فروری کا لگا اور مارچ' ستمبر کا' بہترین تحریر "ماہ تمام" مجھے بہت پسند ہے۔ کہیں پہ ہنسی مذاق کہیں ڈانٹ ڈپٹ اور کہیں گہری سازشیں اور حسد۔

4 ۔ جی جناب' میں اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہوں بس ایک خواہش ہے سب بہنیں دعا کریں کہ میری خواہش پوری ہو میں اپنی بوتیک کھولنا چاہتی ہوں۔

5 ۔ 2013 کے حوالے سے سب سے اہم واقعہ میرے لیے تو بہت اہم اور خوشی کا موقع تھا جب مجھے فروری میں 2012 کے جولائی اور ستمبر کا خواتین کے رسالے جو بہت ڈھونڈنے پر بھی مس ہو گئے تھے اور جب میں بالکل مایوس ہو گئی تو مجھے یہ دونوں شمارے ملے میرے لیے یہ ہی واقعہ سب سے اہم ہے۔

سمیعہ محمود..... حاصل پور

1 ۔ ملک کے موجودہ حالات کے ذمہ دار یہ سب لوگ ہی ہیں۔ اغیار بھی' یار بھی' سیاست دان بھی' میڈیا بھی جس کو جس جگہ بھی موقع ملتا ہے وہ ملک کے حالات کو بدتر بنانے کے لیے اپنا حصہ ڈالنا فرض عین سمجھتا ہے۔ اور جہاں تک عوام کی بات ہے تو جیسے عوام ہوتے ہیں ویسے ہی حکمران ان پر مسلط کیے جاتے ہیں تو نتیجہ سامنے ہے میرا خیال ہے مجھے مزید کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں سب سمجھ دار ہیں۔

2 ۔ 2013 میں متاثر کرنے والے کردار جو یادوں کا حصہ بنے ان میں نگہت عبداللہ کی تحریر "میرے خواب لوٹا دو" اریبہ اور شمشیر کا کردار "زمین کے آنسو" نگہت سیما کا "ایبک' کوہ گراں تھے ہم" عنیزہ سید کا "سعد سلطان کھاری" اور ماہ نور ہیں۔

3 ۔ 2013 کی بہترین تحریر زمین کے آنسو (نگہت سیما) رہی۔ اور بہترین ٹائٹل "اپریل" کا تھا۔

4 ۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے زندگی کی ہر نعمت سے نوازا۔ کسی مفکر نے کیا خوبصورت بات کہی ہے کہ "خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے نصیب پر خوش

ہیں "تو جناب ہم بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں۔

5 ۔ 2013ء میں بہت سے اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے جو ہمیشہ یاد رہیں گے۔ یکم جنوری 2013ء کو ہم اپنے والد صاحب کے مہربان سائے سے محروم ہوئے اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) اپنے والد صاحب کی بدولت ہم بہنیں آج اس مقام پہ ہیں۔ انہوں نے پڑھائی کے سلسلے میں کبھی بیٹے اور بیٹی میں فرق نہیں کیا۔ جون میں میرے دو ماہ کے معصوم سے بھتیجے کی ڈیتھ ہوئی (اللہ تعالیٰ اسے اپنے والدین کے لیے جنت کا وسیلہ بنائے) آمین اور 2013 میں ہی (اکتوبر میں) میری شادی ہوئی۔ اس طرح 2013 کا پورا سال ہی میرے لیے اہم رہا۔

مسکان قریشی' بلال کالونی' ملتان

1 ۔ صرف اور صرف ہم خود۔ چاہے میڈیا ہو' سیاست دان ہو اور ہمارے قومی سلامتی کے ادارے' ہر جگہ اس ملک کے شہری ہونے کے ناتے سے ہم اپنے فرائض سے پہلو تہی' لاپروائی برت رہے ہیں اور آنے والے انجام سے باخبر ہونے کے باوجود بے خبر بننے کی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک صرف اور صرف اپنے مذہب سے دوری ہے۔

2 ۔ عنیزہ سید کی تحریر "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" کا سعد بلال اور کھاری۔ معصوم اور قابل رشک ہیں۔ سائرہ رضا کی تحریر "برف کا موسم" کے خوبصورت اور اپنائیت لیے کردار' ڈاکٹر اتباع' شاہان' غنی اور غازی۔ نگہت سیما "زمین کے آنسو" ایبک فلک شاہ کی حور عین اور شانی کا موی یعنی فلک شاہ فرضی لیکن باکمال کردار تھے۔ سعدیہ عزیز کا بے غرض اور مخلص محبت کی مٹی سے بنا شفاعت عرف شفو۔ سائرہ رضا کے "یقین کامل" کی چٹان کی طرح مضبوط اعصاب کی مالک' صابر اور محبت میں ڈوبی ماں بشائر' سمیرا حمید "راہ یار" کی کھرے کھوٹے کی پہچان سے ماورا' سادہ معصوم اور شفاف زینب عبدالکلام اور پیارے بابا' نزہت شبانہ "ہم سادہ ہی ایسے تھے" کی حساس' پژمردہ' خاموش گہری ندی کی مانند حوریہ۔ سائرہ رضا کا "سیدھی سڑک" کا ذمہ دار اور مخلص اصدق اور فائزہ اور "انصاف اور منصف" کی شفاف اور بے قصور عفت' نبیلہ عزیز کی پاکیزہ' بے داغ گل نین۔ نعیمہ ناز "ہماری آنکھوں کے خواب" کی عزت نفس پر جان نچھاور کرنے والی' حوصلہ مند' باکردار ناہید' بشریٰ احمد "زندگی' تیرگی' روشنی" کی صابر و شاکر غنیہ۔ سعدیہ عزیز "روزن" کے سچے کھرے اور حق پر ڈٹے رہنے والے کردار' ہانیہ اور ابا سب کردار زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر ہمارے ساتھ کھڑے نظر آئیں گے جن سے ہم اپنے "اندر" کی اصلاح کروائیں گے۔

3 ۔ ایک نہیں بلکہ بہت سی ہیں۔ خصوصاً" سائرہ رضا کی "برف کا موسم" مسترد' یقین کامل' سیدھی سڑک' اصل حکایت' سعدیہ عزیز آفریدی کی روزن اور اماں کا شفو' نبیلہ عزیز "گل نین" نگہت سیما کی "زمین کے آنسو" نعیمہ ناز کی "میرے آنکھوں کے خواب" اور سب سے سر عنیزہ سید کا سلسلے وار ناول "کوہ گراں تھے ہم" ٹائٹل جنوری' اپریل' فروری' اگست اور دسمبر کا بھی اچھا تھا۔

4 ۔ اب تک کی گزری زندگی سے مطمئن ہوں اللہ سے دعا ہے کہ وہ کسی کو کسی کا محتاج نہ کرے۔ عزت اور سکون کی زندگی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

5 ۔ کون سی بات یا واقعہ اہم رہا۔ کامیابی' خوشی یا مایوسی.....؟ اس سال میری بیسٹ فرینڈ سندس سعید بٹ فرام لاہور اور نازیہ خلیل فرام ملتان نے مجھے میری سالگرہ پہ وش نہیں کیا۔ بے حد دکھ ہوا۔ اسی سالگرہ پہ میری دو سسٹرز نے مجھے عمیرہ احمد کے ناول گفٹ کیے۔ بے انتہا خوشی ہوئی۔ میری بیٹی "لیلتہ القدر" کا اپنی کلاس میں پوزیشن لینا میرے لیے کامیابی کی نوید سناتا ہے۔



1 "اصلی نام؟"
"آغا عشنا شاہ (Ushna)۔"

2 "پیار کا نام؟"
"عشی' عشو۔"

3 "تاریخ پیدائش/شہر؟"
"12 فروری 1990ء/لاہور لیکن میری پرورش امریکا میں ہوئی۔"

4 "ستارہ/قد؟"
"دلو اور قد 5 فٹ 4 انچ۔"

5 "بہن بھائی آپ کا نمبر؟"
"چھ بہن بھائی ہیں/میں آخری ہوں۔"

6 "تعلیمی قابلیت؟"
"Yourk یونیورسٹی سے انگریزی ادب کیا اور پروفیشنل رائٹنگ۔"

7 "کیا بننے کا ارادہ تھا؟"

ڈراما سیریل رخسار کی

آغا عشنا شاہ سے باتیں

شاہین رشید

"بہت کچھ' رائٹر بھی ڈائریکٹر بھی اور آرٹسٹ تو... ہوں ہی۔"

8 "شادی؟"
"ابھی تو بالکل بھی ارادہ نہیں ہے' ابھی تو کیریر کا آغاز ہے۔"

9 "پہلا پروگرام/وجہ شہرت؟"
"ڈرامہ "آگ" جو کہ جمال شاہ کا تھا/اور "شہریاراں" سے شہرت مل رہی ہے۔"

10 "پہلی کمائی/کیا کیا تھا؟"
"اچھی خاصی معقول کمائی تھی۔ اپنا اپارٹمنٹ لیا اور اپنی پسند کی چیزیں خریدیں۔"

11 "شوبز کی برائی؟"
"اللہ کا شکر ہے مجھے اچھے لوگ ملے اور برائی تو میں نے خود دیکھی ہے اور یہ فیلڈ کسی وجہ سے ہی بدنام ہے۔"

12 "شوبز میں کون لایا؟"
"میری ماں عصمت طاہرہ اور ارسہ غزل۔ دونوں معروف آرٹسٹ ہیں۔"

13 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"کام ہو تو صبح آٹھ بجے ورنہ دوپہر دو ڈھائی بجے۔"

14 "اور رات؟"
ہنستے ہوئے "صبح کے پانچ بجے۔"
15 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"کہ دوبارہ سو جاؤں اور اس فون کو توڑ دوں جس کے الارم سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔"
16 "گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"
"بہت سی باتیں ہیں چونکہ گھر میں چھوٹی ہوں تو سب کا رعب ہے۔"
17 "اپنے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟"
"اگر میں سچ بتا دوں تو مجھے کوئی گولی بھی مار سکتا ہے۔"
18 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"
"میری ہائیٹ کم ہے کاش! 5 فٹ 8 انچ ہوتی۔"
19 "بہت عجیب سا لگتا ہے؟"
"جب لوگ کہتے ہیں کہ کھانا کھلاؤ۔"
20 "آپ کو انتظار رہتا ہے؟"
"اس دن کا جب مجھے کوئی چھٹی مل جائے۔ کیونکہ آج کل ہفتے کے ساتوں دن کام کر رہی ہوں۔"
21 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"
"گانے گا کر' گانے سن کر' ناچ کود کے۔"
22 "طبیعت میں ضدی پن ہے؟"
"بہت زیادہ شاید چھوٹی ہوں اس لیے اور لاڈلی بھی ہوں۔"
23 "دماغ کا میٹر کب گھومتا ہے؟"
"منافق لوگوں کو دیکھ کر اور جو لوگ پروفیشنل نہ ہوں ان کو دیکھ کر کیونکہ میں اپنے کام کو سو فیصد ایمان داری کے ساتھ کرتی ہوں۔"
24 "غصے میں آپ کی کیفیت؟"
"بہت کوشش کرتی ہوں کہ کنٹرول کروں مگر جب نہیں ہوتا تو پھر بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ میرے فونز اور لیپ ٹاپ کی شامت آجاتی ہے۔"
25 "مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
"جسمانی طور پر تو مجھے مردوں کی اونچی ہائیٹ اچھی لگتی ہے اور ویسے وہ مرد اچھے لگتے ہیں جو آپ کو ہر حال میں سپورٹ کریں۔"
26 "کوئی لڑکا اگر مسلسل گھورے تو؟"
"السلام علیکم جی! آپ کو کوئی مسئلہ ہے؟"
27 "پرائز بانڈ نکلنے کی منتظر رہتی ہیں؟"
"پرائز بانڈ تو نہیں لیے۔ البتہ کینیڈا میں تھی تو لاٹری کے ٹکٹ لیتی تھی مگر اس ڈر سے کہ نہ نکلے تو...... میں نے کبھی چیک ہی نہیں کیا۔"
28 "آپ کی نظر میں پیسے کی اہمیت؟"
"بہت کم اہمیت ہے۔ مجھے اپنا حق بھی لینا نہیں آتا جبکہ میں بہت محنت کرتی ہوں۔"
29 "بچت کی عادت ہے آپ کو؟"
"نہیں بالکل نہیں ہے۔ شاید کوئی ذمہ داری نہیں ہے' پھر میں کنجوس بھی نہیں ہوں۔"
30 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
"بھائی اور بہن کے غصے سے۔"
31 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"
"آزادی۔ بہت چھوٹی عمر میں کینیڈا چلی گئی تھی اور پھر اکیلی بھی رہی۔"
33 "شاپنگ پر جا کر سب سے پہلے کیا خریدتی ہیں؟"
"پرفیوم۔"
34 "آپ کے دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟"
"جب میں چلی جاؤں تو لوگ مجھے یاد رکھیں۔"
35 "کبھی برا وقت گزارا؟"
"بہت زیادہ...... فیملی پرابلمز کی وجہ سے۔"
36 "کس بات سے موڈ اچھا ہو جاتا ہے؟"
"کوئی چاکلیٹ دے دے اور میوزک۔"
37 "پسندیدہ پروفیشن؟"
"ایکٹنگ۔"
38 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"
"کئی بار تو اپنے بھی نہیں ہوتے۔ ویسے اپنی فیملی کے علاوہ کوئی بھی سچے دل سے آپ کے لیے مخلص نہیں ہوتا۔"

39 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے؟"
"صرف اور صرف ماں' جس پر آپ اندھا اعتماد کر سکتے ہیں۔ جو مرتے دم تک اور برے سے برے وقت میں بھی آپ کے لیے اچھا ہی چاہتی ہے۔"
40 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"
"اپنے کمرے میں اکیلے یا اپنے دوستوں کے ساتھ یا اپنی فیملی کے ساتھ مگر گھر میں۔"
41 "لباس میں کیا پسند ہے؟"
"باہر جاتی ہوں تو خوب تیار ہو کر جینز وغیرہ پہن کر جاتی ہوں مگر ویسے میں ہر وقت پاجاما ہی پہنے رہتی ہوں۔"
42 "اپنے بارے میں کوئی ایک لفظ یا جملہ؟"
"جنونی۔"
43 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے۔"
44 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتی ہیں؟"
"آج کل آغا عباس کے' کیونکہ اگر اس کو جواب نہ دو تو وہ ناراض ہو جاتا ہے۔"
45 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟"
"میوزک سنتی ہوں۔"
47 "مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟"
"اچھی لگتی ہے مگر مجھ میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ میں ہوسٹ کروں۔ چائے پیش کروں یا کھانا آگے رکھوں۔"
48 "اگر آپ پاور میں آجائیں تو؟"
"سارے کے سارے سیاست دان سوائے عمران خان کے' سب کو ملک بدر کر دوں گی۔"
49 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"جوتے اور پرفیومز۔"
50 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"کوئی بری نہیں لگتی کیونکہ نصیحت اچھائی کے لیے ہوتی ہے۔"
51 "وقت کی پابندی؟"
"کوشش کرتی ہوں۔"
52 "کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟"
"اپنے پہ اور اپنے دوستوں پر۔"
53 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"میرے پاس جتنی بھی قیمتی چیزیں ہیں' میری ماں نے ہی لے کر دی ہیں اور میں نے خود جہاز کا ٹکٹ لیا ہے۔"
54 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ چٹائی یا ٹیبل؟"
"نہ چٹائی نہ ڈائننگ ٹیبل۔ صرف اور صرف میرا بیڈ۔"
55 "اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو کیا لینا پسند کریں گی؟"
"وہ کام کروں گی جو مجھے کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مثلاً" مجھے جہاز اڑانے کا شوق ہے تو میں جہاز اڑاؤں گی۔"
56 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟"
"بہت زیادہ نشہ ہے۔"
57 "ایک کھانا جو بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟"
"اٹالین پاستا بہت اچھا پکا لیتی ہوں بلکہ سارے اٹالین کھانے بہت اچھے بنا لیتی ہوں اور پچھلے دنوں پہلی بار بون لیس چکن کڑاہی بنائی جو کہ بہت مزے کی بنی تھی۔"
58 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"
"عورت۔"
59 "کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"
"امریکہ کے لیڈر کو اور تاوان میں ان لوگوں کی رہائی مانگوں گی جو مختلف جنگوں میں قید کر لیے گئے تھے اور جو بے گناہ تھے۔"
60 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"لال بیگ سے۔"
61 "خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟"
"بزدل ہوتا ہے اور خود غرض ہوتا ہے۔"
62 "دکھ کب ہوتا ہے؟"
"منافق لوگوں کے رویوں سے اور اس وقت جب کوئی مشکل وقت میں آپ کا ساتھ نہ دے۔"

63 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"رخصتی۔"
64 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا نقدی؟"
"گفٹ۔"
65 "ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"ماں کے ہاتھ کا۔"
66 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"قائداعظم محمد علی جناح اور مہاتما گاندھی۔"
67 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کرچکی ہیں؟"
"کم سے کم دس مرتبہ۔"
68 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
"سیل فون' والٹ' پرفیوم اور لپ اسٹک۔"
69 "لوگوں میں مقبول ہونا کیسا لگتا ہے؟"
"بہت اچھا کیونکہ اچھی شہرت اللہ کی نعمت ہے۔"
70 "لوگ آپ کو دیکھ کر بے ساختہ کیا کہتے ہیں؟"
"آپ ڈراموں میں آتی ہیں نا۔"
71 "ویلنٹائن ڈے منانا کیسا لگتا ہے؟"
"اسٹوپڈیٹی ہے۔"
72 "اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتی ہیں؟"
"فوراً" کرلیتی ہوں۔"
73 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"
"اچھا عادت تو یہ کہ اپنی غلطی ہمیشہ مان لیتی ہوں اور اپنے اصولوں کی پابند ہوں اور بری یہ کہ غصہ بہت جلدی آتا ہے۔"
74 "کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"
"جب بہت زیادہ غصہ آیا ہوا ہو۔"
75 "اچانک چوٹ لگنے پر کیا منہ سے نکلتا ہے؟"
"پراپر گالیاں نکلتی ہیں کیونکہ چوٹ برداشت نہیں ہوتی۔"
76 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"جی کئی بار۔"
77 "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"
"ابھی تک نہیں بنی۔ کام میں نے زیادہ کیا ہے مگر آن ایر کم آیا۔"
78 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"
"کروٹیں بدلتی ہوں۔"
79 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر کیا کیا رکھتی ہیں؟"
"ایک کتاب' اسکرپٹ' پانی اور لپ اسٹک۔"
80 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"سب کچھ۔"
81 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"جب میں کبھی تنہا ہوتی ہوں۔"
82 "زندگی کب بدلی؟"
"زندگی تو ہر لمحہ اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہی بدل رہی ہوتی ہے۔"
83 "کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو؟"
"دل چاہتا ہے کہ اس کی جان نکال دوں۔"
84 "کون سا سیریل لکی ثابت ہوا؟"
"میرے خوابوں کا دیا" اس کے آن ایر ہوتے ہی آفرز آنا شروع ہوگئیں اور مسلسل آفرز آرہی ہیں۔"
85 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"
"جب کسی کو بچانا ہو۔"
86 "اپنی شخصیت میں کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟"
"اپنی ماں جیسا بننا چاہتی ہوں۔"
87 "دن کے کس حصے میں تازگی کا احساس ہوتا ہے؟"
"لیٹ نائٹ۔"
88 "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"فریش ہونا۔"
89 "جس دن موبائل سروس آف ہوتی ہے تو کیسا لگتا ہے؟"
"دل چاہتا ہے کہ پورے ملک میں بم بلاسٹ کردوں اور سب کو ماردوں۔"
"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"چونکہ ابھی اتنی شہرت ملی نہیں' اس لیے مجھے نہیں پتا کہ میں کیسا محسوس کروں گی۔"



عفت سحر طاہر

زندگانی کی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھیں مگر ان سے شادی نہ ہو سکی تھی اور سفینہ کو یقین ہے کہ وہ آج بھی ان کے دل میں بستی ہیں۔ صالحہ مر چکی ہیں۔ ابیہا ان کی بیٹی ہے۔ جواری باپ سے بچانے کے لیے صالحہ' ابیہا کو امتیاز احمد کے سپرد کر جاتی ہیں۔ تین برس قبل کے اس واقعے میں ان کا بیٹا معیز ان کا رازدار ہے۔

ابیہا ہاسٹل میں رہتی ہے۔ حنا اس کی روم میٹ ہے اور اچھی لڑکی نہیں ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد' ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کر کے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب' معیز میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔

رباب' ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ زارا کے اصرار پر معیز احمد مجبوراً" رباب کو کالج پک کرنے آتا ہے تو ابیہا دیکھ لیتی ہے۔ وہ سخت غصے میں امتیاز احمد کو فون کر کے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے۔ اتفاق سے وہ فون معیز احمد اٹینڈ کر لیتا ہے۔

ابیہا اپنی اس حرکت پر سخت پشیمان ہوتی ہے۔ معیز رباب میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔

صالحہ ایک شوخ الھڑ سی لڑکی ہے۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند ہے مگر اس کے گھر کا ماحول روایتی ہے۔ اس کی دادی اور تائی کو اس کا امتیاز احمد سے بے تکلف ہونا پسند نہیں ہے۔ امتیاز احمد بھی اس بات کا خیال رکھتے ہیں مگر وہ ان کی مصلحت پسندی اور نرم طبیعت کو بزدلی سمجھتی ہے۔ نتیجتاً" وہ امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی سے ہوتی ہے۔ مراد صدیقی اسے اپنے



آئیڈیل کے قریب محسوس ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف مائل ہونے لگتی ہے۔ صالحہ کی ضد پر شازیہ اس کی ماں سے مراد کا ذکر کرتی ہے۔ وہ غصہ میں صالحہ کو تھپڑ مار دیتی ہیں۔

امتیاز احمد اپنے فلیٹ پر ایبہا کو بلواتے ہیں، مگر ایبہا وہاں معیز احمد کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

چوتھی قسط

یہ صالحہ کے منہ پر ماں کا پہلا تھپڑ تھا۔

اس کے ہوش سنبھالنے کے بعد پہلا تھپڑ۔ وہ بے یقینی سے اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

"بے حیا۔۔۔ غیرت گھول کے پی گئی ہے کیا؟ مرنہ گئی تو ایسے الفاظ منہ سے نکالتے ہوئے۔" وہ غیض و غضب سے کانپ رہی تھیں۔ چیخ کر بولیں تو گلے میں خراش پڑ گئی۔

شازیہ جو صالحہ کے ہمت بندھانے پر بہت کچھ کہنے کے لیے آئی تھی، ان کا غصہ دیکھ کر ڈر گئی اور اس کی حمایت میں کچھ کہے بغیر تیزی سے وہاں سے چلی آئی۔

"اری ٹھہر۔ رک۔ آستین کی سانپ۔ آکے کرتی ہوں میں تیری ماں سے بات۔ اتنا ہی بھلا رشتہ ہے تو تجھے کیوں نہ انکا دیا تیری ماں نے وہاں۔ بے حیا منہ پھاڑ کے راہ کھوٹی کرنے آگئی ہماری۔"

ان کی آواز نے گیٹ تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ لرزتا دل لیے شازیہ تیزی سے گیٹ پار کر گئی۔

اتنی دیر میں صالحہ خود کو سنبھال چکی تھی۔

"دفع ہو جا میری نظروں سے۔ ایسی بکواس تو نے منہ سے نکالی بھی کیسے۔"

"یہ بکواس نہیں ہے امی!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی تو مارے غصے کے ان کے منہ سے کوئی لفظ ہی نہ نکل پایا۔

"تو۔۔۔ ذلیل۔۔۔ خانہ خراب ہو تیرا۔"

"مراد بہت اچھا لڑکا ہے امی۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرا ہم مزاج۔" صالحہ منہ پھٹ ہی نہیں، جی دار بھی بہت تھی۔ ان کی آنکھیں ابلیں۔

"تو ج۔ کب سے ملاقاتیں کی جاری ہیں؟ کیا کرتی رہی ہے۔ ہمارے سروں میں خاک ڈالنے کا بندوبست؟" وہ اونچی آواز میں بولیں تو لہجہ مضبوط تھا۔

"ایسا کچھ بھی نہیں کیا میں نے۔ شازیہ کے گھر سب کے سامنے بات ہوتی ہے اس سے۔ اچھا آدمی ہے۔ خوش مزاج، خوش لباس۔" انہوں نے اپنے سینے پر دو ہتڑ مارے اور بے دم سی تخت پر گر گئیں۔

"اللہ کرے وہ دن آنے سے پہلے ہی میں مر جاؤں۔ جو تو امتیاز احمد کے علاوہ کسی اور کے ساتھ اس گھر سے نکلی۔"

ان کے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"اتنی کمزور کردار کی نکلی تو صالحہ!"

ماں کا طعنہ دل میں بھالے کی طرح پیوست ہو گیا۔

"میں نے کچھ غلط نہیں کیا امی! وہ اچھا لگا سو بتا دیا۔ مذہب اجازت دیتا ہے مجھے۔"

"بکواس بند کر بے غیرت! منگنی ہو چکی ہے تیری۔" وہ چیخیں۔

"نکاح تو نہیں کہ خلع یا طلاق کا مسئلہ ہو گا۔" ادھر وہی اطمینان تھا۔

وہ ہاتھ مل مل کے رونے اور شازیہ کو گھر والوں سمیت کوسنے دینے لگیں۔ صالحہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اسے ابا کے آنے سے پہلے اپنا ہوم ورک مکمل رکھنا تھا۔

کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی صالحہ نے کتنی ہی دیر اپنے گال پہ چھپا اپنی ماں کی انگلیوں کا نشان دیکھا۔ وہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہونے لگی۔

مگر اسے علم نہیں تھا کہ یہ آخری نہیں۔ بلکہ پہلا تھپڑ تھا۔



معیز کو اس قدر غیر متوقع طور پر سامنے پا کر ایبہا کے وجود میں دہشت کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی، جو دروازہ مقفل کر کے اسی طرف آرہا تھا۔

"ک۔ کیا بات ہے۔ م۔۔۔ مجھے۔ یہاں کیوں بلوایا ہے؟" وہ بہت سختی سے استفسار کرنا چاہتی تھی مگر خوف اتنا تھا کہ الفاظ بھی ٹھیک طرح سے ادا نہ ہو سکے۔ چند قدم دور وہ عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

ایبہا بے اختیار پیچھے ہٹی تو اس کی ٹانگیں پیچھے رکھے صوفے سے ٹکرائیں اور وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی صوفے پر گر ہی گئی۔

"تمہیں یہاں بلانے کا مقصد ہے تمہیں تمہاری حقیقت بتانا۔ تم۔۔۔ جو ہماری زندگیوں پر ایک عذاب بن کے مسلط ہو گئی ہو۔"

وہ انتہائی حقارت سے بولا تو ایبہا کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"بولو۔ بتاؤ۔ ایک ہی بار بتاؤ۔ کتنے کا چیک بنا کے دوں کہ تمہیں دوبارہ ہماری زندگیوں میں دخل دینے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔"

وہ اس سے یقیناً "شدید نفرت کرتا تھا تب ہی تو بلا جھجک۔ اور بنا سوچ سمجھے اپنا غصہ اور نفرت اس پر انڈیل رہا تھا۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"میں اپنی مرضی سے آپ کی زندگی میں نہیں آئی۔"

"تو پھر ہماری مرضی سے ہی ہماری زندگی سے نکل جاؤ۔ غلطی ہو گئی تھی ہم سے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"اگر آپ اپنے اور میرے رشتے کا۔" ایبہا نے اسے احساس دلانا چاہا مگر وہ اس بات پر یوں بھڑکے گا، یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"شٹ اپ۔ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے کہ میں بڑے ادب و آداب کا خیال رکھتا پھروں۔ تمہارا جو بھی رشتہ ہے، وہ صرف امتیاز احمد تک ہے اور وہیں آکے ختم ہو جاتا ہے۔"

اور وہ جو پہلے خوف اور اب سہم و بے چارگی کی تصویر بنی ہوئی تھی، اس کے الفاظ نے پتا نہیں روح پر کیسا کوڑا لگایا کہ وہ تڑپ ہی اٹھی۔ چیخ کر بولی۔

"ہاں۔ نہیں ہے میرا آپ سے کوئی رشتہ۔۔۔ تو پھر یوں مجھے دھوکے سے اس جگہ بلوانے کا کیا مقصد ہے آپ کا؟"

"ایک ہی ہے۔" وہ بے حد سکون سے بولا۔ "ابو کا پیچھا چھوڑ دو۔ طلاق لو اور ہمیں ہماری زندگی جینے دو۔ میں جانتا ہوں تمہیں پیسہ چاہیے۔۔۔ وہ میں تمہیں دوں گا۔ تمہیں بس ابو سے طلاق کا مطالبہ کرنا ہے اور بس۔"

ایبہا کا تمام غصہ، تمام وحشت اور خوف اس شخص کی حقارت اور نفرت تلے دب گئے۔

کوئی کسی کی یوں بھی نفی کر سکتا ہے؟ اس کا دل کرلایا۔

"میں۔ کہاں جاؤں گی؟"

"وہ تمہارا اور درد سر ہے۔ میں صرف اپنی فیملی کی زندگی میں سکون چاہتا ہوں۔"

"مگر میری تو فیملی بھی نہیں ہے۔" وہ گڑگڑائی۔

"باپ ہے نا تمہارا۔ ایک کال کرنا' پیسہ دیکھ کے دوڑا چلا آئے گا۔" وہ بے حد سفاک ہو رہا تھا۔

جب ہم ہر حال میں اپنی زندگی کو پرسکون بنانا چاہتے ہیں تو اس کے بدلے کتنے دل بے سکون ہوں گے' یہ نہیں سوچتے۔ معیز احمد بھی اسی منزل پر تھا۔

ایبہا بے بسی سے اسے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کے آنسو رخساروں پہ بہہ نکلے پھر وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

معیز کے دل کو ایک دم سے کچھ ہوا۔

ظالم ہونا اور ظالم ہونے کی اداکاری کرنا۔ دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔

اور کچھ وہ لڑکی چہرے سے اس قدر معصوم اور سادہ سی لگتی تھی کہ... مگر جس طریقے سے وہ ان لوگوں کی زندگی میں آئی تھی۔

معیز نے جبڑے بھینچے تو گردن کی رگیں کھنچ سی گئیں۔ اسے دفعتاً "اپنی ماں کا دھیان آیا۔

اپنی زندگی کے ڈھیروں سال جس نے صالحہ نامی خیالی سوکن سے جل جل کر گزارے تھے اور اب یہ ایبہا مراد...؟

امتیاز احمد صالحہ کو تو اپنا نہ بنا سکے مگر ایبہا کو اپنا کرلے آئے معیز کو یاد آیا کہ سامنے بیٹھی روتی بلکتی لڑکی جس پر وہ ترس کھا رہا ہے' وہ رشتے میں اس کی کیا لگتی ہے۔

اسے اپنی زندگی سے دفعتاً "نفرت محسوس ہوئی۔ اسے یاد آیا کہ تین سال پہلے وہ کیا قدم اٹھا چکا تھا۔ اپنی ماں کے مقابلے میں اس نے اپنے باپ کا ساتھ دیا اور صالحہ کو جتوا دیا۔

اس کی ماں امتیاز احمد سے شادی کرکے بھی ہار گئی تھی۔

"اسٹاپ اٹ۔" وہ سخت لہجے میں بولا مگر ایبہا کی سسکیاں نہ تھمیں۔

"آئی سیڈ اسٹاپ دس نان سینس۔" وہ دانت پیس کر غرایا تو ایبہا نے دم سادھ لیا۔ وہ چند قدم چل کر اس تک آیا۔ ایبہا اپنا بیگ دبوچے خائف سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے تمہارا فیصلہ چاہیے۔ میں تمہیں اب کوئی گیم نہیں کھیلنے دوں گا۔ سمجھیں تم!" وہ پھنکارا تو اس کی آنکھوں سے جھلکتی نفرت اتنی واضح تھی کہ ایبہا کا وجود سرد پڑنے لگا۔

"میں آپ کے والد صاحب کے فیصلے کی پابند ہوں۔" وہ بھکارن بن گئی تھی۔ مگر معیز احمد اس وقت رحم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اسے یہ لڑکی اپنی خوشیوں کی قاتل اور اپنے گھر کے لیے قیامت لگ رہی تھی۔

"تمہاری ماں نے انہیں آفر کی تم سے نکاح کرنے کی۔ اور یاد رکھو کہ امتیاز احمد وہ شخص ہے جس نے اس وقت تمہیں جوئے میں بکنے سے بچایا تھا۔ اور تم یہ صلہ دے رہی ہو اس مہربانی کا۔"

وہ بے حد حقارت سے کہتے انگشت شہادت سے اس کی پیشانی کھٹکھٹا کر بولا تو ایبہا نے مارے شرم کے خود کو مٹی ہوتے محسوس کیا۔ لوگوں کے باپ ان کا فخر ہوا کرتے ہیں اور یہاں اس کی ولدیت اس کے لیے ذلالت کا باعث بن گئی تھی۔

"تمہیں روپیہ چاہیے۔ میں تمہیں دوں گا مگر تمہیں خود ابو سے طلاق کا مطالبہ کرنا ہوگا۔ ورنہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں تمہارا کیا حشر کرسکتا ہوں۔"

سرسراتا ہوا لہجہ ایبہا کے وجود میں پھریری دوڑا گیا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ جو کہتے ہیں میں وہی کروں گی۔" بے حد خوف زدہ انداز میں وہ تیزی سے بولی مگر اسی وقت کلک کی خفیف سی آواز کے ساتھ دروازہ کھولا گیا۔

معیز بے اختیار پلٹا۔ کوئی دروازے کی ناب گھما رہا تھا۔ معیز کا دل بے ترتیبی سے دھڑک اٹھا۔ یہ فلیٹ امتیاز احمد کا تھا اور وہ سمجھ سکتا تھا کہ اگر ڈپلی کیٹ چابی اس کے پاس تھی تو ماسٹر کی (Key) اس دروازے پر کون استعمال

کرسکتا ہے۔



ابا کے آنے سے پہلے امی بمشکل اپنا موڈ تھوڑا بہتر کرکے صالحہ کے کمرے میں آئیں۔ وہ شاید جلد بازی کر بیٹھی تھیں۔ ہوسکتا ہے امتیاز کے ساتھ کوئی لڑائی ہوگئی ہو صالحہ کی۔ اس لیے الثاسید ھابک گئی ہو۔ انہیں صالحہ کو مارے جانے والے تھپڑ پر افسوس ہوا۔

صالحہ کانوں پہ ہیڈ فون چڑھائے ٹیپ میں کیسٹ لگائے گانے سن رہی تھی۔ امی کو اور اطمینان ہوا۔ سرخ رنگ کا یہ چھوٹا خوبصورت سا ٹیپ امتیاز نے صالحہ کے شوق کو دیکھتے ہوئے گفٹ کیا تھا۔ ماں کو دیکھ کر صالحہ نے بٹن دبا کر ٹیپ بند کیا اور ہیڈ فون اتار دیے۔ وہ قدرے خفیف سی تھیں۔

"ایسے ہی تھپڑ دے مارا بچی کو۔ اگر کچھ الٹا سیدھا بول ہی گئی تھی تو پیار سے سمجھاتی میں۔"

وہ انہیں دیکھ کر مسکرائی تو ان کا دل سکون سے بھر گیا۔ یعنی وہ تھپڑ والی بات پر ناراض نہ تھی۔ وہ محبت سے اس کے پاس جا بیٹھیں۔

"کیوں کمرے میں بند ہو کر بیٹھی ہو۔ ابھی تمہارے ابا آئیں گے تو آتے ہی تمہارے نام کی دہائی دینے لگیں گے۔"

"بس یونہی۔ یہ نئی کیسٹ منگوائی تھی۔ وہی سن رہی تھی۔" نارمل سا لہجہ۔

"اچھا۔ امتیاز سے جو منگوائی تھی اس بار؟" انہیں کھلنے کے لیے بچ مل گئی۔

ہلکی سی سانس اندر کھینچ کر صالحہ مسکرائی۔ پھر ماں کو دیکھ کر اس نے بھی گویا باؤنسر مارا۔

"جی۔ اور جس کی خاطر دادی اماں اور تائی کی لعنتیں کھائی تھیں۔"

"تم بھی تو خیال نہیں رکھتیں۔ پتا بھی ہے ان کے اور ہمارے ماحول کا فرق۔"

انہوں نے خفگی دکھائی۔ وہ جم کر کھیلنا چاہتی تھیں۔ مگر جانتی نہیں تھیں کہ مخالف بھی فل فارم میں ہے۔

"آپ کو یہ فرق پہلے بھی معلوم تھا امی! پھر مجھے اس امتحان میں کیوں ڈالا آپ نے؟" وہ تلخ ہوئی۔ انہیں لگا بات کا سرا ہاتھ آنے لگا ہے۔

"جہاں بھی تمہاری بات چلاتی' وہاں کا ماحول ہم سے الگ ہی ہوتا صالحہ! سسرال جاکے ہر لڑکی کو وہاں کا ماحول اپنانا پڑتا ہے۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔

"تم آنکھ او جھل پہاڑ او جھل امی! آنکھوں دیکھی مکھی تو کوئی نہیں نگلتا نا۔"

صالحہ سنجیدہ تھی۔ انہوں نے بات کو ہنسی میں ٹالنا چاہا۔

"چل ٹھیک ہے۔ جاکے سارے بدلے لے لینا۔ ساس سے بھی اور دادی ساس سے بھی۔"

"میں ان سے کوئی بدلہ نہیں لینا چاہتی کیونکہ میں نے ان سب کو معاف کردیا ہے۔" صالحہ کا لہجہ عجیب سا تھا۔

انہوں نے سمجھے بغیر اطمینان سے کہا۔ "بڑی اچھی بات ہے۔ معاف کرنے والے کو اللہ بھی پسند کرتا ہے۔ دیکھنا بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب میاں بیوی راضی ہوں تو حالات چاہے جتنے بھی خراب ہوں' آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"

"ہوں۔" صالحہ نے اثبات میں سرہلایا پھر قدرے توقف کے بعد گویا وضاحت کی۔

"میں نے انہیں معاف کردیا ہے کیونکہ میں مزید ان سے کوئی تعلق نہیں بڑھانا چاہتی۔"

چچی نے ناسمجھی کی کیفیت میں اسے دیکھا۔

"وہ میری تائی ہیں اور میری دادی۔ اور بس۔ ساس واس نہیں۔"

"اچھی مات ہے نا۔ ساس سمجھنا بھی مت۔ ماں اور دادی سمجھ کے خدمت کرے گی تو پھل پائے گی۔"

ماں نے نصیحت کی۔ صالحہ یک ٹک ماں کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس پر پھیلتا اضطراب گواہ تھا کہ وہ گھبرا رہی ہیں۔ وہ شاید دل ہی دل میں محو التجا تھیں کہ صالحہ اس موضوع کو نہ کھولے۔
مگر وہ مجبور تھی۔۔۔ پہلے حالات سے اور اب دل سے۔
"آپ فکر مت کریں امی! ساس والا کوئی چکر ہی نہیں۔ مراد بالکل اکیلا ہے۔ ماں باپ تو کیا بھائی بہن بھی نہیں ہیں۔" صالحہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو ان کی دھڑکن رکتے رکتے بچی۔
"صالحہ۔ میری بچی! یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔" وہ بمشکل خود کو بھڑکنے سے روک پائیں۔
صالحہ نے ماں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے اور نرمی سے بولی۔
"یہ بھی مذاق نہیں ہے امی! میں امتیاز احمد سے شادی نہیں کروں گی۔"
وہ دم سادھے اسے دیکھے گئیں۔
"میں ان لوگوں کی تنگ دلی اور تنگ نظری میں زندگی نہیں گزار سکتی۔ اور نہ ہی مجھے امتیاز احمد کا ببا انداز اچھا لگتا ہے۔ وہ صرف اپنی ماں کا بیٹا اور دادی کا پوتا ہے اور بس۔ اسے رشتے نبھانے نہیں آتے امی!"
وہ بڑے آرام سے کہہ رہی تھی۔ ان کا سکتہ یک لخت ہی ٹوٹا۔ اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر وہ پھنکاریں۔
"اور تو۔۔۔ تجھے کون سا نبھانے آتے ہیں رشتے۔ جو ہم نے جوڑے تھے ان پر بھی لات بیا رہی ہے۔"
"میں نے پوری کوشش کی ہے نبھانے کی۔ پہ اسی کو آداب نہیں آئے۔" صالحہ نے تلخی سے کہا تو انہوں نے سختی سے اس کا بازو ہاتھ کی گرفت میں جکڑا اور جھنجوڑتے ہوئے بولیں۔
"یہ ذہنی آوارگی ہے تمہاری۔ بھول جاؤ اس بکواس کو۔ خبردار جو باپ کے سامنے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو۔ جانتی ہو وہ امتیاز کو اپنے بیٹے کی طرح جانتے ہیں۔"
"اور میں۔۔۔ مجھے اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں؟" اس نے احتجاج کیا۔
ان کا جی چاہا اسے دونوں ہاتھوں سے دھنک ڈالیں۔
بچپن سے لے کر جسے آج تک نازوں اور لاڈوں سے پالا پوسا۔ ہر فرمائش پوری کی۔ وہ آج اپنی زندگی کے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتی تھی۔ گویا اس کی زندگی پر ان کا کوئی حق ہی نہ ہو۔
"ہے اختیار۔ کیوں نہیں ہے۔ ہم تمہاری شادی کردیں گے تو جیسے جی چاہے زندگی گزارنا۔"
انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔ گویا بات ختم۔
"میرا مذہب مجھے اجازت دیتا ہے امی! آپ مراد سے ملیں۔ اسے پرکھیں۔ اگر آپ کو امتیاز سے بہتر نہ لگا تو بے شک انکار کردیجئے گا۔"
صالحہ کے لب و لہجے میں التجا اتر آئی کہ وہ جتنی بھی ضد لگالیتی گھر والوں کی اجازت اور ساتھ کے بغیر بہر حال کچھ بھی نہ کرسکتی تھی۔
"میں کہتی ہوں بکواس بند کر صالحہ! آلینے دے تیرے باپ کو۔ میں کل ہی ان سے فون کرواتی ہوں اماں جی کو اور شادی کی تاریخ رکھنے کا کہتی ہوں۔"
وہ گرج کر بولیں تو صالحہ بھی ساری نرمی اور التجائیں بھول کر اپنی فطری ضد اور ہٹیلے پن پر اتر آئی۔
"اگر آپ میری اور مراد کی شادی کی تاریخ طے کرنا چاہ رہی ہیں تو بصد شوق۔ مگر امتیاز احمد سے شادی میری ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔"
انہوں نے کھینچ کے دو تھپڑ اسے مارے مگر یہ حقیقت ان پر پوری طرح عیاں ہوگئی تھی کہ ان کے گھر کی عزت بیچ چوراہے میں آن پہنچی تھی۔
ان کا غصہ نرمی پیار سب صالحہ نے ایک ہی جملے کے بار تلے دبادیا۔
"میری زندگی چاہتی ہیں تو مراد سے بیاہ دیں۔ ورنہ لاشوں کے نکاح تو ہوا نہیں کرتے۔" صالحہ کے لہجے کا پتھریلا

پن محسوس کر کے وہ دنگ رہ گئیں۔



وہ بھول گیا تھا کہ حبیب خان اس کے باپ کا انتہائی وفادار ملازم تھا۔ زارا کے نکاح والی رات ایبہا کو معیز کے کہنے پر واپس چھوڑ کے آنے کی اس نے فقط ایک ہی غلطی کی تھی۔ اس کے بعد امتیاز احمد چوکے تو نہ ہوں گے۔ یقیناً" حبیب خان نے سیدھا جاکر ان کو رپورٹ دی ہوگی۔

معیز ساکت سا دروازہ کھلتا دیکھ رہا تھا۔ حسب توقع امتیاز احمد کو سامنے دیکھ کر اور اپنی موجودہ پوزیشن کا خیال کر کے معیز شرمندگی سے گڑسا گیا۔

وہ بے حد پرسکون انداز میں اس کے قریب آئے۔ ایبہا جیسے ہوش میں آئی۔ بلک کر روئی اور اٹھ کر امتیاز احمد کے شانے سے لگ گئی۔

انہوں نے بے حد شاکی انداز میں معیز کو دیکھا تو وہ باپ کے سامنے سارے الفاظ ' ساری صفائیاں بھولنے لگا۔

"یہ... یہ مجھے دھوکے سے یہاں لائے ہیں۔" ایبہا اپنی طرف سے تو بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی مگر امتیاز احمد کے سامنے موجودہ صورت حال میں معیز کے اعصاب پر اس کے الفاظ کوڑوں کی طرح لگے۔

"میں صرف اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔ امتیاز احمد نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تو وہ عجیب سا محسوس کرنے لگا۔

ان کی ساری توجہ ایبہا مرادپر تھی۔ اس کے بال سہلا کر اسے چپ کراتے ' تسلی دے رہے تھے اور وہ ان کی بانہوں کے حصار میں جیسے ہر دکھ پر آج ہی رو دینا چاہتی تھی۔

معیز کو شدید غصہ آیا۔ اس کی پوزیشن عجیب سی ہو رہی تھی۔ امتیاز احمد نے خود کچن سے پانی لا کر ایبہا کو پلایا تو وہ کچھ بہتر ہوئی۔

"آپ مجھے ہاسٹل چھوڑ دیں پلیز۔" اس کی آنکھیں سرخ اور آواز رونے سے بھاری ہو رہی تھی۔

"ہاں۔ چلو۔" وہ فوراً" بولے تو اپنا بیگ لیے وہ بھی فوراً" اٹھ گئی۔

معیز کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ وہ دونوں یوں محو گفتگو تھے جیسے کوئی تیسرا وہاں موجود ہی نہ ہو۔

ایبہا کی تو خیر اسے ذرہ برابر بھی پروا نہ تھی۔ ہاں مگر امتیاز احمد کے رویے نے ضرور اسے شرمندہ کیا تھا۔

"ابو! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔"

وہ انہیں جاتا دیکھ کر بے اختیار بولا تو انہوں نے پلٹ کر گہری نگاہ اس پر ڈالی۔

"اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے کہنے کو؟"

ان کا لہجہ کسی بھی قسم کے طنز سے پاک تھا۔ نارمل سے لہجے میں کی گئی عام سی بات۔

مگر معیز احمد تو جیسے شرم سے گڑ گیا۔ وہ پتا نہیں کیا سمجھ رہے تھے۔ وہ ایبہا کو یہاں کیوں لے کے آیا تھا؟؟

"میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا ابو!" وہ تیز آواز میں احتجاجاً" بولا۔

"مگر تمہارا انداز مجھے پسند نہیں آیا معیز!" وہ واقعی قطعی لہجے میں کہہ کر ایبہا کے شانے پر ہاتھ پھیلائے اس کے ساتھ وہاں سے نکل گئے۔

اور پیچھے معیز احمد رہ گیا۔ سرتاپا کسی بھانبڑ میں جلتا ' سلگتا۔ وہ کیا سوچ رہے ہوں گے۔ یہ سوچ ہی معیز احمد کو مارے جا رہی تھی۔

آخر وہ کس رشتے سے اسے یہاں تنہا لے کر آیا تھا۔ وہ بھی دھوکے سے؟

وہ بے دم سا صوفے پر گر پڑا۔

وہ اس وقت خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔

ان کے لیے اب ممکن نہ رہا تھا کہ ابا سے مزید چھپاتیں۔ بات جتنی بگڑ چکی تھی ' وہی قیامت لانے کے مترادف تھی۔

اور ابا چاہے اپنی اکلوتی اولاد سے جتنا بھی پیار کرتے تھے ' ایسی بات ان کے غیض و غضب کو جگانے کے لیے کافی تھی۔ مگر انہوں نے انہیں صالحہ سے الجھنے کی غلطی کرنے کے بجائے دادی سے شادی کی تاریخ طے کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے بہت ہمت اور حوصلے کے ساتھ انہیں ٹھنڈا کیا تو یہ ان کی عقل مندی تھی۔ ورنہ تو وہ صالحہ کو گولی مار دینے کے موڈ میں تھے۔ بھتیجا انہیں بہت پیارا تھا اور داماد کے روپ میں تو وہ اور بھی بہترین تھا۔ ایسے میں صالحہ کے کردار کا یہ ہلکا پن... ان کا دل ٹوٹ گیا تھا اور ادھر صالحہ ' باپ کے کمرے سے اپنے نام کی اٹھنے والی پکار کی منتظر ہی رہی۔ مگر چند لمحوں تک اٹھنے والی اونچی آوازوں کے بعد پہلے آوازیں اعتدال پر آئیں اور پھر خاموشی چھا گئی یا شاید سرگوشیاں؟

وہ کچھ کچھ خوف زدہ اور کچھ پریشان سوچوں میں الجھی تھی۔ اگلے روز امی اور ابا اسے بنا کچھ بتائے کہیں چلے گئے۔ امی نے اسے سختی سے گھر ہی میں رکنے اور دروازے بند کرنے کا آرڈر دیا اور ابا کے ساتھ نکل گئیں۔

صالحہ اور ان کے بیچ ایک نامعلوم سا فاصلہ اور جھجک آگئی تھی۔ ورنہ وہ انہیں یوں بنا بتائے گھر سے نکلنے نہ دیتی۔ دوپہر کو واپس آکے بھی ماں ' باپ میں سے کسی نے اس سے بات کرنا گوارا نہ کیا تھا۔

اس پر بجائے اس کے کہ صالحہ اپنی بے وقوفی پر پچھتاتی ' اس کا دل ماں ' باپ کے رویے پر اور سخت ہونے لگا۔ ساری عمر اس نے ماں ' باپ کو نخرے دکھائے اور ضد منوائی تھی اور اب جبکہ معاملہ اس کے دل کی خوشی اور پوری زندگی کا تھا تو وہ دونوں یوں یکسر اجنبی بن گئے تھے ' روایتی ماں ' باپ۔

امی نے بازار کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ واپسی پہ وہ یوں ہی شاپرز لے کر اپنے کمرے میں گھس جاتیں۔ صالحہ سے وہ ہر بات کرتیں۔ ماسوائے اس کی شادی کے گزشتہ معاملے کو تو جیسے وہ بھول ہی گئی تھیں۔

مگر صالحہ اس معاملے کو دبانا نہیں ' بلکہ اچھالنا چاہتی تھی۔ اس کا شازیہ کے گھر جانا مکمل بند کر کے وہ مطمئن تھیں۔ مگر انہیں علم نہیں تھا کہ جب بھی وہ شاپنگ کرنے جاتی ہیں۔ صالحہ جلدی سے جا کر شازیہ کے گھر کا چکر لگا لیتی اور مراد صدیقی سے ملاقات کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی۔ اس کی چکنی چپڑی باتیں اور حسن و خوب صورتی کو سراہے جانے کا انداز صالحہ کو اپنا دیوانہ بنا چکا تھا۔

یہ سب وہ باتیں تھیں ' جو وہ امتیاز احمد کے لبوں سے سننا چاہتی تھی۔ مراد صدیقی کی آنکھوں سے جھلکتے جذبے وہ کبھی امتیاز احمد کی آنکھوں میں ڈھونڈا کرتی تھی مگر اب تو اسے امتیاز احمد کبھی بھول کر بھی یاد نہ آتا تھا۔ مراد صدیقی کی چرب زبانی اسے پوری طرح شیشے میں اتار چکی تھی اور وہ ماں باپ کی اس پریشان کن خاموشی سے انجان ہی رہتی اگر امتیاز احمد کا فون نہ آجاتا۔

چچی اگر پاس ہوتیں تو صالحہ کو فون اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ مگر وہ نہانے گئی ہوئی تھیں۔ صالحہ نے ریسیور کان سے لگایا تو دوسری طرف امتیاز احمد کو پا کر جیسے منہ میں کونین سی گھل گئی۔

"کیسی ہو؟" وہ بڑی چاہت سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں... ٹھیک ہوں۔" صالحہ پر بے زاری طاری ہونے لگی۔ یہی وہ شخص تھا جس کی وجہ سے اس کے والدین اس سے ناراض تھے۔ اگر یہ شخص میری زندگی میں نہ رہے تو...

اس کے دل نے بے ساختہ خواہش کی تھی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا ' صالحہ چونکی۔

"کیسی تیاری ' کیا مطلب؟" اس کے یوں انجان بننے پر جیسے امتیاز بہت محظوظ ہو کر ہنسا۔

"ایک پری میرے گھر میں اترنے والی ہے۔ ابھی پتا نہیں چلا تمہیں؟"

"کون... کس کی بات کر رہے ہو تم؟" اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی تو فی الفور پوچھا۔

"بس یوں سمجھ لو کہ میری زندگی میں بہار آرہی ہے۔" وہ اپنی ہی موج میں تھا۔
"فون کیوں کیا ہے' یہ بتاؤ۔" صالحہ اس کی کسولی سے زچ ہو کر بولی۔ وہ ہلکی سی ہنسی کے بعد بولا۔
"ابھی تک ناراض ہو؟ میں نے تو سوچا کہ تم ہی نے چچا جان کو بھجوایا ہو گا شادی کی تاریخ طے کرنے۔"
صالحہ کا دل سکڑ کر پھیلا۔ تو اس کی ناک کے نیچے یہ گیم کھیلا جا رہا تھا۔
"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے ان فضولیات میں پڑنے کی۔" وہ بے حد رکھائی سے بولی۔
"چلو اب مان جاؤ یار۔ امی اور دادی کی عادت کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔" وہ جلد از جلد اس کا موڈ ٹھیک کرنا چاہتا تھا۔
"ہاں اور تمہاری عادتوں کا بھی ٹھیک ٹھاک پتا چل چکا ہے مجھے۔ ابھی تمہیں خیال آرہا ہے مجھے منانے کا۔ جب پورا ڈیڑھ مہینہ گزر چکا۔" صالحہ کے لہجے میں تلخی در آئی۔ وہ شرمسار ہوا۔
"ویسے تو پہلے بھی فون وغیرہ نہیں کرتا تمہیں۔ اب کرتا تو پتا نہیں کیا سوچتیں۔ سوچا تھا آکر تمہیں راضی کر لوں گا۔"
"ہنہ... بعض اوقات بہت دیر ہو جایا کرتی ہے امتیاز احمد صاحب!"
قطعی بے گانہ لہجہ۔ کم از کم "امیت جی" سننے والے کی سماعتوں کے لیے تو وہ بہت انجان انداز تھا۔

لفاظی اسے آتی نہ تھی اور یہ صالحہ کے معاملے میں امتیاز احمد کا سب سے بڑا منفی پوائنٹ تھا۔ وہ اس کے ساتھ منگیتر والا رومانٹک سا رشتہ چاہتی تھی جس کو نبھانے کی امتیاز احمد کی تربیت اجازت نہ دیتی تھی۔ تب ہی تو وہ ٹوٹی ڈال کی طرح مراد صدیقی کے ہاتھ بڑھاتے ہی ہاتھ میں آگئی تھی۔
"چلو ٹھیک ہے۔ شادی ہو جانے دو۔ بہت اچھی طرح مناؤں گا تمہیں۔"
وہ اسے بہلا رہا تھا۔ صالحہ نے ثانیہ بھر کچھ سوچا پھر بے نیازی سے بولی۔
"اس وقت تو شاید میرا شوہر تمہیں اتنی بے تکلفی کی اجازت نہ دے۔"
امتیاز احمد کو جھٹکا لگا۔ پھر سنبھلتے ہوئے وہ زبردستی ہنسا۔
"اچھا مذاق ہے۔"
"مراد صدیقی نام ہے اس کا۔ میں نے امی سے بات کی تھی۔ ابا بھی جانتے ہیں میری خواہش۔ اب تم بتاؤ کیا کہتے ہو؟"
وہ اس قدر سفاکی سے پوچھ رہی تھی کہ امتیاز بے چارہ گنگ سا ہو گیا کہ اس ساری بکواس کے جواب میں کیا کہے۔ بہت دیر بعد وہ کچھ کہنے کے قابل ہو سکا۔
"تم مذاق کر رہی ہو صالحہ!" وہ اندر سے اتنا خوف زدہ تھا کہ اس نے صالحہ سے پوچھا نہیں' بلکہ اسے گویا بتانا چاہا کہ وہ مذاق کر رہی ہے یا شاید خود کو...
"میں مذاق نہیں کر رہی امتیاز! بلکہ اچھا ہی ہوا کہ تم سے بات ہو گئی۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ امی اور ابا تمہارے گھر شادی کی تاریخ لینے گئے تھے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ میں انہیں مراد کے بارے میں سب کچھ بتا چکی ہوں۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔ امتیاز کا دل ڈوبنے لگا۔
"کون مراد؟"
"وہ... مجھے بہت چاہتا ہے۔ میرے بالوں' میری آنکھوں پہ شعر کہتا ہے۔ جسے میری ہر ادا پہ یوں فخر ہوتا ہے جیسے یہ اس کی تخلیق ہو۔ اسے نہ تو میری آزاد خیالی پہ اعتراض ہے اور نہ ہی کسی عادت پر۔ بہت پیار کرتا ہے مجھ سے۔"
اس کا محبتوں سے بوجھل ہوتا لہجہ گویا امتیاز احمد کی سماعتوں میں آگ لگا گیا۔
"کیا بکواس کر رہی ہو صالحہ!" اس کی آواز غصے سے پھٹ سی گئی مگر وہ متاثر ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔

اسی اطمینان سے بولی۔
"سچائی ہے امتیاز! جو میرے ماں' باپ تم سے چھپا رہے تھے مگر میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔ تائی اماں اور دادی سچ کہتی ہیں' میں تمہارے اور تمہارے گھر کے قابل نہیں ہوں۔ اس لیے کسی آزمائش میں پڑنے سے بہتر ہے کہ تم پہلے ہی سب کچھ جان کر فیصلہ کر لو۔ میں مراد صدیقی کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گی۔" اس کا امتیاز احمد کی منتیں کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔
امتیاز احمد بے دم ہونے لگا۔
"صالحہ... مذاق مت کرو' دیکھو! تم مجھ سے ناراض ہو یا گھر والوں سے تو میں سب کی طرف سے تم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ غصے میں الٹی سیدھی باتیں مت کرو۔" وہ گھگھیاتے ہوئے بولا۔
صالحہ کی خاطر وہ اس کی منتیں بھی کر سکتا تھا۔ اپنی مردانگی کا زعم بھول کر اس سے معافی بھی مانگ سکتا تھا۔ اسے کوئی تردد نہ تھا۔ وہ اس سے واقعی بہت محبت کرتا تھا۔ مگر صالحہ کی محبت کی ڈیمانڈ کچھ اور تھی۔ اسے محبت کی وارفتگی اور بے باکی چاہیے تھی' جو بغیر شرعی رشتے کے امتیاز احمد کے لیے گویا حرام تھی۔
"میں نہ تو مذاق کر رہی ہوں اور نہ ہی غصہ۔" صالحہ نے رسان سے کہا۔
"میں جانتا ہوں صالحہ... تم ایسا نہیں کر سکتیں۔" وہ یوں بولا گویا اسے خود سے زیادہ جانتا ہو مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اسے آدھا بھی نہیں جانتا۔

"عجیب آدمی ہو تم۔ میں اپنے منہ سے ایک مرد کا نام لے کر اس سے شادی کا اعلان کر رہی ہوں اور تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو۔ کیا کوئی لڑکی مذاق میں کسی اور مرد کا نام لے سکتی ہے۔"
صالحہ کو غصہ آیا۔ فون پر خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد کافی دیر تک وہ ہیلو' ہیلو کرتی رہی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا تھا۔ صالحہ نے ریسیور رکھ دیا۔
اب اسے آنے والی قیامت کا انتظار تھا۔



امتیاز احمد کی گاڑی حبیب خان ہی ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ پچھلی نشست پر ایبہا کے ساتھ بیٹھے دھیمی آواز میں مسلسل معیز کی صفائی پیش کر رہے تھے۔
"وہ ایسا نہیں ہے۔ بہت سوفٹ نیچر ہے اس کی۔ بس... اپنی ماں کے حوالے سے بہت جذباتی ہے۔ اس کے دکھ کا خیال اسے اس نفرت پر اکسا رہا ہے۔"
"تو آپ بھی اپنی بیوی کے دکھ کا خیال کر لیتے۔ کیوں راضی ہوئے اس نکاح پر..." دوپٹے سے چہرہ رگڑتے ہوئے وہ تلخی سے بولی تھی۔
"تمہاری زندگی کا سوال تھا ایبہا!" وہ دکھ سے بولے۔
"ہنہ... ایسے بھی تو داؤ پہ لگ ہی گئی نا۔ ویسے ہی لگ جانے دیتے۔" ایبہا کا لہجہ بھاری تھا۔
امتیاز احمد لاجواب ہونے لگے مگر پھر بھی اسے تسلی دی۔
"میں سمجھاؤں گا معیز کو۔ اسے تمہاری حیثیت کو تسلیم کرنا ہی ہو گا۔ خود سمجھے گا تو ماں کو بھی آسانی سے سمجھا لے گا۔"
"وہ آج مجھے یہاں فورس کرنے کے لیے لائے تھے کہ میں آپ سے ڈائریکٹ طلاق کا مطالبہ کروں۔"
وہ تلخ اور جتاتے ہوئے انداز میں کہتی انہیں ایک دم سے خاموش کرا گئی۔ "آپ کا جذباتیت میں کیا گیا فیصلہ آج پھر مجھے دوراہے پر لے آیا ہے۔"
امتیاز احمد خاموش ہی رہے اور یہ خاموشی ہاسٹل آنے تک برقرار رہی۔

"میں معیز کی طرف سے تم سے معافی مانگتا ہوں اور میری ایک بات کا یقین رکھنا ایپھا! کہ ایک نہ ایک دن اس گھر میں تمہاری حقیقت کو ضرور تسلیم کیا جائے گا۔"

اترتے ہوئے ایپھا نے امتیاز احمد کی آخری بات سنی اور ان کی طرف دیکھے بغیر خدا حافظ کہہ کر ہاسٹل کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ امتیاز احمد کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھائی تو انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔



اس روز معیز کو کمرے میں بلا کر انہوں نے پہلی بار بری طرح جھاڑا۔

"تم ہوتے کون ہو اس پر دباؤ ڈالنے والے کہ وہ طلاق کا مطالبہ کرے.....؟ کبھی شرعی نکتے سے سوچا ہے تم نے کہ یوں زبردستی کسی کو طلاق لینے پر مجبور کرنا کس قدر بڑا گناہ ہے اور سب سے بڑا جرم تمہارا یہ ہے کہ تم نے اسے دھوکے سے وہاں بلوایا۔"

باقی سب تو ایک طرف رہا "آخری جملے نے گویا معیز کو کوڑا رسید کیا۔

"میں نے صرف اس سے بات کرنے کے لیے..... میں اور کسی طریقے سے بات نہیں کر سکتا تھا اس لیے....." بات سنبھالتے ہوئے اس کی رنگت سرخ پڑ گئی۔ یہ بات اس کی ذہنی برداشت سے بڑھ کے تھی۔ امتیاز احمد نے بیچ میں ہی ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا اور تلخی سے بولے۔

"میں تم سے صفائی نہیں مانگ رہا۔ میں تمہیں اس سے دور رہنے کا کہہ رہا ہوں۔ وہ میرا مسئلہ، میری ذمہ داری ہے۔"

"وہ میرا بھی مسئلہ ہے۔" معیز نے احتجاج کیا۔

"تو اسے حل کرو۔" وہ فوراً" بولے۔

"حل ہی تو کر رہا ہوں مگر آپ شاید اپنی فیملی سے بڑھ کر اسے سپورٹ کر رہے ہیں۔" معیز نے اسے جتایا۔

"میری زندگی میں اور میرے ناتے سے اس گھر میں ایپھا کی اہمیت مسلم ہے معیز..... اور یہی میری وصیت بھی ہو گی۔" وہ قطعی انداز میں بولے۔ معیز دانتوں پر دانت جما کر رہ گیا۔

"تم اب جا سکتے ہو۔"

"میں اس معاملے کو ختم کیے بنا نہیں جاؤں گا۔"

"معاملہ ختم ہی سمجھو۔ آئندہ تم اس کو کبھی پریشرائز نہیں کرو گے۔ اینڈ دیٹس آل۔" انہوں نے رکھائی سے بات ختم کر دی تھی۔ معیز بہت سلگتے ہوئے ذہن کے ساتھ ان کے کمرے سے نکل گیا۔



"کوئی ٹاسک ایسا نہیں دیا تم لوگوں نے آج تک جو میں ون نہ کر سکی ہوں۔"

رباب کی آواز پودوں کی درمیانی باڑ کے پار سے واضح طور پر ایپھا کے کانوں میں پڑ رہی تھی چھٹی سے پہلے آج حنا کالج نہیں آئی تھی۔ فری پیریڈ میں وہ دھوپ کا مزا لینے کلریکل آفس سے ملحقہ لان کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ یوں طبیعت پر پچھلے دو دنوں سے جو گرانی چھائی تھی اس میں کمی آنے لگی۔ مگر پھر فوراً" ہی اسے احساس ہو گیا کہ پودوں کی باڑ کے دوسری طرف گھاس کے قطعے پر رباب اور اس کی دوستیں براجمان تھیں۔

رباب کے لب و لہجے کی کھنک سے اس کی مطمئن زندگی اور بے فکری کا پتا چلتا تھا۔ اس کی دوستیں بھی اسی کے اسٹینڈرڈ اور بیک گراؤنڈ کی تھیں۔ منہ میں ببل گم ڈال کے ٹیچرز سے انگریزی میں بات کرتی فیشن ایبل۔ ان کے گروپ کے کپڑوں اور جوتوں کی ورائٹی کی پورے کالج میں دھوم تھی۔ اگرچہ کالج یونیفارم کی پابندی تھی مگر وہ یونیفارم میں ہی کافی کچھ "ارینج" کر لیتی تھیں۔

سرما کی حرارت سے بھرپور دھوپ میں ایپھا کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پچھلے دو دنوں سے معیز احمد کی دہشت نے اسے سونے نہ دیا تھا۔

"اور وہ بھول گئی ہو جو بلیک سوٹ والے کے ساتھ ایک گھنٹہ گزارنا تھا تمہیں؟" رباب کی دوست اسے کچھ یاد دلا رہی تھی۔

"اف..... وہ گنجا۔ پانچ ہزار کی شرط لگی تھی ہماری اور پورے بیس منٹ گزارے میں نے اس بندر کے ساتھ۔ ہاتھ تک تو پہنچ گیا تھا میرے۔ اگر ایک گھنٹہ اس کے ساتھ گزار لیتی تو جانے کیا کرتا۔" رباب نے قہقہہ لگایا۔ ساتھ اس کی دوستوں نے بھی۔

ایپھا چونک کر جاگی۔ غنودہ ذہن نے کچھ آدھا پونا ہی سمجھا تھا۔

"اور وہ جو چھٹی کے ٹائم میرون کرولا میں بیٹھا لائن دے رہا ہوتا ہے "اس کا چیلنج.....؟" کسی نے پوچھا۔

"بھئی۔ وہ تو رباب ہی پورا کر سکتی ہے۔ اس کے جیسی ذہانت اور خوب صورتی ہم میں کہاں۔" اس کی کسی دوست نے اسے جھاڑ پہ چڑھایا۔

"چیلنج کیا ہے تم یہ بتاؤ؟" رباب نے غرور سے پوچھا۔

"وہی۔ نکلواؤ اس سے لمبی رقم۔ پھر شان دار سا ڈنر اڑاتے ہیں پی سی میں۔"

وہ سب ہنسیں۔ ایپھا شاکڈ تھی۔

وہ جو کچھ سمجھ رہی تھی "اگر ویسا ہی تھا تو پھر افسوس تھا ان لڑکیوں کی ذہنیت پر۔

وہ سب ہی بہت امیر گھرانوں کی لڑکیاں تھیں مگر اس انداز میں پیسہ حاصل کرنے میں جو تھرل انہیں لگتا تھا، وہی شاید انہیں یہ گھٹیا حرکتیں کرنے پر اکساتا تھا۔

"یہ تو شہر کے سارے لڑکوں کو مجھ ہی سے کنگال کروائے گی۔ اس گنجے نے پچاس ہزار تو ونڈو شاپنگ کے دوران ہی مجھ پر خرچ کر دیے تھے۔ تم لوگ تو صرف پانچ ہزار ہاری تھیں۔" رباب کے لب و لہجے میں عجیب ـ تفاخر تھا۔

ایپھا کو یوں ان کی باتیں سننا معیوب لگ رہا تھا۔ مگر اب یوں ایک دم سے وہاں سے اٹھ کر خود کو نمایاں کرنا بھی مناسب نہ تھا۔ سو مجبوراً" وہ یہ سب سننے پر مجبور تھی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ پھر کل کی ڈیٹ ڈن ہے رباب! تم اس کی گاڑی میں بیٹھ جانا۔ دیکھتے ہیں ذرا۔ یہ رومیو کتنے پانی میں ہے۔" اس کی ایک دوست نے پروگرام فائنل کیا تھا۔

"کہیں ہارٹ اٹیک ہی نہ ہو جائے اسے۔" رباب ہنسی۔

"ہاں یار! کسی کو لفٹ نہیں آتا۔ یونہی کھڑا تمہیں دیکھتا رہتا ہے۔" کسی نے موشگافی کی۔

"ظاہر ہے بھئی! دیکھنے والی چیز کو تو بار بار دیکھیں گے ہی۔" وہ سب اٹھ گئی تھیں۔ چھٹی کا وقت قریب تھا۔ انہیں یقیناً" گیٹ کے پاس جانے کی جلدی تھی۔

ایپھا شاکڈ سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی اتنی ویل ڈریسڈ اور ویل مینرڈ لڑکی ایسی گراوٹ کا شکار ہو سکتی ہے۔

پھر اسے دفعتاً" خیال آیا۔

کیا وہ معیز احمد کو بھی ایک چیلنج سمجھ کر اسے پھانس رہی تھی؟

اس کی کیفیت عجیب سی ہونے لگی۔



قیامت تو کیا آتی۔ اس سے پہلے امتیاز اس کے روبرو آگیا مگر صالحہ مطمئن ہی رہی۔

وہ اب اس دور سے نکل آئی تھی 'جب وہ امتیاز احمد کو چاہتی تھی یا یوں کہا جائے کہ ایک منگیتر ہونے کے ناتے جو کشش تھی 'وہ اب مراد صدیقی جیسا بے باک عاشق پا کر ختم ہو چکی تھی مگر امتیاز احمد وحشتوں کا شکار تھا۔

"تم کیا فضول باتیں کر رہی تھیں فون پر؟" وہ خفا تھا۔ یقیناً "لاہور سے سیدھا ادھر ہی آیا تھا۔ سفر کی تکان اس کے پورے وجود سے ظاہر تھی۔

مگر ابھی بھی وہ ایک آس 'ایک امید ساتھ لے کر آیا تھا۔ صالحہ کو اکتاہٹ سی محسوس ہوئی۔

"وہی جو تم نے سنا ہے۔" وہ آرام سے بولی۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ امی انہیں بات کرنے کا موقع دے کر وہاں سے ہٹ گئی تھیں۔ تو وہ بھی اس موقع کو ضائع نہ کرنا چاہتی تھی۔

"پاگل ہو گئی ہو تم صالحہ! اتنی چھوٹی سی ناراضی کو تم اتنا طول کیوں دے رہی ہو۔" وہ بے بس ہونے لگا۔ بھیک آپ صرف مانگ ہی سکتے ہیں 'کسی کو دینے پر مجبور نہیں کر سکتے۔

"میں کسی سے بھی ناراض نہیں ہوں اور اگر تمہیں میری ناراضی کی اتنی ہی پروا ہے تو اس شادی سے انکار کر دو امتیاز! کیونکہ میں بھی یہی کروں گی۔ ابھی کروں گی اور اگر ابھی کسی نے نہ مانا تو نکاح کے وقت پھر انکار کروں گی۔ پھر کوئی بھی کچھ نہ کر سکے گا۔"

وہ بے حد سنگ دلی سے بولی تو امتیاز احمد جیسے خالی ہاتھ رہ گیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ وہ سامنے جائے گا اور صالحہ کی ناراضی ختم ہو جائے گی مگر یہاں تو معاملہ ہی اور چل رہا تھا۔

وہ الٹے قدموں وہاں سے بھاگا۔

جیسے بلائیں پیچھے لگ گئی ہوں۔ تین روز تک وہ بخار میں پھنکتا رہا اور چوتھے روز حواس میں آیا تو اس نے چچا سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ صالحہ کی مرضی سے اس کی شادی کروا دیں وہ بھتیجے سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہے۔ وہ گھر آئے اور انہوں نے صالحہ کو دھنک کر رکھ دیا۔ سر سے پاؤں تک وہ نیلو نیل ہو گئی۔ مگر اس کی نہ 'ہاں میں نہ بدلی۔

وہ بے جان سی ہو کر گر گئی۔

"تو مر بھی رہی ہو گی 'تب بھی تیرا نکاح امتیاز ہی سے ہو گا۔" ابا نے کف اڑاتے ہوئے چیخ کر کہا تھا۔

صالحہ نے مرتے مرتے بھی امتیاز کو فون کرکے بلوا بھیجا۔ وہ آیا تو صالحہ کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

"بولو یہ داغ داغ صالحہ قبول ہے تمہیں؟ زندگی گزار لو گے اگر میں بے ایمان دل لے کر تمہارے نکاح میں آئی تو؟" اس کا ہر لفظ گواہ تھا کہ وہ مراد صدیقی کے عشق میں ڈوبی ہوئی ہے۔

امتیاز احمد نامراد وہاں سے اٹھ آیا۔ اس کا دل بالکل خالی تھا کسی فقیر کے کاسے کی مانند۔

گھر آکے وہ ماں کی گود میں منہ چھپا کے بچوں کی طرح رویا۔ وہ پریشان ہو اٹھیں۔

وہ اتنی بے قراری سے رو رہا تھا جیسے کوئی مر گیا ہو۔

"میں سفینہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے دل پہ پاؤں رکھتے ہوئے فیصلہ کیا تو اماں کا دل کرلا اٹھا۔ فوراً "اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"نہ میرے بچے! میں تجھ پہ قربان۔ صالحہ تیرے دل کی سچی خوشی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کو تیری دلہن نہ بناؤں گی۔" وہ معاملہ جانتی نہ تھیں۔

"نہیں اماں۔۔۔ سفینہ سے بس۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا اور اماں کو بھی رلا رہا تھا۔ کہیں کچھ غلط ہونے کا احساس ان کی رگیں کاٹ رہا تھا۔ شاید ان کے رویے کی وجہ سے ان کے بیٹے کی زندگی خراب ہو رہی تھی۔ انہوں نے فوراً "صالحہ سے مل کر

بات جاننے کی سعی کی۔ مگر وہاں تو معاملات ہی اور تھے۔ صالحہ کا نیل نیل ہوتا وجود کچھ اور ہی داستان سنا رہا تھا۔
اس نے تائی کے سامنے صاف لفظوں میں مراد کی محبت اور امتیاز سے شادی نہ کرنے کا مژدہ سنایا تو وہ سکتے میں آ گئیں۔
اتنے رعب داب والی تائی اس چھٹانک بھر کی صالحہ کے سامنے بول نہ پائیں نہ ہی اپنے بیٹے کا حق مانگ سکیں۔ امی اسے ان کے سامنے ہی پیٹنے لگیں۔ مگر اس کے لبوں پر ہر کراہ کے ساتھ مراد کا نام تھا۔
"آپ بے فکر رہیں بھابھی! اس کی شادی امتیاز ہی سے ہوگی اور بس۔"
ابا نے انہیں یقین دلایا تو وہ خاموشی سے اٹھ کے گھر آگئیں۔ امتیاز کو ان کا عندیہ دیا۔
"میں اسی ہفتے سفینہ سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اماں!"
صالحہ کی حالت کا سن کر امتیاز کا نرم دل تڑپ اٹھا۔ اس نے اٹل لہجے میں کہا تو اماں آہ بھر کے رہ گئیں مگر وہی ہوا جو صالحہ کے دل کی مرضی تھی۔
ایک ہفتے کے اندر امتیاز نے سفینہ کو بیوی بنا کر صالحہ کی زندگی آسان کردی۔
ابا کو صالحہ سے نفرت ہوگئی۔ انہوں نے مراد صدیقی کو بلوا کر صالحہ کا نکاح پڑھوا دیا اور اپنے گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند کرلیے اور خود کو اس کے لیے مار دیا۔ مگر صالحہ کو کسی کی پروا نہ تھی۔ اس نے مراد کی صورت اپنے من کی مراد پالی تھی۔ دو دن شازیہ کے گھر رہ کر وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ بے حد شان دار مگر دھول مٹی سے اٹا بے توجہی کا نشان۔ صالحہ دل و جان سے اسے سنوارنے میں لگ گئی۔ مراد کی اس کے لیے محبت بے پایاں تھی۔ اس کے تن بدن پہ لگے زخم دنوں میں بھر گئے۔ ان دنوں وہ سب کچھ بھولے محض مراد صدیقی کی محبتوں کے جام پی رہی تھی۔



زارا اور سفیر مختصر سے عرصے میں ایک دوسرے کے کافی قریب آچکے تھے۔ وہ ان دنوں فرانس میں تھا۔ مگر روزانہ دونوں اسکائپ پر روبرو ہوتے اور ڈھیروں باتیں کرتے۔
زارا نے اندازہ لگایا کہ وہ رباب سے بہت پیار کرتا تھا۔
"چھوٹی ہے اور پھر اکلوتی بھی ہے' اس لیے لاڈلی ہے۔ بڑے ناز اٹھواتی ہے ہم سب سے۔"
سفیر کے لب و لہجے سے رباب کے لیے پیار جھلک رہا تھا۔ زارا نے یہ بات پلو سے باندھ لی۔ یعنی سفیر کے دل میں آسانی سے گھر کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ رباب کو خوش رکھا جاتا۔
یہ سوچ زارا کی بے وقوفی تھی۔
وہ اپنے اور سفیر کے رشتے کو رباب نامی ترازو میں رکھ کے تولنے لگی تھی۔ وہ رباب کو ترازو کا وہ کانٹا سمجھ رہی تھی جو ان دونوں کے پلڑوں کو متوازن رکھے گا اور یہ اس کی سب سے بڑی بھول تھی۔



رات بارہ بجے اس کے موبائل کی میسج ٹون بجی تو اس وقت وہ سونے کی تیاری میں تھا۔
تکیہ ٹھیک کرتے ہوئے نیم دراز ہو کر اس نے میسج دیکھا۔ "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔"
اسی لڑکی کے نمبر سے میسج تھا۔ معیز کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ اتنی ذاتی بات اس لڑکی کو کیسے معلوم ہوئی؟
میسج ٹون پھر بجی۔
معیز نے دیکھا وہ عون عباس کا وشنگ میسج تھا۔ ساتھ ہی التجا بھی کی گئی تھی۔
"یار! صبح یونیورسٹی میں مل۔ بڑا مسئلہ آن پڑا ہے۔" معیز کا ابھی اس سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا سو موبائل آف کرکے وہ اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔

مگر صبح یونیورسٹی میں عون کی رونی شکل دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ بات واقعی گمبھیر تھی۔
وہ اسے کیفے ٹیریا میں لے آیا۔ دو چائے آرڈر کرنے کے بعد وہ عون کی طرف متوجہ ہوا۔
"اب بتاؤ۔ کیا مسئلہ ہے؟"
"کوئی بات نہیں۔ میں کون سا مر رہا ہوں مسئلہ سنانے کو۔ تو پہلے اچھی طرح کھا پی لے۔" اس نے منہ پھلایا۔
"اچھی بات ہے۔" معیز اطمینان سے کہہ کر ٹیبل کو ناخنوں سے بجاتا کیفے ٹیریا میں بیٹھے اسٹوڈنٹس کا جائزہ لینے لگا۔
مگر عون چند پل ہی برداشت کرپایا۔ دانت پیس کر آگے کو جھک کر بولا۔
"بہت خبیث ہے تو۔ دوستی کے نام پر دھبہ۔ دوست یہاں مر رہا ہے اور تجھے کھانے کی پڑی ہے۔"
"دوست کس پر مر رہا ہے؟" وہ ہنسا۔ "اپنی منکوحہ پر؟"
عون نے جز بز ہو کر پہلو بدلا۔ کیا مسئلہ کی تہ تک پہنچا تھا وہ پھر صفائی پیش کرنے لگا۔
"تو کیا غلط ہے۔ اعتراض تو جب ہوتا کہ کسی اور کی منکوحہ پر مر رہا ہوتا۔"
"اچھا اب کیا شوشا چھوڑا ہے اس نے؟" معیز نے دلچسپی سے پوچھا۔
"بی ایس سی کرچکی ہے اور آگے پتا نہیں کون کون سے کورسز اور ڈپلومے لے چکی ہے۔ اب کہہ رہی ہے مزید پڑھنے اپنی خالہ کے پاس لندن جائے گی۔" وہ رونی صورت بنائے ہوئے بولا۔
"تو جانے دے یار۔" معیز نے لاپروائی سے کہا۔ پھر آگے جھکتے ہوئے شرارت سے بولا۔
"اور اگلے ہی دن تو بھی لندن کا ٹکٹ کٹا لے۔"
"ہاں۔ ہنی مون پہ جا رہے ہیں ناں ہم۔" وہ کڑھا تو معیز خوب ہنسا۔
"یہ کون سا ہنی مون ہے۔ جس پہ بیوی پہلے اور شوہر بعد میں جائے گا۔"
"کچھ کرنا یار! مجھے وہ چاہیے۔" وہ بچوں کی طرح مچلا۔ معیز تو اس کی دیوانگی سے متاثر ہو چلا تھا۔
"اپنے والد صاحب سے بات کر۔ ان ہی کے ہاتھ میں ہے سب کچھ۔" معیز نے مسکرا کر مشورہ دیا۔
"وہ تو کہتے ہیں 'سب کے بیچ معافی مانگو ثانی سے۔ پھر وہ رخصتی کی بات کریں گے۔ یہ کہاں کی مردانگی ہے۔"
عون کڑھا تو معیز نے سر ہلایا۔
"یہ تو ہے... اب مرد معافی مانگتا اچھا لگتا ہے بھلا۔" مگر وہ دفعتاً آگے جھک کے سرگوشی میں بولا۔
"او لالے۔ اگر وہ تنہائی میں ملے تو معافی مانگ بھی لوں گا یار... مگر یوں سب کے سامنے..."
معیز نے سر تھام لیا۔
"کیا ہوا' سر میں درد ہے؟" عون نے پوچھا۔ معیز نے اسے گھور کے دیکھا۔
"تیرا کوئی قصور نہیں۔ تجھے عشق خوار کر رہا ہے۔ تو ضرور لڑکی سے معافی مانگے گا۔"
"اگر وہ سچی محبت کرے مجھ سے تو ہزار بار مانگوں گا۔" وہ سینہ ٹھونک کر بولا۔
"یہ کون سی قسم ہے محبت کی۔ جس میں انا ہے ہی نہیں۔" معیز کو اعتراض ہوا۔
"محبت میں انا نہیں مان ہوا کرتا ہے معیز احمد۔" عون نے اسے یاد دلایا۔ پھر جیسے پکا ارادہ کرتے ہوئے بولا۔
"میں اس کے سامنے کان پکڑوں گا اور سوری کہوں گا۔"
"اور ناک سے لکیریں نکالنے والا ڈائیلاگ تو بھول گیا ہے شاید۔"
معیز نے طنز کیا۔ عون ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔
"وہ اس قابل ہے یار! کہ میں اسے منانے کی خاطر ناک سے لکیریں بھی کھینچ لوں۔"
معیز گہری سانس بھر کے چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ عون کے ساتھ دماغ کھپا کھپا کے وہ باہر نکلا تو آسمان بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔

عون تو پیریڈ لینے چلا گیا مگر معیز کا رخ باہر کی جانب تھا۔ اس کا دل یک لخت ہی ہر شے سے بے زار ہونے لگا تھا۔

زندگی کچھ ایسا رخ اختیار کر گئی تھی کہ ہر وقت خوش مزاجی کا مظاہرہ کرنے والا معیز احمد چڑچڑا ہونے لگا تھا۔

ٹپ ٹپ بارش کی بوندیں ونڈ اسکرین پر پڑیں تو وہ چونکا۔ یہ سردیوں کی پہلی بارش تھی۔

اور پنجاب کی بارشیں تو ملک بھر میں مشہور ہیں۔ آسمان سیاہ بادلوں سے بھرا پڑا تھا اور وہی بادل اب ایسے برسے کہ موسم کی خوب صورتی کا مزہ ہی آگیا۔

معیز کی ذہنی کیفیت بدلنے لگی۔ موسم کی خوب صورتی پر ٹینشن پر غالب آنے لگی۔ گاڑی کا ہیٹر آن کر کے اچھا سا میوزک لگائے وہ کتنی ہی دیر سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتا موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا مگر جب بارش اپنے پورے جوبن پہ آئی اور ونڈ اسکرین پہ تیزی سے حرکت کرتے وائپرز کے باوجود اسکرین کے پار دیکھنا ناممکن ہو گیا تو اس نے گھر کی راہ لی۔

اپنی طرف سے وہ بہت احتیاط کے ساتھ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا مگر نجانے کہاں سے بھاگتی وہ لڑکی ایک دم سے کسی چھلاوے کی مانند آکر اس کی گاڑی کے سامنے خوف زدہ سی جم سی گئی۔

"واٹ دا ہیل۔۔۔"

تیزی سے وہیل گھما کر گاڑی موڑتے ہوئے بھی وہ اسے بچا نہ پایا تھا۔ اس نے لڑکی کو برستی بارش میں سرد روڈ پر گرتے دیکھا اور ایک سائیڈ پہ گاڑی روک کر تیزی سے نکل کے اس کی طرف بڑھا۔ سردیوں کی بارش اسے سرتاپا سرد پانی میں شرابور کر رہی تھی۔ مگر وہ بے سدھ پڑی تھی۔

معیز کا دل خوف سے بھرنے لگا۔ سنسان سڑک پر اتنا بڑا حادثہ اس کی زندگی کی پہلی غلطی تھا۔ کوئی اور ہوتا تو یوں ٹکر مار کے بھاگ چکا ہوتا مگر خوف خدا نے معیز کو یہ اقدام کرنے سے روک لیا تھا۔ اس نے پنجوں کے بل بیٹھ کر اس لڑکی کو سیدھا کرنے کی سعی کی تو اس کا چہرہ دیکھ کر زمین و آسمان اس کی نظروں کے آگے گھوم سے گئے۔ ماتھے سے رستا خون بارش کے ساتھ اس کے چہرے پہ پھیل رہا تھا۔

پہلی بار معیز کا جی چاہا کہ وہ اس لڑکی کو مرنے کے لیے یہیں چھوڑ کر فرار ہو جائے۔ اس نے سختی سے جبڑے بھینچے تھے۔



صالحہ کو تو مراد سے محبت تھی ہی، مگر مراد نے بھی اسے بے حد پیار دیا۔۔۔ تب تک جب تک "نئے نئے" کا خمار رہا۔ اس کے بعد راتوں کو دیر سے گھر آنا اس کا معمول بننے لگا۔ وہ اتنے بڑے گھر میں تنہا ڈرتی رہتی۔

"تم کام کاج تو کچھ کرتے نہیں پھر آدھی آدھی رات تک کہاں بیٹھے رہتے ہو؟"

پہلی بار مراد سے الجھی تو اس نے ہنستے ہوئے صالحہ کو بانہوں میں لے لیا۔

"ارے، میری جان کو غصہ بھی آتا ہے۔" اور صالحہ پگھل کے موم بن گئی۔

مگر پھر یہ روٹین ہی بن گئی۔ اوپر سے پیسے کی تنگی۔ وہ پریشان ہونے لگی۔ بینک بیلنس تو کیا خالی بیٹھ کے کھانے سے تو خزانے بھی ختم ہو جایا کرتے ہیں۔

"دوست کے کاروبار میں روپیہ لگایا تھا، سب ڈوب گیا۔" پوچھنے پر مراد نے بتایا تو وہ دل تھام کے رہ گئی۔

"اب بس سر چھپانے کا یہ ٹھکانا ہی بچا ہے۔"

"اب کیا ہو گا مراد؟" وہ خوف زدہ ہونے لگی۔ مراد کچھ نہ بولا۔

"تم کوئی نوکری کر لو۔"

صالحہ نے حالات کے مطابق مشورہ دیا تو وہ ناگواری سے اسے دیکھنے لگا۔ مگر کوئی جواب نہ دیا۔

پھر اس نے دوستوں کو گھر میں لانا شروع کر دیا۔ ڈرائنگ روم میں محفلیں سجتیں۔ اونچی آوازیں، قہقہے اور بلند و بانگ آواز میں گالیاں۔

صالحہ کے کان سنسنا اٹھتے۔ کئی بار اس کا جی چاہتا، سب کو دھکے دے کر گھر سے نکال دے۔ وہ کئی بار مراد سے الجھی مگر وہ اپنے دوستوں یا اپنی روٹین کے متعلق ایک بھی لفظ سننے کو تیار نہ تھا۔

پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ جب مراد کے زیادہ بے تکلف دوست بلا تکلف کچن تک آنے لگے۔

"بھابھی! چائے کا ایک کپ

بھابی! سالن کی پلیٹ

بھابی نمک......"

اس نے کئی بار مراد کے سامنے ناگواری ظاہر کی مگر اسے اپنے دوستوں پر اندھا اعتماد تھا اور ان کی اس بے تکلفی پر چنداں اعتراض نہ تھا۔

اور پھر مراد کا ایک اور روپ صالحہ پر کھلا۔ جب وہ شراب کے نشے میں دھت اس کے پاس آیا۔

صالحہ تو کھڑے کھڑے مر گئی۔

اس مراد کو چاہا تھا اس نے؟

دادی اسے حرام اور حلال کی تمیز سکھایا کرتی تھیں (محرم اور نامحرم کا مطلب بھی تو حلال اور حرام ہی تھا نا) اور اب اس نے ہمیشہ کے لیے حرام کو اپنے لیے چن لیا تھا، تب اسے پہلی بار امتیاز احمد نامی شریف اور نفیس شخص یاد آیا جو اس پر میلی نگاہ بھی نہ ڈالا کرتا تھا اور آج اس کے پہلو میں نشے میں دھت ایک آدمی لیٹا تھا اور جسے وہ اپنی قربت نوازنے پر مجبور تھی۔

اس کے بعد کھانے کے لالے پڑنے لگے۔ صالحہ مراد سے الجھنے لگی۔ محبت روٹی کی طلب تلے دب گئی۔

"میں تو کچھ کام نہیں کر سکتا۔ ساری عمر بیٹھ کے کھایا ہے میں نے۔"

وہ صفاحت انداز میں بولا۔ خود تو وہ دوستوں میں باہر پیٹ بھر آتا ہو گا۔ گھر میں کھانے کو ایک کھیل نہ تھی صالحہ کی حالت دگرگوں تھی۔

"تو پھر مجھے ہی کوئی کام دلا دو۔ میں ہی کما لوں گی۔" اس نے غصے سے چیخ کر گویا مراد کی غیرت کو للکارا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"یہ بھی صحیح کہا تم نے.... تم تو کافی کچھ کما سکتی ہو۔" وہ سرتاپا اسے دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولا۔ اور اسی رات اس نے صالحہ کے لیے کام کا بندوبست کر لیا۔

شیطانی آنکھوں والا مکروہ چہرہ.... وہ شخص مراد کے ساتھ اندر اس کے بیڈروم میں چلا آیا۔ صالحہ دوپٹہ اتارے بے پروائی سے لیٹی تھی۔ ہڑبڑا کر اٹھی اور ادھر ادھر دوپٹے کی تلاش میں ہاتھ مارا۔

"لے بھئی صالحہ! تیرا تو کام ہو گیا میری جان....." بڑی بے تکلفی سے مراد نے اسے پیچھے سے آکر بانہوں میں جکڑا تو غیر مرد کے سامنے اس قدر بے شرمی پر صالحہ کی سانسیں رکنے لگیں۔

"آج کی رات اسے خوش کر دو۔ صبح یہ ہمیں خوش کر دے گا۔ پورے پچاس ہزار دے گا ایک رات کے۔"

مراد صدیقی نے اسے کھڑے کھڑے ایک ہی وار میں قتل کر ڈالا تھا۔ وہ مڑ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نعیمہ ناز



علی نے بڑے چاؤ سے موتیا کے کنگن اور گجرے خریدے تھے۔ ابھی ایک ہی ہفتہ تو ہوا تھا شادی کو۔ اف کتنا خوب صورت اور حسین ہفتہ ہوتا اگر... اگر...

"اونہہ۔" علی نے سر جھٹک کر اپنے خیالات کا رخ اپنی پیاری بیوی کی طرف موڑا۔ نئی نویلی شادی میں بندہ اپنی نئی نویلی بیوی کو ہی سوچے گا نا، مگر جانے کیوں بار بار نئی نویلی بیگم کی صدیوں پرانی نانی اماں خیالات میں آرہی تھیں اور یقیناً "بلاوجہ" نہیں آرہی تھیں۔ پچھلے ایک ہفتے سے یعنی شادی والے دن سے لے کر آج صبح تک، جب وہ آفس آیا ہے۔ وہ نانی اماں ہر معاملے میں ایسی دخیل رہیں کہ علی جیسا بے حد ٹھنڈے مزاج اور دل و دماغ کا مالک بھی جھنجلا گیا اور ایسا جھنجلایا کہ اپنی چھٹیاں اور ہنی مون کا پروگرام بھی کینسل کردیا۔ بات ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی۔ اس نے ہنی مون کا پروگرام بنایا بڑے شوق سے، بڑے چاؤ سے۔ بیگم نے بھی اتنے ہی شوق اور چاؤ سے فرمائش داغ دی، جسے سن کر علی کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔

"ہنی مون پہ نانی اماں کو بھی ساتھ لے چلیں؟" علی نے ایسی بے یقین نظروں سے پیاری بیگم کو دیکھا جیسے وہ خلائی مخلوق ہو۔

"ہاں... تو کیا ہوا، بے چاری اکیلی یہاں کیسے رہیں گی، پھر ان کا دل بھی بہل جائے گا ہمارے ساتھ۔ ایک دوسرے کی کمپنی انجوائے ہی کریں گے ہم لوگ۔"

"ہم اپنے ہنی مون پر جارہے ہیں۔ اپنے ذاتی ہنی مون پر اپنے ذاتی خرچے پر اور اپنے ہنی مون پر میاں، بیوی ایک دوسرے کی کمپنی ہی انجوائے کرتے ہیں کسی اور کی نہیں۔" علی نے دانت پیس کر اسے ایک ساتھ کئی اطلاعات فراہم کیں۔

"اللہ علی! آپ میرے لیے اتنا سا بھی نہیں کرسکتے؟" پیاری بیگم نے ٹھنک کر سوال کیا۔

"اتنا کیا، میں اس سے زیادہ تمہارے لیے کرسکتا ہوں۔ میں تمہارے لیے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھ کر وہاں سے چھلانگ لگا سکتا ہوں۔ مگر اپنے ہنی مون پر اپنے اور تمہارے علاوہ کسی اور کو نہیں لے جاسکتا۔" علی نے دوٹوک الفاظ میں اس پر واضح کیا۔

"اچھا..." اس کے پیارے پیارے چہرے پہ مایوسی چھا گئی اور خوب صورت سنہری آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"اوفوہ... بھئی اب ایسے تو مت کرو۔" علی کے دل کو کچھ ہوا۔

"میں کیا کررہی ہوں؟" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"میرا دل توڑ رہی ہو۔"

"دل تو آپ نے میرا توڑا ہے۔" بیگم صاحبہ جواب صفائی سنے بغیر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

ہنی مون اور چھٹیاں دونوں کینسل ہو گئیں بلکہ کردی گئیں، مگر رہ رہ کر علی کا دل کرلا رہا تھا۔ ہائے شادی، ہائے ہنی مون۔

گھر آتے ہوئے وہ راستے میں سوچ رہا تھا کہ ایک بار اور بیگم سے ہنی مون کے بارے میں بات کرے، شاید عقل میں سما جائے میری بات۔

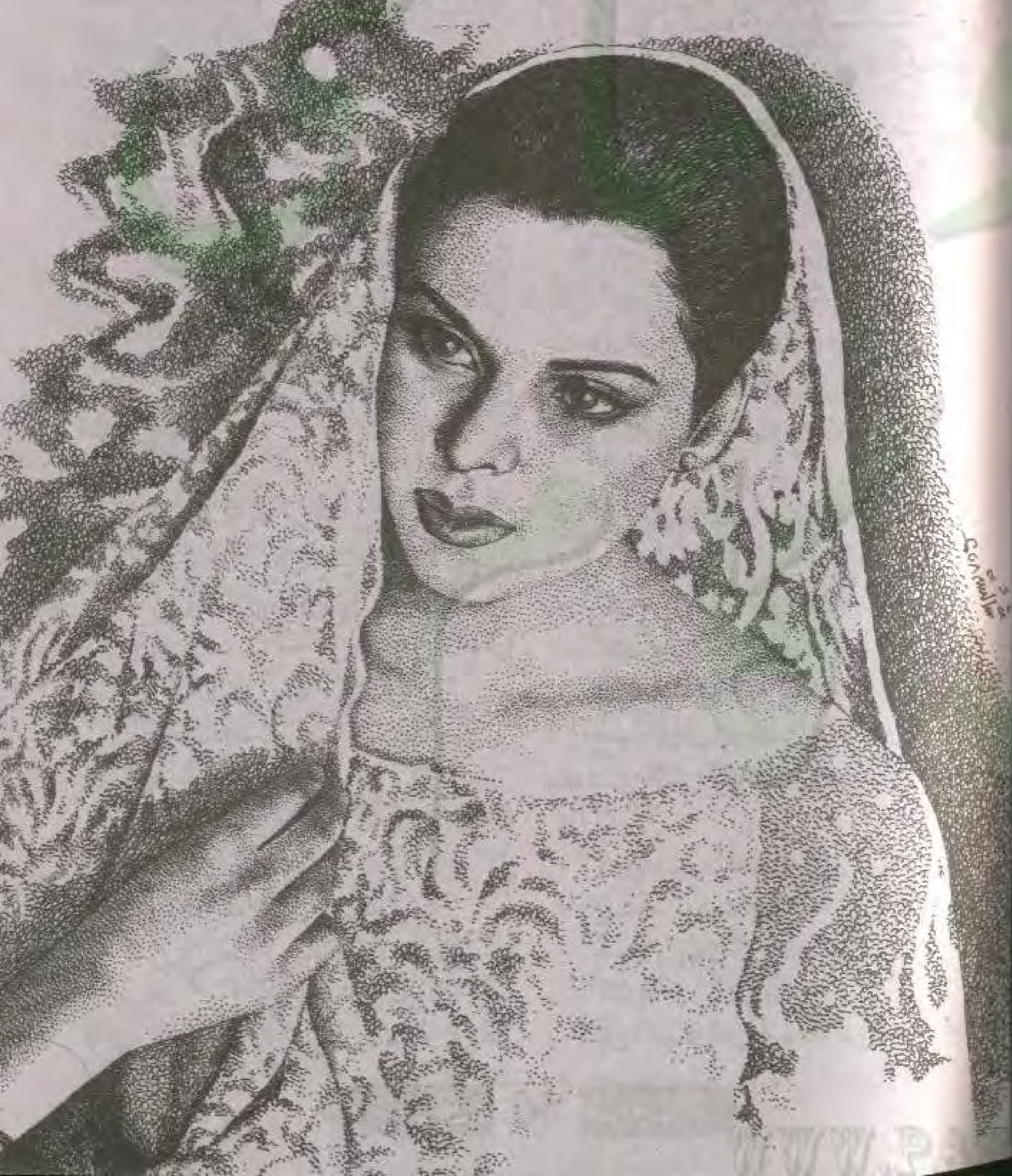
"السلام علیکم!" علی نے لاؤنج میں بیٹھی نانی اماں کو سلام کیا۔

"آ گئے بیٹا۔" وہ غالباً "پان منہ میں رکھ چکی تھیں اور اب چٹکی بھر تمباکو کی باری تھی۔

"جی!" علی نے کھڑے کھڑے ہی عجلت سے جواب دیا۔ وہ اس وقت "فوراً" سے پیشتر اپنے بیڈ روم میں جانا چاہتا تھا۔ تاکہ اپنی پیاری بیگم کی نازک گوری گوری کلائیوں میں اپنے ہاتھوں سے پھولوں کے کنگن پہنائے، اس کی سیاہ دراز زلفوں میں گجرا لگائے اور اسے اپنے سامنے کھڑا کر محبت بھری نگاہوں سے دیکھے اور کہے۔

"آ... آ... آ... چھیں... آآآ چھیں... اونہوں، یہ موتیے کی خوشبو کہاں سے آرہی ہے۔ اف... آآآ چھیں۔" نانی نے لگاتار دو، تین چھینکیں مارتے ہوئے زور سے کہا۔

علی کے رومانٹک خیالات کی عمارت دھڑام سے گر پڑی۔



"کیا ہوا؟" اس نے بدمزا ہو کر بڑی بی کو دیکھا۔

"ارے بیٹا! مجھے موتیے کی خوشبو سے الرجی ہے۔ میلوں دور سے بھی آجائے تو چھینکوں کا... ا... ا... آ چھیں۔" انہوں نے درمیان میں چھینک کا ایک وقفہ لیا۔ "تانتا بندھ جاتا ہے چھینکوں کا۔" چند لمحوں بعد انہوں نے بات مکمل کی۔

"ایک منٹ۔ میں انہیں کمرے میں رکھ آتا ہوں۔" علی نے راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کی۔

"کمرے میں کہاں۔ رکھو گے بیٹا... خوشبو تو وہاں سے بھی آئے گی۔ زویا ' اری او زویا! کہاں رہ گئی بچی۔" انہوں نے نواسی کو آواز لگائی۔

"بھلا بتاؤ' میاں گھر پر آگیا۔ بیگم صاحبہ کمرے میں گھسی بیٹھی ہیں۔" وہ بڑبڑائیں۔

"بیٹا... یہاں آؤ... میاں کو دیکھو' پانی وانی لا کر دو بچے کو' ڈیوٹی سے تھکا ہارا لوٹا ہے۔"

"آرہی ہوں نانی!" زویا اپنا دوپٹا سنبھالتی ہوئی لاؤنج میں آئی۔ ہلکے نیلے رنگ کے دیدہ زیب لباس میں ملبوس' ہلکی ہلکی جیولری' لائٹ سا میک اپ... علی دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا جو آکر تخت پر نانی کے پاس ٹک گئی تھی۔

"آگئے آپ؟"

"ہاں!" علی نے ایک گہری سانس بھری۔

"یہاں تک تو آگیا ہوں۔ اپنے کمرے تک جانے کب پہنچوں گا۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"پانی لا کر دے بچے کو۔" نانی نے نواسی کو ٹھوکا دیا اور وہ "فوراً" فرماں برداری سے کھڑی ہو گئی۔

"ابھی رہنے دو۔ میں..." علی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"ارے بیٹا! پہلے یہ پھولوں کی تھیلی تو فریج میں رکھ دے۔ میں تو چھینک چھینک کر باؤلی ہو جاؤں گی۔" نانی نے علی کی بات کاٹ کر نواسی کو ہدایت دی۔

"لائیں دیں۔" اس نے "فوراً" علی کے ہاتھ سے گجروں اور کنگن کا شاپر لیا اور فریج میں رکھ آئی۔ واپسی پر پانی کی بوتل اور گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔

علی گھونٹ گھونٹ پانی پیتے ہوئے اپنے اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔

"اری زویا! ٹی وی تو لگا' میرا سلطان شروع ہو گیا ہو گا۔" نانی اک دم گھڑی دیکھ کر اچھلیں۔

"یاالٰہی خیر!" علی بھی اچھل پڑا۔

"ہاں ہاں بیٹا خیر ہی ہے ڈرامے کا وقت ہو گیا نا۔" انہوں نے اطمینان سے بولتے ہوئے ٹی وی پہ نظریں گاڑ دیں۔

اب دونوں نانی نواسی' وقفہ آنے تک ڈرامے میں ایسی غرق رہیں گی کہ کسی اور بات کا ہوش ہی نہیں رہے گا۔ علی جلتا بھنتا اپنے بیڈ روم میں آگیا۔

"اگر پتا ہوتا کہ جہیز میں ایسا نمونہ بھی ساتھ آئے گا تو کبھی شادی کے لیے ہامی نہ بھرتا۔" اس نے ٹائی کی ناٹ کھول کر ٹائی گلے سے کھینچ کر نکالی اور بیڈ پر پھینک دی۔

نانی اماں بے چاری کوئی اتنی بری بھی نہیں تھیں' اچھی تھیں' محبت والی' کام والی۔ بس یوں تھا کہ نواسی کے ساتھ ان کی محبت' لگاؤ اور انسیت نے اتنی جگہ گھیر لی تھی کہ علی کو اپنے لیے جگہ نہیں مل رہی تھی۔ وہ بے چارہ جھنجلا کر رہ جاتا۔

چھٹی والے دن اس نے آؤٹنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ "آج شام میں کہیں گھومنے چلتے ہیں؟" علی نے اس کی زلفوں کو چھیڑا۔

"کہاں جائیں گے؟" زویا مسکرائی۔

"تم بتاؤ' کہاں جانا پسند کرو گی؟"

"نانی اماں سے پوچھوں؟" وہ جھٹ سے بولی۔

"اف!" علی دل بھر کے بدمزا ہوا۔ "بھئی نانی کہاں سے آگئیں بیچ میں' اب موٹر سائیکل پر تمہیں بٹھاؤں گا یا انہیں؟"

"ہاں یہ تو ہے' ویسے وہ بڑا ڈرتی ہیں اس دو پہیوں کی سواری سے۔" زویا نے سرہلاتے ہوئے کہا پھر بولی۔

"آپ گاڑی کیوں نہیں خرید لیتے؟"

"گاڑی؟"

"ہاں نا' اب نانی اماں ہمارے ساتھ بائیک پہ تو کہیں جا نہیں سکتیں۔ گاڑی ہو گی تو آسانی ہو جائے گی۔" زویا کی جس معصومیت پہ وہ فدا تھا' کبھی کبھی اسی معصومیت پر اسے غصہ بھی آجاتا۔

"یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ تم شام میں تیار ہو جانا پھر ہم سی ویو چلیں گے۔ وہاں سے ابن قاسم پارک پھر اچھے سے ریسٹورنٹ میں ڈنر۔" علی نے لمحوں میں پروگرام ترتیب دے دیا۔

"اور نانی؟" زویا کا چہرہ پل بھر کو مرجھایا۔

"بھئی نانی اماں گھر پر رہیں گی' پہلے اپنے گھر پر بھی تو وہ اکیلی رہتی تھیں نا۔"

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے مگر۔" وہ ہچکچائی۔

"اگر مگر کچھ نہیں' چھٹی کا دن ہے۔ فہد بھی گھر پر ہے۔ وہ بھی کمپنی دے دے گا نانی کو۔ وہ بور نہیں ہوں گی ٹھیک ہے!" علی نے دھیرے سے اس کا رخسار چھوا۔

"ٹھیک ہے؟" ایک شرمگیں مسکراہٹ زویا کے لبوں پہ چھلکنے لگی۔

"ائے ہائے بیٹا! اس موسم میں سمندر پہ جاؤ گے؟" نانی کو آؤٹنگ کا پتا چلا تو وہ حسب عادت معترض ہوئیں۔

"موسم کو کیا ہوا' ابھی کون سا سردیاں آگئی ہیں؟" علی کو ان کی مداخلت اچھی نہیں لگی۔

"مہینہ تو آگیا نا سردی کا' شام میں تھوڑی بہت ٹھنڈ تو ہو ہی جاتی ہے پھر سمندر کی ہوا تو ویسے ہی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ میری بچی ٹھہری نازک مزاج... اس پر تو ٹھنڈ کا اثر "فوراً" ہوتا ہے۔ نزلہ زکام ہو گیا تو ہفتہ بھر بستر پر پڑی رہے گی۔" نانی بلبلائیں اور ان سے زیادہ علی بلبلا گیا۔

"نہ ابھی شام میں اتنی ٹھنڈ ہو رہی ہے اور نہ ہی ساحل سمندر پر اتنی ٹھنڈی ہوا ہے کہ کسی کو بھی نزلہ زکام ہو جائے پھر بھی احتیاطاً" میں وہاں سوپ پلا دوں گا زویا کو اور رات سونے سے پہلے جوشاندہ۔ ٹھیک ہے؟"

نانی چپ ہو گئیں مگر گھر سے نکلتے نکلتے بھی ان کی ہدایات جاری تھیں۔

"دوپٹا اچھی طرح لپیٹ لے سر پر کانوں میں ہوا نہ لگے۔ علی میاں! بائیک ذرا آہستہ چلانا۔ موئی دو پہیوں کی سواری' بڑی خطرناک ہے۔ اسے تو دیکھ کر ہی ڈر لگتا ہے۔"

علی "جی جی" کرتا ہوا بیگم کو بائیک پہ بٹھا کر بائیک اڑا لے گیا۔

☼ ☼ ☼

ایک دن یہ کہنا غضب ہو گیا کہ بازار کی نسبت اسے گھر کی بنی حلیم زیادہ پسند ہے۔ بس پھر کیا تھا نانی اماں کو ٹارگٹ مل گیا تھا جس پر انہیں کام کرنا... "کرنا" نہیں بلکہ کروانا تھا۔ چھٹی کے دن صبح سے ہی اٹھا پٹخ ہونے لگی۔

"یہ موئی حلیم کھانا بہت آسان ہے' ادھر منہ میں ڈالی ادھر پیٹ میں مگر اسے پکانا... اللہ کی پناہ! پورے دو دن لگتے ہیں اسے پکانے میں' ایک دن گیہوں' جو ساری دالیں چن کے پھٹک کے صاف کر کے رکھو بھگوؤ پھر اگلا پورا دن پکانے میں صرف کرو تب کہیں جا کر سواد آتا ہے گھر کے حلیم کا۔" نانی نے اپنی بات پر حرف بہ حرف عمل کرتے ہوئے ہفتے کو سارے مطلوبہ اناج صاف کروا کے رات میں بھگو دیے۔

اتوار کی صبح' بلکہ علی الصبح ہی زویا کو آوازیں لگنا شروع ہو گئیں۔

"زویا' اری او بٹیا! اٹھ جا میری چندا شاباش' جلدی کر' ابھی قورمہ پکے گا پھر حلیم گھٹے گی۔ پورے دن کام ہے بیٹی! دیر تک پڑے رہنے سے کام تھوڑی ہو گا۔" وقفے وقفے سے ان کی آواز آرہی تھی۔

"کیا مصیبت ہے؟" علی جھنجلا گیا۔

"آپ نے ہی تو فرمائش کی تھی کہ گھر کی پکی حلیم کھانے کا دل چاہ رہا ہے۔" زویا اپنے بال سمیٹ کر کیچر لگاتے ہوئے مسکرائی۔

"تو میں نے یہ کہا تھا کہ ہتھیلی پہ سرسوں جما دیں۔ آج کل میں ہی حلیم گھوٹ کر رکھ دیں؟" علی کو غصہ

آنے لگا۔ "ہفتے میں ایک دن چھٹی کا ملتا ہے' دیر تک سونے کو دل چاہتا ہی مگر یہاں تو۔"

"تو آپ سو جائیں نا کسی نے منع کیا ہے۔ ویسے بھی حلیم آپ کو تھوڑی پکانی ہے۔ نانی بتاتی جائیں گی میں پکاتی جاؤں گی۔" زویا نے نرمی سے بولتے ہوئے میاں جی کو رام کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا بھئی' تم جاؤ۔" علی نے ناراض لہجے میں بولتے ہوئے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

"علی۔۔۔" زویا نے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھا۔

"زویا اری بٹیا! اٹھیں یا نہیں؟" نانی کی پاٹ دار آواز آئی۔

"آئی نانی!" زویا نے گھبرا کر علی کا بازو چھوڑا اور تیزی سے بیڈ سے نیچے اتر گئی۔

"اف یہ نانی۔۔۔ سب سے بڑی پریشانی۔" علی نے جھنجلا کر تکیے میں منہ دے لیا۔

پھر چھٹی کا سارا دن حلیم پکتی رہی' گھٹتی رہی۔ ادھر علی بھی دل ہی دل میں گھٹ رہا تھا۔

"فرزانہ بھابھی تو دو گھنٹے میں حلیم تیار کرلیتی ہیں۔ اتنا ٹائم تو نہیں لگتا۔" علی نے کلستے کلستے اعتراض کر ہی ڈالا۔

"وہ بھی کوئی حلیم ہے' جو دو گھنٹے میں تیار ہو۔ ارے بیٹا! دلیہ اور حلیم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ککر میں گوشت گلا لیا۔ مشین میں (گرائنڈر) میں اناج پیس کر سب کو ملا کر ڈوئی چلائی اور حلیم تیار' سستی ماروں کی حلیم۔ ہمیں تو نہیں پسند ایسے کھانے' جو پکتے تو جھٹ پٹ ہیں اور کھاتے وقت انسان دیر تک سوچتا رہے کہ وہ کیا کھا رہا ہے اور کیوں کھا رہا ہے۔" نانی شروع ہوتیں تو بس "اللہ دے اور بندہ لے۔"

"کب نکلو گی کچن سے؟" علی بے زار ہو کر بیگم کے پاس آن کھڑا ہوا۔

"ابھی ٹائم ہے۔ قورمہ پک رہا ہے' گوشت بھی نہیں گلا۔ پھر یہ سارے اناج ابل رہے ہیں' انہیں بھی دیکھنا ہے' ورنہ سب نیچے سے لگ جائے گا۔"

"بلاوجہ اتنی محنت کر رہی ہو' کھڑی ہو گئیں چولہے کے آگے۔" علی نے منہ بنایا۔

"نانی اماں کہتی ہیں' شوہر کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر جاتا ہے۔" زویا نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"تم تو ڈائریکٹ میرے دل میں آکر براجمان ہو گئی ہو۔ تمہیں ان سب ۔ جھنجھٹوں کی کیا ضرورت ہے۔"

"پھر بھی آپ کی پسند کی ڈشیں تو مجھے اچھی بنانی آنی چاہئیں نا۔" زویا نے اصرار کیا۔

"افوہ! دیکھو مجھے ناشتے میں انڈا' سلائس اور کھانے میں دال چاول پسند ہیں۔ تم بس یہی سیکھ لو' کافی ہے۔"

"اس دن تو آپ اتنے مشکل مشکل کھانوں کے نام لے رہے تھے۔ مٹن کڑاہی' نہاری اور بہاری کباب' فرائی فش' زردہ' چنے کی دال کا حلوہ' کریلے گوشت اور پتا نہیں کیا' کیا۔" زویا نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ فہرست گنوائی' جو علی نے ایک روز بڑی ترنگ میں اسے سنائی تھی۔ جب زویا نے سوال کیا تھا کہ اسے کھانے میں کیا پسند ہے۔

"مذاق کر رہا تھا میری جان!"

"مجھے کیا پتا۔ میں نے نانی اماں کو بتا دیا۔ اب وہ روزانہ مجھے ایک ایک ڈش سکھائیں گی۔"

"اف۔۔۔ اف۔۔۔ تم روزانہ کچن میں گھسی رہو گی چولہے کے آگے۔ خبردار! کوئی ضرورت نہیں ہے یہ سب چیزیں سیکھنے کی۔ مجھے جو پسند ہے میں بازار سے لے آوں گا۔" علی نے لاڈ جتایا۔

"نانی کہتی ہیں بازاری کھانے صحت کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔"

"اک تو یہ تمہاری نانی۔۔۔" علی منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

"اچھا۔۔۔ اب آپ یہاں سے جائیں' مجھے کام کرنے دیں۔" زویا نے اس کی بڑبڑاہٹ پہ توجہ دیے بغیر اسے باہر دھکیلا۔

حلیم پک ہی گئی رات تک۔ علی نے کھائی' پھر کھائی اور خوب ہی کھائی' اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ واقعی بہت ذائقے دار حلیم تھی۔ علی نے دل کھول کر تعریف

کی اور دل کھول کر ہی کھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے روز آفس سے چھٹی کرنی پڑی۔ ضرورت سے زیادہ کھانے سے پیٹ خراب ہو گیا تھا۔ پوری رات وقفے وقفے سے واش روم کے چکر لگاتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج کل زویا کو ایک نیا شوق چرایا تھا۔ وہ آفس سے گھر آتا تو زویا کو سلائی مشین پر جھکے دیکھ کر اور مشین کی گھرر گھرر سن کر اسے طیش آنے لگتا۔

"تم سے کس نے کہا ہے سلائیاں کرنے کو؟"

"نانی اماں کہتی ہیں ہر لڑکی کو سلائی آنی چاہیے۔"

وہ دانت پیس کر رہ گیا۔

"درزی کس مرض کی دوا ہیں؟ ریڈی میڈ کپڑے کیوں ہوتے ہیں؟" وہ اور بھی بھنایا۔

"پھر بھی' کچھ ادھڑا' پھٹا سینے کے لیے یا کوئی اور معمولی موٹی چیزیں سینے کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے' تھوڑی بہت سلائی تو آنی چاہیے۔" زویا کے منہ میں نانی اماں کی زبان بول رہی تھی۔

"تو دن میں سیا کرو نا' میں آفس سے تھکا ہارا آتا ہوں کہ گھر پر بیگم کا فریش فریش چہرہ دیکھنے کو ملے گا اور تمہیں اس سلائی مشین سے فرصت نہیں ملتی۔" علی نے زچ ہو کر شکوہ کیا۔

"دن میں لوڈشیڈنگ ہی اتنی ہوتی ہے۔ پھر جب لائٹ آتی ہے تو ہمارے ڈراموں کا وقت بھی وہی ہوتا ہے۔ ہم ٹی وی دیکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس وقت لائٹ بھی ہوتی ہے اور ڈراموں کا ٹائم بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے مشین پہ بیٹھ جاتی ہوں۔" زویا نے بڑی معصومیت سے اپنی صفائی پیش کی۔

"مجھے بھی کچھ وقت دے دیا کرو۔" علی نے مسمسی شکل بنائی۔

"سارا وقت آپ ہی کے لیے ہے۔" زویا کے لبوں پہ اک شرمیلی مسکان بکھر گئی۔

☼ ☼ ☼

دونوں بھائی کرکٹ کے دیوانے تھے۔ اس وقت بھی پاک بھارت میچ انتہائی سنسنی خیز موڑ پر تھا۔ دونوں دم سادھے' سانس روکے اگلی بال کا یوں انتظار کر رہے تھے جیسے بیٹنگ لائن پر بلا ہاتھ میں پکڑے یہی دونوں موجود ہوں۔

"ارے بیٹا! میں نے کہا' سنتے ہو۔" نانی نے پاس آکر زور سے مخاطب کیا۔ دونوں اچھل پڑے۔

"کیا ہوا؟" ان کے پوچھنے یا کچھ کہنے سے پہلے ہی نانی ان کے اچھلنے پر حیران ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

"آپ بتائیں کیا ہوا؟" علی نے بادل نخواستہ ٹی وی پر سے نظریں ہٹائیں۔

"میں نے کہا' نماز پڑھنے نہیں جاؤ گے؟ جمعہ ہے۔"

"جائیں گے نانی! ابھی تو خطبہ شروع ہوا ہے مولوی صاحب کا' دوسری اذان ہو جائے پھر جائیں گے۔"

"پھر کیا فائدہ جانے کا' تھوڑی دیر پہلے چلے جاؤ' آرام سے بیٹھ کر خطبہ سنو۔ پتا ہے کتنا ثواب ہے اس کا' یہ کیا کہ جماعت کھڑی ہونے والی ہو۔ بھاگم بھاگ پہنچے۔ جلدی جلدی سجدے کیے اور واپس۔" نانی یوں ہی بے لاگ بولتی تھیں۔

"ہر جمعے کو جاتے ہیں نانی! نماز پڑھنے' ابھی چلے جائیں گے۔" فہد نے ان کی بات سے کچھ شرمندہ ہو کر رسان سے جواب دیا۔

"تو بیٹا! بس اٹھو تیاری کرو۔" انہوں نے پھر اصرار کیا۔

"چلیں بھائی صاحب اٹھ جائیں' ورنہ نانی اماں نہ میچ دیکھنے دیں گی' نہ سننے دیں گی۔" فہد نے بھائی صاحب کے پہلو میں کہنی مارتے ہوئے سرگوشی کی۔

"چلو۔"

علی نے ایک گہری سانس لے کر ریموٹ اٹھایا' ٹی وی آف کرنے کے لیے۔

"بات سن یار! نانی اماں کا کوئی انتظام کرنا ہی پڑے گا۔" نماز سے واپسی پر علی نے فہد کو مخاطب کیا۔

"کیسا انتظام؟" فہد نے نہ سمجھنے والے انداز میں

بڑے بھائی صاحب کو دیکھا۔
"کہیں بھیجنا پڑے گا ان کو؟"
"کہاں؟"
"دوسری دنیا میں۔" علی بھنا گیا۔
"تعزیرات پاکستان دفعہ 302 کے تحت قتل عمد کی سزا' سزائے موت ہے۔" فہد اس وقت کوئی وکیل لگ رہا تھا۔
"بکواس مت کر۔" علی کو اس وقت اس کا مذاق کرنا بھی برا لگ رہا تھا۔
"ویسے کبھی کبھی مجھے بھی فکر ہوتی ہے ایک بات کی۔" فہد سنجیدگی سے بولا۔
"کس بات کی؟" علی نے چونک کر اسے دیکھا۔
"میری شادی کے بعد کیا ہوگا؟ نانی کو ہر ایک کے ہر معاملے میں بولنے کی' ٹانگ اڑانے کی عادت ہے۔ اگر سویرا نے برداشت نہ کیا تو؟" فہد نے اپنی منگیتر اور عن قریب ہونے والی بیگم کا نام لے کر خدشے کا اظہار کیا۔
"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کوئی ترکیب سوچ' نانی کو یہاں سے چلتا کرنے کی۔" علی' نانی اماں کی مداخلت بے جا سے بہت تنگ آگیا تھا۔ دراصل کم عمری میں ہی والدین کا سایہ سر سے اٹھنے کے سبب دونوں کو اکیلے رہنے کی عادت تھی۔ اپنے معاملات میں مداخلت ناگوار گزرتی تھی۔ پھر علی کی نئی نئی شادی کے سہانے دن' وہ کبھی کبھی تو نانی اماں کی عادت سے بے حد جھنجلا جاتا تھا۔
مختلف ترکیبیں سوچ سوچ کر اس کا دماغ تھک گیا تھا۔ مگر کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی' جو قابل عمل ہو۔

☆ ☆ ☆

جیسے جیسے فہد کی شادی کے دن قریب آتے جارہے تھے' دونوں کی فکر اور پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ نانی اماں کا رویہ بدستور قائم تھا۔ ان کی عادت اور مزاج کے مطابق ہر بات میں دخل اندازی' ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا۔
زویا بری کی تیاری کررہی تھی۔ روزانہ نت نئے خوب صورت اور جدید فیشن کے کپڑے خرید کر لاتی۔ اس کے ساتھ میچنگ شوز' جیولری اور اسٹائلش بیگ۔
"توبہ اللہ! اتنا مہنگا سامان۔" نانی اماں قیمتیں سن سن کر ہول جاتیں۔
"ارے بیٹا! نکاح' ولیمہ کے جوڑے دوبارہ تو کوئی پہنتا نہیں۔ یوں ہی رکھے رہ جاتے ہیں۔ پھر فائدہ یوں پیسہ لٹانے کا؟ مناسب قیمت کے جوڑے خرید لاتیں۔" عروسی ملبوسات کی قیمتیں سن کر وہ چکرا گئیں۔
"سادگی اچھی چیز ہے بیٹا! اور کفایت شعاری سے کام لینا چاہیے۔ فضول خرچ کو تو ویسے بھی شیطان کا بھائی کہا گیا ہے۔"
"شادی تو ایک ہی بار ہوتی ہے نانی! دل کھول کے سب ارمان پورے کرنے چاہئیں۔" فہد نے جلدی سے مداخلت کی۔
"زندگی بھی تو ایک ہی بار ملتی ہے بیٹا! ہر معاملے میں اپنے دل کے پیچھے پیچھے تھوڑی چلتے ہیں۔" نانی کے پاس ہر دلیل کا جواب موجود تھا۔
"نانی! یہ دیکھیے' یہ سوٹ آپ کے لیے لائی ہوں۔" زویا نے ان کی توجہ دوسری طرف مبذول کرائی۔
"میرے پاس پہلے ہی بہت جوڑے ہیں بیٹا! پھر یہ کیوں لے آئیں؟" نانی نے رسان سے کہا۔
"نانی! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے ولیمہ میں آپ نیا سوٹ نہ پہنیں۔" فہد نے بڑھک ماری۔
"فہد نے منگوایا ہے یہ جوڑا آپ کے لیے۔" زویا نے مسکرا کر نانی کو بتایا۔
"محبت ہے بچے کی۔" نانی نہال ہوگئیں۔
مایوں' مہندی کے فنکشن' ہال کی بکنگ' کھانے کے انتظامات فہد سے زیادہ علی گھن چکر بنا ہوا تھا۔
"گلشن کے سارے ہال بک ہیں۔ نئی حسن چوک پہ ہے ایک ہال' وہ بھی بڑی مشکلوں سے۔" علی تھکن سے چور گھر آیا اور جوتے اتارتے ہوئے بتانے لگا۔
"اتنی دور جاؤ گے ولیمہ کرنے؟ اللہ میاں کے پچھواڑے؟ تمہاری گلی کے کونے پر ہی اتنا بڑا میدان خالی پڑا ہے۔ وہیں شامیانہ لگوالیتے۔" نانی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لگے ہاتھوں مشورہ بھی دے ڈالا۔
"اب وہ زمانے گئے جب گلیوں اور میدانوں میں شامیانے لگا کر بارات' ولیمہ سمیت کئی تقاریب کی جاتی تھیں۔ اب تو ایک سے ایک میرج ہال اور ہوٹل موجود ہیں اس کام کے لیے۔" علی نے لاپروائی سے ہوا میں مکھی اڑائی۔
"بات یہ ہے کہ بیٹا! آج کل لوگوں کا چلن عجیب ہوگیا ہے۔ ہر چیز میں نام و نمود' شان و شوکت کا اظہار۔ جس کے پاس زیادہ پیسہ ہے' وہ پانی کی طرح بہاتا ہے' جس کے پاس کم ہے' وہ قرضے لے لے کر جھوٹی شان کا اظہار کرتا ہے۔ بھلے بعد میں کتنی مصیبت کیوں نہ اٹھانی پڑے۔" نانی شروع ہوگئیں۔
"اف نانی کے لیکچر اور.... اب بتاؤ بھلا انسان اپنی شادی پہ بھی اپنے ارمان پورے نہ کرے' دل کھول کر خرچ نہ کرے۔" علی نے کوفت سے سر جھٹکا۔
نانی کی ساری باتوں اور اعتراضات کے باوجود شادی ہوئی اور بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ سارے فنکشن شان دار اور قسما قسم کے پکوان' عزیز و اقارب' دوست احباب' محلے دار' سب میں خوب واہ واہ ہوئی' بس یہ ہوا تھا کہ فہد کا بینک اکاؤنٹ تقریباً خالی ہوگیا تھا اور آفس سے قرضہ لیا تھا وہ مستزاد' اب ہر ماہ اس کی تنخواہ سے ایک تہائی رقم قرضے کی مد میں کٹنی تھی۔
"فہد! آپ نے شادی سے پہلے کچھ ہنی مون وغیرہ کا پروگرام بنایا تھا۔ یہاں چلیں گے' وہاں چلیں گے' یہ کریں گے' وہ کریں گے' اب تو آپ کی چھٹیاں بھی ختم ہونے والی ہیں۔ کب چلیں گے گھومنے۔" سویرا نے فہد کو کچھ یاد دلاتے ہوئے کہا۔
"اف.... تمہاری یادداشت۔" فہد کراہ کر رہ گیا۔
"سارے پیسے تو شادی میں ہی لگ گئے۔ اس فنکشن اور موقع کو یادگار بنانے کے لیے خوب خوب خرچا کیا تھا۔" فہد نے معصوم شکل بناتے ہوئے سچ اگل دیا۔
"ہائے! سارے پیسے خرچ ہوگئے۔ کچھ بھی نہیں بچا اب؟" سویرا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں حیرانی سے پھیلائیں۔
"سب... بالکل صفر بینک بیلنس ہے میرا۔" فہد نے اثبات میں سر ہلایا۔
"اپنے آفس سے لون لے لیں۔"
"وہ بھی لے کر شادی پر خرچ کرچکا ہوں۔"
"اف.... کس نے کہا تھا اتنا خرچا کرنے کو۔" سویرا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔
"شادی تو ایک ہی بار ہوتی ہے' اسی لیے۔" فہد منمنایا۔
"تو ہنی مون کے لیے بھی تو ایک ہی بار موقع ملتا ہے' بعد میں پھر کون جاتا ہے گھومنے پھرنے' کچھ تو رقم بچاکر رکھنی چاہیے تھی نا۔" سویرا ناراض ہونے لگی۔
"کسی دوست سے ادھار لے لیتا ہوں۔" فہد کو حل سوجھا۔
"نہیں شکریہ... پہلے ہی آفس سے لون لیا ہوا ہے۔ اب مزید قرضہ سر پہ چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھگتنا تو مجھے ہی پڑے گا۔" سویرا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔
نئی نویلی' عزیز از جان بیگم کے آگے فہد سخت شرمندہ ہو رہا تھا۔
شادی کے وقت تو نانی اماں کی باتیں اور اعتراضات بہت برے لگ رہے تھے مگر انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ بہت سارے فضول اخراجات نہ کیے جاتے تو آج اپنے ہنی مون کے لیے اس کے پاس معقول رقم جمع ہوتی۔ فہد نے غیر جانب دار ہو کر سوچا۔

☆ ☆ ☆

"جان... آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔"

سویرا نے فہد کے آفس سے آتے ہی مسکرا کر اسے دیکھا۔

"اچھا۔ کیا ہے؟"

"ہمارے گھر ایک نیا مہمان آنے والا ہے۔"

"نیا مہمان۔ ارے۔ کیا واقعی۔ میں۔ یعنی کہ تم۔ میں پاپا بننے والا ہوں۔ اگر بیٹی ہوئی تو اس کا نام مسکان اور بیٹا ہوا تو ارسل نام رکھوں گا۔" فہد خوشی اور بوکھلاہٹ میں مسلسل مگر بے ربط بولتا چلا گیا۔

"کیا ہوا فہد؟" سویرا آنکھیں پھاڑے اسے گھور رہی تھی۔ پھر یکایک وہ پہلے تو شرمائی 'پھر ہنس پڑی۔

"وہ بات نہیں ہے پاگل!"

"پھر کیا بات ہے؟" فہد کے ارمانوں پہ اوس گر گئی۔ اس کے تصور میں تو ایک چھوٹا سا گل گوتھنا سا بچہ بھی آگیا تھا۔ جسے وہ گود میں لیے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔

"دراصل میری دادی اماں ہیں نا جو پنڈی میں رہتی تھیں پھپھو کے پاس۔ وہ اب مستقل کراچی آرہی ہیں۔ اب یہاں چچا میاں ہیں 'جنہوں نے امی' بابا کے گزرنے کے بعد میری پرورش کی ہے۔ وہ تو بس میری شادی تک پاکستان میں رکے ہوئے تھے۔ آج کل میں وہ کینیڈا چلے جائیں گے۔ دادی سے بہت کہا' مگر وہ جانے پر راضی نہیں 'کہتی ہیں ساری زندگی یہیں گزاری اب مرنے کے اور دفن ہونے کے لیے دوسرے دیس جاؤں؟" سویرا عادت کے مطابق طویل گفتگو کرتے ہوئے بلا تکان بول رہی تھی۔

"پھر؟" فہد نے غائب دماغی سے بیگم کی طرف دیکھا۔

"پھر یہ کہ میں نے دادی سے کہہ دیا کہ وہ بڑے شوق سے ہمارے ساتھ رہ لیں۔ زویا کی نانی اماں بھی تو رہتی ہیں یہاں' پھر گھر میں بزرگوں کی موجودگی سے کتنی برکت ہوتی ہے۔ بڑوں کا سایہ تو سر پر ہونا چاہیے۔ ہے نا فہد؟"

"تم نے ان کو یہاں بلالیا مستقل؟" فہد کو اپنی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ہاں۔ ٹھیک کیا نا۔ مجھے پتا تھا آپ یہ بات سن کر بہت خوش ہوں گے۔" سویرا نے خوش ہو کر کہا۔

"میرا تو دل چاہ رہا ہے' اپنے سر کے بال نوچ لوں' یک نہ شد دو شد۔" فہد نے ساری صورت حال بھائی کے گوش گزار کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔ جو حیرت اور صدمے کی زیادتی سے اپنا کھلا ہوا منہ بھی بند کرنا بھول گیا تھا۔

"میں تو صاف منع کردوں گا سویرا کو۔" فہد کا لب و لہجہ باغی ہوا۔

"چھوڑ یار! منع کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بلالے ان کو۔" علی کی غیر متوقع بات پر اب فہد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"کیا مطلب؟" فہد نے بڑے بھائی کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ان کا دماغ چل گیا ہو۔

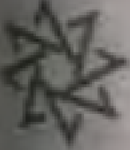
"دیکھ۔ سویرا کی دادی اور زویا کی نانی دونوں قریب قریب ایک ہی عمر کی خواتین ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ لگی رہیں گی' ہماری طرف پھر ان کا دھیان کم ہی جائے گا۔ اچھا ہے ایک دوسرے کے ساتھ مگن رہیں گی۔" علی نے دور کی سوچی۔

"اور اگر دونوں نے مل کر ہم چاروں کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیا تو؟"

"اچھی اچھی باتیں نکالا کرو منہ سے۔" علی نے ڈپٹ کر اسے دیکھا۔

"ویسے اگر۔ ایسا ہی ہوا' جیسا تم نے سوچا تو۔؟"

"اچھی اچھی باتیں نکالا کرو منہ سے۔" فہد نے خوف زدہ ہو کر کہا۔



دِلشاد نسیم



روز کی طرح آج بھی فجر پڑھ کے چچی نے جائے نماز تہہ کی اور تسبیح ہاتھ میں لے کر لگیں صبوحی کے بیڈ روم کا دروازہ بجانے۔ ان کا خیال تھا یہ ہر ماں باپ کا فرض ہے، بچہ چاہے جاگے نہ جاگے ایک بار اسے جگانا ضرور چاہیے شاید کبھی وہ سن ہی لے اب بھی اپنے تئیں انہوں نے اپنا فرض پورا کیا اور بولیں۔

"صبوحی... اٹھ جاؤ دو سجدے ہی کر لیا کرو۔" اندر سے کوئی آواز نہیں آئی تو انہوں نے تیز آواز میں دوبارہ کہا۔ اب ان سے کوئی پوچھے ان کا فرض ادا ہو گیا اب کیا مسئلہ ہے۔

"صبوحی... ارباز!" اس بار قدرے اونچی آواز میں بولیں۔ صبوحی نے کسل مندی سے کروٹ لی اور تیسری اونچی آواز پر بڑبڑاتی ہوئی اٹھی۔

"صور اسرائیل بھی کیا ہوگا جو چچی جان کی للکار ہے..." پھر قدرے اونچی آواز میں چیخی۔ "اٹھ گئی ہوں امی۔"

انہوں نے دروازے سے ہٹتے ہٹتے تیکھے انداز میں کہا۔ "شکر ہے... اسے بھی جگاؤ، پتا نہیں کیسی نیندیں ہیں جو پوری نہیں ہوتیں۔"

صبوحی کا بس چلتا تو اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیتی اور وہ ایسا کر بھی گزرتی مگر عین اسی وقت ارباز نے آنکھیں کھول کے محبت سے اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے سینے پہ رکھ لیا... اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کچھ کہے بنا ہی اٹھ گئی۔

ساس کو ناشتہ کرا کے ارباز کو آفس بھیج کے اپنی اور ارباز کے تایا ابو کی چائے لے کے وہ ان کے کمرے میں آ گئی۔ تایا ابو اپنے کمرے کی کھڑکیوں کے پردے کھول رہے تھے اس کی آواز سن کر مسکرانے لگے وہ جانتے تھے کہ اب صبوحی نے جی بھر کے اپنی ساس کی شکایتیں لگانی ہیں اور وہی ہوا اس نے چائے کا کپ تایا جی کو تھمایا اور ان کے پاس ہی کارپٹ پہ بیٹھ گئی جب صبوحی اپنی چھوٹی سی ناک چڑھا کے روشن ماتھے پہ بل ڈال کر تایا جمیل سے ساس کی برائی کرتی تو تایا جی کو بہت اچھی لگتی تھی صبوحی کے شکوے بھی تو اتنے معصوم ہوا کرتے تھے اب بھی وہ کوئی ایسا ہی غم لے کے آئی تھی کہنے لگی...

"تایا ابو! کوئی آج کی بات تھوڑی ہے یہ... ایسا تو روز ہی ہوتا ہے... میری ساس پتا نہیں کیا چاہتی ہیں...؟" اس نے ٹشو پیپر سے ناک رگڑی۔

"ارے صبوحی تو رو رہی ہے...؟" تایا جی حیران ہوئے۔

صبوحی ہنس پڑی "تایا ابو روتے تو بزدل ہیں اور میں بزدل نہیں... میں تو اپنا حق چھیننے والوں میں سے ہوں... میں نہیں روتی ووتی... تایا ابو!"

"پھر یہ کیا ہے؟" انہوں نے ٹشو پیپر کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ...؟" صبوحی زور سے ہنسی۔ "یہ تو میں کلینزنگ کر رہی ہوں... سارا دن کچن میں کام کر کر کے برا حال ہو جاتا ہے... آج کیا ہوا سنیں..." وہ تایا ابو کے قریب آ گئی انہوں نے بھی دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"میری ساس کہتی ہیں یعنی آپ کی بھابھی۔" اس نے ایسی حسرت سے کہا کہ جیسے اسے خود پہ ترس آ رہا ہو۔ "جانے انہیں مجھ سے کیا بیر ہے... کہنے لگیں "جو بیاہ کر لایا ہے وہی اٹھا سکتا ہے تیرے نخرے..." آپ خود ہی بتائیں، بے چاری، سو کیا نخرہ کر سکتی ہے؟" تایا ابو نے اس سے بھی زیادہ معصوم صورت بنا کر کہا۔

"ہاں... واقعی۔"

"بس اتنا ہی کہا تھا کہ مونگرے آلو نہ پکائیں... پورے گھر میں بدبو پھیل جاتی ہے... لگیں طعنے دینے "بڑی آئیں پیرس سے... باپ نے خوشبو کی فیکٹری لگا رکھی ہے۔ جو بیٹی کو بدبو آتی ہے ہر چیز سے۔"

تایا ابو حیرت سے بولے "ایسا کہا انہوں نے؟"

صبوحی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر کریم کا مساج کر رہی تھی بے نیازی سے بولی "نہیں... کہا تو نہیں مگر ان کا مطلب ایسا ہی تھا۔"

تایا ابو بے ساختہ ہنس دیے کہنے لگے... "بے



وقوف لڑکی، اگر میں کہوں کیا تو پیرس سے آئی ہے جو ذرا سی بدبو برداشت نہیں کر سکتی تو۔۔۔ کیا کرے گی تو۔۔۔؟"

"میں بالکل برا نہیں مانوں گی۔۔۔"

"کیوں، اس لیے میں تیری ساس نہیں ہوں۔۔۔" انہوں نے سادگی سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ اس لیے کہ میں آپ کی کسی بات کا کبھی برا مان ہی نہیں سکتی۔" اس نے اپنا ہاتھ رگڑا۔

"جانتی ہو کیوں۔۔۔؟"

صبوحی نے بیزار سی شکل بنائی "اب کوئی نئی بات نہ کردیجیے گا۔"

"تجھے میری کوئی بات اس لیے بری نہیں لگتی کیوں کہ تو مجھ سے بے حد محبت کرتی ہے۔۔۔" تایا جمیل نے پورے یقین سے کہا۔

"ایک تو میں آپ کے اس اوور کانفیڈنس سے بہت تنگ ہوں۔"

"بیٹی کسی کا پیار پانے کے لیے پہلے اس سے محبت کرنی پڑتی ہے۔۔۔ تمہارا اپنا دل اگر صاف ہوگا تمہیں ساری دنیا پیاری لگے گی۔۔۔"

صبوحی زچ ہو کر رہ گئی۔ "تایا ابو آپ یہ نئی نئی باتیں نکال بیٹھے ہیں، یہاں محبت کہاں سے آگئی۔"

"صبوحی میری بیٹی سب میں سو سو کیڑے نکالتی ہے لیکن مجھ بوڑھے میں ایسی کیا بات ہے، جو وہ میرے پاس بیٹھی رہتی ہے۔۔۔؟" انہوں نے پیار سے پوچھا۔

صبوحی نے ان کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور لاڈ سے کہا۔ "مجھے یہ بوڑھا اس لیے اچھا لگتا ہے کہ یہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔"

"یہی تو میں سمجھانا چاہتا ہوں۔۔۔ باقی نو لاکھ نو ہزار نو سو ننانوے لوگ دکھائی نہیں دیتے۔۔۔ جیسے سب کو چھوڑ کر تم میرے پاس آجاتی ہو۔۔۔ جیسے سارے خاندان کی لڑکیاں چھوڑ کر ارباز نے تجھ سے شادی کرلی۔۔۔" تایا جمیل مسکرائے۔

صبوحی تلملا ہی تو گئی۔۔۔ "پر محبت تو نہیں کی ناں۔۔۔" وہ برا سا منہ بنا کے چلی گئی۔ تایا ابو بڑبڑاتے رہ گئے۔ "پگلی ہے تو۔۔۔ اور وہ کیا کرے بے چارہ۔۔۔"

کمر پر ہاتھ رکھے صبوحی نے کمرے کا جائزہ لیا۔۔۔ گیلا تولیہ صوفے پر پڑا ہوا تھا۔۔۔ گندے کپڑے زمین پر۔۔۔ چادر شکن آلود۔۔۔ سرہانے بے ترتیب، اس نے پہلے گیلا تولیہ اٹھا کر دھونے والے کپڑوں میں رکھا۔۔۔ صبوحی کی نازک مزاجی نے ماتھے پہ سوبل ڈالے۔

"تایا ابو بھی عجیب ہیں۔۔۔ سارا دن کی کِل کِل میں بھلا محبت کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔ اب اگر ارباز نے مجھ سے شادی کرلی ہے تو یہ محبت تھوڑی ہے۔۔۔ اگر وہ مجھ سے محبت کرتا ہے تو مانے ناں میری ساری باتیں۔۔۔ کبھی ایک بار خوشی سے مجھے میکے جانے دیا۔۔۔؟ رضا کی سالگرہ والے دن مجھے کھانا بھی نہیں کھانے دیا تھا کسی نے۔۔۔ پورا خاندان مجھ پر پل پڑا جلدی کرو۔۔۔ جلدی کرو، حالانکہ ارباز جانتا ہے مجھے اپنے اس بھائی سے کتنی محبت ہے حد ہوتی ہے کسی بات کی۔۔۔ اسے محبت کہتے ہیں بھلا۔" تب ہی فون کی بیل بجی۔

"ہیلو۔۔۔" اس نے بے دلی سے فون اٹھا کر کہا۔

دوسری طرف ارباز تھا، خوش مزاجی سے پوچھنے لگا۔

"کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟"

صبوحی نے ناگواری سے کمرے کو دیکھا اور تلخی سے بولی "ہونا کیا ہے۔۔۔ اتنا ہنگامہ مچا کے جاتے ہو کمرے میں۔۔۔ کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نظر ہی نہیں آتی۔۔۔ شرٹ کہیں۔۔۔ تکیہ کہیں اور چادر۔۔۔"

ارباز ہنس دیا "کیا ان سب میں تمہیں میری خوشبو نہیں آتی۔۔۔ کیا تم ایسا نہیں سوچتیں کہ میرے کام تمہیں تھکاتے نہیں۔"

"دیکھو ارباز کام تو تھکا ہی دیتے ہیں۔"

"بہت غصے میں ہو، امی سے جنگ تو نہیں ہوگئی۔۔۔؟" اس نے چھیڑا۔

"آپ تو جانتے ہیں ناشتے کے بعد دو گھنٹے کی نیند انہیں کتنی عزیز ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تو اس میں غصہ کرنے کی کیا بات ہے تم بھی سو جاؤ۔۔۔ تھوڑی دیر کے لیے۔۔۔ ویسے بھی تمہیں جگانے والا تو اس وقت گھر پر ہے ہی نہیں۔" خود ہی ہنس دیا۔

"سب نخرے اٹھائے ہیں تمہارے ایک یہ بھی سہی۔"

"کون سے نخرے اٹھاتے ہو۔ صبح کے گئے کہیں۔۔۔ رات کو آتے ہو، کون سا وقت بچتا ہے میرے نخروں کے لیے میں تو بس یونہی بدنام ہوں۔"

صبوحی کی بات سن کر ارباز خوب ہنسا "اچھا۔۔۔ چلو آج جلدی آؤں گا۔۔۔ وعدہ پھر ہم لانگ ڈرائیو پر چلیں گے۔"

صبوحی خوش تو ہوئی مگر بظاہر لاپروائی سے بولی "اچھا چلیں جب شام آئے گی تب دیکھوں گی۔"

"ہاں ہم دونوں مل کر دیکھیں گے۔" ارباز نے گمبھیر آواز میں کچھ کھوئے کھوئے کہا۔۔۔ "ڈوبتے سورج کو، ساحل سے گلے ملتی لہروں کو۔۔۔"

صبوحی سوچ میں پڑ گئی، اسے اندازہ ہوا تایا جی صحیح کہتے ہیں اب ایسی بھی بات نہیں کہ ارباز مجھے چاہتا نہ ہو آخر خوب صورت ہوں اسمارٹ ہوں مجھ جیسی لڑکی آسانی سے کہاں ہاتھ آتی ہے۔۔۔ اس نے تیار ہو کے خود کو بارہا آئینے میں دیکھا۔۔۔ مگر جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی مایوسی بڑھتی جارہی تھی ارباز ابھی تک نہیں آیا تھا۔ کسی بہلاوے سے بھی دل نہیں بہل رہا تھا۔

شام نے تاریکی کی چادر اوڑھ لی، صبوحی کا لمحہ بہ لمحہ غصہ تیز ہوتا جارہا تھا وہ لان میں چکر پہ چکر کاٹ رہی تھی تایا ابو کو گواہ کے طور پر سامنے بٹھا رکھا تھا۔

"فون کر کے پتا تو کرو۔۔۔" تایا جی نے مشورہ دیا۔

"کیوں کروں۔۔۔؟" غصے میں بولی۔

"مردوں کے کام بڑے عجیب ہوتے ہیں۔۔۔ گھر سے جاتے تو اپنی مرضی سے ہیں مگر واپس اللہ کی مرضی سے آتے ہیں۔۔۔ بزنس مین ہے تمہارا میاں۔۔۔ سرکار کا ملازم نہیں 5 to 9 والا۔۔۔" تایا جی نے سمجھایا۔

صبوحی نے تنک کے کہا "آپ مرد ہیں ناں۔۔۔ اس لیے اس کی طرف داری کر رہے ہیں۔"

"مرد ہوں اس لیے ان کے مسائل سمجھتا ہوں اچھا ادھر آؤ، ایک بات بتاؤں۔۔۔" وہ دونوں گھاس پر بیٹھ گئے۔۔۔ چاند آب و تاب سے چمک رہا تھا۔۔۔ صبوحی چاند کی روشنی میں دمک رہی تھی۔

"میں تمہاری تائی سے بہت محبت کرتا تھا۔۔۔ وہ بھی کرتی تھی مگر کم۔۔۔ جس طرح تمہیں ارباز سے محبت ہے مگر کم کم۔۔۔"

صبوحی نے پہلو بدلا۔

"وہ بھی بہت خوب صورت تھی۔۔۔ اسے مجھ سے زیادہ اپنی ذات سے محبت تھی، وہ کسی کو اپنے جیسا سمجھتی ہی نہیں تھی۔۔۔ بیٹی اپنی ذات سے محبت بڑی ظالم ہوتی ہے۔۔۔ کسی اور کو قریب آنے نہیں دیتی۔۔۔ میں اسے بہت سمجھاتا تھا۔۔۔"

صبوحی نے منہ بنایا "لو جی۔۔۔ کیوں نہ کریں اپنی ذات سے محبت۔۔۔ جب کوئی دوسرا نہ سراہے۔۔۔ نہ چاہے تو کیا خود بھی اپنا آپ بھول جائیں۔۔۔؟ آپ کہتے ہیں ناں۔۔۔ ارباز نے مجھ سے محبت کی شادی کی۔۔۔ آپ کو سچ سچ بتاؤں شادی کے ان تین سالوں میں تین بار بھی اس نے یہ نہیں کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

تایا ابو نے ہنس کے کہا۔ "محبت نہ کرتا ہوتا تو تیرے نخرے اٹھاتا بھلا۔۔۔ صبو! میری جان محبت کو پالینا مشکل نہیں مگر اس کو قائم رکھنا کسی پل صراط سے کم نہیں ہوتا۔ محبوب بنانا بہت جوکھم کا کام ہے میری پیاری۔" انہوں نے صبوحی کے چہرے پر آئی بالوں کی لٹ کو اپنے ہاتھ سے ہٹایا۔ "جس دن تم اپنی ذات کی محبت سے آزاد ہو جاؤ گی اس روز ارباز کی محبت کو بھی سمجھ لوگی۔ اس دن ارباز تمہارا محبوب بن جائے گا۔"

"مجھے تو آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا محبوب کہتے کسے ہیں۔۔۔؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"محبوب اسے کہتے ہیں جس کا نہ ٹھیک بھی ٹھیک لگے۔۔۔ ساری غلطیاں قصور اپنے لگیں۔۔۔ وہ سدا بری الذمہ رہے۔۔۔" وہ کہیں دور کھو گئے۔ "جیسے مجھے تیری تائی سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوئی۔۔۔ وہ غصہ کرتی تو اس کے ماتھے کی ایک رگ پھڑکنے لگتی۔۔۔ مجھے اس

رگ سے بھی محبت تھی۔۔۔ جب وہ ناراض ہوتی تو دنوں لباس نہ بدلتی۔۔۔ بال نہ بناتی۔۔۔ چلتی تو دوپٹے کا آدھا پلو زمین پر گرا رہتا۔۔۔ میں اس کا آنچل اٹھا کر اسے چوم کر اس کے کندھے پر رکھ دیتا۔۔۔ اس کے الجھے بال۔۔۔ اس کے لباس کی شکنیں۔۔۔ سب اچھا لگتا۔۔۔ اور جس دن وہ جا رہی تھی۔"

"آپ جانتے تھے وہ جانے والی ہیں۔۔۔؟" صبوحی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

تایا جمیل چھلکتی آنکھوں کو چھپانے کے لیے ہنس دیے۔

"ہاں۔۔۔ اس نے بہت پہلے بتا دیا تھا' وہ مجھ جیسے لاپروا کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔۔۔ اس دن صبح ہی سے میں بہت اداس تھا۔۔۔ وہ جا رہی تھی اس کا دوپٹہ زمین سے اٹھا کر میں نے اس کے شانے پر رکھنا چاہا اس نے نہیں رکھنے دیا۔۔۔ اس نے غصے سے مجھے دیکھا۔۔۔ اس کی رگ پھڑپھڑائی۔۔۔ میں نے التجا کی اس رگ پہ آخری بوسہ لے لینے دو۔۔۔ مگر وہ رکی نہیں۔"

صبوحی افسردہ ہو رہی تھی۔ "آپ کو بہت غصہ آیا ہوگا۔۔۔؟"

تایا ابو نے لمبی سی آہ بھری جیسے برسوں پرانا حبس نکال دینا چاہتے ہوں۔

"نہیں۔۔۔ اور آج بھی اس پر غصہ نہیں ہوں۔۔۔ قصور تو میرا ہی تھا۔۔۔ نہ کبھی اس کی تعریف کی۔۔۔ نہ محبت کا اظہار۔۔۔ شادی کی تو سمجھا۔۔۔ محبت کو یہ اعزاز بہت ہوتا ہے دیکھو ارباز آئے تو ناراض نہ ہونا۔" جانے وہ اسے سمجھا رہے تھے یا خود کسی دکھ سے نبٹ رہے تھے۔

"تایا ابو! آپ کو پتا ہے اس کے پاس بہانوں کی پوری لسٹ ہے جب دیر سے آتا ہے ایک نیا صفحہ کھول کے بیٹھ جاتا ہے۔"

تایا ابو نے بہت اونچا قہقہہ لگایا۔۔۔ "تو پھر اسے اتنا تو آزاد کر دو میری بیٹی! کہ اسے تمہیں بہلانے کے لیے جھوٹ نہ بولنا پڑے۔۔۔ یا اس کا سچ تمہیں کڑوا نہ لگے۔"

اور وہی ہوا ارباز نے بہانوں کا دفتر کھول دیا۔ صبوحی غصے سے بالوں میں لگا کلپ اتارنے لگی۔۔۔ وہ ارباز کی ہر بات سنی ان سنی کر رہی تھی وہ تقریباً ہاتھ جوڑے التجا کر رہا تھا۔

"تمہاری قسم! اگر بے وقت کلائنٹ نہ آجاتا تو میں وقت سے پہلے تمہارے پاس ہوتا۔" صبوحی نے ان سنی کر دی اور کانوں سے بالیاں نوچنے لگی۔

"مجھے دیکھ تو لینے دو' کیسی لگ رہی ہو۔۔۔" ارباز نے کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا "بہت محنت سے تیار ہوئی تھیں؟"

صبوحی جیسے کچھ سن ہی نہ رہی تھی اس نے چوڑیاں اتارنے کے لیے ایک ہاتھ چوڑیوں پر رکھا۔

ارباز نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے محبت سے کہا۔ "یقین کرو' ایک ایک پل گھڑی دیکھ کر گزر رہا تھا۔"

"تو معذرت کر کے آجاتے۔۔۔" وہ کلائی سے چوڑی کھینچتے ہوئے بولی۔

"تم میری بیوی ہو۔۔۔ میرے دن رات کی رفیق۔۔۔ جب تم میری معذرت قبول نہیں کر رہیں تو وہ کیا کرے گا وہ تو میرا کچھ لگتا ہی نہیں وہ میری معذرت' میری مجبوری کیا سمجھے گا۔۔۔" ارباز قدرے افسردگی سے بولا۔

صبوحی نے کھانے کا پوچھا اور ارباز کی خاموشی نے جواب دے دیا' اس نے بے حد غصے سے کروٹ لی اور سونے کا ڈھونگ کیا۔۔۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر ارباز کے سامنے رومال' گھڑی' موبائل اور چشمہ رکھ کر خود دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ ارباز بے نیازی سے بیٹھا ناشتا کرتا رہا صبوحی نے پہلی بار محسوس کیا کہ ارباز نے اس کی موجودگی کا نوٹس نہیں لیا۔

ارباز کے جاتے ہی اپنی پریشانی لے کے تایا جمیل کے پاس چلی آئی۔

"تمہیں ڈر ہے وہ تم سے دور ہو رہا ہے؟" تایا ابو اس کی پریشانی سن کر ہنس پڑے۔ پھر کسی سوچ میں گم خود کلامی کے انداز میں بولے۔

"کھونے کا احساس محبت کی جڑیں مضبوط کرتا ہے۔۔۔ تم بھی ارباز کو چاہتی ہو۔۔۔ لیکن تمہاری محبت میں خود غرضی کا عنصر تھوڑا زیادہ ہے تم اپنی ذات سے باہر نہیں نکلنا چاہتیں۔ جس دن تم نے اپنی ذات کی نفی کی اس دن تم برملا کہو گی ارباز تمہارا محبوب ہے۔۔۔ تمہیں اس کی کوئی بات بری نہیں لگتی۔۔۔"

"لیکن کب۔۔۔ تایا ابو۔۔۔؟" اس نے حسرت سے پوچھا۔۔۔

"جس دن تم اپنا دل صاف کر لوگی۔۔۔ بات یہ ہے کہ' یہ جو دل ہوتے ہیں ناں انسان کے۔۔۔ آئینے ہوتے ہیں۔۔۔ اسے جتنا صاف رکھوگی دوسرے لوگ اتنے ہی صاف اور اچھے نظر آئیں گے۔۔۔ محبت خالی لفظ نہیں ہے میری جان! بہت بڑی آزمائش ہے اس ایک لفظ میں اپنی خوشی سے زیادہ محبوب کی خوشی عزیز ہوتی ہے۔ جس دن اس میں خود پرستی اور خود غرضی شامل ہو جائے اس دن محبت بھی مر جاتی ہے۔۔۔ اگر تم ارباز کو چاہتی ہو تو تمہیں اپنی ذات کی نفی کرنا ہوگی۔۔۔"

انہوں نے سمجھایا اور شاید صبوحی نے سمجھ بھی لیا تب ہی تو جب ارباز نے اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو اس نے انکار نہیں کیا۔

گاڑی میں بیٹھی صبوحی بار بار کن اکھیوں سے ارباز کو دیکھ رہی تھی' ارباز کا سیاہ رویں والا اجلا ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا دوسرا ہاتھ گیئر پر تھا۔

"ایک بات پر میں اللہ کا بہت شکر ادا کرتی ہوں۔۔۔" صبوحی نے گیئر پہ رکھے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

ارباز مسکرا دیا۔ "صرف ایک بات پر؟ اچھا خیر' بتاؤ وہ ایسی کون سی خاص بات ہے۔"

"میری طرح تمہارے ہاتھ بھی بہت صاف ستھرے اور خوب صورت ہیں بلکہ تم بھی۔"

"اگر ایسا نہ ہوتا تو؟" ارباز مسکرایا۔

"تو تم مجھے بالکل اچھے نہ لگتے۔"

ارباز نے بہت عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"کیا میں تمہیں اچھا لگتا ہوں۔"

"پتا نہیں' دراصل جیسا میں نے سوچا تھا تم ویسے نہیں ہو۔" صبوحی روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

ارباز حیران ہی تو رہ گیا۔ "تم کیا سوچتی تھیں۔۔۔؟"

"میں سوچتی تھی تم بہت پیار کرنے والے ہوگے۔۔۔ تمہیں میرے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیا کرے گا' ظاہر ہے میں اتنی خوب صورت جو ہوں۔۔۔ میری تعریف کروگے۔۔۔ مجھے سراہوگے۔" ارباز ہنس دیا۔

ہلکی روشنی اور دھیمے میوزک والے نیم خوابیدہ ماحول میں وہ اس کا ہاتھ تھامے ایک کونے کی میز پر لے آیا ارباز نے کرسی میز کے سینے سے الگ کی اور صبوحی کو بیٹھنے کے لیے کہا۔۔۔ وہ بیٹھ گئی ارباز اس کے مقابل بیٹھ گیا پھر اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بہت سنجیدگی سے بولا۔

"ایک بات بتاؤں صبوحی! مرد اس عورت کو پیار کرتا ہے جو اپنی ہستی بھلا کے اس کے عشق میں مبتلا ہو جائے۔"

صبوحی کھلکھلا کر ہنس پڑی پھر ارباز کی طرف جھک کر بولی۔

"اور مجھ جیسی عورتوں کے بارے میں کیا خیال ہے ہم کم نصیبوں کو بھی کسی کی محبت میسر آسکتی ہے یا نہیں۔۔۔؟"

"اپنی ذات میں گم رہنے والے لوگ کبھی کبھی نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔" ارباز گمبھیر لہجے میں بولا۔

"محبت کامل یقین کا نام ہے خود پر' محبوب پر۔" صبوحی نے ارباز کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"سچی خوشی کامل یقین۔۔۔ محبت۔۔۔ خود سپردگی۔ سوچو کیسی کیسی لازوال خوشیاں دے سکتا ہے انسان دوسرے انسان کو۔" اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔

آگہی کا ایک پل صبوحی پر سے گزرا' پتا نہیں یہ اپنی محبت کی آگہی تھی یا ارباز کی محبت کا یقین۔

اس روز جب ارباز آفس گیا تو اس کا پھیلایا ہوا ہنگامہ ہنگامہ نہیں لگا وہ بہت خوش تھی اتنی کہ تایا ابو کے گلے میں بازو ڈال کے جھوم گئی۔

"تایا ابو میں بہت خوش ہوں۔۔۔" وہ تایا ابو کے پاس سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آگئی۔ باہر لان میں نئے موسم کے قطار در قطار زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔

"تایا ابو! شکر ہے آپ کا بھتیجا سمجھ گیا۔۔۔ کہ میں کیسے خوش رہ سکتی ہوں۔ اس نے مجھے اتنی ڈھیر ساری شاپنگ کرائی یہ دیکھیں۔" اس نے ہاتھ تایا ابو کے سامنے کیا جس میں نئی انگوٹھی دمک رہی تھی۔

"ڈائمنڈ کی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے میرے بھتیجے کی محبت کا یقین آ گیا تمہیں؟"

صبوحی دلنشیں سی ہنسی۔۔۔ "ارباز کہتا ہے جن چیزوں سے میں راضی ہوتی ہوں وہ انمول ہیں۔۔۔ آپ سچ کہتے تھے تایا ابو! واقعی ارباز مجھے بہت چاہتا ہے۔"

اور واقعی ان دنوں ارباز صبوحی پر بہت توجہ دینے لگا تھا کبھی پھولوں کے گہنے، کبھی آؤٹنگ، صبوحی کی وارڈ روب سج چکی تھی لیکن پتا نہیں کیا ہوا کہ اب اسے ارباز کی محبت میں کچھ کمی سی محسوس ہوتی اس دن بھی وہ بہت خوب صورت ڈریس پہنے۔۔۔ میچنگ جیولری کے ساتھ دل میں اتر رہی تھی مگر اس کی آنکھیں اداس تھیں ارباز کے آنے میں ابھی وقت تھا، وہ تایا جمیل کے پاس آگئی۔

"تایا ابو آج کل ارباز مجھ پر بہت توجہ دینے لگے ہیں۔۔۔"

تایا ابو زچ ہو کے رہ گئے۔۔۔ "لڑکی تو کسی حال میں خوش ہے یا نہیں۔۔۔ توجہ نہیں دیتا تھا تو مشکل تھی۔۔۔ دیتا ہے تو عذاب۔"

صبوحی وہ صبوحی نہیں لگ رہی تھی لاپرواہ، اپنے آپ میں گم رہنے والی۔ بہت اداس نظر آرہی تھی۔

"آپ نہیں سمجھ سکتے۔۔۔ مرد کی آنکھ صرف عورت پہچانتی ہے۔۔۔ تایا ابو! جب شوہر بلاوجہ توجہ دینے لگے۔۔۔ خود سے قریب کرنے لگے تو اس کا مطلب ہے وہ بیوی کی آنکھ میں دھول جھونک رہا ہے۔"

تایا ابو کو اس کی بات دل کو تو لگی مگر وہ صبوحی کو اندیشوں کے دکھ سے بھی بچانا چاہتے تھے۔

"بیٹی شک کی کھڑکی بند کر کے رکھو۔۔۔ یہاں سے آنے والی ہوائیں بہت زہریلی ہوتی ہیں۔۔۔ اور محبت کی کونپلیں بہت نازک۔۔۔ یہ ہوائیں انہیں جلا کر راکھ کر دیں گی۔۔۔"

"کیا کروں۔۔۔ بس خود بخود میرا دماغ بھٹک جاتا ہے۔" صبوحی بے بسی سے بولی۔

تایا ابو کو پھر تائی یاد آگئیں کہنے لگے۔ "تیری تائی نے جانے کے کئی سال بعد فون کیا، کہنے لگی۔" بڑی بھول ہوئی، میں چلی آئی اور اس سے بھی بڑی غلطی یہ ہوئی کہ آپ کے روکنے سے بھی نہیں رکی۔ صبوحی محبت بڑا ظالم جذبہ ہے سمندر کی طرح گہرا اور منہ زور اس میں کوئی موڑ نہ ٹھہراؤ، بہت خاموشی سے غیر محسوس طریقے سے دو محبت کرنے والوں کے بیچ قدم کے ساتھ قدم ملا کے چلتا ہے۔۔۔ مگر جب کوئی ساتھی راستے میں ساتھ چھوڑ جائے، بے وفائی کر جائے تو اسے واپس نہیں لا سکتا۔ محبت کے کسی راستے میں، کوئی یوٹرن نہیں کہ موڑ کاٹ کے اسے اپنے ساتھ ملا لیں۔"

صبوحی نے تڑپ کے دیکھا۔۔۔ "میری پیاری بیٹی۔۔۔ چاہتوں کے رشتوں میں گرہ نہیں لگتی اور لگا دو تو اس میں وہ کشش نہیں رہتی۔۔۔ بس ایک پھیکا پھیکا سا رابطہ ہوتا ہے۔۔۔ نہ روح کے تعلق میں وہ بات ہوتی ہے۔۔۔"

تایا ابو نے گلاس بھر کے پانی پیا اور ایک گلاس ساکت بیٹھی صبوحی کی طرف بڑھایا۔

"اپنے دل کو دنیا کی گرد اور جھاڑ پھونس سے بچا کے رکھو۔۔۔ جس طرح وقت دینے والی گھڑی میں مٹی اٹ جائے تو وہ وقت دینا بند کر دیتی ہے۔۔۔ اسی طرح جب دل شک کی گرد سے بھر جائے تو محبت تھم جاتی ہے۔ اس محبت کو تھمنے نہ دینا۔۔۔ صبو میری جان محبت ٹھہر جائے تو صرف پچھتاوے رہ جاتے ہیں۔"

صبوحی جیسے خواب کے عالم میں سن رہی تھی۔

وہ رات بہت عجیب تھی صبوحی کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی، ارباز نہیں آیا تھا اور وہ جاگ کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔ وہ خود بھی اپنی کیفیت پر حیران تھی دل میں وسوسے تھے یا محبت، وہ خود سمجھ نہیں پا رہی تھی ایسی حالت اس کی پہلے کبھی ہوئی جو نہیں تھی۔

پہلے جب بھی ساس کہتیں جب تک شوہر گھر نہ آئے بیوی کو اس کا انتظار کرنا چاہیے۔۔۔ تو وہ ماتھے پہ بل ڈال کر کہتی "چاہے شوہر گھر کو سرائے سمجھے جب دل چاہے آئے جب چاہے جائے۔۔۔ اس پر کوئی چارج نہیں ہے۔۔۔ میری آنکھوں کے گرد حلقے بن جاتے ہیں۔ میں تو نہیں جاگ سکتی۔"

پھر تایا ابو اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنستے اور ان کی بھابی باقاعدہ برا مان جاتیں، کہتیں۔

"گھر گرہستی کے لیے ہار سنگھار، رنگ روپ کے علاوہ اور بھی بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ مرد کو اپنے کھونٹے سے باندھے رکھنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔۔۔ یہ نہیں کہ بس اپنا روپ چمکا لیا اور سمجھا کہ میاں کو قابو کر لیا۔۔۔"

جانے وہ کیسا وہم تھا کہ اس کی آنکھوں کی نیند ختم ہو چکی تھی۔ گھڑی رات کے آخری پہر کا اشارہ کر رہی تھی۔۔۔ صبوحی نے باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولی۔۔۔ چاند اپنی پوری آب کے ساتھ بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا اس نے مڑ کے دیکھا بے شکن بستر انتظار کر رہا تھا، ارباز ابھی تک نہیں آیا تھا اور زندگی میں پہلی بار اسے غصہ نہیں آرہا تھا، وہ انتظار کر رہی تھی، اسی انتظار میں کرسی پر بیٹھی اور آنکھ لگ گئی۔۔۔ جانے وہ کب تک سوئی رہتی کہ ارباز بنا آہٹ کمرے میں آگیا۔۔۔ صبوحی کو اس طرح سوئے دیکھا تو پریشان ہوا اسے یقین تھا آج اس کی شامت آنے والی ہے اس نے صبوحی کو آواز دی اور صبوحی کی آنکھ کھلتے ہی جلدی جلدی بولنے لگا۔

"دیکھو خفا نہ ہونا۔۔۔ میں جان بوجھ کر لیٹ نہیں ہوا۔ اچھا چلو اٹھو بستر پر لیٹو۔" وہ معصوم بچے کی طرح پچکار رہا تھا "تم نے کیوں نیند خراب کی سو جاتیں۔۔۔"

صبوحی خاموش تھی "آج لڑنے کا ارادہ نہیں لگتا۔۔۔ یا سارا دن فارغ رہ رہ کر تھک گئی ہو؟ اگر پوری نیند نہیں لو گی تو چہرے کی فریش نیس ختم ہو جائے گی۔" وہ ہنس کر بولا۔

صبوحی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے، چیخے روئے یا فریاد کرے۔ ارباز نے اس کا ہاتھ تھاما اور کمر کے گرد بازو ڈالے اسے بیڈ تک لے آیا اور صبوحی ارباز کا معمول بنی اس کے اشارے پہ لیٹ گئی۔۔۔ ارباز نے چادر کا کونا کھینچ کر صبوحی کے اوپر کر دیا۔ صبوحی کروٹ کے بل ہو کر پلکیں جھپکا رہی تھی۔۔۔ ارباز واش روم میں چلا گیا۔ صبوحی نے بہت انتظار کیا کہ اس کی طرف سے صبوحی کے بدلے رویے پر کوئی خوشی کا اظہار ہو گا، مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ دبے پاؤں آیا اور لیٹ گیا۔۔۔ صبوحی نے منتظر ادھ کھلی آنکھیں بند کیں اور ایک آنسو تکیے کے اندر جذب ہو گیا۔

اگلی صبح حسب عادت صبوحی رومال، گھڑی، موبائل چشمہ اور گاڑی کی چابی میز کے اوپر ارباز کے سامنے رکھ کر وہ خود ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بہت خفا لگ رہی ہو۔۔۔؟" ارباز نے کانٹے کی مدد سے سلائس کو دو ٹکڑوں میں کرتے ہوئے یوں پوچھا جیسے موسم کا حال بتا رہا ہو۔

صبوحی کو جانے کیوں اتنا رونا آرہا تھا۔۔۔ اس نے جلدی سے چائے کا کپ منہ سے لگا لیا۔۔۔ "پوچھو گی نہیں اتنی دیر سے کیوں آیا۔۔۔؟" ارباز نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔۔۔

صبوحی نے آہستہ سے کہا۔ "کوئی کام ہو گا۔"

ارباز کی مسکراہٹ گہری ہو گئی کچھ دیر اسے یونہی دیکھتا رہا اور پھر بہت احتیاط سے سلائس دانتوں کے نیچے دبایا۔۔۔ "میں سوچ رہا تھا گھر پہنچوں گا تو تمہارا منہ غبارہ بنا ہوا ہو گا لیکن اچھا ہوا تم سو گئیں۔ کرسی پر سوئی ہوئی تم بہت حسین لگ رہی تھیں۔

"You are gorgeous" وہ اس طرح بولا جیسے اخبار سے کوئی خبر پڑھ کر سنائی ہو۔

ارباز نے پانی پیا اور گولڈن اسٹریپ والی گھڑی اپنی مضبوط سیاہ رویں والی کلائی پر پہنی۔۔۔۔ صبوحی اس کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ارباز اور صبوحی کی نگاہیں ملیں۔۔۔۔ صبوحی کے حلق میں چائے کا پھندا لگ گیا۔ وہ شوخی سے بولا۔

"چاند کی کرنوں میں تمہارا چہرہ اتنا چمک رہا تھا کہ میں حیران رہ گیا۔" صبوحی نے چونک کر اسے دیکھا "اتنی حسین عورت میری بیوی میں شاید تمہاری قدر نہیں کرسکا تمہارے حسن کی اتنی تحسین نہ کرسکا جتنی تم چاہتی تھیں۔۔۔۔" ارباز نے اس کے گلے میں بازو ڈال کے محبت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولے گیا۔ "دراصل ہم دونوں ہی اپنی ذات کی محبت میں گرفتار تھے، تمہیں اپنی ستائش اور مجھے اپنے وجود کی اہمیت درکار تھی میں زبان سے تمہاری ستائش نہ کرسکا لیکن میں نے تمہیں بہت چاہا ہے۔"

صبوحی اس سے کہنا چاہتی تھی اعتراف کرنا چاہتی تھی کہ وہ بھی اسے بہت چاہتی ہے۔ اس سے محبت کرتی۔

لیکن اس نے بازو علیحدہ کیے نرمی سے کہنے لگا۔۔۔۔ "آفس کو دیر ہورہی ہے۔"

ایک بہت قیمتی پل ضائع ہوگیا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ گیا وہ وہیں کھڑی رہ گئی ستون سے ٹیک لگائے۔ اس کے کان میں مسلسل آواز آرہی تھی۔

"میں نے تمہیں بہت چاہا ہے۔" صبوحی کے چہرے پہ خوشی ناچ رہی تھی۔ وہ جان گئی تھی اپنی خوشی محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر ملتی ہے محبوب کو جھکا کر نہیں۔

اس سے رہا نہیں گیا بھاگی بھاگی تایا جمیل کے پاس جا پہنچی ایک وہی تو تھے جنہوں نے اس کی منزل تک کے راستوں کو آسان کیا تھا۔

"آپ یقین کریں تایا ابو۔۔۔۔ اب میں اپنی ذات سے باہر نکل آئی ہوں۔۔۔۔ آپ بالکل ٹھیک کہتے تھے جب تک ہمارا اپنا دل صاف نہیں ہوتا کوئی چہرہ صاف دکھائی نہیں دیتا۔۔۔۔ اب میں بہت خوش ہوں لگتا ہے میرا دوسرا جنم ہوا ہے اور اس جنم میں ارباز میرا محبوب ہے۔۔۔۔ مجھے اس کی ساری باتیں ٹھیک لگ رہی ہیں۔۔۔۔ تایا ابو ایک بات اور بتاؤں؟" صبوحی ہنسی "آج صبح امی نے جگایا تو مجھے ان کی آواز صور اسرافیل نہیں لگی، میں نے انہیں شکریہ کہا تو وہ حیران رہ گئیں اور سچ میں ان کی حیرت پر شرمندہ ہوگئی۔"

تایا ابو اس کی دیوانگی پر مسکرا رہے تھے۔ "اب میری بیٹی خود بھی اس قابل ہوگئی ہے کہ اسے چاہا جائے۔"

وہ ان دنوں عجیب سی سرشاری میں رہتی تھی ہونٹ بن بات ہنستے یہ اور بات کہ ارباز آج کل کچھ زیادہ مصروف رہنے لگا تھا مگر وہ ساس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتی تایا کے پاس آتی تب بھی نہ شکوہ نہ شکایت۔۔۔۔ تایا ابو کو صبوحی اپنی جیت لگتی انہیں یقین تھا وہ غلطی جو انجانے میں ان سے ہوئی صبوحی سے نہ ہوگی۔

یہ ایسے ہی ایک غافل دن کی بات ہے ارباز صبوحی کو اپنے ساتھ لارنس لے گیا، سبز گھاس کے درمیان پکی زمین پر ارباز کے کندھے پر سر رکھ کر چلتی صبوحی خود کو کسی اور ہی دنیا کی سمجھ رہی تھی اس کا دھیان اپنے ساتھ چلتے ارباز کی کچھ کہتی الجھن کی طرف نہیں تھا۔۔۔۔ اس کے اپنے ہی پاس کہنے کو بہت کچھ تھا وہ نیم وا آنکھوں سے راستوں کو دیکھتی اپنا آدھا وزن ارباز پہ ڈالے گویا اسی کے سہارے چل رہی تھی۔

"ارباز! جیسے ایک غیر مسلم اسلام قبول کرتا ہے اس کا دل چاہتا ہے ساری عمر کی نمازیں ایک ہی وقت میں پڑھ لے، پورا قرآن دل میں بسالے۔۔۔۔ بالکل ایسے ہی میرا جی چاہتا ہے اپنی ساری کوتاہیوں کا ازالہ کر دوں۔" وہ اپنی دھن میں مگن کہہ رہی تھی محسوس ہی نہ کرسکی کہ ارباز کچھ بے چین تھا اس نے صبوحی کا سر خود سے علیحدہ کیا اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ساتھ ساتھ چلنے لگا صبوحی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تایا ابو کہتے ہیں دل کا شیشہ صاف ہو تو دنیا خوب صورت لگتی ہے۔۔۔۔ ہم جو دوسروں کے عیب دیکھتے ہیں، وہ ہمارے اپنے ہی دل کی میل ہوتی ہے چلو میری سمجھ میں یہ بات جلدی آگئی ورنہ" اس نے معصومیت سے کہا اور ہنس دی۔

ارباز بہت بے دلی سے سن رہا تھا۔۔۔۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا اسے صبوحی کی باتیں صرف سنائی دے رہی تھیں۔

"صبوحی۔۔۔۔!" ارباز نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کچھ کہنا چاہا۔

صبوحی کی سرشاری نے اسے ارباز کی آواز بھی نہ سننے دی، وہ سر اٹھائے محبت بھرے تبسم کو اپنے گلابی ہونٹوں پہ سجائے بولے جارہی تھی "مجھے یوں لگتا ہے میرا وجود بے وزن ہو رہا ہو اور میں ان بادلوں کے ساتھ مل کر چاند سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہوں۔"

"بہت دنوں سے تمہیں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔" ارباز نے دوبارہ ہمت کی۔ اس نے جیسے صبوحی کی کوئی بات سنی ہی نہ تھی۔

صبوحی کو ابھی بہت کچھ کہنا تھا اس نے پھر ارباز کے کندھے پہ سر رکھ دیا۔

"میں سوچتی ہوں اگر تایا ابو نہ ہوتے تو میں تمہیں کبھی پا ہی نہیں سکتی تھی۔"

ارباز نے سرگوشی جیسی مدھم آواز کہا۔ "میں شاید تمہارے قابل تھا ہی نہیں۔۔۔۔ کہاں تم اور کہاں میں۔۔۔۔ تم بہت خوب صورت ہو۔۔۔۔ اور میں۔۔۔۔" صبوحی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"شاید میں تمہارے قابل نہ تھا۔ میں نے تمہاری قدر نہیں کی۔۔۔۔ اور امی، انہوں نے بھی ہمیشہ تمہیں دوسرے درجے پہ رکھا۔۔۔۔ تمہیں تمہارا حق نہیں دے سکیں نہ ہی میں تمہاری خاطر ان سے لڑ سکا۔"

صبوحی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ارباز کہہ رہا تھا۔ "میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکا۔۔۔۔ ہم دونوں کی آنکھوں پر اپنے اپنے نظریات کا چشمہ چڑھا تھا۔۔۔۔ جانے دونوں میں سے زیادہ قصوروار کون ہے۔۔۔۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہم اپنے اپنے راستے الگ کرسکتے ہیں۔"

صبوحی جیسے آسمان پر چلتے چلتے زمین پر آگری۔

"میری کولیگ ہے حمیرا۔۔۔۔ بہت چاہتی ہے مجھے۔" اب وہ ہشاش بشاش نظر آرہا تھا جیسے بہت دنوں کے بند کمرے کی کھڑکی کھل گئی۔۔۔۔ "میں حمیرا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

صبوحی جیسے پتھر کی ہوگئی۔۔۔۔ اس کی آنکھ میں آنسو نہیں تھا۔۔۔۔ آواز میں لرزش نہیں تھی۔۔۔۔ اس کی کیفیت تو اس نومسلم کی سی تھی جو ساری قضا نمازیں ایک ہی وقت میں پڑھ لینا چاہتا ہے۔۔۔۔ چاہتا ہے سجدے سے سر نہ اٹھے۔۔۔۔ جب تک کہ اس کے سارے گناہ۔۔۔۔ ثواب نہ بن جائیں۔

رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی کرسی پر بیٹھی صبوحی چاند کی آنکھ مچولی دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی تھی مگر آنسو گالوں پر نہیں اترے تھے اس نے ارباز کے ہمراہ گزارے چند سال چند لمحوں میں ٹٹول لیے ارباز نے اگر اس کے لیے تنہائی چنی تھی تو وہ یقیناً اس کی حق دار تھی۔ اس کا دل بھر آیا وہ سوچ رہی تھی یہ کیسا گورکھ دھندا ہے کہ میں نے چاہے جانے کی تمنا چھوڑ کر اس کی چاہت کی تو اس نے سب سے پہلے مجھے ہی چھوڑ دیا۔

☆

نازیہ جمال

اُجلی کرنیں

ناولٹ





"اماں کافی دنوں سے بیمار ہیں۔ اب تو کھانا پینا بھی برائے نام رہ گیا ہے۔" سمیع نے فون پہ بتایا تو وہ بے اختیار تڑپ اٹھی۔

"ہائے میری ماں!" فوراً" اٹھ کے چادر اوڑھی اور بچوں کو ساتھ لے کر میکے آگئی۔

حمیدہ بی بی بخار سے تپ رہی تھیں۔ محض تین دن کے بخار نے اتنی توانائی نچوڑی کہ ہلنے جلنے کی بھی سکت نہ رہی۔ ضعیف تو پہلے بھی تھیں مگر پھرتیلی بھی تھیں۔ گھر کے سارے کام کئی سالوں سے نبٹاتی آرہی تھیں۔

اب تو پورا گھر تلپٹ ہوا پڑا تھا۔ جھوٹے برتن 'گھر میں لگے پیپل' بیری اور شہتوت کے اڑتے بکھرے سوکھے پتے۔ چھپّر کے نیچے بندھی گائے کے قریب گوبر کا ڈھیر۔

"آخر اماں کو ہوا کیا؟" وہ آبدیدہ سی بولتے ہوئے ماں پہ جھکی۔

"شام ڈھلے تک کپڑے دھوتی رہیں۔ ٹھنڈ لگ گئی ہے۔" ماریہ نے آٹا گوندھتے ہوئے بتایا۔

وہ بھی کچھ دیر پہلے اپنے بچوں کے ساتھ آگئی تھی۔ آتے ہی چولہا صاف کیا۔ یخنی بنا کر ایک دو چمچے ماں کے حلق میں بصد اصرار ڈالے' پھر رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔

"اماں! آپ کپڑے نہ دھوتیں۔ مجھے بھجوا دیتیں' میں دھو دیتی۔ کئی بار سلیم سے کہتی ہوں اماں کے گھر سے چکر لگا کر جایا کریں۔ شاید کوئی کام ہو مگر وہ بھی کیا کریں ان کا روٹ جو الگ ہے۔" جوریہ ماں کا گرم ماتھا ہولے ہولے دباتے ہوئے آزردگی سے بولی۔

"تو اور کیا۔ کپڑے کیا میں تو کھانا بھی بنا کر بھجوا دوں مگر دینے کون آئے۔ گھر میرا اللہ میاں کے پچھواڑے ہے۔ دکھ سکھ میں ماں بھائیوں کے کام بھی نہیں آسکتی۔" ماریہ بھی گیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی ادھر آگئی اور ماں کے پاؤں دبانے لگی۔

حمیدہ بی بی کی چار اولادوں میں پہلے دو بیٹیاں تھیں۔ پھر دو بیٹے۔ رفیع اور سمیع۔ ماریہ اور جوریہ کو انہوں

نے میٹرک کے بعد سولہویں سن میں ہی آگے پیچھے لگ بھگ بارہ برس پہلے بیاہ دیا تھا۔

جویریہ کا گھر شہر کے ایک کونے میں تھا تو ماریہ کا دوسرے کونے میں۔

بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد حمیدہ بی بی نے گھر کا سارا کام خوش اسلوبی سے سنبھال لیا۔ بیٹیوں کی موجودگی میں بھی وہ کبھی ٹک کر نہیں بیٹھی تھیں۔ قدرت نے انہیں گھرداری کے تمام امور سے نوازا تھا۔ کھجور کا بان اتنی تیزی سے بنتیں کہ ہفتے میں ہی من دو من بان اکٹھا ہو جاتا۔ چنگیریں، چٹائیاں اور دستی پنکھوں کی بنت اور مضبوطی دیکھنے کے لائق ہوتی۔

اب بھی کبھی وقت ملتا تو موٹی سوئی، کھجور کے رنگین پتوں اور سرکنڈوں کا کھیل شروع کر دیتیں۔ ورنہ تو سارا دن گھر کے کام نمٹاتے گزر جاتا۔

ماریہ، جویریہ شادی کے اولین دنوں میں تو ہر دوسرے دن میکے کا چکر لگا لیتیں۔ ماں کو خوب آرام دے کر رات کا کھانا کھا کر اپنے میاؤں کے ہمراہ چل دیتیں۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں صاحب اولاد ہو گئیں۔ بچے بڑے ہونے لگے۔ ان کے اسکول شروع ہوئے تو میکے آمد کافی کم ہو گئی۔ اب تو ذمہ داریوں اور مصروفیت نے ایسا گھن چکر بنایا کہ مہینے میں ایک دو بار ہی ماں کو شکل دکھا پاتیں۔

سلیم کو جویریہ نے موبائل پہ ہی اپنے میکے آمد کے متعلق بتا دیا تھا، اس لیے وہ دکان بند کر کے ادھر ہی چلا آیا۔ ہمیشہ کی طرح ساس کے لیے ڈھیروں پھل اور جوس کے ڈبے اس کے ہاتھ میں موجود تھے۔

"ارے بیٹا! خوامخواہ اتنی زحمت کی۔ یہ سب تو پہلے بھی گھر میں موجود تھا۔" حمیدہ بی بی نقاہت بھری آواز میں سلیم سے مخاطب ہوئیں۔

"ارے ماں جی! مجھے علم ہے کہ سب کچھ آپ کے پاس ہے مگر میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی ماں کے لیے کچھ لیتا جاؤں۔" سلیم نے محبت سے کہتے ہوئے سر ساس کے آگے جھکایا، جس پہ انہوں نے دست شفقت پھیرتے ہوئے دعائیں دیں۔

"اللہ خوش رکھے، اپنی اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب ہوں۔"

"ان شاء اللہ! میں تو ضرور بفضل الٰہی اپنی اولاد کی خوشیاں وقت آنے پہ دیکھوں گا۔ مگر آپ کب خوشی کے شادیانے بجوا رہی ہیں۔" سلیم مخاطب تو ماں جی سے تھا مگر شوخ نگاہیں رفیع پہ جمی تھیں، جو ہاتھ دھو کے اب تار پہ لٹکے تولیے سے ہاتھ خشک کر رہا تھا۔

"ہاں تو بڑے بھائی ہو تم۔ تم نے ہی تو اپنے چھوٹے بھائیوں کا فرض پورا کرنا ہے۔" حمیدہ بی بی مان سے بولیں۔

"تو پھر بے فکر رہیں۔ میں آج سے ہی سالے صاحب کی دلہنیا ڈھونڈنے کا کام شروع کرتا ہوں۔" سلیم کافی پرجوش تھا۔

"سلیم بھائی! ابھی نہیں۔ ذرا ایک دو سال ٹھہر جائیں۔ میں نے دکان کا اوپر والا حصہ بنوانا ہے۔ فی الحال کسی خرچے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" رفیع نے نرمی سے منع کرنا چاہا۔

"میرے بھائی ایک دو سال کیوں، یہ کیوں نہیں کہتے جب بوڑھی ماں، خاک نشین ہو جائے گی تب سہرا باندھو گے۔" رفیع کی بات پہ ماریہ طنز سے بولی۔

"تو اور کیا رفیع! ایک دو سال، ایک دو سال، کب سے تمہارا یہی الاپ سن رہے ہیں۔ کبھی کمیٹی نہیں نکل رہی ہوتی تو کبھی کاروبار میں گھاٹا آ جاتا ہے۔ تم آخر اماں کا کیوں نہیں سوچتے۔ ان کی بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنا دم نہیں رہا کہ گھسٹ گھسٹ کے جھاڑو لگائیں۔ تم دونوں کے کپڑے دھوئیں۔" جویریہ تو پھٹ ہی پڑی تھی۔

"ذرا پڑوس میں جھانک کر دیکھو، تمہیں اماں کی عمر کی ہر بزرگ خاتون پوتا، پوتی گود میں کھلاتی بہو سے خدمت کرواتی ہوئی ہی نظر آئیں گی۔ کوئی بھی ہماری ماں کی طرح نہ برتن مانجھ رہی ہوگی، نہ ہی تین ٹائم ہانڈیاں چڑھا رہی ہوگی۔" ماریہ کا لہجہ گلوگیر ہوا جس نے رفیع پہ خاطر خواہ اثر ڈالا۔

"اچھا بابا اچھا! کرو تم لوگ اپنی مرضی۔ میں اپنی آزادی سے بخوشی دستبردار ہوتا ہوں۔" رفیع ہاتھ اٹھا کر ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ اس کے سیل پہ کال آ گئی تھی، اس لیے وہاں سے ہٹ کر کمرے میں چلا گیا۔

"میرا دل تو انیلا کے لیے کرتا ہے، وسیم بھی کئی بار مجھے کہہ چکے ہیں کہ میں اماں سے بات کروں۔" ماریہ بولی۔

"خدا کو مانو۔ تمہاری نند بھلا یہاں کہاں ایڈجسٹ ہو پائے گی۔" جویریہ کو سن کے اچنبھا ہوا تھا۔

"کیوں نہیں ہو پائے گی۔ بھلا یہاں کس چیز کی کمی ہے۔ میرا بھائی لاکھوں میں ایک ہے۔" ماریہ تفاخر سے بولی۔

"اُفوہ! تم سمجھیں نہیں۔ اس گھر کو ایک سادہ، شریف اور خالصتاً" گھریلو بہو درکار ہے جب کہ تمہاری نند....."

"ہاں کیا میری نند۔" ماریہ نے تیزی سے بڑی بہن کی بات کاٹی۔ "بس ذرا لاڈلی اور نازک مزاج ہے، آخر کو ایک ہی بہن ہے نا۔ ویسے تو بہت پیاری، باادب اور ہنس مکھ ہے۔" ماریہ کے لہجے میں اکلوتی نند کے لیے پیار کھلا تھا۔

"مجھے ان سب باتوں پہ کیا اعتراض، تم خود ہی تو کہتی ہو کہ وہ ہل کر پانی بھی نہیں پیتی۔ بس سارا دن موویز، فیشن اور دوستیاں، ہمیں ایسی بھابھی چاہیے جو ہماری ماں کی خدمت کرے۔ انہیں ہل کر پانی بھی نہ پینے دے۔" جویریہ کا موقف دوٹوک تھا۔

"خیر تم دیکھو ادھر ادھر لڑکیاں۔ میں بھی دیکھتی ہوں۔ وسیم نے مجھ پر کوئی پریشر نہیں ڈالا ہوا۔ نیلی اکلوتی ہے۔ کافی گھرانے اس کے خواہش مند ہیں۔" ماریہ کندھے اچکا کر بولی۔

چائے پینے کے بعد سب اپنے گھروں کو چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ماریہ نے چلتے وقت میلے کپڑوں کا گٹھڑ اٹھا لیا۔ جویریہ نے ہفتے بھر کے لیے ایک دو سالن بنا کر فریج میں رکھ دیے۔

"یہ ہم کہاں جارہے ہیں؟" واپسی پہ سلیم کو انجانے راستے پہ بائیک ڈالتے دیکھ کر جویریہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"ذرا شاہین آپا کی طرف ہوتے جاتے ہیں۔ وہ کافی دنوں سے مجھے بلا رہی ہیں' آج نکلے ہیں تو ملتے جائیں۔" سلیم نے بتایا۔

"خیریت' کیوں بلا رہی ہیں؟" جویریہ نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"فائقہ کے لیے ایک دو رشتے آئے ہوئے ہیں۔ ان کی بابت مشورہ کرنا ہے۔"

سلیم کی بات سن کر جویریہ ایک لمحے کو خاموش رہ گئی پھر ایک دم پرجوش ہو کر بولی۔

"سلیم! کیوں نہ ہم آپا سے فائقہ کو مانگ لیں رفیع کے لیے۔"

"ارے واہ! یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہ آیا۔" سلیم کو بھی بے اختیار خوشی ہوئی تھی۔ بائیک ڈیوڑھی میں کھڑی کر کے وہ لوگ اندر چلے آئے۔ ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران سلیم اور جویریہ نے اپنا مدعا شاہین کے سامنے پیش کر دیا۔

فائقہ کے لیے کافی رشتے آئے ہوئے تھے۔ ان میں ایک تو بہت ہی اچھا تھا' جسے وہ اسی غور و غوص کے بعد اوکے کرنے ہی والی تھیں مگر ابھی جویریہ اور سلیم کے پیش کردہ پروپوزل نے تو انہیں جیسے خوشی سے نہال کر دیا تھا۔ رفیع نہ صرف خوبرو' نیک سبھاؤ اور سنجیدہ طبیعت کا لڑکا تھا بلکہ اچھے خاصے چلتے کاروبار کا مالک بھی تھا۔ جویریہ کی ماں حمیدہ بی بی تو تھیں ہی شفقت و محبت کا مرقع۔ اپنے تو اپنے غیر بھی ان کے چشمۂ محبت سے جی بھر کر سیراب ہوتے تھے۔

غرض جویریہ کا پورا گھرانہ ان کا دیکھا بھالا اور خوب پسندیدہ تھا خود جویریہ نے کبھی بھابھی والا روایتی پن نہیں اپنایا تھا۔ ہمیشہ بڑی بہن سا مان اور عزت دی۔

شاہین آپا نے شوہر سے صلاح مشورے کے بعد سلیم اور جویریہ کو "ہاں" کہنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ مگر اس سے پہلے وہ خدا کے حضور سجدہ شکر ادا کرنا نہ بھولی تھیں جس نے ان کی بیٹی کا اتنا اچھا نصیب بنایا تھا۔



"اماں جی! آپ کو بھوک لگی ہوگی۔ میں کھانا نکال دوں؟" فائقہ دیگچی کو ڈھکن سے ڈھانپتے ہوئے بولی تو حمیدہ بی بی نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"ہاں دلہن! بھوک تو واقعی لگی ہے۔ ناشتا کیے کافی ٹیم گزر چکا ہے۔" وہ ہاتھ دھونے کے لیے چارپائی سے اٹھ کر چپل پہننے لگیں۔

"ٹھہریں اماں جی! آپ بیٹھی رہیں' میں آپ کے ہاتھ یہیں دھلا دیتی ہوں۔" وہ پھرتی سے اٹھی اور لوٹا لے کر حمیدہ بی بی کے ہاتھ دھلانے لگی۔

"اللہ خوش رکھے۔ سدا سہاگن رہو۔" حمیدہ بی بی اپنے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے اسے دعا دینے لگیں۔

وہ مسکراتے ہوئے کھانا نکالنے کچن میں چلی گئی۔

رابعہ باجی کی شادی کے بعد گھر کا تقریباً سارا کام خود بخود ہی اس کے کندھوں پہ آگیا تھا۔ گو کہ رافعہ بھی ہاتھ بٹا دیتی لیکن نوعمری کے الہڑپن اور بے فکری کے رنگوں نے اسے اتنا ذمہ دار اور حساس نہیں بنایا تھا جتنی فائقہ ہو گئی تھی۔ تب ہی تو مجال ہے کہ سسرال میں اسے ذرا برابر بھی کوئی دقت ہوتی ہو۔

فجر کی پہلی اذان سے اٹھتی تو رات گئے تک آخری کام نمٹا کر ہی دم لیتی۔

"چوتھی" کے اگلے دن ہی اس نے حمیدہ بی بی کو چارپائی پہ بٹھا دیا۔

"اماں جی! آپ نے بہت کام کر لیا۔ بس اب آپ بیٹھ کر کھائیں۔"

دو کنال کے گھر میں جھاڑو دینا حمیدہ بی بی کے بس کی بات نہ تھی۔ مہندی سے رچے ہاتھ پیر' زرد ریشمی کامدار جوڑا زیب تن کیے' اس نے دوپٹا کمر کے گرد کسا اور جھاڑو کو زمین پہ مار کر تیلے برابر کرنے کے بعد صفائی میں جت گئی۔

شوق، لگن اور اپنے گھر کو سنوارنے سجانے کی فطری خواہش۔۔۔ ایک ہی دن میں گھر کا کونا کونا چمک اٹھا۔ سمیع تو برملا اپنی حیرت کا اظہار کرتا۔

"یہ ہمارا ہی گھر ہے یا میں کسی اور گھر میں آگیا ہوں۔"

اجلے چمکتے، خوب استری شدہ کپڑے پہنتے ہوئے جو اعتماد محسوس ہوتا تھا وہ پہلے نہ ہو پایا تھا۔

رفیع کو بھی اپنی نئی نویلی دلہن کے ہاتھ کے بنے لذیذ اور خوش ذائقہ پکوان خوب پسند آرہے تھے مگر جو خوشی ماں کو یوں بستر پہ آرام سے بیٹھا دیکھ کر ہو رہی تھی اسے لفظوں میں بیان کرنا آسان نہ تھا۔

وہ گزشتہ کئی سالوں سے ماں کو گھر کے کاموں میں خوار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ حمیدہ بی بی ملازمہ رکھنے کے لیے راضی نہ تھیں۔ بیٹے کی کمائی کی پائی پائی کا خیال رکھتیں۔ تب ہی تو سمیع و رفیع نے بخوشی بے مزہ پھیکے کھانے کھائے، سلوٹ زدہ کپڑے پہنے، دھول سے اٹے کمرے، موٹی روٹیاں۔۔۔ بوڑھے وجود میں سکت ہی اتنی تھی۔

دل تو پہلے ہی فائقہ کی من موہنی صورت کا اسیر ہو چکا تھا۔ اب جو سگھڑاپے کے جوہر دیکھے تو بے اختیار اپنی خوش نصیبی پہ رشک آجاتا۔

سارا دن کام نمٹانے کے بعد جونہی ڈھلتی شام رفیع کی دکان سے واپسی کا پتا دیتی تو وہ فوراً "اپنا جوڑا پہن کر ہلکا پھلکا میک اپ کر لیتی۔ زندگی ایک دم سے حسین اور نرم روندی کی مانند بہنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"فائقہ! میری پیاری بھابھی! میری ماں جی کا خیال رکھا کرو۔ انہیں کبھی شکایت کا موقع نہ دینا۔ آج بھی ماموں سلیم نے بیوی بچوں کے ساتھ سسرال کا چکر لگایا تو اسے تاکید کرنا نہ بھولے تھے۔

"ارے بچے! تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ اس بخت آور نے تو مجھے وہ سکھ دکھائے ہیں کہ میری اپنی سگی بیٹیاں بھی کیا دکھاتیں۔" فائقہ کے بولنے سے قبل حمیدہ بی بی بول پڑیں۔

"رات کو روز میری ٹانگیں دباتی ہے۔ پورے جسم پر مالش کرتی ہے۔ میں تو تیری شکر گزار ہوں کہ تو نے میرے لیے ایسا ہیرا ڈھونڈا ہے، جس نے میرے گھر کو اجالوں سے بھر دیا ہے۔"

حمیدہ بی بی اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں تو جہاں فائقہ انکساری سے مسکرا دی تھی، وہیں سلیم اور جویریہ کو بھی بے ساختہ خوشی ہوئی تھی۔ گویا اپنی "پسند" کا اماں جی کو پسند آجانا ان کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ ہو۔

ماریہ کو بھی اپنے میکے میں خوش گوار تبدیلی بہت پسند آئی تھی اور یہ بات بھی سلیم اور جویریہ کے لیے باعث اطمینان تھی۔

حمیدہ بی بی نے ایک گائے بھی پال رکھی تھی۔ خود اپنے ہاتھوں سے اس کا چارہ بھوسہ کرتیں۔ کھل بھگوتیں۔ اب جبکہ فائقہ نے گھر کے سارے کام تقریباً "اپنے ذمے لے لیے تو اب بس اپنی گائے کی ہی سیوا میں لگی رہتیں۔ صبح سویرے اٹھ کر برقی مدھانی میں دہی بلو کر ڈھیر سارا سنہری مکھن نکالتیں۔ کھٹی لسی میں پانی ڈال کر پتلا کر دیتیں تو سارا دن محلے کے بچے لسی لینے آتے رہتے۔ ہر نوالے پہ لسی کا گھونٹ کیا بھلا لطف دیتا۔

"آج نگوڑ ماری بھوری نے وہ زور سے رسہ کھنچوایا ہے کہ میری تو انگلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔" حمیدہ بی بی دودھ دوہ کر آئیں اور لبالب بھری بالٹی چولہے کے قریب رکھ کر چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے انگلیاں دبانے لگیں۔ چہرے پہ سخت اذیت کے آثار تھے۔

"اماں! میں نے آپ سے کہا بھی ہے کہ اتنی تکلیف نہ اٹھایا کریں۔ گائے کو بیچ دیتے ہیں۔ میں روز ہوٹل سے تازہ دودھ لے آوں گا۔" روٹی کھاتے ہوئے رفیع نے چنگیر پرے کھسکائی اور اٹھ کر ماں کی چارپائی پہ آگیا۔ ہاتھ پکڑ کر چیک کیا تو حمیدہ بی بی کے منہ سے کراہ نکل گئی۔

"فائقہ! تم اندر سے بام لے کر آو۔" وہ پیر پڑا رات

میں رکھ کر اٹھ گئی۔

"تو ٹھیک کہتا ہے۔ واقعی میری ہڈیاں جواب دے گئی ہیں۔ اتنی تکلیف صرف اپنی اولاد کی خاطر اٹھاتی ہوں۔ صبح گرم روٹی پہ مکھن لگا کر کھاتے ہو تو ماں کے دل کو سکون مل جاتا ہے اور سمیع تو سردیوں میں دیسی گھی کے بغیر نوالہ لینا حرام سمجھتا ہے۔" بام نے دھیرے دھیرے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔

"آپ بس دودھ نکالا کریں۔ باقی سب فائقہ دیکھ لے گی۔" رفیع ہاتھ دھو کے آیا، فائقہ نے ٹھنڈی روٹی اٹھا کر گرم روٹی چنگیر میں رکھی تو وہ اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ فائقہ کا بے اختیار سر اثبات میں ہل گیا۔

"ارے میری بچی! سارا دن کام میں لگی رہتی ہے۔ اب کیا کیا بکھیڑے یہ سمیٹے۔" حمیدہ بی بی نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے محبت سے بولیں۔

اگلے دن صحن کی صفائی کے دوران اس نے گائے کے سارے کام ایسے ہی دلجمعی سے ۔۔۔ کیے جیسے حمیدہ بی بی کرتیں۔ تازہ گھاس لا کر ڈالی۔ پانی پلایا اور سارا گوبر پھاوڑے سے اکٹھی کر دیا۔ ارادہ باہر پھینکنے کا تھا۔

"ارے دلہن! گھاس ڈانڈوں سمیت ڈال دی۔ ایسے تو یہ کھانے میں نخرے کرتی ہے۔ میں تو ٹوکے سے ٹکڑے کر کے ڈالتی ہوں۔ مکئی کی گھاس ہے آخر۔" حمیدہ بی بی بیری کے نیچے سے اٹھ کر ادھر آگئیں۔ انداز کافی ناقدانہ تھا۔

"ٹھیک ہے اماں جی! میں کل کاٹ کر ڈالوں گی۔" اس نے سادگی سے کہا۔ دھوپ تیزی سے پھیلتی جارہی تھی۔ ابھی تو برتن دھونے تھے۔ پھر دوپہر کے کھانے کی تیاری۔

"جیتی رہو! اور یہ اپلے ذرا جلدی تھاپ لو۔ دن گرم ہو رہا ہے۔ گوبر سوکھ جائے گا۔"

"جی!" اس نے ہونق ہو کر ساس کا چہرہ دیکھا۔ مگر وہ گائے کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ نظریں الگ سلامیں لے رہی تھیں۔

"مگر اماں جی! اتنی لکڑی تو ہے۔ آخر اپلے تھاپنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ نرمی سے بولی۔

"ارے دلہن! گھر کا بالن ہے۔ خواہ مخواہ ضائع کیوں کریں۔ پھر لکڑی بھی تو پیسے سے آتی ہے۔ اپنے بچے کی خون پسینے کی کمائی یوں آسانی سے چولہے میں جھونک دوں؟ خیر میں خود تھاپ لوں گی۔ تم جاؤ، اپنا کام کرو۔" وہ مشفق انداز میں بولیں۔

"ارے نہیں، بس میں چولہے کا کام نمٹا کر کرتی ہوں۔" وہ جلدی سے بولی۔ مجازی خدا کی ہر بات اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

اتنا غلیظ کام اور وہ بھی زندگی میں پہلی مرتبہ۔۔۔ طوعاً" کرہاً" صحن کی چار دیواری پہ اپلے تھاپ کے رکھ دیے جیسے حمیدہ بی بی کرتیں۔

آنے والے دنوں میں اس کی کراہت میں کمی آتی گئی۔ ہاں بس دھوپ اور چھاؤں کے حساب سے اندر برآمدے میں باندھنے اور کھولنے کے دوران گائے کے سینگ اپنے پیٹ میں گھونپے جانے کا ڈر اسے کپکپاتا رہتا، مگر حمیدہ بی بی کے منہ سے جاری دعاؤں اور تعریفوں کا چشمہ خوف کو ایک دم سے زائل کر دیتا۔

رفیع کو بیوی کی تابع داری پہ ٹوٹ کے پیار آتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اماں جی! یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" وہ نہا کر باہر نکلی تو حمیدہ بی بی کو ٹنکی کے پاس بنے سیمنٹ کے کھرے میں تھال رکھے کپڑے دھوتا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"دلہن! کپڑے دھو رہی ہوں۔" حمیدہ بی بی سادگی سے بولیں۔

"وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے مگر کیوں؟" وہ قدرے جھنجلا کر بولی۔

"اور یہ سمیع کے کپڑے کیوں دھو رہی ہیں۔ میں کل مشین لگانے والی تھی۔ آپ خواہ مخواہ تکلیف کر رہی ہیں۔"

"ارے تکلیف کیسی؟ پہلے بھی تو کرتی آرہی ہوں اور ویسے بھی تم اپنے دھوتی ہو، پھر اپنے میاں کے۔

سارا دن لگ جاتا ہے۔ کم بخت ماری بجلی کون سی سارا دن رہتی ہے۔" حمیدہ بی بی اپنے سوتی جوڑے پہ تیزی سے صابن رگڑتے ہوئے بولیں۔

"آپ اپنے دھولیں مگر سمیع کے تو رہنے دیں اتنے موٹے کھدر کے مردانہ سوٹ۔۔۔ آپ کیسے دھو سکیں گی۔"

وہ ساس کی محبت سے بے حد متاثر ہوئی۔ اتنی محبت اور خیال تو اپنی ماں ہی رکھ سکتی ہے۔ وہ ابھری رگوں والے بوڑھے ہاتھوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ جو نجانے کتنے سالوں سے مشقت کی چکی چلاتے آرہے تھے۔

"السلام علیکم!" عقب سے ڈیوڑھی میں سے سلیم نے آکر باآواز بلند سلام کیا تو دونوں چونک کر پیچھے دیکھنے لگیں۔

"وعلیکم السلام ماموں! آپ اس وقت؟" وہ خوش دلی سے ان کی طرف مڑی۔

"ہاں بھئی! وہ رفیع نے فون کیا تھا کہ آج ڈیو ڈیٹ ہے۔ بجلی کا بل جمع کروانا ہے۔ میں اپنا کروانے جا رہا تھا تم جلدی سے مجھے بل لادو۔ میں تمہارا ابھی کروالوں گا۔" سلیم قدرے عجلت سے بولا تو وہ سر ہلا کر اندر کمرے کی طرف چل دی۔

"اور ماں جی! آپ کپڑے کیوں دھو رہی ہیں، بہو سے کہتیں۔ وہ آپ کو دھو دیتی۔"

کمرے میں داخل ہونے سے قبل اس نے ماموں سلیم کی آواز پشت پہ سنی تھی۔

بل پتا نہیں کہاں رکھ دیا تھا۔ مل ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک دراز کھنگالتی جا رہی تھی، مگر بل نہیں مل رہا تھا۔

"ارے فائقہ! جلدی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مجھے دکان بھی جانا ہے۔" سلیم اندر آکر اس کے عقب میں بولا۔

"ہاں ماموں! رات انہوں نے مجھے دیا تو ادھر ہی رکھا تھا۔ اب پتا نہیں کہاں چلا گیا۔" وہ شیلف میں جھانکتی ہوئی بولی۔

"یہ رہا، مل گیا۔" اس نے بل سلیم کی طرف بڑھایا۔

"بیٹا! میں نے تمہیں پہلے بھی نصیحت کی تھی، اب بھی کہہ رہا ہوں اپنی بوڑھی ساس کے آرام کا خیال رکھا کرو۔ انہیں زیادہ سے زیادہ سکھ دینے کی کوشش کیا کرو۔" سلیم بل تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے جواب دیتی، وہ جلدی سے چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"سمیع! مجھے اعصام الحق اور فاہا کے بریک اپ کا بہت افسوس ہوا، کیا چاند سورج کی جوڑی تھی۔" وہ چولہے سے فارغ ہو کر سمیع کے ساتھ والی چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہوں۔" سمیع نے ہنکارا بھرا۔ نظریں ٹی وی پہ لگے اسپورٹس چینل پہ تھیں جہاں اعصام الحق اور روہن بوپنا کے مابین مقابلہ جاری تھا۔

وہ کل ہی شہر سے لوٹا تھا۔ قصبے میں تعلیم کے پست معیار کی بدولت اس نے قریبی شہر کے ٹیکنیکل کالج میں ایڈمیشن لیا ہوا تھا۔ دو ہفتے بعد گھر کا چکر لگا لیتا کیونکہ اماں جی اس کے لیے بہت اداس ہو جاتی تھیں۔ میٹھے کا خاصا شوقین تھا۔ اس لیے ہر بار اس کی آمد پر فائقہ کوئی نہ کوئی میٹھی ڈش پکا لیتی، جسے وہ خوب تعریف کے ڈونگرے برسا برسا کر کھاتا۔ آج بھی فائقہ نے دیسی گھی میں سوجی کا حلوہ بنایا تھا۔ جسے ایک دو چمچے لینے کے بعد سمیع نے پلیٹ پرے کھسکا دی تھی۔ جو فائقہ کے لیے خاصے اچنبھے کا باعث تھی۔

"سمیع! یہ حلوہ ایسے کیوں چھوڑ دیا، تمہارا تو فیورٹ ہے۔" وہ دوستانہ انداز سے بولی۔

"بس ایسے ہی دل نہیں چاہ رہا۔" سمیع ہنوز سنجیدگی سے بولا۔ اس نے نظر بھر کر دیور کے چہرے کو دیکھا، جہاں چھائی سنجیدگی میں ناراضی کے رنگ اسے صاف نظر آرہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا

کہ سمیع اس سے خفا ہے تو کس بات پر؟ پہلے تو فرمائش کر کے پکوان پکواتا، ساتھ مل بیٹھ کر ریسلنگ دیکھنے پہ اصرار کرتا۔ وہ بھی اس کی خوشی کی خاطر جان سینا اور انڈر ٹیکر کے قصیدے سنتی رات دیر تک بیٹھی رہتی۔ بالکل بڑی بہنوں کے سے لاڈ اٹھواتا تھا مگر اب نجانے کیا ہوا تھا۔

"چلو! کوئی بات نہیں، میں نے حلوہ فریج میں رکھ دیا ہے کل جب جاؤ گے تو گرم کر کے تمہارے بیگ میں رکھ دوں گی۔ ہاسٹل جا کے کھا لینا۔" وہ نرمی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اماں جب کپڑے دھو کر استری کرنے کے بعد رکھیں گی تو حلوہ بھی پیک کر دیں گی۔" وہ ٹی وی سے ذرا سا نظر ہٹا کر خشک لہجے میں بولا تو وہ ششدر رہ گئی۔

"ذرا جلدی سے کھانا نکال کر دو، دکان پہ پھر جانا ہے، سامان آنے والا ہے۔" اسی وقت رفیع ہاتھ دھو کے آیا تو وہ سمیع کے رویے پہ غور کرتی چولہے کی طرف آگئی۔

"ہائے! بڑا ظالم درد ہے۔ مجھ بڈھی کی تو جان ہی نکال کے رکھ دی۔" حمیدہ بی بی اذیت سے ڈوبی ہوئی آواز میں بولیں۔ دونوں بھائی چونک کر ماں کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیا ہوا اماں!" دونوں ماں کی چارپائی پہ آکے بیٹھ گئے۔

"کیا بتاؤں میرے لال! ذرا سا چارپائی اندر سے باہر نکال کے رکھ دی۔ کمر ٹوٹنے کو آگئی ہے۔ بازو میں الگ درد ہو رہا ہے۔" حمیدہ بی بی اپنا بازو دباتے ہوئے بدقت بولیں۔

"تو آپ چارپائی کیوں نکال رہی تھیں۔ فائقہ کہاں تھی۔ وہ آپ کو نکال کر دے دیتی۔" رفیع دبے دبے سے غصے سے بولا۔

"ارے بیٹا! وہ بے چاری کہاں کہاں کھپے۔ روٹیاں پکا رہی تھی میں کب سے اندر بیٹھی تھی۔ شام ڈھلی تو سوچا اب باہر چل کر بیٹھوں اور یہی چارپائی نکالنے کی خطا کر بیٹھی۔" حمیدہ بی بی درد سے بے حال ہوتے ہوئے بولیں۔

"تم روٹی بعد میں بھی پکا سکتی تھیں۔ پہلے اماں کو چارپائی نکال کر دے دیتیں۔" رفیع فائقہ کو دیکھتے ہوئے غصے سے بولا۔

وہ کچھ جواب دینے کے بجائے حمیدہ بی بی کو دیکھنے لگی۔ جن کے چہرے پہ ـــــ اذیت کے تمام آثار مٹ چکے تھے۔ چہرہ بہت مطمئن اور پرسکون تھا۔ سمیع ماں کے کندھے دبا رہا تھا۔

"بہوویں بھرے سسرال کی خدمت کرتی ہیں۔ درجن بھر دیور اور نندیں اور یہاں میری ایک ماں کا بھی خیال نہیں رکھا جا رہا تم سے۔" رفیع کھانا کھاتے ہوئے باآواز بلند بڑبڑانے لگا۔

"رفیع! میں نے۔۔۔" اس نے بولنا چاہا مگر بھیگی آواز میں بس اتنا ہی نکل سکا تھا۔

"ہاں! کیا تم؟ بولو نا، تمہیں ترس نہیں آتا اس بوڑھی پہ، جنہوں نے اس گھر کی خواری میں اپنی ہڈیاں تک گلا ڈالیں۔ میں تمہیں پلنگ توڑنے کو نہیں بیاہ لایا تھا۔ میری ماں کی خدمت تمہارا اولین فرض ہے۔"

رفیع کو غصہ کم آتا تھا، مگر جب بھی آتا تو خوب زوروں کا آتا۔ یہ بات اس نے خود فائقہ کو شادی کے اولین دنوں میں بتائی تھی۔ ساتھ میں نصیحت بھی کر دی تھی کہ شدید غصے کے وقت وہ اس کے سامنے سے ہٹ جایا کرے۔ سو اس وقت بھی اس کی ہدایت پہ عمل کرتی وہ اندر اپنے کمرے میں آگئی۔

"میں نے کہا بھی تھا اماں جی چارپائی نکال لوں مگر اس وقت دھوپ چبھ رہی تھی اور جوں ہی روٹی پکانے بیٹھی تو خود چارپائی نکال لائیں۔ اب کیسے بیٹوں کے سامنے مظلوم بن رہی ہیں۔" غصے سے دانت پیس پیس کر بولتے ہوئے وہ اپنی بھڑاس نکالنے لگی کیونکہ باہر نکالنا جو ناممکن تھا۔

☼ ☼ ☼

رفیع کو باہر شہر میں کام تھا، اس لیے اس نے سویرے کی بس پکڑی۔ فائقہ نے میکے کا ارادہ باندھ

لیا۔

"اماں جی! میں ذرا امی کے ہاں چکر لگا آؤں۔ فریج میں چکن پڑا ہے۔ آپ کے لیے یخنی بنا لیتی ہوں۔" سارے کام نمٹا کر اس نے حمیدہ بی بی سے سنجیدگی سے پوچھا۔ رات کی ڈانٹ ابھی بھولی نہیں تھی۔

"ارے! ابھی تو فارغ ہوئی ہو۔ پھر سے چولہا جلاؤ گی۔ میں رات کے سالن سے روٹی کھا لوں گی۔ تم جاؤ۔ ماں بہنوں سے مل کر آؤ۔" حمیدہ بی بی اپنے مخصوص شفیق انداز میں بولیں جس کا اس پہ کوئی خاص اثر نہ ہوا۔

"ہائے مائی سویٹ مامی! آپ کہیں جا رہی ہیں کیا؟" نائلہ آتے ہی اس کے گلے لگ گئی۔

"ہاں، پیاری بھانجی! بس ذرا امی کے گھر جا رہی ہوں۔" وہ اس کے گال پہ پیار کرتے ہوئے بولی۔ ماریہ باجی کی یہ بیٹی اسے بہت پیاری لگتی تھی۔ بڑا ہی کھلنڈرا مزاج پایا تھا۔ ہر ہفتے نانی کے گھر کا چکر لگاتی۔ فائقہ سے کافی گاڑھی چھنتی تھی۔

"میں آپ سے بلیک سینڈل لینے آئی ہوں، میری فرینڈ فضا کی برتھ ڈے ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ لے لو۔" فائقہ نے فراخ دلی سے کہا۔

"میں ذرا نانی سے مل آؤں۔" نائلہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

حمیدہ بی بی اسے باہر صحن ہی میں مل گئیں، پتلی خشک لکڑیاں ہاتھوں سے توڑتیں۔ پورے صحن میں تیز دھوپ پھیل چکی تھی۔ گرمی کے ساتھ مشقت کے پسینے سے تر بتر بوڑھا چہرہ نواسی کو دیکھ کر ذرا سا کھلنے کے بعد مرجھایا تھا۔

"ارے نانی! یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ چھوڑیں یہ ٹہنیاں۔ کتنی گرمی ہو رہی ہے، یہ کام کسی ٹھنڈے وقت میں بھی کیا جا سکتا ہے۔" نائلہ نے ان کے ہاتھ سے ٹاہلی کی خشک بے خار ٹہنی لے لی۔

"میری بچی! جب کام کرنا ہے تو وقت ویلا کیسا۔" حمیدہ بی بی گہری سانس بھر کر بولیں۔

فائقہ چادر پہن کر باہر آئی تو حمیدہ بی بی کو تپتی دھوپ میں لکڑیاں توڑتا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"ایں! یہ کب باہر آئیں۔ کچھ دیر پہلے تو اندر بیٹھی تھیں۔" وہ حیرانی سے بڑبڑائی مگر زیادہ حیرانی اسے حمیدہ بی بی کو بے وقت لکڑیاں توڑتے دیکھ کر ہوئی تھی۔ وہ شام کو کھانا پکاتے وقت خود یہ لکڑیاں توڑ توڑ کر چولہے پہ جمع کر لیتی تھی۔ پھر صبح تک یہ لکڑیاں ناشتے بنانے میں بھی استعمال کر لیتی تھی۔ حمیدہ بی بی کو اس وقت لکڑیاں توڑنے کی چنداں ضرورت نہ تھی مگر۔۔۔؟

فائقہ نے ایک لمبی سانس کھینچی اور تیزی سے صحن پار کر کے باہر آ گئی۔



روز کی طرح وہ نماز فجر اور تلاوت قرآن کے بعد سر پہ لپٹے دوپٹے کو ڈھیلا کرتی جوں ہی کچن میں داخل ہوئی تو بے ساختہ کراہ کر رہ گئی تھی۔

"اماں جی! آپ کو یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ تقریباً روہانسی ہو کر حمیدہ بی بی سے مخاطب ہوئی۔

"ارے بچی! ایسا کون سا میں نے پہاڑ الٹ دیا یا کھیتوں میں ہل چلا مارا۔ بس ذرا سا آٹا ہی تو گوندھ لیا ہے۔ پہلے بھی تو روز یہی کام کرتی تھی۔" حمیدہ بی بی نے آرام سے بولتے ہوئے پرات کو تھال سے ڈھک دیا اور چائے کے لیے ابلتے پانی میں اندازے سے چیچ بھر پتی جھونک دی۔ مدھانی سے تو وہ پو پھٹنے سے قبل ہی فارغ ہو چکی تھیں۔

"اماں! پہلے کی بات اور تھی۔ اب میں آ گئی ہوں۔ پچھلے چھ مہینوں سے میں ناشتا بناتی آ رہی ہوں مگر آپ روٹین کیوں خراب کر رہی ہیں۔" وہ جیسے عاجزی سے بولی۔ پھر پریشانی سے دروازے کی طرف دیکھا۔ ابھی کچھ دیر میں ربیع کو نہا دھو کر ناشتے کے لیے آنا تھا اور اگر اس نے چولہے میں ماں کو پھونکیں مارتا اور آنکھیں مل مل کر کھانستا دیکھ لیا تو اس کی شامت یقینی تھی۔

ابھی کل ہی تو اماں کی یخنی بنائے بغیر میکے جانے پہ خوب جھاڑ پڑی تھی۔ اس کے میکے جانے کے بعد حمیدہ بی بی نے خود اپنے لیے یخنی بنائی تھی۔ تھکاوٹ جو ہوئی سو ہوئی مگر بوٹیاں بناتے ہوئے چھری کے کٹ نے تو قیامت ہی ڈھادی تھی۔

رفیع سے جتنا بن پڑا۔ اس پہ گرجا برسا۔ بس ہاتھ اٹھانے کی کسر رہ گئی تھی۔ اس کے پاس بھی کمی نہ تھی۔ وضاحتیں... دلیلیں... صفائی... مگر وہ سنے بھی تو نا۔

"جو ہوا سو ہوا، مگر اب رفیع کو مزید اپنی انسلٹ نہیں کرنے دوں گی۔" ہاتھ پکڑ کر حمیدہ بی بی کو انگیٹھی کے سامنے سے اٹھا کر چارپائی پہ بٹھایا اور خود رفیع کے آنے سے قبل روٹیاں بنانے میں لگ گئی۔

سمیع اس بار آیا تو اس کے لیے رسالے بھی لے آیا۔ رسالے تو وہ ہر ماہ لے آتا تھا۔ مگر اسے خوشی سمیع کے چہرے پہ کسی ناراضی کا شائبہ نہ پاکے ہوئی تھی۔ جھٹ پٹ چقندر کا حلوہ بنالیا جو کے چھلکے بنا کے شیرے میں ڈال کے اس کے لیے مرونڈے بنالیے جو ہاسٹل جانے سے قبل آدھے گھر پہ ہی کھالیے۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر سمیع کے کپڑے دھونے کے لیے اس نے پانی کا پتیلا گرم کرنے کے لیے چولہے پہ چڑھا دیا مگر اس سے پہلے ہی حمیدہ بی بی سمیع کے کپڑے تھال میں دھونے بیٹھ گئیں۔

"بیٹا! میں فارغ بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں۔ تم نے تو بالکل مجھے بچہ بنا کے پلنگ پہ بٹھا دیا ہے۔ ایسے بے کار بیٹھنے سے تو میرے جوڑ بند ہو جائیں گے۔" اس کے سنجیدہ چہرے کو نرمی سے دیکھتے ہوئے وہ پیار سے بولیں تو اس نے سرہلا دیا۔

کپڑے ٹھیک طرح سے دھل نہیں پائے تھے مگر اس نے خوب جما جما کر استری کیے، تہہ شدہ کپڑے ہاتھوں میں اٹھائے سمیع کے کمرے کی طرف چلی آئی۔

"اماں! اب بس کریں۔ میں خود آکر الماری ٹھیک کروں گا۔" بیگ میں کتابیں رکھتے ہوئے سمیع ماں سے مخاطب ہوا۔

حمیدہ بی بی سمیع کی الماری کھولے صفائی میں مصروف تھیں۔ دھول مٹی سے چہرہ اٹ چکا تھا۔ زور زور سے کھانستے، چھینکتے اور کانپتے لرزتے ہاتھوں سے وہ فالتو اور بے مصرف چیزیں باہر نکالتی جارہی تھیں۔

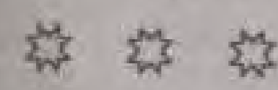
"ارے! میں نہ کروں تو کون کرے گا۔ جب تک تیری بیوی نہیں آتی، تب تک مجھ بڈھی کو ہی تیرے سب کام کرنے ہیں۔ وہ دلہن رانی تو کسی کام کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتی ہے۔ کتنی عاجزی سے کہا کہ بیٹا! دیور کے کپڑے دھولو مگر نہیں۔ کھٹ سے انکار کردیا۔ جس اذیت اور لاچاری سے اس بڈھی بیماریوں کی پوٹ نے بالٹی بھر پانی اٹھائی، کپڑے دھوئے، نچوڑے اور تار پہ ڈالے... یہ بس میں ہی جانتی ہوں۔" بولتے بولتے حمیدہ بی بی ہانپنے لگیں۔

الماری کی صفائی نے بوڑھی جان کو تھکا کے چور چور کر دیا تھا۔ ماں کی بات سن کے سمیع کے ماتھے پہ سلوٹیں ابھر آئیں۔ لب بے ساختہ بھنچ گئے تھے۔

"آپ رفیع بھائی سے کیوں نہیں کہتیں، وہ اپنی بیوی کو سمجھائیں۔ کیا فائدہ ہوا بھابھی لے کر آنے کا۔" سمیع کاٹ دار لہجے میں بولا۔

"چھوڑو بچے! اس زن مرید کو خود نظر نہیں آرہا۔ تجھے تیری ماں میاں بیوی میں پھوٹ ڈلواتی نظر آتی ہے؟ بس میرا بچہ خوش رہے۔ میری آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی۔ مجھ بڈھی کا کیا ہے۔ پہلے بھی اپنے آرام پہ تم لوگوں کے سکون کو ترجیح دی تو اب بہو کے آنے سے کیا بدلا...؟" حمیدہ بی بی بولتے ہوئے کافی مغموم ہوگئیں۔

اور دروازے کے پٹ سے لگی فائقہ کی آنکھوں کے گوشے دکھ اور بے یقینی سے گیلے ہوگئے تھے۔



"فریبی، مکار۔ ڈرامے باز۔" اس نے غصے سے دانت پیسے۔

"فائقہ! میری یہ تربیت ہے؟" شاہین خفا ہوئیں۔

"امی! آپ نہیں جانتیں انہوں نے میری جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ مجھے سب کے سامنے بری طرح ڈی گریڈ کرکے رکھ دیا ہے۔ دیور نالاں ہے تو نندیں برگشتہ، ستم بالائے ستم کہ میاں صاحب کی نظروں میں بھی میں دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی ہوں۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ میں کوئی کاہل، کام چور اور آرام طلب، بے حس بہو ہوں جو سارا دن بوڑھی ساس کو کاموں میں جوتے رکھتی ہوں۔ بظاہر معصوم اور نیک بنی رہتی ہیں مگر اندر سے اتنی گھنی ہیں امی! کیا بتاؤں آپ کو۔" وہ غصے سے بری طرح پھٹ پڑی۔ آنکھیں لبالب بھر آئیں۔

"تو مسئلہ کیا ہے، تمہاری ساس کو کام کرنے کا شوق ہے تو کرنے دو۔ تمہارا ہی بوجھ کم ہوتا ہے۔" رافعہ عصر پڑھ کر ادھر آگئی تھی اور فائقہ کے قریب بیٹھتے ہوئے آرام سے بولی۔

"میری بہنا! اگر انہیں کام کرنے کا شوق ہے تو ضرور کریں... مگر ایسا نہیں ہے۔ جب بیٹوں کے آنے کا ٹائم ہوتا ہے، اس وقت اپنے کمرے کی صفائی کرنے لگ جاتی ہیں۔ یا جب کوئی داماد، بیٹیاں یا نواسا، نواسی آنکلیں تو ایسے ایسے کام ڈھونڈ کر کرنے بیٹھ جاتی ہیں جن کے کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی... اور جب سب کی ملامتی نظریں مجھ پر اٹھتی ہیں۔ تب جاکر ان کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ پوری اسٹار پلس کی ساس ہیں۔" وہ جلے کٹے انداز میں بولی۔

اس ہفتے وہ میکے آئی تو سلیم ماموں پہلے سے موجود اس کے خلاف شکایات کا دفتر شاہین کے سامنے کھولے بیٹھے تھے۔

"یہ اپنی ساس کی خدمت نہیں کرتی۔ میں جب بھی گیا ہوں اماں جی مجھے کسی نہ کسی کام میں مصروف ہی نظر آئیں۔ جویریہ بھی ناراض ہورہی تھی کہ فائقہ بہت ہی لاپروا، غیر ذمہ دار اور ہماری توقعات کے بالکل برعکس ثابت ہوئی ہے۔"

حیرت نے اس کا دماغ ماؤف کردیا تھا۔ کچھ کہنے کی کوشش ہی میں اس کے لب کپکپا کر رہ گئے تھے۔

شاہین نے ایک نظر بیٹی کے فق چہرے کو دیکھا پھر سنجیدگی سے بھائی سے مخاطب ہوئیں۔

"سلیم! تمہیں اور جویریہ کو لگتا ہے کہ بوا حمیدہ کام میں پستی رہتی ہیں اور فائقہ بس پلنگ توڑتی رہتی ہے۔ مجھے یہ بتاؤ! اگر حمیدہ بوا اتنی ہی چابک دست اور محنتی ہیں کہ میری بیٹی کے آنے سے انہیں کوئی آرام نہیں ملا تو گھر ایسے کیسے چم چم کرنے لگ گیا ہے۔ برتن ہاتھوں سے پھسلنے تک آجاتے ہیں۔ رفیع و سمیع کے کپڑوں کی چمک دمک پہلے تو کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ تو کیا فائقہ کے آجانے سے اس گھر پہ واقعی کوئی فرق نہیں پڑا؟" شاہین کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"آپا! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اماں جی کو جو چھوٹی موٹی شکایت ہے۔ وہ فائقہ دور کرنے کی کوشش کرے۔" سلیم سے اتنا ہی جواب بن پڑا۔ بہن کے تیکھے انداز سے وہ گھبرا گیا تھا۔

"پہلے تم اور جویریہ جب بھی میرے ہاں آتے تو ایک ہی بات دونوں کی زبان پر ہوتی کہ اماں جی دن بدن بوڑھی ہوتی جارہی ہیں۔ گھر کے کام جیسے تیسے نبٹاتی ہیں۔ رفیع کے لیے کسی سلیقہ شعار اور سگھڑ لڑکی کی تلاش ہے، اب جبکہ میری فائقہ اس گھر کا نصیب بن چکی ہے تو اچانک بوا حمیدہ کے اندر چستی و توانائی بھر آئی ہے، جو منٹوں میں کام نبٹا لیتی ہیں۔ گھر کا سلیقہ و نفاست شاید کسی جن کی مرہون منت ہے کیونکہ فائقہ تو ایک غیر فرض شناس بہو ہے نا۔" شاہین خوب طنز سے بولیں۔ اپنے ماں جائے کے سامنے ایسا لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے انہیں خود بھی افسوس ہورہا تھا مگر اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔

گزشتہ ایک ماہ سے انہیں فائقہ بجھی بجھی اور اداس دکھائی دینے لگی تھی۔

"بیٹا! رفیع تو ٹھیک ہے نا تمہارے ساتھ... کچھ غلط تو نہیں کرتا۔" وہ خدشات میں گھر کر پوچھتیں۔

"ارے نہیں امی! رفیع پہلے جیسے ہیں بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اچھے اور خیال رکھنے والے ہوتے جارہے ہیں بس اماں جی بہت ڈسٹرب رہتی ہیں۔ میں انہیں

خوش رکھنے کی بہت کوشش کرتی ہوں، پھر بھی کوئی نہ کوئی شکایت نکل ہی آتی ہے۔" فائقہ کا ہر دفعہ ایک ہی جواب ہوتا۔

ایسے میں سلیم کی ہر ہفتے آمد۔

"آپا! فائقہ مجھے سسرال والوں کے سامنے شرمندہ کروا رہی ہے۔ کس مان سے اور فخر سے میں اپنی بھانجی کو بیاہ کرلے گیا تھا مگر مجھے اب وہ سب مٹی میں ملتا نظر آتا ہے۔" سلیم کافی دل گرفتہ و مایوس ہوتا۔

شاہین زیادہ دن مخمصے میں نہ رہیں کیونکہ وہ اپنے بھائی کی فطرت سے مکمل آشنا تھیں۔

کانوں کا کچا اور پیٹ کا ہلکا، بیوی کے کہے پر من و عن عمل کرنے والا تابع دار شوہر۔

وہ غیر جانب داری سے بھی دیکھتیں تو انہیں فائقہ پہ ترس آجاتا۔ آنکھوں کے گرد حلقے، مرجھائی رنگت اور بے نام سا چھایا ہراس۔

وہ سلیم سے دوٹوک بات کرنے کا ارادہ باندھ ہی رہی تھیں کہ اس دن فائقہ کی حالت دیکھ کر دھک سے رہ گئیں۔ وہ حمیدہ بی بی کی سمیع کے کان بھرنے سے بہت دل برداشتہ تھی ـــــ جن رشتوں کو آپ بہت خلوص اور چاہ سے نبھائیں اور بدلے میں انہی رشتوں سے آپ کو منافقت اور بداعتمادی ملے تو ہستی ایسے ہی بے مول ہو کر رہ جاتی ہے۔

"میں اماں جی کو سمجھ نہیں پارہی۔ آخر وہ مجھ سے کس قسم کی خدمت کی طلب گار ہیں۔ آپ یقین کریں میری ذہنی حالت اس حد تک ابتر ہوچکی ہے کہ سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں کہ کہیں کوئی کام مجھ سے رہ گیا نہ ہو اور وہ کام اماں جی نہ کرنے لگ جائیں۔ پھر رفیع کا خفا ہونا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔" سلیم ماموں کے رخصت ہوجانے کے بعد وہ پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولنے لگی۔

"بیٹا! جو بھی ہے۔ تم صبر کرو۔ حمیدہ آپا کو تو بس کام کا شوق ہے۔ تمہاری دادی کے ساتھ بھی جیسے میں نے بسر کی ہے، وہ میں اور میرا خدا ہی جانتے ہیں۔ اللہ بخشے مرحومہ نمک مرچ تک تالے میں رکھتیں اور چابی اپنے ازار بند سے باندھے رکھتی تھیں۔ ہزار ہا کوششیں کیں، بہتیرے جتن کیے مگر تمہاری دادی کا اعتماد نہ جیت سکی۔ کچن کی الماری جس میں گھی اور مسالوں کے علاوہ اور کیا ہوتا تھا بھلا ـــ کبھی زندگی بھر ہاتھ لگانے کی جرات نہ ہوئی ـــ میں نے بھی ایسی ہی ذہنی اذیت جھیلی تھی۔ کبھی اپنی نظروں میں بھی سرخرو نہ ہوپائی۔ ہمیشہ تمہاری دادی کی ٹٹولتی، کھوجتی نظروں کے حصار میں رہی کہ کہیں کچھ چرا کر میکے تو نہیں لے جارہی۔ یہ بزرگ ایسے ہی بالکل ہٹ پہ آجاتے ہیں۔ تم اپنی سابقہ روش جاری رکھو۔ کبھی کسی خدمت میں کمی نہ آنے دو۔"

نرمی سے بولتے ہوئے شاہین نے محبت سے اس کی پیشانی چومی تو ڈھیر سارا اطمینان اس کے اندر اتر گیا۔ دل کا بوجھل پن منٹوں میں غائب ہوگیا۔ ورنہ تو جب سے آئی تھی، مسلسل افسردہ و دل گیر بیٹھی، اپنے دل کا بوجھ کم کرنے کے ساتھ ماں، بہن کو پریشان کیے جارہی تھی۔

"سچ اگر میری ساس ایسی کام کاج کی شوقین ہوتی نا تو میں تو شکرانے کے نوافل ادا کرتی تاکہ تمہاری طرح ہاتھ جوڑ جوڑ کر، سر پیٹ کر اور دہائیاں دے کر انہیں کام سے باز رکھنے کی کوشش کرتی۔" سیب کی قاشیں بناتے ہوئے رافعہ مزے سے بولی۔

"ہاں! جب میاں سیدھے منہ بات نہ کرتا، نندیں کترانے لگتیں اور اڑوس پڑوس کے لوگ بزرگوں کے حقوق پر لمبے لمبے لیکچر دینے لگتے تو پھر میں تم سے پوچھتی کہ تم کتنے نوافل ادا کرتیں۔" فائقہ نے منہ میں قاش رکھتے ہوئے قدرے جل کر کہا۔

رافعہ اس کی بات سن کر پہلے تو مسکرائی پھر سنجیدگی سے بولی۔

"دیکھو فائقہ! ہر انسان کی اپنی نفسیات ہوتی ہے اور پڑھے لکھے انسان کے لیے کسی کی نفسیات اور مزاج کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں ہوتا۔ تم بی اے پاس ہو مگر تم نے اپنی ساس کے مزاج کو سمجھنے کا ذرا بھی تردد نہیں کیا۔ بس دن رات جھاڑو سے چولہا، چولہا سے برتن میں خود کو گم کرلیا، صرف اس لیے کہ تمہارے سگھڑاپے اور امی کی تربیت پہ کوئی حرف نہ آئے۔" رافعہ ٹھہرے انداز میں بول رہی تھی۔

"کام، کام اور بس کام ـــ کاموں میں گھن چکر بنی کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ تمہاری ساس اچھی بھلی چارپائی پہ آرام کرتی، اپنے بچوں یا ان کے بچوں یا کسی ہمسائی کو دیکھ کر کام کیوں کرنے لگ جاتی ہیں۔ وہ اس لیے ڈیئر! کہ ساری زندگی انہوں نے تن تنہا گھر سنبھالے رکھا۔ نہ بیٹی، نہ بہو نہ کوئی نوکرانی ان کی ہمت، چستی اور صلاحیتوں کو اپنوں کے ساتھ ساتھ غیروں نے بھی خوب سراہا۔ ان کے کان برسوں سے ایسے جملے سنتے چلے آرہے تھے، جس میں کبھی ترس و ہمدردی ہوتی تو کبھی ستائش و توصیف ـــ تمہارے آنے سے یہ سلسلہ یک دم تھم گیا۔ نندیں، دیور اور سب رشتہ دار تمہارے گن گانے لگے کہ کس طرح تم نے آکر گھر سنبھالا۔ بوڑھی ساس کی خدمت کی وغیرہ وغیرہ ـــ انہیں تمہارا سراہے جانا اتنی بے چینی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا نہیں کررہا جتنا خود سے رشتوں کی توجہ کا کم ہوجانا ـــ انہیں یہ وہم لاحق ہوچکا ہے کہ تم انہیں ایک بے کار اور بے مصرف وجود بنا کر سب کو اپنا گرویدہ بنا چکی ہو۔ اپنے بچوں کی ہمدردی، ترس یا محبت، جو بھی کہہ لو، پھر سے حاصل کرنے کی خاطر وہ ایسا کررہی ہیں۔" رافعہ کی تفصیلاً گفتگو کے دوران اس کا سر مسلسل اثبات میں ہلتا رہا۔ رافعہ کے خاموش ہونے پہ وہ چونک اٹھی، پھر بولی۔

"تمہارا تجزیہ حرف بہ حرف درست مگر یہ تو طے ہے کہ اماں جی نہ تو کام کرنے سے باز آئیں گی اور نہ ہی رفیع یہ گوارا کریں گے کہ ان کی ماں روتی کراہتی، پیٹھ پہ ہاتھ رکھے کام کرتی پھریں۔" فائقہ مایوسی سے بولی۔

"تو کرتی رہیں۔ تم اپنی جان کیوں جلاتی ہو۔ بس تم ایسا کرو کہ ـــ" رافعہ اپنا چہرہ اس کے قریب لائی تو وہ فوراً ہمہ تن گوش ہو کر جی جان سے اس کا مشورہ سننے لگی۔

☆ ☆ ☆

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ معمول کے مطابق گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ کی نیند لے کر کمرے سے باہر آئی تو مشرق کی طرف سائے کافی لمبے ہوچکے تھے مگر جنوب کی طرف بنے مٹی کے چولہے پہ ہنوز تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چبھتی ہوئی دھوپ میں حمیدہ بی بی چائے کی پتیلی چڑھائے بیٹھی تھیں۔ وہ چائے کی بہت رسیا تھیں۔ ویسے تو روز فائقہ ہی عصر کے وقت انہیں چائے بنا کر دیتی تھی۔ اگر کبھی دیر سے آنکھ کھلتی تو حمیدہ بی بی خود ہی چائے بنا کر اس کا کپ پتیلی میں ڈھک کے رکھ دیتیں۔

"آؤ بیٹا! تم بھی چائے پی لو۔" چائے کپوں میں انڈیلتے ہوئے حمیدہ بی بی نے رفیع کو آواز لگائی جو گائے کے لیے کھل کا تھیلا گھر چھوڑنے آیا ہوا تھا۔

ماں کی آواز پہ رفیع نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تیز دھوپ کی وجہ سے ان کا چہرہ تپ کر سرخ ہوچکا تھا۔ پسینے کے قطرے جھریوں کی راہ سے بہتے ہوئے گریبان میں جذب ہورہے تھے۔

"نہیں اماں! میں بس چلتا ہوں۔ دکان پہ ساتھ والے لڑکے کو بٹھا کر آیا ہوں۔" رفیع نے ناراضی سے بھرپور ایک نظر فائقہ پہ ڈالی اور خود پنجوں کے بل بیٹھ کر گھڑے سے پانی بھر کر پینے لگا۔

"ارے رفیع! آجا۔ میں تامل کر، ماں جی کے ہاتھ کی چائے پیتے ہیں۔ سچ بہت مزے کی بناتی ہیں۔" فائقہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پہ بے فکری اور اطمینان تھا، جو رفیع کے ساتھ ساتھ حمیدہ بی بی کے لیے بھی اچنبھے کا باعث بنا۔

"اللہ! اماں جی! آپ کے ہاتھ میں بالکل میری امی کے ہاتھ والی تاثیر ہے۔ روم روم سے تھکن اتر جاتی ہے۔" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ بھرپور لطف لے کر بولی۔ ساتھ ہی رفیع کو بھی کپ اٹھا کر دیا۔

"ارے بیٹا! کہاں تمہاری اماں جوان خون والی اور کہاں میں بڈھی ـــ بیماریوں کی پوٹ۔ بس جو پکایا ریندھا، وہ جوانی تک ہی تھا۔ اب تو بس الٹے سیدھا ہاتھ ہی مارنا رہ گیا ہے۔" حمیدہ بی بی اپنے دوپٹے سے چہرے کو ہوا دیتے ہوئے بولیں۔ دھوپ کے ساتھ ساتھ آگ کی تپش نے بھی چہرے کو جھلسا کے رکھ دیا

تھا۔

"ارے اماں جی! اب کسرِ نفسی سے کام نہ لیں۔ رفیع! آپ خود بتائیں کیا آپ کو میری اور اماں جی کی چائے میں فرق نظر نہیں آتا؟" خاموشی سے گھونٹ گھونٹ بھرتے رفیع سے اس نے دریافت کیا۔

"وہی روز کا گھر کا دودھ، پتی اور چینی مگر اماں جی کے ہاتھوں کی محبت اور شفقت کی تاثیر کے آگے تو میری چائے ایسا جوشاندہ بن جاتی ہے جو غالباً" سخت بیماری میں جانوروں کو دیا جاتا ہے۔" محبت سے بولتے ہوئے اس نے رفیع کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا تو رفیع نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

حمیدہ بی بی کو اپنی چائے بے حد بدمزا و کسیلی لگنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ارے اماں جی! صبح صبح اتنی تکلیف کیوں اٹھائی آپ نے؟ صرف چائے بنا لیتیں۔ باقی کام میں خود کر لیتی۔" حسبِ معمول وہ نہا دھو کر فریش سی کچن میں آئی تو حمیدہ بی بی ناشتا بنانا شروع کر چکی تھیں۔

"باقی کام کب کرتیں؟ دن چڑھے تو تم میاں بیوی اٹھتے ہو۔ کیا سارا دن ہی یہی ناشتا چلتا رہتا۔" حمیدہ بی بی قدرے تپے ہوئے انداز میں بولیں۔

اس نے محسوس کیا تھا کہ اماں جی دن بدن چڑچڑی اور سرد مزاج ہوتی جا رہی ہیں۔ اپنے ہاتھ سے کیے کام کو وہ دوسروں کے سامنے پہلے بھی دس بار جتاتی تھیں مگر لہجے میں محبت کی مٹھاس ہوتی تھی۔ جیسے بہو کے کام خود سرانجام دیتے ہوئے انہیں کوئی روحانی و قلبی مسرت حاصل ہوتی ہو مگر چند ہفتوں سے ان کے مزاج میں کڑواہٹ سی گھلتی جا رہی تھی۔ وہ جب بھی مالش کرنے بیٹھتی، فوراً" ٹانگیں کھینچ لیتیں۔ بیٹوں سے بھی اب نروٹھے پن سے بات کرنے لگی تھیں۔

"ارے بھئی! ابھی تک ناشتا نہیں بنا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" کف کے بٹن بند کرتا رفیع اندر آیا اور فائقہ کو چارپائی پہ بیٹھا دیکھ کر حیرانی سے بولا۔ حمیدہ بی بی چائے تھرماس میں ڈال رہی تھیں۔

"آئیں رفیع! آج اماں جی کے ہاتھوں کے مزے دار بل دار پراٹھے کھاتے ہیں۔" ذرا سا کھسک کر رفیع کے لیے جگہ بناتے ہوئے وہ جوش سے بولی۔

"ہائیں! میں بڑھیا اب لرزتے کانپتے ہاتھوں سے چائے بنا سکتی ہوں، آٹا بھی گوندھ لیتی ہوں مگر پراٹھے نہیں بنائے جاتے۔" حمیدہ بی بی نے حیرانی سے فائقہ کو دیکھا۔

"پلیز اماں جی! آج مجھے بنا کر کھلا ہی دیں۔ جویریہ باجی سے آپ کے ہاتھوں کے بنے پراٹھوں کی اتنی تعریف سنی کہ دل میں ٹھان لیا تھا کہ ایک دن فرمائش کر کے آپ سے بنواؤں گی۔" وہ لاڈ سے بولی۔

"ہاں فائقہ! تم نے ٹھیک سنا۔ اماں جی کے ہاتھوں میں جادو ہے جادو۔ جو ایک بار ان کے ہاتھ کی بنی چیز چکھ لے تو تاحیات اس کا ذائقہ نہیں بھول سکتا۔" رفیع کے لہجے میں ماں کے لیے فخر تھا۔

"میں تو سیدھے پراٹھے بنا لیتی ہوں۔ بل دار نہیں بنتے۔" وہ لہجے میں خودترسی سموتے ہوئے بولی۔

"تو دلہن رانی! اپنی ماں سے یہ بھی سیکھ لیتیں۔ میں نے اپنی بیٹیوں کو ہر ہنر میں طاق کر کے ہی وداع کیا تھا۔" حمیدہ بی بی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولیں۔

"وہی تو... امی نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھ جیسی نالائق کو آپ ہی ٹھیک کر سکتی ہیں۔ ان شاء اللہ میں آپ سے ہر ڈش بنانا سیکھوں گی دھیرے دھیرے۔" وہ مؤدب ہو کر بولی تو رفیع کو بیوی کا یہ انداز بے حد بھایا تھا۔

"اب کہاں سے سیکھنا سکھانا۔ اب تو صرف چل چلاؤ کا وقت ہے۔" حمیدہ بی بی یاسیت سے گہرا سانس بھر کر بولیں۔

"ارے نہیں اماں جی! اب ایسی باتیں کر کے آپ مجھ سے جان نہیں چھڑا سکتیں۔ اپنے سب بچوں کو اپنے ہاتھ کے پراٹھے کھلائے تو کیا میں آپ کی بچی نہیں؟" وہ بچوں کے سے انداز میں منہ بسور کر بولی تو

رفیع کے چہرے پہ بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔
"کیوں نہیں بنا کر کھلائیں گی۔ آج کئی سالوں بعد تو من پسند ناشتا نصیب ہو رہا ہے۔ ورنہ تو روز کے تمہارے بار بار پراٹھے اور شیرہ چائے۔" رفیع اس کے چہرے کو شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
حمیدہ بی بی نے کھا جانے والی نظروں سے ہنستے مسکراتے بیٹے، بہو کو دیکھا اور پیڑا بنانے لگیں۔



آج کل انہیں جی بھر کر غصہ آیا ہوا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اپنا غصہ اور جھنجلاہٹ نکالیں کس پر؟ فائقہ پر یا رفیع پر۔ جس نے ان کی باتوں پہ توجہ دینے کے بجائے بیوی کا پلو تھام لیا تھا۔ اب نہ تو اسے بوڑھی ماں کا کام کرنا نظر آتا تھا اور نہ ہی پہلے کی طرح وہ فائقہ کو ڈانٹا ڈپٹتا۔ بس بیوی کے ساتھ مل کر ماں کی عظمت اور ہمت کے گن گائے جاتے۔ وہ شدید بے چینی کا شکار تھیں۔ فائقہ کے تیور الگ حیران کیے دے رہے تھے۔ وہ مزے سے جتنا بن پڑتا کام نمٹاتی، باقی ان پر چھوڑ دیتی۔ کام تو وہ پہلے بھی کرتی تھیں مگر اب فائقہ کا ہر وقت ان کے قصیدے پڑھنا سخت غصے میں مبتلا کر دیتا۔
انہیں صاف علم تھا کہ فائقہ جان بوجھ کر صبح دیر سے اٹھتی ہے تاکہ وہ ناشتے کی تیاری شروع کر چکی ہوں۔ سہ پہر کو بھی دن ڈھلے اٹھتی، جب وہ چائے چولہے سے اتار چکی ہوتیں۔ بیٹے کو بھی صاف لفظوں میں زن مریدی کا طعنہ دیا۔ بیٹیوں اور دامادوں کے سامنے اپنی بے بسی اور لاچاری پہ خوب خوب آنسو بہائے مگر بہو بیگم نجانے کس مٹی کی بنی تھیں۔ مجال ہے جو کسی بات کا اثر لیا ہو۔
موسم نے انگڑائی لی تو انہوں نے رضائیوں کے غلاف اتار کر سرف میں بھگو دیے۔ ارادہ شام کو دھونے کا تھا۔ ساتھ والی زرینہ ان سے اچار ڈالنے کا طریقہ پوچھنے آ گئی۔
"ٹھہرو! میں تمہیں تسلی سے طریقہ بتاتی ہوں۔ پہلے اپنا کام نمٹا لوں۔" حمیدہ بی بی ٹنکی سے پانی سے بھر بالٹی اٹھا کر آئیں اور دھوپ میں رکھے ٹب میں بالٹی انڈیل دی۔ پھر زرینہ کے ساتھ چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے لمبے لمبے سانس لینے لگیں۔ اپنی طاقت سے زیادہ وزن اٹھانے پر وہ ہانپ سی گئی تھیں۔
"خود کیوں کپڑے دھو رہی ہیں؟ بہو آپ کو دھو کر دیتی۔" زرینہ نظروں میں ترحم لیے ہوئے بولی۔
"ارے بچی! بس کیا میرے منہ سے سنتی ہو۔"
ابھی ان کی بات ادھوری ہی تھی کہ فائقہ ادھر آ گئی۔
"ارے زرینہ باجی! آپ کب آئیں؟" وہ خوش اخلاقی سے ہمسائی کا حال چال پوچھنے لگی۔
"اور اماں جی! یہ رفیع کا رومال، مفلر اور جرابیں ہیں۔ آپ انہیں بھی اپنی رضائی کے ساتھ بھگو دیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی چیزیں آرام سے حمیدہ بی بی کی طرف بڑھائیں تو انہوں نے زرینہ کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں "دیکھ لو! میری بہو کا حال"
"زرینہ باجی! بس کیا بتاؤں آپ کو۔ اللہ ہر مسلمان بہن، بیٹی کو میری اماں جی جیسی ساس دے۔ میری تو ساس نہیں بلکہ سگی ماں کی طرح ہیں۔ دیوار پار سے آپ کی ساس کے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں سنتی ہوں تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں، جس نے مجھے اماں جی جیسی شفیق ہستی کا ساتھ نصیب کیا۔" اس نے محبت سے گیلے ہاتھ پونچھتی حمیدہ بی بی کو دیکھا جن کے چہرے پر ان توصیفی جملوں کا کوئی خاص اثر نہ دکھائی دے رہا تھا البتہ زرینہ خوب متاثر ہوئی تھی۔
"ہاں فائقہ! اب حمیدہ ماسی جیسا کون ہو سکتا ہے۔ میری ساس میں تو انسانوں جیسی کوئی بات ہی نہیں۔ پوری ڈائن ہے۔ نہ پیٹ بھر کر روٹی دیتی ہے اور نہ ہی میکے جانے دیتی ہے۔" زرینہ اپنے دکھڑے رونے لگی۔
"سچ! میں تو بہت خوش نصیب ہوں۔ اماں جی بالکل مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتی ہیں۔ میرے آرام کا اتنا

خیال رکھتی ہیں کہ کیا بتاؤں۔ میرے ہاتھ لگانے سے قبل ہی وہ بیسیوں کام کر چکی ہوتی ہیں۔ ہر کام اتنا دل لگا کر اور صفائی سے کرتی ہیں کہ رفیع کو تو میرے ہاتھ کا کوئی بھی کام پسند نہیں آتا۔ اب جیسے صبح جاتے ہوئے کہنے لگے کہ اماں سے میرا رومال اور جرابیں دھلوا لینا۔ ان کے دھلے کپڑوں سے خوشبو آتی ہے۔ جناب کو میرے ہاتھ کا کھانا پسند آتا ہے اور نہ کچھ۔ آخر میں پھوہڑ اور نکمی بھلا اماں جی جیسی نفاست اور سلیقہ کہاں سے لاؤں؟" محبت سے بولتے ہوئے اس نے حمیدہ بی بی کے گلے میں لاڈ سے بانہیں ڈال دیں تو حمیدہ بی بی جبراً مسکرا دیں۔
زرینہ ساس بہو کی محبت اور ہم آہنگی سے ازحد متاثر دکھائی دے رہی تھی۔



"بہو! اگر مشین لگا رہی ہو تو میرے اور سمیع کے کپڑے بھی دھوتی جانا۔" حمیدہ بی بی نے اسے صابن کاٹتے دیکھ کر کہا اور اندر جا کر میلے کپڑے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر لے آئیں۔
"جی اماں جی! مشین تو لگا رہی ہوں مگر سارے کپڑوں کا آج دھلنا ناممکن ہے۔ آپ دیکھ تو رہی ہیں بجلی صبح سے گئی ابھی تک نہیں آئی۔ آپ ایسا کریں، خود تھال میں دھو لیں۔ جیسے پہلے دھوتی آ رہی ہیں۔" وہ آرام سے بولی۔
"نہ میں کیوں تھال میں دھولوں۔ تم مشین کس لیے لگا رہی ہو۔ صرف اپنے اور اپنے شوہر کے کپڑوں کے لیے۔ میں اور میرا بیٹا کوئی سوتیلے ہیں۔ تمہارے وہ کچھ نہیں لگتے یا میں نے تمہیں چولہا الگ کر کے دے دیا ہے؟" وہ اس کے سر پر کھڑی ہو کے غصے سے بولیں۔
"آپ خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہیں۔ میں نے بس اس لیے کہا ہے کہ آپ خود ہی تو کہتی ہیں کہ سمیع کو ہاتھ سے دھلے کپڑے پسند ہیں۔ میری مشین ٹھیک طرح سے میل نہیں نکالتی۔" اس نے کوشش کی کہ اس کا لہجہ طنزیہ نہ ہو مگر پھر بھی حمیدہ بی بی سلگ اٹھیں۔
"بکواس کی تھی میں نے۔ اور مجھے یہ بتاؤ کیا ماں نے تمہیں یہی تربیت دی تھی کہ بوڑھی ساس ہڈیاں چٹخاتی کام کرتی پھرے۔ روٹیاں بیلے، کپڑے دھوئے اور تم چارپائی پہ بیٹھ کے مزے کرو۔" حمیدہ بی بی خوب چبا چبا کر بول رہی تھیں۔ فائقہ کا پرسکون انداز انہیں آگ لگا رہا تھا۔
"وہ سارے کام تو آپ خود اپنی خوشی سے کرتی ہیں۔ بلکہ میرا خیال کرتے ہوئے کہ اتنے ڈھیر سارے کام مجھے تھکا نہ دیں۔" صابن کے ٹکڑے تھیلی میں ڈالتے ہوئے وہ معصومیت سے بولی۔
"بہو کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ساس کے آرام کا خیال رکھے، نا کہ ساس کا کہ وہ بہو کو چارپائی پہ بٹھا کے کھلائے۔ غضب خدا کا کیا اس لیے میں ہزاروں خرچ کر کے بہو بیاہ کر لائی تھی کہ بڑھاپے میں دیگچیاں کھڑکاتی رہوں۔" حمیدہ بی بی اب اپنی چارپائی پہ بیٹھ کے غصہ نکالنے لگیں۔
"اپنی بہن رابعہ کو دیکھو بھرے پرے سسرال کو اٹھا رکھا ہے اور تم سے دو بندوں کا کام نہیں ہوتا۔" بولتے بولتے معاً حمیدہ بی بی کو احساس ہوا کہ فائقہ بالکل خاموش ہو گئی ہے۔ نظر اٹھا کے دیکھا تو حیران رہ گئیں۔ فائقہ دبی دبی سی ہنسی ہنس رہی تھی۔
"یہ اتنا مسکرایا کس بات پہ جا رہا ہے۔ میں کوئی پاگل خبطی ہوں جو لطیفے سنا رہی ہوں۔ میں کہے دے رہی ہوں۔ میرے اور میرے بیٹے کے کپڑے دھل کر استری شدہ میرے کمرے میں پہنچ جانے چاہئیں۔ آج تو خود کپڑے دے دیے مگر آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ بہو ہو تو اپنی ذمہ داری پوری نبھانی ہو گی۔" حمیدہ بی بی انگلی اٹھا کر حکیمہ انداز میں بولیں تو اس کی ہنسی بے ساختہ قہقہے میں بدل گئی۔
"جی اماں جی! ایسا ہی ہو گا۔" وہ اپنی ہنسی پہ قابو پاتے ہوئے تابع داری سے بولی پھر مطمئن سی کپڑے اٹھا کر اندر آ گئی۔ اور حمیدہ بی بی حیران سی وہیں کھڑی رہ گئیں۔

سمیرا حمید

خانۂ عنکبوت

"یہ بارش کب ختم ہوگی اماں! تین دن ہونے کو آئے ہیں۔ کتنے پہر بیت گئے ہیں۔ اندھیرا چھایا ہے، صبحیں، دوپہریں... شامیں ایک سی لگتی ہیں... اندھیرے سے اٹی۔"

خدیجہ نے کچھ اماں کو سنایا، کچھ صرف خود کو۔ سوال اماں سے بھی تھا اور خود سے بھی، جیسے تمہیں دوپہر شاموں سے کیا خدیجہ... اس نے ان گھرے سیاہ بادلوں کا سا سانس لیا، جو کبھی برس کر نہیں دیتے اور گرج کر اندھیرا پھیلا کر تن فن کرتے پھیرتے ہیں۔ اگر دن کی روشنی بھی دکھائی نہ دے۔ سورج کی موجودگی، گمشدگی کا پتا نہ چلے... اور...

"روٹی کب بناؤ گی؟" اماں اسے سن ہی کہاں رہی تھیں۔ بہت سنیں ایسی باتیں، بہت پوچھیں، بہت کیں، بہت ہوئی بس اب۔

گھر میں موجود دوسری واحد عورت کے اس سوال اندر جواب پر وہ دنگ سی رہ گئی۔ روٹی کا سوال، روٹی کا جواب، روٹی کی ہی بات بس۔

وہ روٹی بنانے کے لیے اٹھ گئی۔

سفید اجلی قلعے سی دیواروں اور قلعے سے گھر میں مسلسل برستی بارش اور سیاہی پھیلاتے بادلوں سے گھٹن ہو رہی تھی۔ اسے ان سے شکایت تھی۔ اس بند گھر پر وہ آسمانی پہرے دار سے تھے۔ ان کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ اس کی پیاری، چمکیلی، کھلی کھلی، نکھری چمک کر پھیلی دھوپ کو چھین کر اسے اندھیروں میں غرق کیے رکھیں؟

"کوئی بتاتا کیوں نہیں... یہ حق ان سب کو کس نے دیا؟"

ابا کے گھر وہ اسی بارش میں نہا لیا کرتی تھی۔ تب وہ دن کے اجالے کے لیے اتنا نہیں تڑپا کرتی تھی۔ ابا بھی سخت تھے، پر وہ چھپ کر چھت پر چلی جایا کرتی تھی اور اڑنے والے پرندوں کو دیکھ کر تالیاں بجایا کرتی تھی۔ اسے کبھی ستارے اچھے نہیں لگے، کیونکہ وہ کبھی ستاروں بھرے چھاتے تلے آئی ہی نہیں تھی۔ بس اسے رات سے خوف آتا تھا اور رات میں آنے والی ہر چیز سے... رات میں من و سلویٰ بھی اس کے لیے اتارا جاتا تو وہ اس سے بھی خوف کھاتی، اس متبرک غذا کو نہ کھاتی... ابا رات کو ہی گھر آیا کرتے تھے۔

شوہر کے گھر وہ اسی بارش پر کڑھنے لگی۔ بادل گرجتے تو وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی۔

"بچی ہو کیا... ایسے کیا ڈر جاتی ہو؟" ارشد کہتے کروٹ بدل کر سو جاتے۔

وہ چپ رہتی۔ خود بھی نہ جان سکی کہ وہ بہانے بنا کر ڈرتی ہے۔ الزام کبھی اس پر لگایا، کبھی اس پر۔ کبھی ماچس کی تیلی کی آگ سے جلی اور کبھی خواب میں ڈر کر روئی۔ اس نے رونے ڈرنے کے کئی اور راستے تلاش کر لیے۔ کیوں...؟ شاید وہ اپنی قسمت پر کھل کر رونے سے ڈرتی تھی۔

وہ ارشد سے نہیں ڈرتی تھی لیکن گھر میں ارشد کے ہونے سے ڈر جاتی تھی۔ جیسے شام ہوتے ہی وہ ابا کے آنے سے ڈرا کرتی تھی۔ دونوں نہیں مارتے تھے۔ دونوں ہی کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔ دونوں ہی اس کے قریبی تعلق دار، حقوق دار، فرائض دار تھے۔ پھر وہ ان سے کیوں ڈرتی تھی؟

●

دونوں نے ہی اپنی مرضی سے اس کے گرد مذہب کا دائرہ کھینچا تھا۔ ارشد اس دائرے کو تنگ سے تنگ کرتا جا رہا تھا۔ وہ قرآن و حدیث پڑھتا تھا اور اپنی ہی مرضی کے مطلب نکالتا تھا۔ وہ بھی وہی کتابیں پڑھتی تھی اور اسے وہ کتابیں بہت صاف صاف سیدھی سیدھی لگتی تھیں۔

سچی... کھری... کھلے آسمان کی طرح وسعت لیے... پرہیزگار مومن کی سی روشن نور لیے۔

لیکن اس کا آسمان بند تھا۔ بند کر دیا گیا تھا۔ اس کی روشنی اندھیرا کر دی گئی تھی۔

وہ قلعہ بند گھر میں زوجہ بنی تنگ سے تنگ ہوتے دائرے میں گھٹ رہی تھی۔

وہ عبدالکریم کی بیٹی تھی۔ وہ ارشد صدیق کی بیوی بنا دی گئی تھی۔ وہ خدیجہ نہیں تھی۔ ایک عورت، ایک انسان ہی، دو پیروں والی، دو آنکھوں والی... آنکھیں جنہیں اڑتے پرندے بہت پسند تھے۔ آنکھیں جو پرندوں کے پروں کے ساتھ لپٹ جانا چاہتی تھیں اور جو ان سب اڑنے والے کھلے روشن وسیع آسمان تلے چہلیں کرتے آزاد ہنسوں کے ساتھ ساتھ اڑ کر رب عظیم کی بنائی رنگ برنگی دنیا کے رنگ اکٹھے کرنا چاہتی تھی۔

لیکن اب تک اس کے ہاتھ ایک ہی رنگ لگا تھا۔ "مان لینے کا"

غلط درست بس مان لینا، بند رہنا، خود کو بند رکھنا۔ عبدالکریم کے گھر... ارشد صدیق کے گھر... ماں



اونچے برآمدے کے نیچے کھڑا تھا۔ وہ باورچی خانے سے نکل کر برآمدے کے ستون کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ برآمدے میں ہی بچھے تخت پر سے اماں نے لیٹے لیٹے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا چاہیے منے؟"

وہ ایسے کھڑا تھا جیسے نماز کے لیے نیت باندھنے جا رہا ہو۔

"آپا جی! بھائی جی نے کہا ہے ان کی الماری میں سب سے نیچے والے خانے میں نیلے رنگ کی چھوٹی سی کتاب ہے۔" اس نے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اٹھا کر

کی کوکھ سے لحد تک... یہی فرض تھا جیسے فرض کردیا گیا تھا۔ یہی نصیب تھا اسے ہی نصیب بنا دیا گیا تھا۔

خدیجہ عبدالکریم کیا کرسکتی تھی؟ خدیجہ ارشد کیا کرسکتی ہے؟ حکم کی تعمیل کررہی ہے۔ آسمان کو صحن سے دیکھ لیتی ہے۔ اڑتے پرندوں سے نفرت کرنے لگی ہے۔ ایسے گھر میں جس کی وسعت میں باہر انسانوں کا شور بھی اندر نہیں آسکتا' وہ اپنے نہیں کے سناٹے پر بلبلانے لگی ہے۔

"کیونکہ اور کرہی کیا سکتی ہے۔"

ایک دن بغیر پروں والا سریلا پھرپھر اڑنے والا ننھا ابابیل ان کے گھر میں آیا۔

"یہ بچہ بھیجا ہے ارشد نے دکان سے... کچھ لینے آیا ہے۔" سر جھکائے آئے' کہہ کر چلے گئے۔

بچہ اجنبیت اور نئے پن سے ذرا سا سہما' دو سیڑھی پھیلا کر بتایا۔ "رکھی ہے' وہ مجھے دے دیں۔"

"کتنی چھوٹی؟" خدیجہ نے برآمدے کے ستون کے ساتھ ٹک کر اس کی طرف شرارت سے دیکھا۔

"اتنی چھوٹی۔" اس نے پھر ہاتھوں کے اشارے سے بتایا۔

"اتنی...؟" خدیجہ نے زیادہ بڑے ہاتھ پھیلا کر پوچھا۔

"نہیں آپا جی! اتنی بڑی نہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اتنی سی ہے۔ بس وہی لانا' وہ ناراض ہوں گے پھر۔"

خدیجہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے اوپر کیا اور اسے اندر کمرے میں لے گئی۔

"نام کیا ہے منے کا؟" خدیجہ نے اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ گردن اٹھا کر اونچی چھت کو دیکھنے لگا جس پر چاک سے نقش نگاری کی گئی تھی۔

"محمد ابوبکر جلیل۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ اجنبیت جاتی رہی۔

"کہاں سے آئے ہو۔"

"اپنے گھر سے ارشد بھائی کی دکان پر' پھر یہاں۔"

وہ ہنسی۔ "ہمارے گھر کیوں آئے بھلا؟"

"کتاب لینے آپا جی؟" اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"یہ والی کتاب؟" وہ الماری کھول کر کھڑی ہوگئی۔

"یہ تو کالے رنگ کی ہے آپا جی! ارشد بھائی نے کہا تھا نیلی والی ہی لانا۔" وہ سمجھ رہا تھا کہ آپا بے چاری کم عقل ہے' بات سمجھ نہیں رہی۔

"اچھا یہ ہوگی پھر؟"

"یہ تو اتنی بڑی ہے اور یہ نیلی بھی نہیں۔"

"پھر یہ ہوگی۔" اس نے مطلوبہ کتاب نکال کر دکھائی۔ وہ کرسی سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

"ہاں یہی... دیکھا مل گئی نا آپا جی!"

اس کی پیاری میٹھی شفاف آواز پر خدیجہ جیسے فدا سی ہوگئی۔

"ہاں مل گئی۔" اس نے اس کے گالوں کو چھوا۔

چند دن گزرے' وہ پھر آیا۔

"ایک اور اتنی چھوٹی سی کتاب تو نہیں ہے ہمارے گھر۔" خدیجہ نے ہاتھ سے اشارہ کرکے کہا۔

"میں تو میٹھا لینے آیا ہوں آپا جی!" وہ ڈر کر صفائی دینے لگا۔ میٹھا وہ تیار کرچکی تھی۔ ارشد نے ابا جی کو دکان سے فون کردیا تھا۔

"تمہارے کپڑوں پر کیا لگا ہے ابوبکر!" وہ اس کی انگلی تھام کر اسے باورچی خانے میں لے آئی۔

"آتے ہوئے میں گر گیا آپا جی! آپ کی گلی کے نکڑ پر... کیچڑ تھا وہاں... اماں مجھے مارے گی اب... میں نے کپڑے گندے کرلیے ہیں نا۔"

"گرے کیسے؟" وہ ہاتھ سے اس کے کپڑے جھاڑنے لگی۔ "دیکھ کر نہیں چلتے کیا' گندے بچے ہو گیا۔"

"میں غبارے والے کو دیکھ رہا تھا آپا جی!" کہہ کر وہ مسکرانے لگا۔

"غبارہ لینا تھا کیا۔" کپڑا گیلا کرکے وہ کپڑوں پر لگا کیچڑ صاف کرنے لگی۔

"دو روپے تو میں نے اسکول میں ہی خرچ کردیے تھے۔" اب اس نے منہ بسور لیا۔

"تو پھر غبارے والے کا کیا کرنا تھا؟"

"غبارے دیکھنے تھے۔" اس کا نچلا ہونٹ لٹک گیا۔

"خالی خولی دیکھ کر کیا کرتے؟" خدیجہ کے اندر بھی بہت کچھ لٹک گیا۔

"بڑا مزا آتا ہے آپا جی! ایک لڑکی نے پورے تین غبارے لیے۔ میں بھی کل پورے چار غبارے لوں گا۔ لال' نیلا اور ہرا' ایک پیلا' لال دو لوں گا۔" وہ انگلیوں پر گننے لگا۔

"تم پورے پانچ لینا۔" خدیجہ نے اس کے گال پر چٹکی بھری۔

"جب میں گرا تو سب ہی بچے ہنسنے گے۔" اسے اپنے گرنے کا دکھ یاد آیا۔

"نہیں معاف کردو۔" خدیجہ نے اسے بہلایا۔

"آپ کی ہی گلی کے بچے ہیں آپا جی! آپ ان سب کو ماریے گا۔"

"میں کیسے ماروں۔" وہ خود مار کھائی نظر آنے لگی۔

"اپنے گھر بلا کر... یا ان کے گھر جا کر... میری جمیلہ باجی ایسے ہی کرتی ہیں۔ بہانے سے بلالیتی ہیں پھر کان کھینچتی ہیں۔"

"جمیلہ باجی اچھی والی باجی ہیں نا۔"

"آپ اچھی نہیں ہیں کیا؟"

اس کی نظریں باورچی خانے کی کھڑکی سے ہوتی ہوئی پھیلے ہوئے صحن کے گرد بنی دیواروں میں الجھ گئیں اور آم کے پھیلے ہوئے درخت میں بھی' جس کی شاخیں کبھی دیوار کے اس پار نہیں جاسکی تھیں اور جس کی کچی کیریاں کبھی میٹھے رسیلے آم نہیں بنی تھیں۔

"نہیں۔" اس کے منہ سے نہیں ایسے نکلا جیسے عمر خیام کی رباعی نے آہ بھری ہو' جو اس نے روح پارے لکھ کر جلا ڈالی ہو۔ جیسے نظر بند کیے قیدی نے دہائی دی ہو۔ جیسے تابوت میں کیل گڑی ہو۔

خدیجہ نے اسے انڈوں کے حلوے کا ڈبا پکڑایا اور جانے کے لیے کہا۔

انڈوں کا حلوہ رات واپس بھی آگیا۔

"پکانا بھول گئی ہو کیا؟" ارشد غرائے۔

وہ لکڑی کی سیاہ منقش الماری کھول کر کھڑی ہوگئی۔ بھول گئی کیا تلاش کرنا تھا۔ اکثر بھول جاتی تھی۔

"گھر میں رہتی ہو۔ کھانا پکانا تو ڈھنگ سے پکایا کرو نا... ہم مردوں کا ہی کمال ہے۔ باہر کے ہزار بکھیڑے کس طریقے سے نپٹاتے ہیں۔ تم جیسوں کے ہاتھوں میں نظام ہو تو دنیا اجڑ بکھڑ جائے دنوں میں ہی۔"

ارشد بہت دیر تک عورتوں کے نقصانات اور مردوں کے فوائد گنواتا رہا۔ خدیجہ حسب عادت سنتی رہی۔ سنتی ہی آئی تھی۔ زبان پریاں نے تالا لگایا تھا اور چابی اسی کے ہاتھوں گم کروادی تھی۔ تو اب کیسے بول لیتی' اس نے مان لیا کہ بہت نقصان ہے عورت ہونے میں' کوئی فائدہ نہیں' ورنہ وہ گھاٹے میں نہ جا رہی ہوتی۔ جس رتبے پر اسے بنایا ہے' اس رتبے کو کوئی ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تو... گھاٹا ہی ہوا نا۔

☼ ☼ ☼

"یہ ابوبکر کون ہے؟" بہت دنوں بعد وہ پوچھ سکی۔

"چھوٹے موٹے کاموں کے لیے رکھا ہے دکان پر۔ اس کی اماں سے اچھی دعا سلام ہے۔ کہنے لگی اسکول کے بعد ادھر ادھر گھومتا رہتا ہے۔ میں دکان پر بٹھا لیا کروں۔"

"اتنا چھوٹا سا تو ہے' کیا کام کرے گا؟"

"کام کیا کرتا ہے۔ بس بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی گز پکڑا دیا۔ کبھی تھان' دکان کی صفائی بھی کردیتا ہے' سوچا گھر

سے کھانا لے آیا کرے گا۔ اباجی کو بھی سکون ہو جائے گا۔"

سکون کہیں اور ہوا تھا۔

"روز ہی کھانا لے جایا کرے تو ٹھیک ہے نا۔ اباجی کیوں ضد کرتے ہیں۔ کھانا لے جانے کی۔" خدیجہ نے کسی قدر مسرت سے کہا۔

"اباجی سنتے ہی نہیں۔۔۔ کہتے ہیں چہل قدمی ہو جاتی ہے۔" ارشد بے زار سا بولا۔ "خیر آیا کریں تو ٹھیک ہے، ورنہ ظہر کے وقت تو میں اسے بھیج ہی دیا کروں گا۔"

وہ ظہر کبھی کبھی آیا کرتی، جب وہ آیا کرتا۔ وہ اسے باورچی خانے کے اسٹول پر بٹھا لیتی۔ کھانا باندھتے دیر کر دیتی۔ اس سے باتیں کیے ہی جاتی، سوال پر سوال پوچھے ہی جاتی۔

اس کی عمر سات سال سے تھوڑی زیادہ تھی۔ پلکیں اور بھنویں اتنی گھنی تھیں کہ اس پر کسی نوجوان لڑکے کے ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ تیز تیز جلدی جلدی بولتا۔ تاکہ فٹ اگلی بات کر سکے اور اس کے بعد فٹ اس سے اگلی اور باتیں ایسی تھیں جیسے ایک ننھا فرشتہ روز شہر کے اوپر پرواز کرتا ہے اور نت نئی باتیں سیکھ کر دیکھ کر آتا ہے۔ ننھے فرشتے، ننھے ابابیل کی پرواز کی کہانی اس کی گھٹن کے لیے تریاق بنی۔ آسکر وائلڈ کے شہزادے کی مانند وہ اسے پرواز کے لیے بھیجتی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ یہ سب اپنے لیے کرتی، ابوبکر اسے کھلا کھلا آسمان لگنے لگا۔ وہ اسے نت نئی باتیں سناتا بازار کی، دکان پر آنے والی عورتوں کی، گلیوں کی، اپنے اسکول کی۔

اپنے گھر، کھیل کے ساتھیوں کی بھی۔

خدیجہ ایسے کرید کرید کر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل پوچھتی جیسے اسے ست رنگی دوپٹا رنگنا ہو اور ہر ہر رنگ کی پہچان کر رہی ہو۔ وہ لکڑی کے اسٹول پر آنکھیں مٹکا کر گھما کر کچھ ایسی باتیں کرتا۔

"ان کے بٹوے پر پہلے میری نظر پڑی آپا جی!"

"اچھا۔۔۔ تمہاری ہی کیوں بھئی۔" وہ ایسے ہی سوال کرتی۔

"باقی سب گاہکوں کے ساتھ لگے تھے۔ ایک میں ہی فارغ بیٹھا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ اپنا بٹوہ بھول گئی ہیں، میں نے بھاگ کر بٹوہ اٹھایا اور ان کے پیچھے بھاگا، بھاگا، بھاگا، اتنا بھاگا کہ مجھے لگا میں مر ہی جاؤں گا لیکن بٹوے والی خالہ جی مجھے کہیں نظر نہیں آئیں۔"

"وہ کسی اور دکان میں چلی گئی ہوں گی۔"

"بھاگتے بھاگتے اتنی دکانیں بھی تو دیکھ لی تھیں۔"

"بھلا کون کون سی دکان دیکھی تھی تم نے؟" خدیجہ کبھی بازار نہیں گئی تھی۔ ارشد کی دکان بھی نہیں دیکھی تھی۔

"کپڑوں، جوتوں، برتنوں کی آپا جی۔۔۔ بہت دکانیں دیکھیں۔"

"ہار سنگھار کی دیکھی؟"

"وہ تو بازار کے آخری نکڑ پہ ہے۔ خالہ جی وہاں کہاں اتنی دور جا سکتی تھیں۔"

"اچھا جوتوں کی دکان کس طرف ہے۔ وہ بھی نکڑ میں ہے؟"

"جوتوں کی تو کتنی ہی دکانیں ہیں۔ تین ہماری دکان کے ساتھ، دو سامنے، ایک بہت بڑی دکان ادھر بڑی سڑک کی طرف، جہاں پھلوں کی ریڑھیاں لگتی ہیں اور رکشے کھڑے ہوتے ہیں۔"

"تمہیں سب دکانوں کا پتا ہے ابوبکر!" وہ حیران ہوئی۔

"جی آپا جی! بازار میں بہت دکانیں ہیں، بہت۔۔۔ کل تو ضرور ہی گنوں گا ساری دکانیں۔ آپا جی! آپ کس دکان سے کپڑے جوتے لیتی ہیں۔"

"میرے جوتے کپڑے گھر میں آجاتے ہیں۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

وہ کھی کھی کرنے لگا۔ "آپ کو بازار جانے سے ڈر لگتا ہے۔"

"وہ خالہ جی پھر کہاں ملیں؟" وہ اتنے سے بچے کے سوال سے ڈر گئی۔

"وہ۔۔۔ ہاں وہ جب میں تھک کر دکان پر واپس گیا تو وہ دکان میں بیٹھی تھیں۔ مجھے کہتی ہیں، کیا گھر تک دینے گئے تھے۔ مجھے کیا پتا ان کا گھر کہاں ہے۔" ہاتھ سوالیہ لہرا کر اس نے پوچھا۔

"گھر کا پتا ہوتا تو چلے جاتے؟" خدیجہ کو اس پر رشک آیا۔

"ہاں چلا جاتا۔ میری اماں کہتی ہیں میں بدروح ہوں، جو ہر جگہ چلی جاتی ہے۔" وہ کھی کھی کرنے لگا۔

"ہر جگہ جانے کے لیے بدروح ہو جانا بھی ٹھیک ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"خدیجہ! دیر ہو رہی ہے اس منے کو کھانا دے دو۔ اس کا سر کھانا چھوڑ دو۔ شمسہ اور فائزہ کی بھی یہی عادت تھی۔ آس پڑوس سے کوئی بچہ، بچی آجاتے تو گھنٹہ گھنٹہ ان کا سر کھاتیں۔ یہاں کی پوچھ، وہاں کی پوچھ، نہ جانے تم لڑکیاں کرید کی ہی مٹی سے کیوں بنی ہوتی ہو۔" اماں دیر تک بڑبڑانے والی تھیں اب۔

"اور اپنا نام نہیں لیا ارشد کی ماں۔" اباجی اپنے کمرے سے مومی کاغذ کی نایاب مسلم بخاری کی کتابیں لیے نکلے۔ آج وہ ایک ایک کتاب کو دھوپ لگا رہے تھے۔ سارا دن ان کتابوں کے سرہانے بیٹھے رہتے تھے کہ مومی کاغذ پر کوئی چڑیا، کوا، کبوتر چونچ نہ مار جائے۔ بلی کا دھڑکا بھی لگا رہتا تھا کہ کتابوں پر پھدکنے پھلانگنے نہ لگے۔ تیز ہوا چلے، کاغذ پھڑپھڑا جائے تو یہ دھڑکا الگ سے، خود وہ وضو کر کے دو انگلیوں کی پوروں سے احتیاط کے ساتھ مومی کاغذ پکڑتے اور الٹتے تھے۔ ارشد بھی ایسے ہی کرتے۔ جی جان سے زیادہ کتابوں کی حفاظت کرتے تھے۔

باورچی خانے کی برآمدے کی طرف بنی جعفری کے گول گول دائروں سے خدیجہ نے ایک گہرے سائے کو اماں کے وجود پر لپک کر آتے اور جاتے دیکھا۔ وہ بلاوجہ گاؤ تکیہ ٹھیک کرنے لگی۔ کبھی شمسہ، فائزہ، خدیجہ، وہ بھی تھیں، پرواز کا شوق انہیں بھی رہا تھا۔ کھلے آسمان پر پرندوں کی پروازوں پر انہوں نے بھی تالیاں بجائی تھیں۔ ہاں کبھی انہوں نے بھی زندگی کے لیے سانسیں لی ہوں گی۔ اب وہ زندہ رہنے تک ہی سانس لیتی تھیں۔

خدیجہ نے ابوبکر کو کھانا دے کر رخصت کیا اور برآمدے کے ستون کے ساتھ کھڑی ہو کر آم کے درخت کو دیکھنے لگی۔ کس شان سے چڑیاں پھر پھر پھدک رہی تھیں درخت پر۔۔۔ کتنی خوش تھیں وہ اور کیوں خوش نہ ہوتیں، انہوں نے وہ مرثیہ نہیں سنا ہو گا جس پر مرثیہ نگار خود بہت رویا ہو گا۔

"زندہ انسانوں کی مردہ زندگیوں کا۔"

ڈھائی سال ہو گئے تھے اس کی شادی کو۔۔۔ صرف دوبار ڈاکٹر کے پاس لے جائی گئی۔ پھر ارشد نے کہا۔

"دعا کرو۔"

اور اماں دعا کرنے لگی۔ اس کی اماں، بڑی بہنیں بھی، جٹھانی بھی۔

"ڈاکٹر صاحبہ نے کہا تھا کہ کورس پورا ہو جائے گا تو۔۔۔" ڈرتے ڈرتے ہی اس نے اتنا کہہ ضرور دیا تھا۔

"ہزار جتن کر کے لے کر جاتا ہوں۔ بس بہت ہوئی۔"

"برقع میں تو ہوتی ہوں، جتن کیسے؟" اس کی آواز بھیگ گئی، کانپ گئی۔

"سو طرح کے لوگوں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اولاد مل جائے گی، بات ختم۔"

"خدا تو اور بھی بہت کچھ چاہتا ہے اس کا کیا۔" وہ کہہ نہ سکی۔ ڈر گئی۔ ساری رات باورچی خانے کی جعفری سے لگ کر روتی رہی۔

دو دن بعد ابوبکر آیا تو ہاتھوں میں نمک پارے تھے۔

"یہ کہاں سے ملے۔" اس نے اسے پلیٹ دی اور خود بھی اس کے ساتھ کھانے لگی۔

"آپ کے ساتھ والے گھر سے آپا جی!"

"کون سے ساتھ والے گھر سے؟" دونوں برآمدے کی دوسری سیڑھی پر بیٹھ گئے۔

"وہی ہرے دروازے والے۔" ہاتھ کا اشارہ کر کے بھی بتایا۔

"میں کیا جانوں کس کا ہرا دروازہ ہے۔" گھر سے نکلتی تو جانتی۔

"ارے وہی گھر آپا! جن کی چھت پر یہ بڑا سارا کبوتروں کا گھر ہے۔"

"کبوتروں کا گھر۔" وہ دیر تک ہنستی رہی۔ "اچھا ہاں۔۔۔ کبھی کبھی وہ گلابی دم والے ہمارے آم کے درخت اور گھر کی دیواروں پر آبیٹھتے ہیں' وہ ساتھ والوں کے کبوتر ہیں؟"

"ان کا یہ بڑا شیر سا کتا بھی ہے۔ پہلے مجھے اس سے بہت ڈر لگتا تھا' اب تو میں بھی اس کی گردن پر ہاتھ پھیر لیتا ہوں آپا جی!"

"ارے ہاں' ہاں۔۔۔ رات میں وہ اکثر دیر تک بھونکتا رہتا ہے' ہر رات۔"

"آپ دیکھیں تو ڈر جائیں۔" ابوبکر نے ہاتھ اٹھا کر جیسے فیصلہ دیا۔

"کاش وہ مجھے ڈرا دے۔" دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر اس نے خواہش کی۔

"آپ تو چلانے لگیں گی۔" ابوبکر نے اسے ڈرانا چاہا۔

"ہاں۔۔۔ میں ضرور چلاؤں گی۔" وہ ڈری نہیں' خوش ہوئی۔

"اگر آپ نے اسے گھورا تو وہ آپ کو کاٹ لے گا۔"

"میں اسے ضرور گھوروں گی۔" یہ کہتے ہوئے خوش تھی۔

"احمد اسے بازار میں لے کر گھماتا رہتا ہے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے آپا جی! میرے پاس بھی اس شیر جیسا کتا ہو۔ دکان والے بہت پیار کرتے ہیں اسے۔ قصائی اسے اتنا زیادہ گوشت کھلاتا ہے' جسے دیکھو شیرا شیرا کرتا ہے۔ ارشد بھائی بھی کہتے ہیں۔ واہ جی آج تو ہمارا شیر آیا ہے۔"

"ایک کتے سے اتنا پیار۔۔۔ بھلا کیوں؟" خدیجہ نے اس سے پوچھا۔ دراصل خود سے پوچھا۔

"تو آپا جی۔۔۔ وہ ہے ہی اتنا پیارا اور پھر شیر ہے شیر۔۔۔ ایسے چھلانگیں لگا کر بھاگتا ہے کہ دل خوش ہو جاتا ہے' سب کو ڈرا بھی دیتا ہے۔"

ساری رات وہ کروٹیں بدلتی رہی' شیر۔۔۔ شیر۔۔۔ کتا۔۔۔ جی دار۔۔۔ بہادر۔۔۔ نہ ڈرنے والا۔۔۔ ڈرا دینے والا۔

اور وہ۔۔۔ اس کی ذات میں کیا خصوصیات تھیں۔ کیا تھا اس میں۔ کیا پید اکر سکی تھی خود میں وہ۔ بہادری کے نام پر' جی داری کے سوال پر۔ سوال بہت تھے' جواب کہیں نہیں تھے۔

ایک ہی سوال۔۔۔ "میں کون ہوں؟"

سارے جواب "تو عورت ہے۔"

ایسے میں وہ باقی سوالوں کے جواب کہاں سے لاتی۔ سوال خانہ عنکبوت (مکڑی کا جالا) بنے اسے لپیٹے رکھتے۔

یہ ہوا۔۔۔ یہ پھول' یہ باغات' یہ گیلی آبشاریں' اونچے پہاڑ' کھلے آسمان میرے لیے کیوں نہیں؟ اگر جو میں انسان ہوں تو آزادی کے شفاف جھرنے میرے لیے کیوں نہیں؟ اگر جو میں انسان ہوں تو۔۔۔ تو میرے سارے اختیار میرے کیوں نہیں؟ مقدس کتابیں لاؤ۔۔۔ مجھے سناؤ' مجھے سمجھاؤ' جو ان میں لکھا ہے اس پر عمل کیونکر نہیں؟

خانہ عنکبوت میں اس کا دم گھٹنے لگتا۔

خانہ عنکبوت سے اسے ابوبکر نکالنے لگا۔

☼ ☼ ☼

رمضان آیا۔۔۔ شب قدر' چاند رات۔۔۔ ابوبکر اسے اپنے ساتھ ساتھ لیے اڑتا رہا۔ ہر بار ڈھیروں باتیں کر جاتا اس سے۔ باقی کا وقت وہ ان باتوں کی تصویریں بناتی اور رات بھر کروٹیں بدلتی۔ چاہ بابل (وہ کنواں جس میں ہاروت ماروت قید ہیں) سے گھر میں رہتے ہوئے ابوبکر کے ساتھ باہر نکل جاتی۔ باہر نکل جانا' صرف ایک پرواز کی خواہش کی مانند تھا' نمائش نہیں۔ خدا کو دیکھتا تھا' دکھاتا تھا۔

ارشد یہ کبھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس کے والد محترم بھی نہیں سمجھتے تھے۔ پھر وہ جان ہی گئی کہ سمندر کے ساحل کی گیلی ریت کو اس کے پاؤں کبھی نہیں چھو

سکیں گے۔ اس کی ماں کے بھی نہیں چھوئے تھے۔ اس کی ساس کے بھی۔۔۔ سب ان پر حرام نہیں تھا۔ سب ان پر حرام کر دیا گیا تھا۔

اور اب ابوبکر گیلی ریت نہ سہی' کچھ ذرات تو ضرور تھا اس ریت کے۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو لہرا لہرا کر ایسے تانے بانے بنتا جیسے ہاتھ کے برش سے کائنات کی تصویر بنا رہا ہو۔

"بڑی سڑک سے دائیں ہاتھ جو پہلی پتلی گلی ہے نا' اسی میں ہے نان کباب' دہی بڑوں کی دکان۔ اسی پتلی گلی کے نکڑ پر یہ بڑی ساری مچھلی والے کی دکان ہے۔ کمال کی مچھلی تلتا ہے آپا جی! سب سے زیادہ رش اسی دکان پر رہتا ہے۔ بہت عورتیں آتی ہیں۔ اماں بھی جاتی ہیں۔ جمیلہ باجی بھی' آپا جی! چلیں نا آپ بھی۔" اس نے لاڈ سے کہا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اپنے ارشد بھائی کے سامنے یہ بات نہ کر دینا۔"

"پردے لگے ہوئے ہیں آپا جی! دو عورتیں ہیں جو اندر پلیٹیں لے کر جاتی ہیں۔ ارشد بھائی جانتے ہیں۔"

"نہیں' نہیں' بازار تو تباہی اور بربادی کی جگہ ہے۔" اسے خوف آیا کہ کہیں یہ سب کسی کونے میں چھپے بیٹھے ارشد سن ہی نہ لیں۔

"تو پھر میلے چلیں آپا جی! مسجد کے پیچھے جو میدان ہے نا اس میں لگا ہے۔ عید سے لگا ہوا ہے' ابھی بہت دن لگا رہے گا۔"

"تم گئے تھے میلے میں؟" اب وہ میلے کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔

"اماں اور باجیاں گئی تھیں۔ مجھے بھی لے گئی تھیں' لیکن مجھے جانے ہی نہیں دیا اندر۔" اس کا منہ بن گیا۔

"کیوں؟" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی اور ہنستی ہی رہی۔

"کہتے ہیں صرف عورتوں کے لیے ہے۔"

"تم تو بچے ہو۔" وہ حیران ہوئی۔

"اماں نے کہا تھا' مگر وہ کہتے صرف گود کے بچے۔"

وہ خوب ہنسی "بہت رش ہو گا۔"

"ہاں جی بہت تھا' سب گئے تھے۔ اماں نے سب کو اکٹھا کر لیا۔ اماں نے ابا سے کہا کہ اب ہو گی ہماری بھی عید۔ باجیاں کہنے لگیں۔ اب آئے گا مزا' ہم بھی مزے کریں گے۔ گھر کے کام کرنے کے لیے ہی پیدا نہیں ہوئے صرف۔۔۔ روز ہی چلی جاتی ہیں مجھے چھوڑ کر' پھر آکر چڑاتی ہیں' بہت مزا آتا ہے وہاں۔"

"تو ہو گئی ان کی عید؟" ایک سسکاری سا سانس لیا اس نے۔

"اماں نے کہا۔ جاؤ اپنی آپا جی کو بھی لے آؤ۔ میں لینے آیا تو ارشد بھائی بہت ناراض ہوئے مجھ پر' بس مارا ہی نہیں۔"

"تم آئے تھے عید پر' کب آئے تھے' باہر سے ہی چلے گئے تھے' میں نے تو بہت انتظار کیا تھا تمہارا۔"

"دوپہر میں آیا تھا۔ ارشد بھائی باہر ہی کھڑے تھے۔"

"اچھا! میں نہیں جاتی میلوں ٹھیلوں میں ابوبکر۔۔۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"کہاں جاتی ہیں آپ پھر آپا جی؟" اس کی گھنی بھنویں ذرا سی سکڑ گئیں۔

"میں۔۔۔؟"

کتنا اچھا سوال تھا۔ کتنا برا جواب تھا۔

ابوبکر معصومیت سے خدیجہ کو دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "ہاں! آپ ہی بھلا اور کون؟"

"میں آنکھیں بند کرتی ہوں تو سب جگہ چلی جاتی ہوں ابوبکر!" آج دونوں آم کے درخت تلے بیٹھے تھے۔ ارشد دکان کا مال لینے مارکیٹ گئے تھے۔ ابوبکر خود ہی دکان سے گھر آگیا تھا۔

"اچھا آپا جی!" اس کی بھنویں خوشی سے پھیل گئیں۔ "کہاں کہاں آپا جی؟"

"کہاں کہاں۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔ پہلے تو صبح سویرے اٹھ کر میں سڑک پار والے پارک میں جاتی ہوں۔ وہیں جہاں اتنی گھاس ہے اتنی گھاس ہے کہ کیا بتاؤں۔۔۔ اور اتنے پھول ہیں اتنے پھول ہیں کہ کیا

کہوں۔"

"ہر رنگ کے آپا جی۔۔۔ یہ اتنے ڈھیر سارے؟"

"ہاں۔۔۔ لیکن میں کوئی پھول نہیں توڑتی۔۔۔ میں جھک جھک کر ایک ایک پھول کو سونگھتی ہوں۔ انہیں اپنے گالوں سے لگاتی ہوں۔ دیر تک کھڑی انہیں دیکھتی رہتی ہوں۔ سونگھتی رہتی ہوں۔ تتلیاں تلاشتی ہوں ان پر۔۔۔"

"کتنی پیاری خوشبو ہوتی ہے نا ان کی۔۔۔ ہے نا۔۔۔؟"

"بہت۔۔۔ بہت پیاری۔۔۔ پور پور رچ بس جانے والی۔"

وہ نا سمجھی سے خدیجہ کو دیکھنے لگا۔

"پھر میں نیلی کھڑکیوں والے گھر کی دہلیز میں بیٹھی اماں جی کو سلام کرتی ہوں جو ہر آتے جانے والے سے سلام لیتی ہیں۔"

"سر پر پیار بھی کرتی ہیں اور پوچھتی ہیں۔ "کدھروں آیا ایں کاکا؟"

"میں ان سے سر پر پیار لیتی ہوں اور انہیں بتاتی ہوں کہ پارک میں چہل قدمی کرنے اور پھولوں کی خوشبو لینے گئی تھی۔۔۔ پھر ہمارے گھر سے دوسری گلی جو بند ہے اور جہاں ساری گلی کی عورتیں بیٹھی باتیں کرتی رہتی ہیں ______ میں جا کر ان کی باتیں سنتی ہوں۔۔۔ کچھ انہیں اپنی سناتی ہوں۔ پھر اس بالکنی کے نیچے سے تو ضرور ہی گزرتی ہوں جہاں ایک چھوٹی بچی کھڑی آنے جانے والوں پر پانی پھینک کر چھپ جاتی ہے۔"

"بہت گندی لڑکی ہے وہ۔ گندے بال۔۔۔ گندے کپڑے۔۔۔ گندی۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

وہ دل کھول کر ہنسی۔۔۔ "پھر میں برف کے گولے والے کو ڈھونڈتی ہوں جو اتنی دیر میں ایک گولا بناتا ہے اتنی دیر میں کہ میں تھک جاتی ہوں۔"

"ہاں میں بھی تھک جاتا ہوں۔"

"ارے میں تو بھول ہی گئی۔ پہلے تو مجھے شیرا کو دیکھ کر ڈرنا تھا۔"

"وہ کتنا پیارا ہے نا۔۔۔ ہے نا۔۔۔ نہیں لگتا نہ ڈر اب اس سے۔۔۔؟"

"اتنا پیارا ہے کہ اس سے تو بالکل ڈر نہیں لگتا۔"

وہ صحرا میں دم توڑتی صدا کی طرح بولی۔

"بازار نہیں جاتیں کیا آپ؟"

"بازار۔۔۔" وہ سوچ کر چپ کر گئی۔ "وہاں کیوں نہ جاؤں جہاں پر جمعرات کو نان دال بانٹی جاتی ہے۔"

"کتنے مزے کی دال ہوتی ہے نا۔۔۔ اس بار تو ضرور ہی آپ کے لیے لاؤں گا۔"

"جھوٹے۔۔۔" خدیجہ نے ہلکے سے اس کی ناک مروڑی۔

"نہیں آپا جی! اس جمعرات کو پکا۔۔۔" اس نے سرہلایا۔

"اور کھوئے والی قلفی نہیں کھاتیں آپ۔۔۔ میں تو روز کھاتا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ مجھے کوئی پانچ روپے دیتا ہی نہیں ابوبکر۔۔۔ کیسے کھاؤں۔" وہ شرارتاً بولی۔

"کل اماں پیسے دیں گی تو میں آپ کو دے دوں گا۔" اس نے سرگوشی کی۔

"تم پیسے تو دے دو گے' باقی سب کون دے گا؟" سرگوشی کی صورت ہی اس نے خود کلامی کی۔

ابوبکر سوالیہ اسے دیکھنے لگا۔ وہ خود سرتاپا سوالیہ بن گئی۔ اس نے آنکھیں کھول لیں۔۔۔ رنگ برنگی دنیا کی سیر ختم ہوئی۔ اب وہ اپنے گھر میں بیٹھی ہے جس گھر کی دیواریں اونچی اٹھا دی گئی ہیں۔ جس گھر کے اندر آنے کا تو دروازہ ہے لیکن باہر جانے کا نہیں۔۔۔



کبھی کبھار اس کی جٹھانی آ جاتیں' جتنا ان کے پاس کہنے سننے کے لیے ہوتا اتنا ہی اس کے اپنے پاس۔۔۔ ان کی تین نوعمر بچیوں کے پاس بھی وہی سب۔۔۔ ایک دن ان ہی کے سامنے ابوبکر آ گیا۔ تینوں لڑکیاں پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی رہیں۔

"چچی! کتنا تیز ہے یہ ابوبکر۔۔۔ کیسے تیز تیز بولتا

ہے۔۔۔ کتنی باتیں کرتا ہے' تھکتا نہیں ہے کیا یہ۔۔۔ آنکھیں کیسے مٹکاتا ہے۔"

اس دن وہ انہیں اس موٹے آدمی کے بارے میں بتا رہا تھا' جو ان کے گھر کے راستے میں کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہوتا ہے اور اگر کوئی بچہ چیخ چلا کر گزرے تو اسے ایک دھپ لگاتا ہے۔ اس دن تیز آواز میں قلفی والے کو روکتے اس نے وہ دھپ کھائی تھی۔

خدیجہ نے محبت سے اس کی کمر مسلی۔ "میرے پیارے ابوبکر کو کیوں مارا انہوں نے؟"

"اماں نے تو کہا کہ اچھا ہوا مجھے لگی ایک۔۔۔ اور گلا پھاڑ کر چلایا کر۔" وہ روہانسا ہو گیا۔

"اماں نے مذاق کیا ہو گا۔"

"روز ہی ایسے مذاق کرتی ہیں؟" وہ رونے کے قریب ہو گیا۔

"میں تو ایسے مذاق نہیں کرتی نا!"

"آپ تو بہت اچھی ہیں آپا جی!" وہ خوش ہو گیا ایک دم سے۔

"تم سب سے اچھے ہو۔۔۔ مجھے بہت پیارے ہو تم؟"

"سچی آپا جی؟" وہ خوب خوش ہوا۔

اگلے دن آیا تو پھر منہ بگڑا ہوا تھا۔

"جمیلہ باجی کہتی ہیں۔ تمہاری آپا جی مذاق کرتی ہیں۔ تمہارا دل رکھتی ہیں۔ تم اتنے اچھے نہیں ہو اور انہیں کیوں اچھے لگو گے بھلا۔"

خدیجہ ہنس پڑی اور اسے سمجھا نہ سکی۔ ابوبکر کی عمر جتنے الفاظ کہاں سے لاتی کہ وہ جان جاتا کہ وہ اس کے لیے کیا ہے۔

اس کا ابابیل۔۔۔ اس کی جھری۔۔۔ اس کا ہوا دان۔۔۔ اس کی پروا۔۔۔ خدیجہ کے دو پر۔۔۔ دو آنکھیں۔۔۔ آسان تھا اسے یہ سب سمجھانا بھلا؟

"اماں سے کہنا ارشد بھائی اور آپا جی دونوں مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

وہ خوش ہو گیا۔ "میں ضرور کہوں گا اماں اور باجیوں سے۔۔۔ یہ بھی کہ ارشد بھائی مجھے کبھی نہیں ڈانٹتے۔۔۔ حسن بھائی اور نذیر بھائی کو بہت ڈانٹ پڑتی ہے مجھے نہیں۔" ابوبکر نے ننھا سا ہاتھ لہرا کر ذرا مٹک کر کہا۔

"انہیں کیوں ڈانٹ پڑتی ہے؟"

"سارا وقت باتیں کرتے رہتے ہیں آپا جی۔۔۔ کام پر دھیان نہیں دیتے' میں تو سارے کام کرتا ہوں۔۔۔ ارشد بھائی کہتے ہیں میں بہت اچھا بچہ ہوں اور وہ مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں گے۔ میں ان کی ہر بات مانتا ہوں۔ بھائی کہتے ہیں 'ابوبکر! مجھے دکان اتنی سی بھی گندی نظر نہ آئے۔ میں ہر وقت دکان صاف کرتا رہتا ہوں اور پھر بھائی جان کہتے' جا بجلی کی طرح جا اور ایک پیالہ ربڑی تین قلفیاں ڈلوا کر لے آ۔۔۔ میں یوں جاتا ہوں اور شوں آتا ہوں۔" اس نے بھاگ کر دکھایا۔

وہ ہنسی "واہ۔ کہاں ہے ربڑی کی دکان؟"

"بازار سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف۔۔۔ بہت رش ہوتا ہے وہاں پر۔ میں جلدی لے آتا ہوں۔"

"تم کیسے جلدی لے آتے ہو؟" کھانا باندھ کر خدیجہ نے ایک طرف رکھا اور باداموں کا حلوہ اسے کھانے کے لیے دیا۔ دونوں باورچی خانے میں تھے۔ وہ اسٹول پر بیٹھا تھا اور وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"ملک جی! مجھے دے دیں۔۔۔ ملک جی! پہلے مجھے فارغ کریں۔ کہتا جاتا ہوں۔ کہتا جاتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں اف یہ لڑکا تو کان کھا جائے گا پہلے اسے فارغ کرو۔"

ملک جی۔۔۔ دکان۔۔۔ رش۔۔۔ اور اس کے الفاظ وہ منظر کو نگاہوں میں لا کر خوب ہنسی۔

"آپ نے ملک کی ربڑی کھائی ہے آپا جی۔۔۔ ٹھنڈی ٹھار قلفیاں ڈلوا کر؟"

"ربڑی تو کھائی ہے۔ ملک کی تھی یا نہیں' یہ نہیں معلوم۔"

"اگر آپ نے ملک کی کھائی ہوتی تو آپ روز منگوا کر کھاتیں۔ اتنی مزے کی ہوتی ہے۔" حلوہ کھاتے اس نے ربڑی کا چٹخارہ لیا۔

"منگوا کر کھاؤں گی۔ ضرور کھاؤں گی۔" خدیجہ نے ٹفن اس کے ہاتھ میں دیا۔ ہاتھ سے اس کے بال سنوارے اور اس کی گھنی پلکوں کو محبت سے دیکھا۔

"تم بہت پیارے ہو ابوبکر!" اسٹول سے وہ اتر گیا تو خدیجہ نے اسے روک کر کہا۔ وہ خوش ہو کر خدیجہ کو دیکھنے لگا۔

"سچی آپا جی۔۔۔؟" بچکانہ الوہی خوشی۔

"ہاں۔۔۔ تم فرشتے سے ہو۔"

"فرشتہ" وہ مسکرایا۔ مقدس مسکراہٹ۔۔۔

"فرشتہ۔۔۔ فرشتہ" کرتا وہ چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

رات ارشد آئے۔ اس نے بہت دنوں بعد گلابی سوٹ پہن کر بال کھولے تھے۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور اس سے بھی خاص بات یہ کہ وہ مسکرانے لگی تھی۔ اس نے ربڑی کی فرمائش کی۔۔۔ اور اگلی ہی رات ربڑی آ گئی۔

"کہاں سے لی آپ نے یہ۔۔۔؟" ہلکی مسکراہٹ لیے اس نے پوچھ لیا۔۔۔

"بازار سے ہی لی ہے اور کہاں سے لینی تھی۔" ارشد چڑ سے گئے۔ وہ قیامت کی نشانیاں اور دجال کی آمد نامی کتاب پڑھ رہے تھے۔

"لیکن ملک ربڑی والے کی دکان تو بس اسٹاپ پر ہے۔۔۔ بازار سے کیوں لی۔۔۔ وہیں سے لے لیتے۔"

کتاب پڑھتے ارشد اپنی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کر رہے تھے۔

"تجھے کیسے پتا کہ ملک ربڑی والے کی دکان بس اسٹاپ پر ہے؟" انگلیاں کنگھی کرتے رک گئیں۔ ارشد نے اپنی نظریں اس کے آرپار گاڑ دیں اس کا جی چاہا جل کر بھسم ہو جائے۔۔۔ ان نظروں میں ہر وہ رنگ تھا جو ذرا سی عزت نفس رکھنے والی عورتیں بھی اپنے لیے پسند نہیں کرتیں۔ جن کے سایوں سے ہی وہ بے سایہ ہو جاتی ہیں۔ جن کی چاپ پر ہی وہ زمین میں خود کو گاڑ لینا چاہتی ہیں۔ ہاں اب وہ کامل وہی مرثیہ نگار بن گئی' جو اپنے ہی مرثیے پر بہت روئی۔۔۔ روتی رہے گی۔

"بس ایسے ہی۔۔۔ باتوں میں بات نکلی۔۔۔ وہ۔۔۔" اس کی زبان صفائی دینے سے انکاری ہوئی۔

"کس کی باتوں میں بات نکلی؟" کتاب ایک طرف رکھ کر وہ تقریباً" دہاڑے۔

شیر آیا۔۔۔ شیر آیا۔۔۔ ابابیل ڈر کر پھر اڑا۔۔۔ وہ سہم گئی۔

"ابوبکر کی باتوں۔۔۔ وہ بتا رہا تھا۔" خدیجہ نے خود کو چھپانے کے لیے کوئی کونا تلاش کرنا چاہا لیکن سارے کونوں کی لگامیں ارشد کے ہاتھوں میں تھیں۔

ربڑی کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔۔۔ وہ زہر آلود ہو گئی۔

وقفے وقفے سے کئی بار اسے گھورنے کے بعد ارشد سو گئے۔۔۔ وہ سو نہ سکی۔ جن پیاری باتوں کے مناظر کھینچ کر انہیں دیکھتے دیکھتے وہ میٹھی نیند سو جایا کرتی تھی۔ آج وہ اسے دکھائی نہ دیے۔

کئی دن گزرے۔ ابوبکر نہ آیا۔۔۔ پھر ہفتے بھی گزرنے لگے۔

اس کے امتحان بھی تو ہونے والے تھے نا۔۔۔

"وہ منا نہیں آتا اب ارشد۔۔۔؟" صبح سویرے اماں پوچھ رہی تھیں۔ وہ بل والے پراٹھے بنا رہی تھی۔ جھری سے اس نے برآمدے میں بیٹھی اماں کو محبت سے دیکھا۔۔۔ ایک پراٹھا توے پر تھا ایک چکلے پر۔۔۔

"اسے سامنے کی دکان میں رکھوا دیا ہے اماں۔۔۔ بہت سر کھاتا تھا۔"

"ہاں بولتا تو بہت تھا۔" اماں نے تائید کی۔

پراٹھا جل گیا۔

چاہ بابل سے توبہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔

شیر آیا۔۔۔ شیر آ گیا۔۔۔

ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ جھری میں کیل گڑے۔۔۔

بعد ازاں شام ڈھلے خدیجہ کے سسر نے مومی کاغذ کی کتابوں میں سے ایک کتاب کو پڑھتے اس کی دبی دبی گھٹی گھٹی ہچکیوں کو سنا۔۔۔ اور ساس نے بھی۔۔۔

"دنگی ہے' اس کے گھر دیر ہے' اندھیر نہیں۔۔۔ وہ ضرور صاحب اولاد کرے گا۔"

دونوں چپکے چپکے سرگوشیاں کرتے رہے۔

☼

گل افشاں رانا

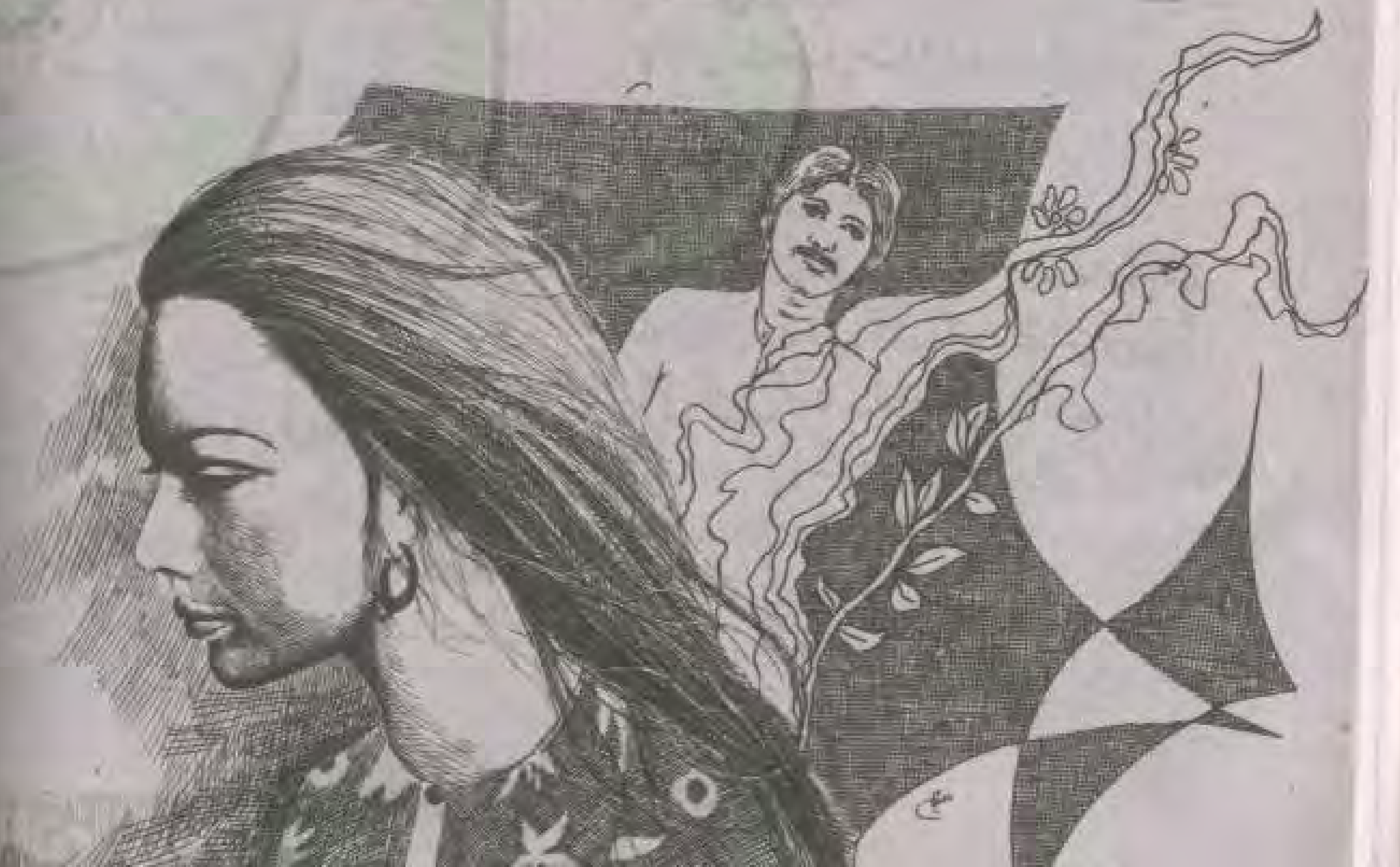
میری محبتوں کا کارواں

"مفتی صاحب! السلام علیکم!
قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ اچھی عورتوں کے لیے اچھے مرد اور بری عورتوں کے لیے برے مرد ہوتے ہیں۔ میں نے اب تک خود کو ہر گناہ اور غلطی سے بچائے رکھنے کی سعی کی ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ بدلے میں مجھے بھی ایک اچھا ساتھی ملے گا۔ پھر زندگی کی راہوں پر چلتے ہوئے مجھے بھی ایک بہت اچھا ہم سفر ملا۔ میں نے خلوص دل سے اسے عمر بھر کے لیے جیون ساتھی بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن وہ کسی طرح بھی میرا نصیب نہ بن سکا۔ اب اس کے ساتھ بیتے ہوئے پل گناہوں کا اژدھا بن کے مجھے دن رات ڈستے ہیں۔ میرا اپنی ذات پہ کوئی مان نہیں رہا۔ میں نے اس سے صاف ستھری محبت کی ہے مگر وہ نامحرم محبت مجھے اب گناہ لگتی ہے اور میں اس احساس کے ساتھ مزید زندہ نہیں رہ سکتی۔

"مفتی صاحب! دین اسلام میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ایسا طریقہ ہوگا تاکہ انسان مرجائے اور اسے حرام موت مرنے پر کوئی گناہ بھی ہو۔ میں حرام موت نہیں مرنا چاہتی، مگر اب زندہ بھی نہیں رہنا چاہتی۔ خدارا۔ ایسا کوئی طریقہ بتادیجیے کہ میرا رب مجھ سے راضی رہے اور میں زندہ بھی نہ رہوں۔"

ای میل کرکے میں نے اپنا لیپ ٹاپ بند کرکے ایک طرف رکھ دیا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کے نیم دراز ہوگئی۔

ناولٹ



نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو رہا تھا کہ جواب میرے حسب منشا ہی آئے گا۔ یعنی چند دن بعد نائلہ گل کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو جاتا تھا۔

میں اپنے کمرے میں تنہا سوچوں کے لاانتہا ہی گورکھ دھندے میں الجھی بیٹھی تھی۔ حالانکہ کھلی کھڑکی سے باران رحمت برستی نظر آرہی تھی۔ میں اٹھ کر کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔ نیچے لان میں قوس قزح کے دلکش رنگوں جیسے حسین پھول آتے جاتے لوگوں کو خوش و خرم دیکھ کے کورنش بجا لا رہے تھے۔ مجھے اس وقت دنیا میں اپنے سوا سب اپنی اپنی جگہ موزوں نظر آرہے تھے۔ اگر دنیا میں کوئی بلاوجہ تھی تو وہ صرف اور صرف میری ذات تھی کہ جس کے پاس اب جینے کا کوئی جواز، کوئی بہانہ، کوئی سہارا نہیں رہا تھا۔ زندگی اور زندگی سے وابستہ ساری دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں۔ میں نے جو پانا تھا، وہ پالیا تھا۔ میرے خیال میں اب میری تقدیر کے پاس مجھے دینے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا اور میں نے جو کھونا تھا وہ بھی کھو چکی تھی۔ اپنے ماں، باپ، بھائی، بہن، اپنا محبوب کیپٹن میر عمر۔ اپنا وقار تک تو میں کھو چکی تھی۔ اب میرے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس قیامت خیز زلزلے نے مجھ سے میرے ماں، باپ، عزیز، رشتے دار، میرا گھربار سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں اور میری بڑی بہن سونیا گل ذلیل و خوار ہونے کے لیے اس بھری دنیا میں تنہا بے یارومددگار بچ گئی تھیں۔ میری عمر اس وقت چودہ سال تھی اور سونیا گل مجھ سے تین سال بڑی تھی۔ آئندہ زندگی میں مجھے جب جب کوئی رنج پہنچا۔ میرے دل سے بے ساختہ ہوک اٹھتی کہ کاش! اس دن میں بھی اپنے پیاروں کے ساتھ زندہ زمین میں دفن ہو جاتی لیکن یہ کاش۔۔۔ کاش ہی رہا اور ہم دونوں بہنیں روتی دھوتی مفلسی اور غم سے نڈھال مانسہرہ کی چھوٹی سی جنت سے نکل کے کراچی جیسے بڑے شہر میں آن بسی تھیں۔ خالہ اماں کا گھر جدید سہولیات سے آراستہ تھا۔ ان کی بے لوث محبت نے ہمیں چند دنوں میں ہی اس نئے ماحول سے مطابقت کرنے میں مدد دی۔ وہ گھر میں اکیلی رہتی تھیں۔ خالو نے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کی ہوئی تھی لیکن شومئی قسمت کہ اولاد تب بھی نہ ہو سکی۔ وہ پھر بھی اپنی دوسری بیوی کے ساتھ الگ گھر میں رہتے تھے۔

خالہ ماں نے ہم دونوں بہنوں کو قریبی اسکول میں داخل کروانا چاہا تو سونیا نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا اس کو پڑھائی سے زیادہ رغبت نہیں تھی چنانچہ میں اکیلی ہی اسکول داخل کروادی گئی۔ انہوں نے صحیح معنوں میں ہمیں ماں بن کے پالا تھا۔ گھرداری، دنیاداری کے ساتھ ساتھ دین داری کے سبق بھی گھول گھول کے پلائے۔ سونیا کی نسبت میں خالہ ماں کے زیادہ قریب تھی۔ فرمائشیں کر کر کے کھانے پکواتی، رات کو ان سے لپٹ کے سوتی، بیتے دنوں کے دکھ جب یاد آتے تو ان کی گود میں سر رکھ کر آنسو بہا کے اپنا دل ہلکا کرتی۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کام اپنے ہاتھ سے کرنا میں عبادت سمجھنے لگی تھی۔

وقت اپنی خوبصورت یادیں چھوڑتا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے کالج میں ایڈمشن لے لیا تھا۔ خالہ ماں نے ملنے جلنے والوں میں سونیا کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ ان ہی دنوں خالو اپنی دوسری بیوی کے انتقال کے بعد دوبارہ خالہ ماں کے گھر آکے رہنے لگے تھے۔ میں اپنے کالج اور کوچنگ سینٹر میں مصروف رہتی تھی۔ سو خالو کے آجانے سے مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ لیکن سونیا کے انداز کچھ دنوں بعد بدلنے لگے۔ میں اسے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر رہی تھی لیکن پھر خالہ ماں کے چہرے پر بھی مجھے فکر و پریشانی کی پرچھائیاں گہری ہوتی نظر آنے لگیں۔ میں اپنی مصروفیات کے باعث زیادہ غور نہ کر پائی مگر ایک دن جب میں کالج سے گھر لوٹی تو۔۔۔

خالہ ماں کے رونے کی آوازیں مجھے گھر کی دہلیز پر ہی سنائی دے گئیں۔ میں بھاگتی ہوئی ان کے پاس گئی۔ خالو اور سونیا سر جھکائے ان کے قریب ہی کھڑے تھے۔ سونیا کے جسم پر سجا سرخ زرتار سہاگنوں والا جوڑا بہت کچھ غلط ہو جانے کا اظہار کر رہا تھا۔ میں نے سب کو نظرانداز کر کے خالہ ماں کے آنسو پونچھنے کے لیے آگے بڑھی مگر انہوں نے مجھے بری طرح جھٹک کے پیچھے کر دیا۔

"دفع ہو جاؤ۔ نکل جاؤ تم بھی میرے گھر سے۔ اپنی اولاد سمجھ کر پالا تم لوگوں کو۔ اور تم نے اپنی ماں کے گھر ہی نقب لگائی۔ میں تو تم لوگوں کو حیا اور پاکیزگی کے سبق پڑھاتی رہی اور تمہیں میرے ہی گھر میں، اپنے باپ کی عمر سے مرد سے منہ کالا کرتے ہوئے ذرا حیا نہ آئی۔"

خالہ ماں ہذیانی انداز میں نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھیں اور میں پتھرائی ہوئی سونیا کو دیکھے جا رہی تھی۔ میرا وجود ایک بار پھر زلزلوں کی زد میں تھا۔ میری بہن، میری سہیلی، میری ماں جائی نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا اور مجھے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

"ایسا کیوں کیا تم نے سونیا!" میرے منہ سے بس یہی نکل سکا۔ سونیا کچھ نہ بولی۔ بس سر جھکائے ویسے ہی کھڑی رہی۔ کچھ فاصلے پر مختار علی سپاٹ چہرہ لیے کھڑا تھا۔ میں کچھ دیر یونہی کھڑی رہی پھر چکنے فرش پر بین کرتی خالہ ماں کے سامنے بیٹھ گئی۔

"خالہ ماں! میرا یقین کیجیے گا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میری سگی بہن اتنی پستی میں بھی گر سکتی ہے۔ خالہ ماں! میں۔۔۔"

خالہ ماں نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جھٹکے سے دروازہ بند ہوا تو سونیا میری طرف بڑھی۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

"نائلہ! مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا مگر میرے ساتھ بہت غلط ہوا۔" اس نے غصے سے دور کھڑے مختار علی کو دیکھا۔

"میں نے خالہ ماں سے اپنے رشتے اور ان کے احسان کا مان رکھا تھا نائلہ! مگر ہمارے نام نہاد خالو نے کسی رشتے کا پاس نہیں رکھا۔ میں نکاح نہ کرتی تو کیا بدکاری کرتی رہتی۔ اس شخص نے۔۔۔"

"بس کرو یہ فضول تماشا۔" اب تک خاموش کھڑے مختار علی کو جوش آیا۔ "اولاد کے لیے میں جتنی چاہوں شادیاں کر سکتا ہوں۔ اور شکر کرو کہ نکاح کر لیا میں نے ورنہ کیا کر سکتی تھیں تم۔"

مختار علی نے نخوت سے مفلر جھٹکا۔ "تمہارا رونا دھونا ختم ہو جائے تو سامان باندھ لینا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا مگر سامان باندھنے کی نوبت نہ آئی۔ بلکہ خالہ ماں دوسرے دن اپنا رخت سفر باندھ چکی تھیں۔

میری دنیا ایک بار پھر اجڑ گئی۔ میں ایک بار پھر اکیلی رہ گئی۔ میری ماں ایک بار پھر مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

مختار علی کے ساتھ رہنا میری مجبوری بن گیا لیکن میں دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرچکی تھی کہ مجھے جیسے ہی موقع ملے گا' میں یہاں سے چلی جاؤں گی اور اس معاملے میں قدرت نے میرا ساتھ دیا۔
میری واحد دوست حرا نے ایرہوسٹس بننے کے لیے درخواست دی تو میں نے بھی قسمت آزمائی۔ پہلے ہی سیشن میں ہم دونوں کو پاس کردیا اور ٹریننگ کے لیے بلالیا گیا۔ صبح ناشتے کے بعد جب مختار علی چلا گیا تو میں اپنا بیگ اٹھائے سونیا کے پاس گئی۔ وہ اپنے ڈیڑھ سالہ بیٹے کو گود میں بٹھائے ناشتا کروا رہی تھی۔
"سونیا! میں آج تمہیں اور تمہارے گھر کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے یہاں سے جارہی ہوں۔" میں نے بنا کسی تمہید کے کہا۔
اپنے بیٹے کے منہ میں کارن فلیکس کا چمچ بھر کے ڈالتی سونیا کے ہاتھ وہیں رک گیا۔ اس نے چونک کے سر اٹھایا۔
"کہاں جارہی ہو؟"
میں نے اس دن کے بعد سے اسے بڑی بہنوں والی عزت دینا چھوڑ دی تھی۔ میں آج بھی سونیا اور مختار علی کو معاف نہیں کرپائی تھی۔ ہرچند کہ آنے والے وقتوں میں یہ ثابت ہوگیا تھا کہ سونیا بے قصور تھی۔ مختار علی تو خیر تھا ہی میری نظر میں ایک نفس کا مارا انسان' مگر مجھے اپنی بہن کی بزدلی پر بھی گہرا رنج تھا' جو آج تک کم نہ ہوا تھا۔ وہ خالہ ماں کو بتاتی' مجھے بتاتی۔ ہم مل کر اس مسئلے کا حل نکالتے مگر وہ اپنی بزدلی کے ہاتھوں نہ صرف اپنی بلکہ ماں جیسی خالہ کی زندگی بھی درگور کرگئی۔
میں نے زمین پر پڑا اپنا بیگ اٹھایا اور اپنی ماں جائی پر آخری نظر ڈالی جو ابھی تک حیرت سے مجھے تک رہی تھی۔
"سونیا! خالہ ماں کے بعد تم نے مجھے اس گھر میں رکھا اور اسٹڈی پوری کرنے میں مدد دی' اس کا احسان میں عمر بھر نہ بھولوں گی اور چکانے کی کوشش بھی کروں گی مگر میرا ظرف ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا کہ میں تمہیں معاف کرسکوں۔ اپنی خالہ ماں کے قاتلوں کو معاف کرسکوں۔"
یہ کہہ کر میں یعنی نائلہ گل اپنی مختصر سی زندگی میں دوسری مرتبہ گھر بدر ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

ہاسٹل میں قیام کے دوران میں ہوم ٹیوشن سے اپنا خرچہ اٹھانے لگی۔ تھوڑا بہت ٹریننگ کے دوران بھی وظیفہ ملتا رہا۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ اور خوبصورتی کی وجہ سے میری اور حرا کی فرسٹ کلاس ٹف ٹریننگ شروع ہوگئی۔
ٹریننگ کا ایک مرحلہ جس میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگائی جاتی تھی۔ جب وہ مرحلہ آیا تو بڑی بڑی بہادر لڑکیوں کے اوسان خطا ہوگئے۔
سیفٹی ڈریسنگ کے بعد جب ہمارے ٹرینرز کی جانب سے "GO" کا سگنل دیا گیا تو کتنی ہی لڑکیوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ کلمہ پڑھ کے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لینے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔
اپنے گروپ سے میں نے بارش کا پہلا قطرہ بننے کا فیصلہ کیا۔
کلمہ پڑھتے ہوئے میں نے جیسے ہی ہیلی پیڈ کو چھوڑا' مجھے لگا کہ میرے نازک سے جسم کے ساتھ کسی نے بہت بڑے بڑے سے وزنی پتھر باندھ دیے ہیں۔ جس سے میرا وجود اتنا بھاری ہوگیا تھا کہ میری شریانوں کا سارا خون سمٹ کے چہرے پر آگیا اور کلیجہ منہ کو آنا کسے کہتے ہیں' اس وقت سمجھ میں آگیا تھا' پھر میرے جسم نے فضا میں اڑتے پنچھی کی طرح زور زور سے دو تین جھٹکے کھائے اور جیسے کوئی باز ایک دم اپنے شکار کو دبوچ لیتا ہے' مجھے لگا کہ کھلتا پیراشوٹ بھی میرے لیے ایک بھاری بھرکم باز بن گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ میری ہڈیاں زمین کے سینے سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتیں' میرا پیراشوٹ کھل گیا اور ایک شفیق باپ کی طرح مجھے اپنی بانہوں میں جھولا جھلاتے ہوئے زمین کی جانب لانے لگا۔
چند لمحے لگے تھے خود کو اس دل دہلا دینے والی کیفیت سے نکالنے میں' پھر میں آنکھیں کھول کے اپنے ارد گرد کی فضاؤں کو انجوائے کرنے لگی۔ اس وقت مجھے اپنا آپ اس ست رنگی نخریلی تتلی جیسا لگ رہا تھا' جسے بیٹھنے کے لیے کوئی پھول پسند نہ آرہا ہو اور وہ فضاؤں میں اٹھلاتی پھر رہی ہو۔ بالآخر جیسے ہی زمین میرے پاؤں کے نیچے آئی' میں بھی اپنی انسانی اوقات میں آگئی۔
ہم انسان جتنی بھی اونچی ہواؤں میں اڑلیں' لوٹ کے ہمیں زمین پہ ہی آنا ہوتا ہے کہ ہمارا اصل ٹھکانا یہی ہے۔ ہم خاکی پتلے اس ٹھکانے کو جیتے جی چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ہی مرجانے کے بعد۔ لیکن ہم ناشکرے اور بے قدرے ہیں کہ اس عافیت کدے کو چھوڑ کے ہمیشہ آسمانوں میں اڑنا پسند کرتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو جتنا بلند ہوتا ہے' اسے اتنے ہی خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر انسان کی جبلت میں جو بے چینی ہے وہ اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ میں بھی ہر وقت اندر سے بے چین و مضطرب رہتی تھی۔ مجھے کہیں بھی چین و قرار نصیب نہ ہوتا تھا۔ میری دوستی ابھی تک صرف حرا سے ہی تھی اور مرد حضرات ابھی تک میرے لیے شجر ممنوعہ ہی تھے حالانکہ میری طرف اب تک بہت سارے مرد آئے تھے۔ جو بہت اچھے بھی تھے اور میرے ساتھ کے طلب گار بھی تھے' لیکن میں نے اپنے دل کے کواڑ کبھی کسی کے لیے کھلتے محسوس نہ کیے تھے۔ شاید میں اپنے دل میں مردوں سے بدظن اور بے زار تھی حالانکہ اپنی اب تک کی زندگی میں' میں نے مختار علی' جسے نہ خالو کہنے کا دل چاہتا تھا اور نہ ہی بھائی۔ کسی کو بدطینت نہیں دیکھا تھا' مگر پتا نہیں کیوں کب مجھے مردذات پر بھروسا نہ رہا تھا۔ مردذات سے نفرت اور بے زاری اپنی جگہ۔۔۔۔
لیکن زمانے میں سر اٹھا کر چلنے کے لیے مجھے ایک مرد کے سہارے کی واقعی ضرورت تھی۔ بطور فضائی میزبان جاب کرتے ہوئے چار سال کے عرصے میں میری یہ خواہش شدت اختیار کرگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں ہو ڈیر! کیا کررہی ہو؟"
"مجھ جیسے لکیر کے فقیر لوگ کبھی بھی کچھ نہیں کرسکتے۔ بس جب کبھی ہمیں کچھ کرنے کا خیال آجائے تو بہت شوق اور لگن سے خیالی پلاؤ پکاتے ہیں اور اپنے اس عظیم کارنامے پر خود کو داد دیتے ہوئے مزے لے لے کر جی بھر کر کھاتے ہیں' پھر اتنی مشقت کے بعد ہم تھک کر سوجاتے ہیں اور نیند میں بھی اپنی ترقی و خوش حالی کے خواب دیکھتے رہتے ہیں اور جب صبح سو کر اٹھتے ہیں تو اہل کربلا کی طرح جہاں سے چلے ہوتے ہیں' طویل مسافت کے بعد وہیں کھڑے ہوتے ہیں۔"
اس کے ایک چھوٹے سے سوال پر میں نے گویا داستان سنا ڈالی۔ شاید اپنی فرسٹریشن نکالنے کی کوشش کی تھی۔
"تمہاری یہ ساری قنوطیت نکال دوں گی میں۔ ایک بار ملو تو۔" حرا نے جواب میں مجھے ڈپٹا۔ "سنو! تمہاری جدہ کی فلائٹ کب ہے؟"
"پرسوں۔" اب کے میں نے مختصر جواب دیا۔
"اوکے۔ شرافت سے میرے گھر آجانا اور ایک مہینے کی لیو لے لو۔ تمہارے ساتھ باتیں کیے بہت عرصہ ہوگیا ہے۔" اس کے لہجے میں اصرار تھا۔ حرا کی دوران جاب ہی شادی ہوگئی تھی اور اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ جدہ میں مستقل رہائش پذیر تھی۔ میری جب بھی جدہ کی فلائٹ ہوتی' میں اس سے ضرور ملتی۔ جب حرا نے شادی کی وجہ سے جاب چھوڑی تو میں نے بھی قومی ایرلائن چھوڑ دی۔ جاب چھوڑنے کی ایک وجہ حرا تھی اور دوسری وجہ وقت پر تنخواہوں کا نہ ملنا تھا۔

☼ ☼ ☼

اتنے مہینوں سے جیسے تیسے گزارا ہو رہا تھا لیکن اب حالات کنٹرول سے باہر ہو رہے تھے۔ ان بڑی بڑی کمپنیوں اور اداروں کو تو کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا کہ ان کے غیر ملکی دورے ' ہوٹلنگ ' شاپنگ سب کچھ جوں کا توں تھا۔ ان کا سارا سرکل یوں ہی چلتا رہتا تھا۔ مگر نہیں چلتا تھا تو غریب ورکرز کا چولہا نہیں جلتا۔ میری اکیلی جان دیوالیہ ہونے کو آرہی تھی ' سو میں نے ایک پرائیویٹ ایرلائن جوائن کرلی تھی۔

چند ہی روز ہوئے تھے مجھے ' جب میری ملاقات کیپٹن میر عمر سے ہوئی۔ سیاہ چمک دار بال ' آڑی مانگ ' کشادہ چمکتی ہوئی پیشانی ' گہری براؤن روشن آنکھیں ' سیدھی کھڑی ناک ' چھوٹی چھوٹی مونچھوں کے بیچ ہمہ وقت ٹھہرا دھیما سا تبسم ان کی خوش مزاجی کا آئینہ دار تھا۔ پروقار انداز میں اٹھی سیدھی گردن ' ان کے مضبوط چوڑے شانے پہاڑوں کی طرح اٹل ارادوں کو ظاہر کرتے تھے۔ ان کا ایک ایک نقش سیدھا دل میں اتر جانے والا تھا۔ میں دل ہی دل میں سراہے بنا نہ رہ سکی۔ میرے دل نے چپکے سے اس رب رحمٰن سے اس جیسا ہم سفر ملنے کی بے ساختہ دعا مانگی۔

ہمارے درمیان پیشہ ورانہ بات چیت تھی۔ وہ مزاجا" سنجیدہ کافی سنجیدہ تھے۔ ہماری ملاقات عموما" فلائٹ پر ہی ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد کچھ ملاقاتیں اتفاقا" ہوئیں پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ان اتفاقات میں دونوں فریقوں کی مرضی بھی شامل ہونے لگی۔ ہمارے درمیان موبائل نمبرز کے تبادلے ہوتے ہی میسجز اور فون کالز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہماری حیثیت ابھی اک دوسرے کے دل میں غیر واضح تھی لیکن میں کیپٹن میر عمر کے ساتھ کی عادی بننے لگی تھی۔ ہر وقت ان کے ساتھ رابطے میں رہنا مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ ہماری پسند ناپسند ملنے لگی تھی۔ یوں کہیے کہ میں اب میر عمر کی اسیر بنتی جا رہی تھی۔ ہماری باتیں گھنٹوں گزر جانے کے باوجود ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ہم اک دوسرے کے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اک عجیب سی خوشی ' ایک عجیب سا سکون سا ملنے لگا تھا۔ ہم اکثر پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے تنہا ساتھ وقت گزارتے لیکن میر عمر نے کبھی حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کی۔

پتا نہیں یہ یقین و اعتبار کی کون سی حد تھی۔ آج کے اس نفسا نفسی کے دور میں ایسی حیران کن شخصیت کے مالک بہت کم ملتے ہیں۔ واقعی خاندانی شرافت اپنا اثر ضرور رکھتی ہے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان کے والد ریٹائر کرنل حافظ نوید الرحمٰن مذہبی شخصیت کے مالک تھے۔ والدہ ہاؤس وائف تھیں۔ گھر کا ماحول خاصا مذہبی ٹائپ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کیپٹن میر عمر اپنے دیگر کولیگز کے برعکس "نو اسموکنگ ' نو ڈرنک ' نو کلب" کا اشتہار تھے۔ بلاشک و شبہ وہ دنیا کے بہترین مردوں میں سے ایک تھے۔ میں اگر ان سے متاثر ہو رہی تھی تو یہ بلاوجہ نہیں تھا۔ وہ تھے ہی اس قابل کہ ان کے ہمراہی پر فخر کیا جائے۔

میں ابھی تک انہیں سر کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی۔ ان کے ٹوکنے پر میں نے احتراما" انہیں میر جی کہنا شروع کر دیا۔

ہم دونوں کو ہی ساحل سمندر بہت پسند تھا۔ فلائٹ لے کر ہم جس ملک میں جاتے ' اگر وہاں سمندر ہوتا تو ہم وہاں ضرور جاتے۔ ساحل پر قدم سے قدم ملا کر نرم و گداز ریت پر ننگے پاؤں دور تک چلتے۔ انسان کا موڈ جتنا بھی اداس ہو ' ریت کی گدگداہٹ انسان کو کھلکھلانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ آفتاب جب سمندر کی موجوں کو الوداع کہہ رہا ہوتا ہے تو ایسے لگتا کہ جیسے سارے جہاں کا سونا اکٹھا کر کے سمندر میں ڈال دیا ہو۔ تاحد نظر صرف سنہرا پن ہی دکھائی دیتا ہے اور ان سنہری لمحوں میں ' میں جب میر جی کے روشن چہرے کی جانب دیکھتی تو وہاں مجھے محبت کی کتنی ہی قندیلیں اپنے ہم کی جلتی ہوئی نظر آتیں اور میں دھیرے سے نظریں جھکا کے دل ہی دل میں ہمیشہ ان قندیلوں کے جلتے رہنے کی

دعا کرتی تھی۔

وہ میری کسی بات پر زور سے ہنسے تھے۔ میں ایک پل کو بالکل بھول گئی کہ میں نے ایسی کیا بات کہی تھی۔ مجھے ان کے جاندار قہقہے نے مسحور سا کر دیا تھا اور میں بے ساختہ سانس روکے انہیں تکنے گئی۔ یوں کہ اگر میں نے ذرا سی بھی جنبش کی تو یہ دلنشیں ساز تھم جائے گا۔

ہم قریہ قریہ، بستی بستی گھومتے۔ خوشبوؤں سے مہکے جنگل سے گزرتے ہوئے کبھی میں قوس قزح کے رنگوں جیسے پھولوں سے اپنا آنچل بھر لیتی تو میر جی شرارت سے میرا پھولوں بھرا آنچل میرے ہی اوپر الٹ دیتے۔

کبھی میر جی کے سنگ اونچے پربتوں کے چرنوں میں بہتے جھرنوں کے ساتھ میری اور میر جی کی ہنسی کے ترنم میں پرندوں کی نغمگی شامل ہو کر ماحول کو دلنشیں سروں کے ردھم سے نواز دیتی۔

کبھی برف کے چٹیل میدانوں میں اک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اسکیٹنگ کرتے تو کبھی بلند و بالا پہاڑوں کو سر کرنے نکل کھڑے ہوتے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کی کوشش میں خون کو رگوں میں منجمد کر دینے والی ٹھنڈ جب میری ہڈیوں میں سرایت کر کے مجھے مزید ایک بھی قدم اٹھانا محال کر دیتی اور میں نڈھال ہو کر گرنے والی ہو جاتی تو مجھے اپنے میر جی کی زندگی کی توانائیوں سے بھرپور آواز سنائی دیتی۔

سن اے کھلتے ہوئے شوخ رنگوں سی لڑکی!
چاہت کے جذبوں سے مہکتے گلابوں سی لڑکی!
حیا میں چھوئی موئی کے پتوں سی لڑکی!
ساحل کی نٹ کھٹ موجوں سی لڑکی!
زندگی سے بھرپور کھنکتی چوڑیوں سی لڑکی!
سرِ شام چوکھٹ پہ جلتے چراغوں سی لڑکی!
محرومیوں کے دور میں آس کے ستاروں سی لڑکی!
اندھیروں میں راہ دکھاتے جگنوؤں سی لڑکی!
سن اے اداس زرد موسموں سی لڑکی!
مجھے تمہاری ضرورت ہے اب
کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے اب!!!

یہ صدا سنتے ہی میں پھر سے جی اٹھتی اور میں برتی برف کا گولا سا بنا کر شرارت سے انہیں مار دیتی اور پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے منزل کی جانب قدم بڑھاتی چلی جاتی۔

زندگی کے اک اک پل کو انجوائے کرنا کیا ہوتا ہے، مجھے اب پتا چل رہا تھا۔ میر جی میرے اتنے مزاج آشنا ہو چکے تھے کہ کبھی کبھی مجھے یہ خیال گزرتا کہ شاید وہ میرا دل رکھنے کو میری ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں لیکن ان کے بے ساختہ لفظوں میں ریا کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ ہماری کیمسٹری اس حد تک ملنے لگی تھی کہ بسا اوقات اپنی اتنی انڈر اسٹینڈنگ پہ ہم خود بھی حیران رہ جاتے۔

ایک بار ہم جبل رحمت پر گئے، جہاں بابا آدم اور اماں حوا کا ملن ہوا تھا۔ وہاں ایک پتھر پر میر جی نے اپنا اور میرا نام کندہ کر کے اس پر ایک بوسہ ثبت کر دیا اور میں محبت کی اس انتہا پہ کتنی ہی دیر ساکت کھڑی رہی تھی۔

ایک دفعہ ہماری فلائٹ لیٹ ہو گئی تھی۔ ہم ویٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔ میں کاؤنٹر سے ان کے لیے ان کی پسندیدہ کولڈ کافی اور اپنے لیے کریمی ہاٹ کافی لے کر آئی تو وہ دو سانسوں میں اپنی کولڈ کافی پی گئے۔ پھر جب میں نے اپنا مگ اٹھایا تو وہ معصوم صورت بنا کر بولے۔

"اکیلے کافی پی رہی ہو؟"

"تو آپ سے کس نے کہا تھا، اپنی کافی غٹاغٹ چڑھانے کو؟" میں ان کے سوال پر حیران ہوئی۔

"غلطی ہو گئی۔" انہوں نے بے چارگی سے کہا پھر میرے ہاتھ سے میری کافی لے لی۔ "اب اسے شیئر کرو۔ اکیلے پیتے ہوئے مزا نہیں آئے گا تمہیں۔"

انہوں نے ایک گھونٹ بھر کر مگ میرے سامنے رکھ دیا۔ ان کے ہونٹوں میں دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے مگ اٹھا لیا۔ اس دن کافی پیتے ہوئے مجھے اتنا لطف آیا کہ میں کئی دنوں تک اس کیفیت کو فراموش نہ کر پائی۔

ایک رات ساڑھے دس بجے کے قریب فلائٹ لے کر ہم مالدیپ پہنچے تو انہوں نے آفیشل ریسٹ ہاؤس میں رات گزارنے کے بجائے سامان سمیٹ کر اپنے ہمراہ کہیں اور چلنے کو کہا۔ میں ان کے ساتھ لیموزین میں بیٹھ کر مالدیپ بیچ ریڈ ہارٹ کے بالکل کنارے ایک انتہائی رومانٹک سی لوکیشن پر موجود ہوٹل میں پہنچی۔ اس ہوٹل کی بیرونی خوب صورتی نے مجھے شدید متاثر کیا۔ شب کی تاریکی میں سرخ رنگ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ارد گرد گلابوں سے بھری کیاریاں اس دلکش انداز میں سیٹ کی گئی تھیں کہ ایک بھی پھول چھپا ہوا نہ تھا اور ان کی دلفریب مہک نے ماحول کو عجیب فسوں خیز بنایا ہوا تھا۔

ہوٹل کے فرسٹ فلور پر پہنچ کر جب میر جی نے ایک ہی کمرے میں اپنا اور میرا سامان رکھوایا اور کمرے میں آ کر بے تکلفی سے جوتوں سمیت بیڈ پر نیم دراز ہو گئے تو میرا دل ایک دم ان سے برا ہو گیا۔ ابھی میری سوچوں کا بدگمان گھوڑا کہیں تک دوڑا تھا کہ میر جی مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

"اوکے ڈیر! کچھ دیر آرام کرو۔ میں تھوڑی دیر میں تمہیں کال کروں گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنا بیگ اٹھایا اور میرے بالکل سامنے والے کمرے کا دروازہ کھول کر ہاتھ ہلاتے اندر چلے گئے اور میں اپنے کمرے کے دروازہ کا ہینڈل تھامے کچھ لمحے پہلے آنے والی سوچوں پر جی بھر کر شرمندہ ہوئی، پھر سر جھٹک کر بیڈ پر اسی جگہ آ بیٹھی جہاں کچھ دیر پہلے میر جی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سرخ رنگ کی مخملی بیڈ شیٹ پر نیم دراز ریڈ ہارٹ شیپ کشن بازوؤں میں دبائے نیند کی بھول بھلیوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ میسج ٹون نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

"نیچے لابی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔"

میں نے ٹائم دیکھا تو ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے میرا سونے کا بھرپور موڈ ہو رہا تھا۔ دس گھنٹے کی فلائٹ نے مجھے تھکا دیا تھا لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ میر جی بلائیں اور میں نہ جاؤں۔ ضرور کوئی خاص بات ہو گی جو انہوں نے مجھے اس ٹائم بلایا ہے اور ساتھ ہی پہلی بار فرمائش بھی کی تھی کہ میں تیار ہو کر آؤں۔

فلائٹ تو وہ بھی لے کر آئے تھے۔ تھکن تو انہیں بھی ہوئی ہو گی لیکن اس کے باوجود وہ تیار تھے تو مجھے بھی اب ہر صورت جانا ہی تھا۔

میں نے جلدی سے اٹھ کر سوٹ کیس کھولا اور پہننے کے لیے کپڑے دیکھنے لگی۔ ارد گرد کے ماحول کا یا میر جی کی فرمائش کا اثر تھا کہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس وقت میرے پاس ایک بے حد خوب صورت اسٹائلش سا سوٹ ہوتا مگر اس وقت میرے پاس عام روٹین کے کپڑے تھے اور میرا بیگ عموماً" ایسے ہی کپڑوں سے بھرا ہوتا کیونکہ فلائٹ پر تو یونی فارم ہوتا تھا۔۔۔ اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ پندرہ دن قبل حرا کے ساتھ شاپنگ کے دوران خریدا ہوا وہ سفید سوٹ اس بیگ میں موجود تھا مگر اس کے ساتھ دیگر لوازمات نہ تھے۔ مثلاً" جیولری وغیرہ پھر میں نے اپنے آپ کو یہ مغرورانہ تسلی دی کہ میرے حسن کو ان مصنوعی سہاروں کی ضرورت ہے ہی نہیں۔

میں نے اپنے لمبے سیاہ چمکیلے بالوں کو برش کر کے کھلا چھوڑ دیا۔ لبوں پر پنک شائنر اور آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی لکیر ڈالی۔ سفید نازک سی سینڈل پہن کر میں نے آنچل سر پر ٹکایا مجھے صرف ایر ہوسٹس جاب میں ہی سر پر اسکارف لینے کی عادت نہیں تھی۔ خالہ ماں نے اٹھنے بیٹھنے پہننے اوڑھنے سارے مشرقی اوصاف سکھا رکھے تھے۔

جلدی سے موبائل پاؤچ میں ڈالا اور لفٹ کے ذریعے جیسے ہی لابی میں آئی، میر جی کو اپنا منتظر پایا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جس دلکش انداز میں مسکرائے اور جس طرح ان کی خوب صورت آنکھیں جگمگا اٹھی تھیں۔ میں فوراً" سمجھ گئی تھی کہ میں انہیں بہت اچھی لگی ہوں۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باہر آئے تو آتے

جاتے لوگوں کی چونکتی نظریں ستائشی انداز میں ہمیں سراہ رہی تھیں۔ ڈارک بلو شرٹ میں میرجی خود بھی بہت گریس فل لگ رہے تھے۔

پھر ہم لیموزین میں بیٹھ کر ساحل پر پہنچے جہاں بہت ساری کشتیاں کھڑی تھیں۔ جس میں سب جوڑے بیٹھ رہے تھے۔ آج ویلنٹائن نائٹ تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر یاد آیا۔ میں بے اختیار مسکرادی۔ ہم دونوں بھی ایک بے حد خوب صورت قمقموں اور سرخ گلابوں سے سجی بوٹ میں بیٹھ گئے۔ جیسے ہی پورے بارہ بجے "آٹومیٹک" کشتی ہم دونوں کو لے کر سمندر کی انجانی راہوں پر چل پڑی تھی۔

میں سمندر کی سبک لہروں کی دلکشی پر نظر جمائے ہوئے تھی کہ میرجی نے سرخ گلابوں کا ایک بڑا سا بوکے جاپانی اسٹائل میں مجھے پیش کیا۔

میں خوشی سے اپنی جگہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔ پھر سرخ کلر کا بہت خوب صورت ٹیڈی بیر جس کے پیٹ پر ایک سلور کلر کا دل بنا ہوا تھا۔ جیسے ہی میں نے اس دل کو چھوا اس میں سے "آئی لو یو" کی آواز آئی۔ میں بے ساختہ کھلکھلا اٹھی۔ ابھی میں ان ہی چیزوں سے محظوظ ہو رہی تھی کہ انہوں نے ایک سرخ رنگ کی مخملی ڈبیا میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ میں نے حیرانی سے انہیں دیکھتے ہوئے ڈبیا کھولی تو اندر اسٹار شیپ میں وائٹ گولڈ کے چھوٹے چھوٹے ٹاپس تھے جن کے بالکل سینٹر میں ننھا سا ڈائمنڈ جگمگا رہا تھا۔

"اور یہ چاکلیٹ بھی۔ آئی ایم سوری۔۔۔ یہ ریڈ کلر میں ملی ہی نہیں۔" انہوں نے معصومیت سے کہا اور میں ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تم نے ایک بار بتایا تھا کہ تمہیں سمندر کنارے رات بتانا بہت اچھا لگتا ہے۔ کیسی لگی یہ سیلیبریشن۔" میرجی نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور سامنے والے تختے پر جا بیٹھے۔ میں خود کو پور پور ان کی محبتوں کے ساگر میں ڈوبتی محسوس کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے پوری دنیا میں میرجی اور ان کی محبت کے سوا کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"آپ۔۔۔ میرجی! آپ بہت اچھے ہیں۔ بہت اچھے۔"

جذبات سے بوجھل مجھے اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"میں بھی آپ سے بہت محبت کرنے لگی ہوں۔" میں ان کے پاس جا بیٹھی۔ انہوں نے میرے شانوں کے گرد اپنا بازو حمائل کر دیا۔

"تمہیں یہ سب اس لیے اچھا لگ رہا ہے کہ تم فرسٹ ٹائم اس کیفیت سے گزر رہی ہو جبکہ میں بہت پہلے ہی یہ سب فیل کر چکا ہوں۔ تمہاری اور میری عمر میں بہت فرق ہے نا۔"

ماحول کی فسوں خیزی اپنے عروج پر تھی۔ وہ مسحور کن لہجے میں دھیرے دھیرے بول رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ موجوں کا شور بھی تھم سا گیا ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ میرجی کی باتوں کو آب حیات کی مانند قطرہ قطرہ اپنے دل میں اتار رہی ہیں۔ میرے آئیڈیل میرے میرجی میرے دل کی سلطنت کے بلا شرکت غیرے مالک بن گئے تھے۔ میں اس وقت دل و جان کی آمادگی سے خود سپردگی کے عالم میں مدہوش سی ہو رہی تھی کہ میرجی نے غیر محسوس انداز میں مجھے خود سے الگ کیا اور بوٹ کے وی شیپ والے حصے میں جا کھڑے ہوئے۔ میں ان کی ایک دم یوں بیگانگی اور بے رخی پر الجھ سی گئی۔

ستاروں سے بھرا آسمان بہت نزدیک لگ رہا تھا۔ یہ حسین سا حسن اتفاق ہی تھا کہ آج فروری کی چودہ تاریخ ہی نہیں تھی بلکہ چاند کے جوبن کی بھی چودہ تاریخ تھی اور چاندنی کا طلسم اندھیری رات کی تاریکیوں میں سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ستارے کھلکھلا رہے تھے۔ ہوائیں محبت کرنے والوں کے لیے ملن رت کے رومانوی نغمے گا رہی تھیں اور ساحل کی موجوں کی تو آج اٹھان ہی غضب کی تھی۔ وہ ایسے اٹھ رہی تھیں جیسے ایک حسین دوشیزہ کچی نیند سے اٹھ کے انگڑائی لے اور کسی کو اپنی جانب متوجہ پا کر ہنستے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھوڑ دے۔ ایسے ہی لہریں ایک دم سے اوپر کو اٹھتیں اور ایک جھٹکے سے اپنے محبوب سمندر کی ذات میں ایسے ضم ہو جاتیں کہ محبت اور محبوب کی پہچان ہی ختم ہو جاتی۔ میں بھی اس لمحے اپنے محبوب کی محبت میں ایسی ہی دیوانی بننا چاہتی تھی۔ میں بھی تو یہی چاہتی تھی کہ وہ میرا سارا زنگ اتار کے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنے رنگ میں رنگ لیں مگر میرجی ایک دم اجنبی سے بن گئے۔ یوں اچانک خاموش ہو کر مجھ سے دور جا کھڑے ہوئے تھے کہ میں حیران رہ گئی۔

میں جھجکتے ہوئے ان کے پاس جا کھڑی ہوئی اور ہچکچاتے ہوئے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"کیا ہوا میرجی!"

انہوں نے آہستہ سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ ان کے ہاتھ میں مجھے غیر معمولی گرماہٹ محسوس ہوئی تھی۔ ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔ میں نے پھر ہمت کر کے پوچھا۔

"میرجی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"نائلہ۔۔۔ سائیلنٹ پلیز۔ میں اس وقت صرف خاموشی چاہتا ہوں۔"

اپنی ذات کی اس نفی پر میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میں واپس تختے پر بیٹھ گئی۔ وہ یوں ہی پیٹھ موڑے کھڑے رہے۔ نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ وہ پلٹے۔ قریب آئے۔ میری سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر لمحے بھر کے لیے ان کے تاثرات تبدیل ہوئے۔

"میرا خیال ہے۔ واپس چلتے ہیں۔" وہ مخصوص محبت و حلاوت اس وقت ان کے لہجے میں مفقود تھی۔ انہوں نے کشتی کو بیک کرنا شروع کر دیا۔ میں اس وقت شدید ترین توہین محسوس کر رہی تھی۔ مجھے بے اختیار رونا آ رہا تھا۔ میں بوٹ کے آخری سرے پر جہاں سمندر کی بپھری موجیں اپنے طاقت ور ہونے کا بھرپور احساس دلا رہی تھیں، اپنے دونوں بازو بوٹ کی دیوار پر رکھے آگے کو جھکی اس طرح رو رہی تھی کہ میرے آنسو سمندر کے سینے پر گر رہے تھے اور لہریں انہیں اپنے رنگ میں رنگے جانے کہاں سے کہاں لیے جا رہی تھیں اور کہنے والے کہہ دیتے ہیں کہ سمندر کا پانی اتنا نمکین کیوں ہوتا ہے۔ کیا پتا صدیوں سے ان پانیوں میں کتنے محبت کرنے والوں کے آنسو شامل ہوتے آ رہے ہیں؟

مجھے میرجی کے اس رویے نے بہت ہرٹ کیا تھا۔ مجھے آسمان سے، چاند ستاروں سے، سمندر کی موجوں سے، فضاؤں سے، ہواؤں سے، خوشبوؤں سے، رنگوں سے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ سب میری توہین پر ہنس رہے ہیں کہ دیکھو ابھی کچھ دیر پہلے دل ہی دل میں یہ پگلی سی البیلی سی لڑکی دل ہی دل میں خود کو سب سے زیادہ خوش قسمت اور حسین سمجھ رہی تھی اور اب دیکھو ذرا اس راج ہنسوں کی شہزادی کو۔۔۔ کیسے اپنی بے قدری پر نیر بہا رہی ہے اور اس کا رومیو منہ اس سے موڑے کھڑا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ان دونوں کے چہرے محبت کی الوہی روشنی سے جگمگا رہے تھے اور اب۔۔۔ میں نے کنکھیوں سے میرجی کو دیکھا کہ شاید انہیں احساس ہو گیا ہو مگر وہ ویسے ہی کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اب ان سے کبھی بات نہیں کروں گی۔

بوٹ جہاں سے چلی تھی جیسے ہی وہیں آ کے رکی، میں بھاگتی ہوئی بوٹ سے اترنے لگی۔ بے دھیانی میں میرا پاؤں بل کھا گیا اور میں سمندر میں جا گری۔ صد شکر کہ اس طرف پانی کم تھا۔ میرے پیچھے آتے میر جی نے "فوراً" سے پیشتر چھلانگ لگا کر مجھے بچا لیا۔

"آر یو اوکے نائلہ!" ایک دم سے ان کے لہجے میں محبت اور فکر امڈ آئی تھی۔ میرے پاؤں میں موچ آ گئی تھی۔ درد کی شدت مجھے ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہونے دے رہی تھی۔ انہوں نے میرا سارا وزن اپنے کاندھے پر ڈال کر مجھے کھڑے ہونے میں مدد دی تھی۔ رو تو میں پہلے سے ہی رہی تھی۔ اب کھل کے رونے کا موقع مل گیا تھا۔ میں ان کے کاندھے سے لگ

کرزوروشور سے رونے لگی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ جس کے سلوک سے دل برداشتہ ہو کر میں اب کبھی نہ بولنے کا فیصلہ کرچکی تھی، اب اسی کے سینے سے لگی سسک رہی تھی۔

میرجی نے فون کرکے مالدیپ کی ایمرجنسی موبائل سروس بلوائی۔ موبائل سروس نے آتے ہی میرے پاؤں پر اسپرے کرکے اسکن کلر کا موزہ سا پہنا دیا تھا جسے پہنتے ہی میرے درد میں نمایاں کمی محسوس ہوئی تھی۔ میرجی کے سہارے ہی میں ہوٹل میں اپنے کمرے تک پہنچی۔ انہوں نے مجھے پین کلر دی اور سکون سے سوجانے کی تلقین کرکے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

میں ان کے اس پل پل بدلتے مزاج پہ حیرانی سے سوچتے سوچتے سوگئی۔

☼ ☼ ☼

"کیسی طبیعت ہے اب۔" صبح کے وقت ان کا میسج موصول ہوا۔

"ٹھیک ہوں۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے جواب بھیجا۔

"میں رات والے رویے پر معذرت چاہتا ہوں۔" ایک اور میسج آیا۔

"سزا ملے گی آپ کو۔" میں نے دھمکی دی۔

"اگر کسی سے کچھ غیر اختیاری طور پہ سرزد ہوجائے تو اسے سزا نہیں دیتے۔ بلکہ بڑے دل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے معاف کردیتے ہیں۔" درخواست آئی۔

"میرجی! آپ نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے۔ پلیز آئندہ اس طرح مجھے ہرٹ مت کیجیے گا۔" میں میسج کرتے کرتے پھر رو پڑی۔

"ایم سوری نائلہ۔۔۔ آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔"

"ویسے ہوا کیا تھا آپ کو؟" مجھ سے رہا نہیں گیا۔

"نائلہ! اس وقت تم بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے تمہارے گرد اک نور کا ہالا بنا ہوا ہے۔ میں صرف تمہاری خوشی کے لیے ادھر لے کر گیا تھا۔ میں سمجھتا تھا میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں۔ اپنے جذبات پر کنٹرول رکھ سکوں گا مگر مجھے لگا میں اپنے دعوے پر قائم نہیں رہ سکوں گا۔ نائلہ۔۔۔ میں۔" انہوں نے میسج ادھورا چھوڑ دیا۔ مگر میں سمجھ گئی تھی۔ میری نظر میں اور میرے دل میں میر جی کی قدرو منزلت مزید بڑھ گئی۔ مجھے اپنے انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔

اس دن کے بعد ہم باقی پروگرام کینسل کرکے آن ڈیوٹی ہوگئے۔

مگر ہم نے فلائٹ کے علاوہ ملنا کم کردیا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔ مگر نہ ان کی طرف سے اصرار ہوا نہ میں نے کوئی کوشش کی مگر پھر جس دن میری مصر کی فلائٹ تھی میں نے انہیں دریائے نیل کے کنارے شام پانچ بجے ملنے کے لیے بلایا۔

میں مقررہ وقت پر اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ گئی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد میرجی آف وائٹ شرٹ اور ڈارک براؤن پینٹ پہنے دکھائی دیے۔ موسم قدرے سرد تھا۔ اس لیے انہوں نے شانوں پر شال پھیلائی ہوئی تھی۔ خود میں بھی گرم لباس میں تھی۔ بہت سارے لمحے یوں ہی گزر گئے۔ وہ میری طرف منتظر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"اس واقعے کے بعد میں نے اپنے اور آپ کے ریلیشن کے بارے میں بہت سوچا ہے۔ پارسائی کا دعوا نہیں کرتی مگر یوں ہی۔۔۔ بس صرف۔۔۔ ملتے رہنا۔"

میں بولتے بولتے اٹک گئی۔ میرجی یوں ہی مجھے دیکھتے رہے۔ میں نے سوچا۔۔۔ مجھے آپ سے الگ ہوجانا چاہیے۔۔۔ مگر۔۔۔ یہ سوچتے ہی میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل ڈالا ہو۔ کیونکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں اور میرجی۔۔۔ میرجی۔۔۔ آپ مجھ سے شادی کرلیں۔ میں نم آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور آج وہ مجھے دیکھنے

کے بجائے۔ دریائے نیل کے پانی کو تک رہے تھے۔ خاموشی کے یہ لمحے مجھ پر بہت بھاری گزر رہے تھے۔ میں ان کا ارتکاز توڑنا نہیں چاہتی تھی مگر مجھ سے اب برداشت بھی نہیں ہو رہا تھا۔

"میرجی! بتائیں نا۔۔۔ میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے۔"

"نائلہ! تم بہت اچھی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں آل ریڈی میرڈ ہوں اور میری اپنی وائف سے یہ کمٹمنٹ تھی کہ میری لائف میں اس کے سوا اور کوئی لڑکی نہیں آئے گی۔ میں ان میرڈ ہوتا تو باخدا ایک منٹ بھی نہ لگاتا سوچنے میں۔۔۔ مگر۔۔۔ میں مجبور ہوں۔۔۔ میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں چھپایا نائلہ! مگر۔۔۔ شاید۔۔۔ میں تمہارے معاملے میں خود کو بہت بے بس محسوس کرتا ہوں۔"

"آپ اپنی وائف سے پرمیشن لے لیں۔ میں یقین دلاتی ہوں۔ میں آپ کے لیے کبھی پرابلم کا باعث نہیں بنوں گی۔ پلیز میرجی! میں نے آپ کے علاوہ کبھی کسی کے بارے میں اس طرح سے نہیں سوچا۔"

"پلیز نائلہ۔۔۔ اٹس امپاسبل۔۔۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔۔۔ بلکہ تم بہت اچھی ہو۔۔۔ مگر۔۔۔ یہ میری بدقسمتی کہہ لو کہ میں میرڈ ہوں۔"

ان کے دوٹوک انداز پر میں خاموش رہ گئی۔ پھر نہ جانے کتنے لمحے اسی خاموشی کی نذر ہوگئے۔

"کوئی اور بات کرو نا۔۔۔ بہت دنوں سے تمہاری آواز نہیں سنی۔" تھوڑی دیر بعد بہت بھاری آواز میں انہوں نے کہا۔

"اب آپ کبھی میری آواز نہیں سن پائیں گے۔۔۔ میں۔۔۔ میں آپ سے کوئی کانٹیکٹ نہیں رکھوں گی۔" میں نے کس دل سے یہ کہا تھا، میں ہی جانتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ پھر میں چلتا ہوں۔" وہ یکدم ہی بے رخی سے کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور میں جہاں کی تہاں بیٹھی انہیں لمحہ بہ لمحہ خود سے دور جاتے دیکھ رہی تھی۔ صدمے کی شدت سے میرے آنسو آنکھوں میں منجمد ہوگئے۔

کیا روح سے روح کے ساتھی کا ساتھ بس اتنا تھا۔ چھ ماہ اور دو دن۔۔۔ یہ تھی میری محبت کی کہانی۔۔۔ کیا میں نے برسوں اس شخص کے لیے اپنی محبتیں تمام تر سچائیوں اور شدتوں کے ساتھ سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں کہ وہ مجھے یوں اچانک چھوڑ جائے گا؟

میرا دل سکڑتا جا رہا تھا۔ میرے اندر اس وقت ایک حشر برپا تھا۔ میں بظاہر ساکت وجامد نظروں سے اس رستے کو بے بسی سے تک رہی تھی۔ جس پہ جانے والے نے اپنے قدموں کے نشان بھی نہ چھوڑے تھے۔ میری ذات ایک بار پھر زلزلوں کی زد میں تھی۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یوں رستہ بدل جائیں گے۔ وہ شادی شدہ تھے۔ مجھے اول روز سے معلوم تھا مگر مجھے لگا۔ شاید میری گنجائش نکل آئی ہے ان کی زندگی میں۔ جب ہی تو وہ میری طرف بڑھے ہیں۔۔۔ مگر۔۔۔ مجھے ان کے ساتھ گزارے سارے لمحے یاد آنے لگے۔۔۔ اتنی محبت، اتنی اہمیت آدمی اسے ہی تو دیتا ہے۔ جس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔۔۔ تو کیا وہ بھی عام مردوں کی طرح بس وقت گزاری۔۔۔ محض دل لگی۔۔۔؟

میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور آج میرا غمگسار دریائے نیل بنا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں سعودی عرب چلی آئی مگر اس بار میں حرا سے نہیں ملی۔ میں نے مکہ کے نزدیک ترین ہوٹل میں کمرا بک کروالیا تھا۔ میں اس قدر ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی کہ میں نے دنیا کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مجھے میرے ہر مسئلے کا حل موت میں نظر آرہا تھا۔ مجھے صرف اپنی ای میل کے جواب کا انتظار تھا۔ صبح ساڑھے دس بجے کے قریب مجھے بذریعہ میل اپنے سوال کا جواب موصول ہوا۔

"محترمہ نائلہ گل صاحبہ!

"آپ کی خاصی پریشان کن ای میل موصول

ہوئی۔ آپ جیسے بھی حالات کا شکار ہیں۔ پلیز اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہوں۔

اللہ عزوجل کے حضور استغفار کریں اور آئندہ کے لیے توبہ کرلیں۔ وہ رحیم ہے۔ معاف کرنے والا ہے۔

برائے مہربانی اللہ پر توکل کرتے ہوئے اللہ کی جانب لوٹ آیئے کہ بے شک ہمیں اسی کی طرف لوٹ کے جانا ہے۔

آپ کے لیے دعاگو۔ مفتی فراز شاہ۔"

میری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ مجھ سے اپنی سسکیاں دبانا دشوار ہوگیا۔ بے قراری' بے چینی مجھے کسی پہلو چین نہیں لینے دے رہی تھی۔

میں طواف کعبہ کی نیت سے حرم شریف چلی آئی تھی۔ طواف کے بعد میں عورتوں والے حصے میں نسبتاً" الگ تھلگ سا کونا دیکھ کر میں نے دو نفل حاجات پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو مناجات کے سب الفاظ آنکھوں سے بہنے لگے۔ حرمت والے گھر کے سامنے میرا سر خود بخود سجدہ ریز ہوگیا تھا۔ ہچکیوں سے روتے ہوئے میں کیا کیا کہے جارہی تھی' مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک سارے دکھ میں نے کھول کر رکھ دیے تھے۔ میری داستان غم طویل ہوتی جارہی تھی۔ مجھے گردوپیش کا بالکل ہوش نہیں تھا۔

"ہمت سے کام لو بیٹا! حوصلہ کرو۔ کتنی دیر سے آپ رو رہی ہو۔"

کسی اجنبی مہربان نے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھا تھا مگر صبر کے بندھن آج کچھ اس طرح ٹوٹے تھے کہ ضبط کا یارا نہ رہا تھا۔ میرے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ شدت گریہ سے میں نیم جان ہوئی جارہی تھی۔ اس ہم زبان اجنبی مہرباں خاتون نے ایک گلاس میں آب زم زم بڑھایا۔ میں ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گئی۔ پھر شاید آب زم زم نے اپنا اثر دکھایا تھا کہ میرے تڑپتے دل کو تھوڑا قرار آیا۔

میں نے اتنی دیر میں پہلی بار نظریں اٹھا کر اپنی اس اجنبی مہرباں کو دیکھا۔ جو نہایت شفقت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ پچاس پچپن سال کے لگ بھگ چمکتے روشن چہرے والی اس خاتون نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"پہلے سے بہتر فیل کررہی ہو؟"

میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"بیٹا! کس کے ساتھ آئی ہو یہاں۔ کون ہے تمہارے ساتھ؟"

میری مہربان نے لاعلمی میں میری دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے پھر لبالب بھر گئیں۔ اب میں انہیں کیا بتاتی کہ قسمت کبھی مہربان ہوئی ہی نہیں۔ ورنہ گھر بنانے اور بسانے کی تمنا کسے نہیں ہوتی۔ اسی اثنا میں ایک چار سال کی گول مٹول سی بچی سر پہ اسکارف اوڑھے اس خاتون کی گود میں آکر بیٹھ گئی۔ وہ پیاری سی بچی ان کی پوتی آمنہ نور تھی۔ اس خاتون نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بہت محبت سے کہا۔

"بیٹا! اب اس طرح بے قرار ہو کر مت رونا۔ خود کو ٹوٹ کر بکھرنے مت دینا۔ لوگ ٹوٹے ہوئے مکان کی اینٹیں تک اٹھا کرلے جاتے ہیں۔ محرومیوں کے اندھیرے جب تمہیں خوفزدہ کرنے لگیں تو اللہ کو یاد کرنا۔ وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ' تمہارے پاس ہے۔ تم مجھے بہت اپنی اپنی سی لگی ہو بیٹا! اگر تم دوبارہ مجھ سے ملو تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ یہ میرا نمبر رکھ لو۔" انہوں نے ایک چٹ پر اپنا نمبر لکھ کر مجھے تھمایا۔ پھر مجھ سے میرا اسیل نمبر بھی مانگا۔ میں نے بھی انکار نہ کیا۔ انہوں نے عربی انداز میں میرے ماتھے پہ بوسہ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کے جانے کے بعد میں سورہ بقرہ کی تلاوت کرنے لگی۔ دھوپ سے بھری دوپہر میں حرم کے ٹھنڈے صحن میں بیٹھے ہوئے مجھے لگا کہ میں ننگے پاؤں ریگستان میں چلتے ہوئے ایک دم نخلستان میں آگئی ہوں۔ حجر اسود کو چومتے ہوئے یوں محسوس ہوا کہ کسی

نے میرے زخموں پہ خوشبودار ٹھنڈے پھاہے رکھ دیے ہوں۔ میرا ذہن' میرا دل' میری روح تک آسودہ ہورہی تھی۔ میرا بے چین دل قرار پکڑتا جارہا تھا۔ شاید مجھے صبر کی توفیق ملنا شروع ہوگئی تھی۔

میں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردیا۔



میں حرا سے ملنے جدہ گئی۔ لفٹ کے انتظار میں کھڑی تھی کہ اس دن والی مہربان ہستی آمنہ نور کا ہاتھ پکڑے لفٹ سے نکلیں۔ مجھے دیکھ کر بے ساختہ لپک کر میرے گلے آلگیں۔

"مجھے یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی تم سے دوبارہ ملاقات ہوجائے گی۔" وہ میری پیشانی چومتے ہوئے خوشی سے بولیں۔ میں بھی مسکرادی۔

"آؤ۔۔۔ میرے گھر چلو۔" وہ پیار سے بولیں۔ میں نے حرا کا بتایا تو کہنے لگیں کہ میرے ہاتھ کی چائے پی کر پھر اپنی سہیلی کے پاس چلی جانا۔ میں مسکرا کر ان کے پیچھے ہولی۔

سادگی اور نفاست سے سجے ٹی وی لاؤنج میں زینب آنٹی نے مجھے بٹھا کر کچن کا رخ کیا۔ آمنہ نور اپنی گڑیا لے کر میرے پاس آبیٹھی۔ اس نے اپنی گڑیا کو اپنے ساتھ لگا کر شرارت سے پوچھا۔

"آنٹی! میں زیادہ پیاری ہوں یا میری ڈول؟" میں اس کے اس سوال پر بے ساختہ ہنس پڑی۔ تب ہی زینب آنٹی ٹرالی گھسیٹتے ہوئی چلی آئیں۔

"بیٹا! آپ کو اپنے گھر میں دیکھ کر۔۔۔ مجھے بہت خوشی ہورہی ہے۔" مجھ سے چینی کا پوچھتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ان کے گھر میں ان کے ہزبینڈ اور ان کا اکلوتا بیٹا احمد نور ہوتے ہیں۔ اس وقت عصر کی نماز پڑھنے گئے ہوئے ہیں۔ آنے ہی والے ہوں گے۔ ان کے بقول ان سے مل کر مجھے بہت اچھا لگے گا۔ میں نے "رسما" مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ نے آمنہ نور کی ماما کا تعارف نہیں کروایا۔"

میری بات سنتے ہی ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"آمنہ کی ممی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ ہم کراچی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پچھلے سال چھٹیوں میں ہم کراچی گئے ہوئے تھے۔ عائشہ اور احمد دونوں شاپنگ کرنے چلے گئے۔ آمنہ میرے پاس رک گئی۔ وہاں بم بلاسٹ ہوگیا۔ میری بہو تو اسی وقت دم توڑ گئی' جبکہ میرا بیٹا کمر پر لگنے والی چوٹ کے سبب ہمیشہ کے لیے وہیل چیئر کا محتاج ہوگیا۔ اس حادثے نے ہمارے گھر کی خوشیوں کو نگل لیا۔ عائشہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ بہت سلجھی ہوئی' نیک طبیعت' احترام کرنے والی۔ میرا احمد تو اب دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتا جارہا ہے۔ حالانکہ اس کی خوش مزاجی سے میرے گھر میں رونق لگی رہتی تھی مگر اب تو اسے ایک چپ سی لگ گئی ہے۔ اس کی خموشی اور سناٹے سے میرا دل ہول جاتا ہے۔" وہ آمنہ کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ "اگر یہ گڑیا ہمارے پاس نہ ہوتی تو شاید ہم سب دکھ کی شدت سے بولنا ہی چھوڑ دیتے۔"

مجھے حقیقتاً" بہت دکھ ہوا تھا ان کی بات سن کر۔ پر ہم انسان ایسے موقعوں پر کیا کرسکتے ہیں۔ سوائے تسلی دلاسے دینے کے۔

ڈور بیل بجی تو آمنہ نور اچھلتی کودتی دروازہ کھولنے بھاگی۔ پھر چند لمحوں بعد آٹومیٹک وہیل چیئر پر ایک ہینڈسم سے آدمی کی گود میں بیٹھی نظر آئی۔ ٹی وی لاؤنج میں آتے ہی وہ چہکی۔

"بابا! مجھے یہ آنٹی بہت اچھی لگی ہیں اور یہ آج سے میری فرینڈ بن گئی ہیں۔ میری فرینڈ اچھی ہے نا بابا!" احمد نور نے "رسما" مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ پھر اپنی والدہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ماما! میری چائے کمرے میں دے دیجئے گا۔" یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ زینب آنٹی چائے کے ساتھ کچھ اسنیکس رکھ کر احمد نور کو دینے چلی گئیں۔ اسی دوران عبدالعزیز صاحب بھی آگئے۔ زینب آنٹی نے تعارف کروایا۔

"یہ وہ ہی بچی ہے جو اس دن مجھے مکہ میں ملی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا۔"

"اچھا اچھا۔ یاد آگیا' بیٹا! کیسے ہو آپ؟" انہوں نے نہایت شفق لہجے میں پوچھا اور میرے سامنے والی کرسی سنبھالی۔ ہلکی پھلکی گفتگو میں احساس ہی نہیں ہوا وقت کا۔ حرا کا فون آیا تو میں چونکی۔

"کہاں ہو' دو بجے کہا تھا آنے کو۔ اب تو چار سے اوپر ٹائم ہو گیا ہے۔ تمہارے انتظار میں' میں نے لنچ بھی نہیں کیا۔ محترمہ کو کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ حد ہوتی ہے بدتمیزی کی۔" وہ حسب عادت نان اسٹاپ شروع ہو گئی تھی۔ میں زیر لب مسکراتے ہوئے اس کے چپ ہو جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے ہی وہ سانس لینے کو رکی تو میں نے کہا۔

"تم دروازہ کھولو۔ میں ابھی رہی ہوں۔" پھر فون بند کرکے میں نے آنٹی سے اجازت مانگی۔

"اس بلڈنگ کے آٹھ نمبر فلیٹ میں میری دوست رہتی ہے۔ میں کچھ دن اس کے پاس رکوں گی۔ مجھے جیسے ہی ٹائم ملا آپ لوگوں سے دوبارہ ملوں گی۔ مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

دونوں میاں' بیوی مجھے چھوڑنے دروازے تک آئے تھے۔

اوپر آئی تو حرا تھوڑا سا دروازہ کھولے میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ گرم جوشی سے گلے ملتے ہی وہ دوبارہ شروع ہو گئی۔

"کہاں رہ گئی تھیں تم۔ کب سے ویٹ کر رہی ہوں تمہارا۔"

"اندر چلو سب بتاتی ہوں تمہیں۔" میں اسے دھکیل کر اندر بڑھی۔ ڈرائنگ روم میں صوفے پر پاؤں پسارتے میں نے آرام سے اسے بتانا شروع کیا۔

"تمہاری بلڈنگ کے نمبر دو میں زینب آنٹی رہتی ہیں۔ میں ان کے ساتھ تھی۔ اتنی اچھی فیملی ہے کہ وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔"

"زینب آنٹی کی فیملی کو تم کیسے جانتی ہو؟" حرا نے اپنا چشمہ اتار کر رکھتے ہوئے پوچھا اور میں نے مختصراً مکہ والی ملاقات بتادی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ واقعی بہت اچھے لوگ ہیں۔ لاسٹ ایر ان کے ساتھ ایک ٹریجڈی ہو گئی۔ اس وجہ سے وہ لوگ بہت اپ سیٹ ہیں۔ ان کا ارادہ ہے مستقل طور پر کراچی شفٹ ہونے کا۔ ان کی بہو عائشہ بہت اچھی تھی۔ اس کے بعد زینب آنٹی نے احمد نور کی دوسری شادی کرنی چاہی۔۔۔ مگر ابھی تک کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جو احمد نور سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو۔" حرا نے سب عادت تفصیل سے ساری بات بتائی۔

"میرا تو نہیں خیال کہ انہیں ایسا مسئلہ ہو گا۔ بہت اچھی فیملی ہے۔ احمد نور سے بھی ملاقات ہوئی میری۔ زیادہ بات چیت نہیں ہوئی' مگر مجھے تو بہت معقول لگا۔" مجھے اچنبھا ہوا تھا۔

"نائلہ۔۔۔ احمد نور ہمیشہ کے لیے ڈس ایبل ہو چکا ہے۔ ایک بیٹی کا باپ بھی ہے۔ بوڑھے ماں' باپ ساتھ ہیں۔ کون سی لڑکی آج کے دور میں اتنی ذمہ داریاں اٹھانا پسند کرتی ہے۔"

"بات تو درست ہے تمہاری۔ لیکن اگر کوئی اللہ کی رضا کے لیے احمد جیسے انسان کو اپنی زندگی میں شامل کر لے تو۔۔۔"

"بہت مشکل ہے یار!" حرا نے میری بات کاٹی۔

"انسان کو ہر حال میں اپنا ظرف اور حوصلہ بڑا رکھنا چاہیے۔" میں نے ٹانگیں دوسرے صوفے پر رکھ کر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا تو حرا نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا تم میں اتنا حوصلہ' اتنا ظرف ہے؟ بولنا بہت آسان ہوتا ہے مگر اس ہمدردی کو عملی جامہ پہنانا بہت ہی مشکل کام ہے۔"

اس کی بات نے مجھ پر ایک لمحے کو چپ لگادی۔

"کیا ہوا خود پہ بات آئی تو میڈم چپ ہو گئیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ میرے ذہن کے پردے پہ ایک لمحے کو میر جی کی شبیہہ لہرائی پھر پتا نہیں کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔

"تم میری طرف سے ابھی میرا پروپوزل لے جاؤ حرا!"

حرا کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا نائلہ! مذاق کر رہی تھی میں۔ تم جتنی خوب صورت ہو۔ تمہارا ہزبینڈ بھی اتنی ہی شاندار پرسنالٹی کا مالک ہونا چاہیے کہ تم دونوں کو ساتھ دیکھ کر لوگ بے ساختہ چاند سورج کی جوڑی کہیں۔"

اس کی بات پر مجھے بے ساختہ چند ماہ پہلے مالدیپ ریڈ ہارٹ ہوٹل کی لابی کا منظر یاد آگیا۔ جب لوگ مڑ مڑ کر مجھے اور میر جی کو سراہتی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"چھوڑو یار! ہم بھی کیا باتیں لے بیٹھے ہیں۔ اتنے عرصے بعد ہم مل رہے ہیں۔ ساری ایکٹوٹیز بتاؤ اپنی۔ میرے پاس بھی بہت ساری باتیں ہیں کرنے کو۔" وہ سمجھی مجھے برا لگا ہے۔ اس کا کہنا' سو بات بدل دی۔

"کیا بتاؤں تمہیں۔۔۔ بس یہ سمجھ لو کہ کومے میں چلی گئی تھی۔ اب ہوش میں واپس آئی ہوں۔"

"چلو تمہارے ہوش میں آنے کی خوشی میں خوب شاپنگ کریں گے۔ ہوٹلنگ کریں گے۔ خوب ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔" اس نے میری بات کو مذاق میں لیا اور ہاتھ کا مکا بنا کر میرے آگے کیا تو میں نے اپنے ہاتھ کا مکا بنا اس کے مکے سے ٹکرا کر ڈن کر دیا۔

اس کا شوہر ایک ہفتے کے لیے آفیشل ٹور پر گیا ہوا تھا۔ سو ہمیں خوب آزادی تھی۔

مزے مزے کی باتوں کے دوران ہم نے مزے کی بریانی بنائی اور فریش فروٹ کریمی ٹرائفل بنایا۔ ہلکا سا انسٹرومینٹل لگا کر ڈائننگ ٹیبل پر کینڈل لائٹ ڈنر کرتے ہوئے خوب باتیں کیں۔

حرا کے بلند و بالا قہقہے سن کر میں ہمیشہ یوں ہی توانا ہو جایا کرتی تھی۔ بے شک اچھے دوست اللہ کا بہترین تحفہ ہوتے ہیں۔ میں اللہ کی شکر گزار ہوں کہ مجھے حرا جیسی دوست ملی۔

ہم ڈنر کرکے چھت پر آگئے۔

"نائلہ! اب تم بھی شادی کر لو۔ بہت پھر لیا تم نے ملکوں ملکوں۔" حرا نے اچانک کہا۔

"اچھا مشورہ ہے' وہ بھی مفت میں اور تمہیں پتا ہے' مفت میں ملی چیزوں کی انسان کبھی قدر نہیں کر سکتا۔ وہ چیزیں خواہ کتنی ہی انمول کیوں نہ ہوں' انسان گنوا دیتا ہے اور جب تک وہ گم ہوئی چیزوں کی اہمیت سے واقف ہوتا ہے' تب تک اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔" میں نے ہوا سے اڑتے بالوں کو کیچر میں سمیٹتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

"میں نے تم سے فلسفہ جھاڑنے کو نہیں کہا۔ بی سیریس نائلہ! تم کب تک بنجاروں کی طرح بستی بستی پھرتی رہو گی۔ کوئی اچھا سا ہمسفر ساتھ ہوتا تو جیون کا سفر اچھا کٹ جاتا ہے۔" اس نے رسان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کہاں سے ڈھونڈوں اچھا سا ہم سفر۔ ملا تو تھا ایک ایسا کہ جسے دل نے بے ساختہ ہم سفر بنانے کا سوچا۔ مگر وہ بزدل اور مجبوریوں کا مارا نکلا۔ اگر وہ تھوڑی سی ہمت کر لیتا تو آج میرا بھی اپنا گھر ہوتا۔"

دل کی باتیں دل ہی سے کرکے میں نے زبان سے کہا۔

"اپنے آئیڈیل پرسن کے سوا میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ اس معاملے میں کمپرومائز نہیں کر سکتی میں۔۔۔ زبردستی کسی کے ساتھ خوش رہنے کی ایکٹنگ نہیں ہو گی مجھ سے۔"

"بس کرو یار! یہ آئیڈیلزم کچھ نہیں ہوتا۔ خود کو بہلانے کے لیے حقیقت سے فرار کی باتیں ہیں۔ تم فضول کے نخروں پر اتری ہوئی ہو۔ وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔ خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ تم نے خود کسی کو گھاس نہیں ڈالی۔ ورنہ دس ایسے لوگوں کو میں جانتی ہوں جنہوں نے تمہیں پروپوز کیا۔ مگر

تم۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر جوس کا ایک گھونٹ بھرا۔
"میں زینب آنٹی کے بیٹے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔" میں نے کہا۔
"ارے تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔ میں تو مذاق میں کہہ رہی تھی۔ بھلا تم میں کیا کمی ہے، جو تم ایک ڈس ایبل سے شادی کرو گی اور جو پہلے سے میرڈ بھی ہے۔"
"انسانیت کے ناتے یہ کام کیا جا سکتا ہے۔"
"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے پتا ہوتا میری مذاق میں کہی بات کو تم یوں سر پہ سوار کر لو گی تو میں کبھی تم سے وہ بات مذاق میں بھی نہ کہتی۔"
اسے غصے میں آتے دیکھ کر میں خاموش ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

حرا کی ہمراہی میں ایک اچھا دن گزار کر میں گھر آ گئی۔ محمود سعید سے زبردست شاپنگ بھی کی اور ساحل سمندر پر بھی بہت سارا وقت گزارا۔ رات ہم دونوں کافی لیٹ سوئیں اور اہل جدہ کی طرح جمعے والے دن دیر سے اٹھنے کا موڈ تھا مگر چھ بجے کے قریب جو میری آنکھ کھلی تو پھر نہ لگی۔ کروٹیں بدل بدل کر جب میں تھک گئی تو اٹھ بیٹھی۔ چائے بنا کر بالکنی میں چلی آئی اور خود کو بکھری ہوئی سوچوں کے حوالے کر دیا۔
میں کیا تھی؟ کیا ہوں؟ اور مستقبل میں کیا ہو جاؤں گی؟ بہت سارے سوالیہ نشان میری نظروں کے سامنے محو رقص ہو گئے۔
میں پھر قنوطیت کا شکار ہو رہی تھی۔ اس دن حرم میں غلاف کعبہ کو تھام کر حجر اسود کو چوم کر آب زم زم سے برسوں کی پیاس بجھا کر رب رحمٰن کے حضور گریہ و زاری کر کے جو سکون کا دریا میرے دل کی بنجر زمین کو سیراب کرنے آیا تھا۔ لگتا تھا، آج وہ رستہ بدلنے کو تیار کھڑا ہے۔ میری ناشکری کی وجہ سے کہ میں رب رحمٰن کے ہوتے ہوئے پھر ایک عبدالرحمٰن کے لیے سسک رہی تھی۔
میر جی کی یاد کی آندھی پھر میری ذات کو مختلف حصوں میں بانٹ کر — اڑانے کو تیار تھی۔

میں خوف زدہ ہو گئی کہ اگر میں اب بکھری تو پھر شاید میں کبھی بھی سمٹ نہیں پاؤں گی۔ مر جاؤں گی۔ میں روتے ہوئے آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کرنے لگی۔ نہ جانے کتنی گھڑیاں بیتی تھیں۔ جب میرے بلکتے دل کو کچھ ٹھہراؤ محسوس ہوا تو میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ میری نظر سامنے سڑک پار کر کے بلڈنگ کی جانب آتے احمد نور پر پڑی۔ ان کی گود میں بیٹھی آمنہ نور نے بھی شاید مجھے دیکھ لیا تھا مسکراتے ہوئے مجھے ہاتھ ہلانے لگی۔ ساتھ انکل عبدالعزیز بھی تھے۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھ کر شفیق سی مسکراہٹ سے نوازا تھا۔ پھر وہ لوگ بلڈنگ کے مین گیٹ میں داخل ہو کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔
میں بالکنی سے ہٹ کر واش روم میں آئی اور تازہ پانی کے چھینٹے منہ پر مار کر خود کو نارمل کر رہی تھی کہ ڈور بیل ہوئی۔ حرا ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ سو مجھے دروازہ کھولنے جانا پڑا۔ تولیے سے چہرہ تھپتھپاتے ہوئے میں نے دوربین سے باہر جھانکا تو مجھے زینب آنٹی کھڑی نظر آئیں۔
میں نے دروازہ کھول دیا۔ انہوں نے سلام کے بعد اپنے مخصوص عربی انداز میں میرے ماتھے کا بوسہ لیا۔
"بیٹا! میں معذرت چاہتی ہوں کہ اتنی صبح صبح آپ کو زحمت دی۔ دراصل میں آپ کو لینے آئی تھی۔ آمنہ ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھی ضد کر رہی ہے کہ میں نے اپنی فرینڈ کے ساتھ ناشتا کرنا ہے۔ بیٹا! اگر تم مائنڈ نہ کرو تو ناشتا ہمارے ساتھ کرو۔" میں ہنس پڑی۔
"اوکے آنٹی! میں حرا کو بتا کر آتی ہوں۔"
میں نے سوئی ہوئی حرا کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ کیونکہ ٹریننگ کے دوران اس کا کمرا شیئر کر کے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ آوازوں سے اٹھنے والوں میں سے نہیں ہے۔ اس نے آنکھیں موندے موندے خمار آلود لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہے؟"
"میں زینب آنٹی کے گھر جا رہی ہوں۔ اٹھ کر مجھے ڈھونڈتی نہ پھرنا۔ میرے لیے مزے کے میکرونیز بنا کر

رکھنا، میں آ کے کھاؤں گی۔" اس نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں۔
"صبح صبح تم ان کے گھر جا رہی ہو، وہ بھی بن بلائے کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" اس کی آواز بھی نیند سے بوجھل تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"بنا بلائے نہیں جا رہی۔" اسپیشل انویٹیشن پر جا رہی ہوں۔ وہ خود مجھے لینے آئی ہیں سمجھیں! میں جا رہی ہوں۔ اٹھ کر اپنے خوب صورت ہاتھوں سے مزے کی میکرونیز ضرور بنا لینا۔" میں نے اس کے بال بگاڑ دیے۔
"میں نہیں بنا رہی تمہارے لیے میکرونیز۔ اپنی ہونے والی ساس سے فرمائش کرو۔" اس نے تنک کر کہا اور کمبل سر تک تان لیا۔
میں نے اسے ایسے ہی چھوڑا اور باہر آ کر جلدی سے اس کا عبایا پہنا۔ اسکارف سے سر کو اچھی طرح ڈھانپتے ہوئے میں باہر آ گئی۔ آٹومیٹک ڈور بند کر کے آمنہ نور کا ہاتھ پکڑے میں زینب آنٹی کے ہمراہ ان کے ڈائننگ روم میں داخل ہوئی، جہاں انکل عبدالعزیز اور احمد نور ناشتے کے لوازمات سے سجی ٹیبل پر موجود تھے۔ میرے سلام کا احمد نور نے خاموشی سے اور انکل عبدالعزیز نے گرم جوشی سے جواب دیا۔
آمنہ کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ احمد نور نے خفگی سے آمنہ کو دیکھا۔ میں سمجھ گئی کہ انہیں آمنہ کی یہ ضد پسند نہیں آئی۔
انکل عبدالعزیز نے بسم اللہ کے ساتھ ناشتے کی شروعات کی۔ سب خاموشی سے ناشتا کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ آمنہ نور بھی خاموش تھی لیکن اپنی چمکتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے بار بار میری جانب دیکھ رہی تھی۔ سب سے پہلے احمد نور نے ناشتا ختم کر کے ہاتھ اٹھایا اور الحمدللہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ چند لمحوں بعد انکل نے بھی دعائیہ انداز میں الحمدللہ کہہ کر گویا ناشتا ختم کیا۔
"بعض خواہشیں کتنی جلدی پوری ہو جاتی ہیں نا۔ ابھی پرسوں ہی تو ہم نے دوبارہ ملنے کا سوچا اور دیکھو۔

آج ملاقات ہو گئی۔" انکل عبدالعزیز نے خوش اخلاقی سے کہا۔ میں ناشتے کے بعد زینب آنٹی کی مدد کرنے لگی تھی۔
"بیٹا! مطالعے کا شوق ہے آپ کو؟" انکل نے بک شیلف سے — کتاب نکالتے ہوئے پوچھا۔
"بہت کم انکل! ایکچوئلی ٹائم ہی بہت کم ملتا ہے تو۔" مجھے یکدم ہائیگی کا احساس ہوا۔
"مولانا روم کا نام تو سنا ہو گا؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"جی جی انکل! اب ایسا بھی نہیں ہے۔" میں پھر شرمندہ ہوئی۔
"انکل — میں عشق کو جاننا چاہتی ہوں۔ یہ کیا ہوتا ہے؟" کچھ دیر بعد میں نے ان کے ہاتھوں میں مثنوی مولانا روم کا اردو ترجمہ دیکھ کر پوچھا۔ وہ میرے سوال پر مسکرا دیے۔ میں یک دم گڑبڑا گئی۔
"مولانا روم کے مطابق بتاتا ہوں۔" پھر وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر بولے۔
"عشق کے معنی ہیں، کسی چیز کو اپنے اندر جذب کرنا یا جزو ذات بنانا۔ عشق کی اعلا صورت یہ ہے کہ اپنے سامنے ایک نصب العین رکھا جائے اور اس کے گرد اپنی ہستی کو گھماتا رہے۔ اس کائنات کی پیدائش عشق کے تحت ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی ہر شے میں عشق سرایت کیے ہوئے ہے۔ عشق کے مدارج میں پہلا درجہ خواہش یعنی خواہش نفسانی کا ہے۔ یہ پہلا درجہ عشق مجازی کہلاتا ہے۔ یہ یہ درجہ پختہ ہو جائے تو دل کو ہمیشہ مجاہدے میں رکھتا ہے۔
عشق حقیقی بظاہر مجازی عشق کے مشابہ ہے لیکن مجازی عشق انسانوں تک محدود رہتا ہے اور عشق حقیقی انسان کی باہمی الفت و محبت سے بلند ہو کر حق تعالیٰ کی ذات میں جذب ہونے کا نام ہے۔
یوں سمجھو اگر عشق نہ ہوتا تو دنیا ٹھٹھر جاتی۔ ہماری پیدائش سے ہی ہماری فطرت میں اللہ تعالیٰ نے محبت کی شرط پیدا کر دی ہے اور ہماری جان میں اس کے عشق کا بیج بو دیا ہے۔ عشق مجازی فساد گندم ہے۔

جسمانی اور مادی چیز ہے' ہوس ہے' خواہش ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں "عشق کرنے کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے۔ باقی سب دھوکا اور فریب ہے۔ معشوق حقیقی تو حی قیوم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کا عشق ابدی ہے۔ فانی چیز کا عشق بھی فانی اور ناپائیدار ہوتا ہے۔
عشق خواہ مجازی ہو یا حقیقی' بالآخر اللہ کی طرف ہی لے جاتا ہے۔"

میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میرا دل مجھ سے محو گفتگو ہوا۔ "کیا میرے رب نے مجھے عشق حقیقی کا اذن عطا کر دیا ہے۔ کیا میں گناہ گار اس قابل ہو گئی ہوں کہ میں اللہ سے محبت کر سکوں؟ میں نے توبہ کر کے جو ایک قدم اپنے رب کی طرف بڑھایا تھا تو کیا میرا رب میری توبہ قبول کر کے میری طرف دس قدم بڑھا چکا ہے؟"

اس لمحے شدت سے میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں سربسجود ہو کے خوب تڑپ تڑپ کے رو دوں۔

بسا اوقات ہمارا چہرہ ہمارے دل میں موجود ہر خواہش ہر آرزو' حسرت' محبت' نفرت' خوشی' غم کے ہر جذبے کو عیاں کر کے رکھ دیتا ہے کہ مقابل لمحے کے ہزارویں حصے میں ہماری کیفیت جان جاتا ہے۔

"ڈونٹ مائنڈ بیٹا! میں ذرا ابھی آیا۔ مجھے کچھ کام یاد آگیا ہے۔" یہ کہہ کے انکل عبدالعزیز مجلسی روم سے باہر چلے گئے۔ مجھے لگا کہ انہوں نے میرا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ میں فوراً" رب کے آگے سربسجود ہو گئی۔

"اے میرے رب! میرے حال پر اپنا رحم کرم اور فضل فرما دے۔ مجھے معاف فرما دے میرے مالک...!" کافی دیر بعد جب دل کو سکون ملنا نصیب ہوا تو میں نے سجدے سے سر اٹھایا۔ آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو صاف کر رہی تھی تو دبے پاؤں آمنہ نور لاؤنج میں چلی آئی۔ اس نے منہ پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا اور پیار سے پوچھا۔

"آپ نے منہ پر انگلی کیوں رکھی ہوئی ہے؟"

"بابا جان نے کہا تھا کہ لاؤنج میں جا کر شور مت کرنا۔"

میرا دل اس مہربان شفیق ہستی کے احترام سے مزید بھر گیا۔ میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹا! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے آمنہ نور کی دعوت قبول کی۔" مجھے نکلتے دیکھ کر زینب آنٹی نے کہا۔ میں مسکرا کر آمنہ کو پیار کرتے ہوئے نکل آئی۔

اس وقت احمد نور کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ آنٹی نے بتایا تھا کہ احمد نور کتنے زندہ دل ہوا کرتے تھے۔ میں احمد نور کے دکھ کو سمجھ سکتی تھی۔ میں جدائی کے صحرا کو جس کرب و اذیت سے پار کر کے آئی تھی' میں ہی جانتی تھی۔ اگر میرا رب مجھے سہارا نہ دیتا تو میں حرام موت کو اپنا کر ہمیشہ کے لیے عذاب الٰہی کی مستحق ٹھہر جاتی اور جس طریقے سے مرتی' ابد تک اسے ہی دہراتی رہتی۔

میں نے ڈور بیل بجائی تو حرا دروازے پر لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"آ گئیں خاطر خدمتیں کروا کے اپنے سسرال والوں سے؟"

"ہاں۔" میں نے ہنستے ہوئے اسے ایک طرف دھکیلا اور ڈائننگ ٹیبل پر آ گئی۔ وہ سلاد بنانے کے لیے سبزیاں اور پھل لیے بیٹھی تھی۔

"حرا... تم زینب آنٹی سے کب بات کرو گی؟" میں نے سیب چھیلتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کھیرا کاٹتے ہوئے اس کا ہاتھ رکا ہے۔ شاید منہ اور آنکھیں بھی کھل گئی ہوں گی۔ میں نے دیکھنے سے گریز کیا۔

"نائلہ... یہ آسان فیصلہ نہیں ہے۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔"

"ان کے جانے میں صرف تین دن رہ گئے ہیں۔ اب کیا سود و زیاں سوچنا۔ حرا! مجھے لگ رہا ہے' ان کا ملنا محض اتفاق نہیں ہے۔ شاید... شاید اللہ کو ہی یہ منظور ہے۔ مجھے کوئی خوف اور خدشہ بھی نہیں ستا رہا۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے مجھے کوئی بے چینی' کوئی اضطراب بھی نہیں ہو رہا حرا! میں تھک گئی ہوں یار...." میرے لہجے میں تھکن در آئی۔

"اچھا! میں بات کرتی ہوں آنٹی سے۔ میری بہت ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ خود کو اکیلا مت سمجھنا۔" اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر محبت سے کہا۔ مجھے حرا پر بہت پیار آیا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی دوستی کی سلامتی کی ڈھیروں دعائیں مانگ ڈالیں۔



"احمد نور نے انکار کر دیا۔"

"کیوں؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"وہ اپنے نامکمل وجود کا بوجھ تم پر نہیں ڈالنا چاہتا۔"

میں فوری طور پر کچھ نہ بول سکی۔ حرا میرے پاس ہی آ کر بیٹھ گئی۔

"انکل اور آنٹی تو بہت خوش ہو گئے تھے یہ سن کر مگر... میرا خیال ہے نائلہ! احمد نے انکار کر کے درست کیا۔ تم نے بھی نیک نیتی سے سوچا تھا۔ مگر ہو سکتا ہے اسی میں بہتری ہو۔"

"میں احمد نور سے خود بات کرنا چاہتی ہوں حرا!" میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ وہ حیرانی سے میری شکل دیکھنے لگی۔

"میں اپنی سی ایک کوشش کرنا چاہتی ہوں پلیز...." میں نے جیسے التجا کی۔ اور پھر اسی شام حرا نے احمد نور سے میری ملاقات کروا دی۔

احمد نور بیڈ سے ٹیک لگائے گود میں لیپ ٹاپ رکھے بیٹھے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں وہاں آ سکتی ہوں۔ انہوں نے اچٹتی سی ایک نظر کھلے دروازے پر ڈالی مگر مجھے دیکھ کر وہ حیران سی وہیں جم گئی۔

"آپ یہاں؟"

"میں آنٹی کی اجازت سے آپ سے کچھ بات کرنے آئی تھی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تشریف رکھیے۔" میں دروازہ ایسے ہی کھلا چھوڑ کے سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ نے انکار کیوں کیا؟" میں نے بلا تمہید پوچھا۔

"آپ کو مجھ سے بہتر مل سکتا ہے۔" سنجیدگی سے فوراً" جواب آیا۔

"زندگی میں ہر چیز پرفیکٹ ملے' ضروری تو نہیں۔"

"اس کمی کا احساس آپ کو لمحہ لمحہ ہو گا۔ آپ پچھتانے لگیں گی۔"

"زندگی میں ہونے والے حادثات و واقعات پر کب کسی کا زور چلا ہے۔ اگر یہ حادثہ عائشہ کے ساتھ ہوتا تو کیا آپ اسے چھوڑ دیتے کہ اب وہ ایک نارمل انسان نہیں رہی یا... عائشہ ہی اس وقت ہوتی تو کیا وہ آپ کو چھوڑ کر چلی جاتی کہ اب آپ اس کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہے... آپ کا انکار مجھے قبول ہے احمد صاحب... مگر... آپ صحیح نہیں کر رہے ہیں۔ حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے... آپ نے خود کو وقت و حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا ہے۔ مگر جب تک زندگی ہے... اسے گزارنا تو ہے نا... تو کیوں نہ اس میں سے تھوڑی بہت خوشیاں اور سہولتیں کشید کر لی جائیں...."

احمد نور خاموشی سے سن رہے تھے۔ کافی دیر تک جب میری بات کا کوئی جواب نہ آیا تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ احمد نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا ہے' مگر میں نے ان کی طرف نظر نہ ڈالی۔

"رکیے...!" میں دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ احمد نے پکارا۔

"مجھے آپ کی بات سے اتفاق ہے... مجھے ایسا لگ رہا ہے... اگر آپ چلی گئیں تو... یہ کفران نعمت ہو گا... اللہ تعالیٰ نے اگر ہمارا مقدر ایک ساتھ جوڑا ہے تو میں کیونکر انکار کر پاؤں گا... میں آئندہ زندگی سے اپنے لیے اور آپ کے لیے خوشیاں کشید کرنے

کے لیے تیار ہوں۔"

گمبھیر لہجے میں احمد نور نے اپنی بات مکمل کی تو ایک لمحہ کو تو مجھے یقین ہی نہیں آیا، مگر جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو احمد کے چہرے پر ہلکا سا تبسم تھا۔ میں بھی مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

انکل عزیز کی فیملی کے کراچی جانے میں صرف تین دن تھے، سو اب جو کرنا تھا' ان تین دنوں میں ہی کرنا تھا۔ طے پایا کہ اس بلڈنگ کے دو تین گھروں کو بلا کر آج شام ہی مایوں کی ایک چھوٹی سی رسم کرلی جائے۔ دوسرے دن مدینہ جاکر ظہر اور عصر کے درمیان نکاح اور تیسرے دن شام کو ولیمہ کی تقریب نمٹا کر اسی رات ڈیڑھ بجے کی فلائٹ سے کراچی۔۔۔

مایوں کی رسم حرا کے اصرار پر رکھی گئی، کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ شادی اور ولیمہ کی تقریب ایمرجنسی میں منعقد ہوگی تو وہ میری شادی انجوائے کیسے کرے گی۔ اس کی خوشی دیکھتے ہوئے کسی نے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا' سو افراتفری میں کی گئی تیاری یوں رنگ لائی کہ میں احمد نور کی پسند سے خریدا ہوا آتشی اور پیلے رنگ کا راجستھانی فراک پہنے حران کے لاؤنج میں بیٹھی پھولوں کے زیور سے مہک رہی تھی۔ ایک خوشگوار سا احساس مستقل طاری تھا۔ لاؤنج کے دروازے کے باہر سے مجھے احمد کی آواز سنائی دی۔ وہ زینب آنٹی کو کسی کام سے بلا رہے تھے اور اندر نہیں آرہے تھے۔

میرے ہونٹوں پر احمد کی جھجک محسوس کرکے ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ میری ذہنی رو احمد کے ساتھ اپنے مستقبل کی طرف بہنے لگی۔ اسی لمحے میرے پاؤچ میں رکھا میرا موبائل بجنے لگا۔ میں نے سیل فون نکال کر دیکھا تو میری مسکراہٹ سمٹ گئی۔

"میرجی کالنگ۔۔۔"

میں تذبذب کا شکار۔۔۔ فون اٹھاؤں یا نہیں۔۔۔ سانسیں بے ترتیب ہوگئیں۔ دھڑکنوں نے یک دم ہی رفتار پکڑی تھی۔

"ہیلو۔۔۔" بٹن دبا کر میں صرف یہی کہہ پائی۔

"تم جدہ میں ہونا۔۔۔ حرا کے پاس۔۔۔ تیار ہوجاؤ۔ میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔" میرجی کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"تم سوچ بھی نہیں سکتیں نائلہ۔۔۔ میں اس وقت کتنا خوش ہوں۔۔۔ اور وہ خوشی کی خبر میں تم سے مل کر ہی سنانا چاہتا ہوں کیونکہ تمہارے چہرے پر پھیلے حیرت' خوشی اور حیا کے سارے رنگ میں بہت قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ انہیں محسوس کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ جلدی سے بتاؤ کب مل رہی ہو تم۔۔۔"

میرجی بول رہے تھے خوشی سے اور میں سن رہی تھی کرب سے۔

"تم بول کیوں نہیں رہیں نائلہ۔۔۔ کیا تم کسی فنکشن میں ہو؟ تمہارے پیچھے سے ڈھولک کی آواز آرہی ہے۔ نائلہ۔۔۔ نائلہ۔۔۔ بولو پلیز! جواب دو۔"

"کل ظہر کے بعد میرا نکاح ہے میرجی!" میرے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔ دوسری طرف یک دم گہرا سکوت چھا گیا۔ بالکل میرے اندر کی طرح۔ ڈھولک کی آواز گم گشتہ ہوئی۔ کتنے ہی پل خاموشی کی نذر ہوگئے۔

"یہ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو نائلہ۔۔۔ میں تو۔۔۔ میں تو تمہیں یہ خوش خبری سنا رہا تھا کہ تمہاری محبت جیت گئی۔ میری بیوی نے دوسری شادی کی اجازت دے دی ہے۔"

میرجی کی آواز سے گرم جوشی مفقود تھی اب۔

میرے پاس جواب میں کہنے کو کچھ نہ تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ دل رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ڈھول کی آواز کان کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ پھولوں کی مہک دم گھوٹنے لگی تھی۔

"تمہاری محبت اتنی جلدی مرگئی نائلہ!" میری مسلسل خاموشی سے انہوں نے نتیجہ اخذ کیا۔

"محبت کبھی نہیں مرتی میرجی! محبت نے آب حیات پی رکھا ہے۔ یہ کبھی نہیں مرتی۔۔۔ محبوب کے ستم سہ کر نا تواں ضرور ہوجاتی ہے مگر مرتی نہیں۔۔۔ بے اعتنائی اور بے قدری برداشت نہیں کرتی۔ ٹوٹ جاتی ہے، مگر پھر بھی زندہ رہتی ہے۔ محبوب کی جفا پر سراپا احتجاج بن جاتی ہے یا خاموشی کی ردا اوڑھے کہیں نقل مکانی کر جاتی ہے۔ قسمت ساتھ دے تو کہیں ٹھکانہ مل جاتا ہے ورنہ بنجاروں کی طرح بستی بستی بے چین پھرتی ہے، مگر زندہ رہتی ہے میرجی! مرتی تب بھی نہیں ہے۔" میرے لبوں سے سسکی نکلی تھی۔

"اور میری خوش قسمتی کہ مجھے ٹھکانہ مل گیا۔۔۔ میری محبت کو احمد نور کے دل میں پناہ مل گئی میرجی!"

"تھوڑا انتظار تو کیا ہوتا۔" ٹوٹا ہوا لہجہ تھا۔

"آپ نے کہا تھا؟" مجھے ان کا چھوڑ کر جانا یاد آیا۔

"مجھے اعتراف ہے۔" شاید انہیں بھی اپنی بے رخی یاد آگئی تھی۔ "مجھے اندازہ ہو رہا ہے اپنی غلطی کا۔۔۔ مگر مجھے ایک موقع دو۔ میں تم پر جمی اپنی سرد مہری کی برف اپنی محبت کی حدتوں سے پگھلا دوں گا نائلہ۔۔۔ تمہیں مالدیپ کا بیچ بہت پسند ہے نا' میں۔۔۔ میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔ ہم اس بیچ پر لگے سفید جھولے میں اپنی۔۔۔"

"میری ازدواجی خوشیوں کے لیے دعا کیجئے گا میرجی!" میں نے ان کی بات کاٹی' پھر لائن بھی کاٹ دی۔

"بابا کے ساتھ تصویر بنوائیں نا۔" آمنہ نے میری گود میں گھستے ہوئے فرمائش کی۔ "آپ رو رہی ہیں؟" اس نے بغور میری طرف دیکھا۔

"نہیں تو۔۔۔" میں نے گڑبڑا کر آنکھیں صاف کیں۔ بلا لو اپنے بابا کو۔" میں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"وہ نہیں مان رہے نا۔" اس نے منہ بسور کر کہا اور یہ میں اچھی طرح جانتی تھی احمد نہیں آئیں گے۔

☼ ☼ ☼

مدینے کے بلند بالا پہاڑوں کے بعد اب آبادی کے آثار نظر آنا شروع ہوگئے تھے۔ مدینہ پہنچتے ہی ہم سب نے وضو کیا اور نوافل ادا کرکے درود پڑھتے ہوئے گنبد خضرا کے سائے تلے بیٹھ گئے۔

"نائلہ گل!"

مجھے سونیا گل کی آواز کا شاید واہمہ ہوا تھا لیکن نہیں یہ وہم نہیں تھا حقیقت تھی۔ سونیا گل دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھ تھامے واقعی میرے دائیں طرف کھڑی تھی۔

"نائلہ میری بہن۔۔۔ ہمارا رب کتنا مہربان ہے' میں نے تم سے ملنے کی دعا مکے میں مانگی اور اللہ نے آج مدینے میں پوری کردی۔ اب تو تم نے مجھے معاف کردیا ہے نا۔" میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔

آقا دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے صحن میں انسانوں کا سمندر سمایا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی بہت اپنے سے ملنے اس کے گھر آئے ہوئے ہیں۔ میری خوش قسمتی کہ خالہ ماں کے گھر جس حافظ قرآن کی دلنشیں آواز کے ساتھ اپنی آواز ملا کر میں قرآن کی تلاوت کیا کرتی تھی' آج وہ مدینے آئے ہوئے تھے۔ نماز ظہر کے بعد انہوں نے ہی میرا نکاح پڑھایا تھا اور پھر جیسے ہی میرا نکاح ہوا۔ "مبروک مبروک" مجھے ہر طرف سے صدائیں آنے لگیں۔

میں اپنی زندگی کے ان انمول لمحوں کو کبھی بھی فراموش نہیں کرپاؤں گی۔ نہ جانے کون کون کس کس روپ میں مجھے دعائیں دے رہا تھا۔ آستانہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے در پر آج میرا کشکول سکون اور خوشیوں سے بھر گیا تھا۔ نکاح کے وقت جو میرے جذبات ہو رہے تھے۔ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری کے وقت میں انہیں لفظوں کے پیراہن پہنانے سے قاصر ہوگئی۔

میرے گواہان میں کون کون شامل ہے' یہ تصور ہی میری ہستی کو بدلنے کے لیے کافی تھا۔ سب ہی کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو بھرے ہوئے تھے۔ انکل عبدالعزیز' آنٹی زینب' احمد نور' آمنہ' حرا' سونیا' حتیٰ کہ مختار علی۔۔۔ سب ہی خوش تھے۔ ہم سب نے وہیں صحن نبوی میں کھانا کھایا۔ آمنہ نور میری گود میں بیٹھی تھی کہ مجھے ایک اجنبی نمبر سے میسج موصول ہوا۔

"نائلہ گل کو نائلہ نور بننے پر ہم دل سے مبارک باد

دیتے ہیں اور اپنے دل کے سب دروازے آپ کے لیے وا کرتے ہیں۔۔۔ احمد نور۔"

میرے گالوں پر کلیاں سی چٹکی تھیں۔ میں نے پہلی بار احمد کو مان اور اپنے پن کے ساتھ دیکھا جنہیں اللہ نے اپنے محبوب کے در پر میرے سر کا تاج بنا دیا تھا اور اس عزت والے تاج کی حرمت نے مجھے میری ہی نظروں میں معتبر کر دیا تھا۔

میں نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے روشن چہرے پر سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ نور کا گویا ایک ہالا سا تھا۔ انسان کا چہرہ اس کے دل کا آئینہ دار ہوتا ہے اور احمد نور کتنے پیارے دل کے مالک تھے' یہ ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ میں منکر میرجی کی خوبیوں سے بھی نہیں تھی لیکن وہ بنیادی طور پر ایک بزدل آدمی تھے۔ وہ دنیا دکھاوے کو اپنی بیوی کے ساتھ وفادار بھی رہنا چاہتے تھے اور دنیا سے اوجھل کہیں چھپا کر محبت رکھنا بھی چاہتے تھے۔ جو شخص آج اپنی بیوی کے کہنے پر دوسری شادی کرنے کو تیار ہو گیا' اس کا کیا بھروسا کہ کل دوبارہ اس کے کہنے پر چھوڑ بھی دے جبکہ میرا آئیڈیل تو ایک سچا' کھرا اور نڈر انسان ہے۔۔۔

"میں بھی اپنے سر کے تاج کو پوری عزت و محبت کے ساتھ زندگی کی نئی راہوں پر "اہلاً و سہلاً" مرحبا کہتی ہوں۔"

میں نے جوابی میسج بھیجا اور آنکھیں بند کر کے اس نئے رشتے کی استقامت کے لیے دعائیں کرنے لگی۔



ولیمہ کی ایک چھوٹی سی تقریب کر کے ہم جدہ ایرپورٹ سے کراچی کے لیے جہاز میں بیٹھے۔ حرا اور سونیا نے مجھے اچھا خاصا تیار کروا دیا تھا۔ آنٹی تو بار بار بلائیں لے رہی تھیں۔ احمد بھی چپکے چپکے پرشوق نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے پورے استحقاق کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ والی سیٹ پر مجھے بٹھا رکھا تھا۔

ابھی جہاز کے دروازے کھلے ہوئے ہی تھے کہ پائلٹ کیبن سے کیپٹن میر عمر ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا بڑا سا بکے تھامے ہمارے نزدیک آکر ٹھہرے۔

"ہم اپنی فضائی میزبان کو زندگی کے اس نئے موڑ پر ڈھیروں مبارک باد دیتے ہیں اور پرخلوص دعائیں دیتے ہیں کہ آپ کا یہ سفر اور زندگی کا نیا سفر خیریت کے ساتھ گزرے۔"

انہوں نے انتہائی پیشہ ورانہ انداز میں سنجیدگی سے کہا۔ میں نے ہولے سے مسکراتے ہوئے بکے تھام کر احمد نور کی گود میں رکھ دیا۔ میرا ایک ہاتھ ابھی بھی احمد کے ہاتھ میں تھا۔

میری زندگی کا یہ پہلا لمحہ تھا کہ جب میرے دل نے میرجی کی طرف دیکھنا نہ چاہا کہ احمد کی امانت میں خیانت مجھے کسی طور قبول نہ تھی۔

کیپٹن میر عمر تھکے تھکے قدموں سے اپنے کیبن کی طرف پلٹ گئے۔ میں نے بھی ایک گہرا سانس لے کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

کیپٹن میر عمر جانے کب جہاز کو ہواؤں میں بلند کر چکے تھے۔ جہاز کی لائٹس آف کر دی گئیں۔

میں نے زندگی میں اب تک جتنے بھی لوگوں سے محبت کی تھی' وہ سب کسی نہ کسی صورت میرے ساتھ محو سفر تھے۔ گویا میری محبتوں کا ایک کارواں سا بن گیا تھا۔۔۔

سونیا اور مختار علی ایک اچھی زندگی گزار رہے تھے۔۔۔ پیچھے کون کیسا تھا' اور کیا کیسے ہوا تھا' یہ وہ دونوں بھول گئے تھے۔ مختار علی معافی مانگ کر سونیا کو عمرہ کروانے لایا تھا۔

حرا اور فیصل نے کچھ عرصہ کراچی گزارنے کا فیصلہ کیا تو وہ بھی ہمراہ ہوئے اور میرجی بھی میرے ہم سفر تھے۔۔۔ بے شک جہاز کے سفر میں ہی۔۔۔

✡

شمینہ عظمت علی



جس کو یہ داغ لگا تھا' بے خبر خراٹے لے رہے تھے۔ ہم نے صبح سویرے اٹھ کر کبھی کوئی معمولی کام بھی انجام نہ دیا تھا تو وہ ہم سے اتنے بڑے معرکے کی توقع کیونکر رکھ سکتے تھے۔

لیجیے ان کا الارم بج گیا ہے۔ جسے انہوں نے کمال پھرتی سے بند کر دیا کہ مبادا ہماری نیند خراب نہ

"ایک دن علی الصبح ہم اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔"

حالانکہ ساری زندگی ہر اس کام سے ہماری جان جاتی رہی جو علی الصبح انجام دیا جاتا ہے' کیا خبر تھی کہ انجاما "جان ہی علی الصبح جائے گی۔"

کرنا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور۔۔۔

ابھی تو پاکستان نے جنوبی افریقہ کو ون ڈے سیریز میں شکست دینا تھی۔ فواد خان کی نئی سیریل آنی تھی۔ ابھی تو ٹیلر کے پاس ہمارے پانچ سوٹ تھے۔ بڑی آپا کے پاس جو کمیٹی ڈالی تھی اس میں اگلا نمبر ہمارا تھا۔ بڑی نند کی بہو کے جوہر کھلنا تھے۔ لیکن ملک الموت تو (نامعلوم افراد) کی طرح آیا اور ہم۔۔۔

آہ! عین جوانی میں داغ مفارقت دے گئے۔ (کس کو؟)



ہوجائے اور ہم جلال میں نہ آجائیں۔ (ہائے سرتاج الارم، سیٹیاں، بینڈ باجے، بغلیں، جو بجانا ہے، بجائیے، ہم تو اب کسی کا باجا بجانے کے قابل نہیں رہے۔)

اب وہ بالکل آہستہ آہستہ اٹھے ہیں۔ سارے کام گونگے حتی کہ ان کے ہاتھ پاؤں، الماری، دروازے، تکلے سب گونگے بن جائیں گے۔ (صم "بکم" کا معجزہ صرف ان شوہر حضرات کو آتا ہے، جن کو ہم جیسی منتظم بیویاں میسر ہوں، سچ ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

لیکن آج خوشی کے بجائے ہماری روح کانپ گئی ہے۔ کیا ہم یوں ہی اپنے گھر میں مردہ سڑتے رہیں گے۔ جو لوگ دہشت گردی میں مارے جاتے ہیں۔ وہاں بھی اتنی دیر میں میڈیا کا کوئی نمائندہ یا چھیپا پہنچ جاتی ہے۔

میاں جی، ایسا بھی کیا... ہم نے کیا ہی کیا ہے؟ صرف "ذرا سا" تاکہ جب ہمیں ناشتا بنانے کے لیے اٹھانے کی کوشش کی، ہماری خونخواری میں "ذرا" سا اضافہ ہوگیا۔ دروازہ ہم نے "تھوڑا" سا زور سے بند کردیا۔ آملیٹ ہلکا سا جلا دیا۔ چائے میں پتی معمولی سی تیز ہوگئی۔ پلیٹ ٹیبل پر رکھی تو چیخ سی آواز قدرے تیز پیدا ہوئی اور ہم نے چلتے ہوئے فرش پر ذرا سی دھم دھم کردی۔ لیجیے آپ تو اتنے نازک مزاج نکلے کہ ہمارا اتنا سا ناز نہ سہ سکے اور گھر کی ہر چیز کو بشمول خود ساکن اور (سائلنٹ موڈ) پر کردیا۔

ہائے اللہ اب ہماری موت کی خبر آخر کس طرح نشر ہوگی۔ جاتے جاتے پلٹ کر مہر سے نہ سہی قہر سے ہی ایک نظر ڈال دیں کہ شاید آپ کو ہمارے وجود کی مردنی کا کچھ احساس ہوجائے۔ لیکن نہیں... آپ تو گھر سے رخصت ہوگئے یہ جانے بغیر کہ ہم تو دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں۔

اب چھیپا کے بجائے چھیما کا انتظار ہے۔ لیکن اس میں اتنی جرات کہاں کہ ہمیں جگا سکے۔ ہم تو اس وقت تک نہیں جاگتے جب تک کہ ہم خود نہ جاگ جائیں یا پھر ہماری عزیز از جان دوست سارا کا فون نہ آجائے۔ ویسے تو ہم جنات نکالنے کے عمل، رنگولیوں، مایوں مہندی، شادی کی جھوٹی سچی تقریبات اور مارننگ شو کے ہر قسم کے مسالے سے سخت بیزار ہوچکے ہیں، لیکن سارا کسی نہ کسی شو میں کوئی بات نکال کر ہمیں فون کھڑکا دیتی ہے۔

لیکن اس کا فون آئے بھی تو کیا حاصل... یہاں فون کون اٹینڈ کرے گا۔ افسوس کہ روح کو فون سننے کی سہولت فراہم نہیں کی گئی ہے۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی



آج کے زمانے میں کوئی خبر بھلا کتنی دیر رک سکتی ہے۔ آخر کو یہ دلخراش خبر سب کو پہنچی ہے اور گھر لوگوں سے بھر گیا ہے۔

سب کو سر جھکا کر ہل ہل کر دعائیں پڑھتے دیکھ کر ہمیں یقین ہونے لگا کہ ان کی دعاؤں کے طفیل ہمیں جنت کی انٹری تو مل ہی جائے گی اور اپنے کردہ ناکردہ گناہ ختم ہوتے محسوس ہوئے۔ ادھر ادھر جھانکنے کی صلاحیت ابھی موجود تھی۔ اپنی بھتیجیوں، بھانجیوں اور دیگر بچیوں کی محبت پر ہماری روح بھر آئی۔ قریب سے دیکھا تو معلوم یہ ہوا کہ جھولیوں میں موبائل گھسائے یہ بریکنگ نیوز زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فارورڈ کرنے میں مشغول تھیں۔ بعض پھرتیلیوں نے تو فیس بک پر اسٹیٹس بھی لکھ دیے اور ہمارے انتقال پر ملال کی خبر نہایت اضمحلال کے ساتھ ٹوٹ بھی کرچکیں۔ اتنی ہائی ٹیک موت پر ایک لمحے کو تو ہمیں نہایت روحانی مسرت محسوس ہوئی۔ مزید یہ کہ ملک کی مایہ ناز مصنفہ اور ڈراما نویس آمنہ مفتی نے یہ خبر اپنے پیج پر شیئر بھی کردی اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آمنہ اپنے اسٹیٹس پر ایک نقطہ بھی ڈالیں اور عاصم مفتی اسے لائیک نہ کریں۔ لیکن ہماری موت کی خبر؟

آپ سے یہ امید نہ تھی عاصم بھائی... زندگی میں تو ہم آپ کی بندوق سے خائف رہے، لیکن آج ہمیں یہ کہنے دیں کہ آپ جیسا (پتنی بھگت) کہیں نہیں دیکھا۔ اب تو ہمیں یقین ہو چلا ہے کہ آپ نے اتنی بندوق کی لبلبی نہیں دبائی ہوگی۔ جتنا کہ اپنی بیگم کی پوسٹوں پر Like کا بٹن۔

لیکن کچھ تو ہمارا خیال کیا ہوتا... یہ صحیح ہے کہ ہم نے "الو برائے فروخت نہیں" کے جواب میں "دم کٹی لومڑی" اور "شیر کیوں دھاڑتا ہے" لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اب ایسا بھی کیا خوف، انسان کو حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔

اچانک ہماری روحانی نظر اپنی بڑی نند پر پڑی تو دل کام نہ کرنے کے باوجود بھی بھر آیا۔ گو کہ ہماری زندگی میں، ہم دونوں کے درمیان امن کی کوئی آشا نہ تھی۔ لیکن یہ کیا کہ آپا کے جوہر مرنے کے (ظاہر ہے کہ ہمارے) بعد کھلے۔ شدت غم سے ان کا یہ حال تھا کہ دوپٹا آنکھوں تک کھینچا ہوا تھا اور ایک پلو مستقل طور پر منہ پر تھا۔ شاید مسلسل سسک سسک کر رو رہی تھیں۔

"آپا... ذرا منہ تو اوپر کرو، کیا ہوا ہے۔" چھوٹی نند نے ان سے کہا۔

"کم بخت یہ ہماری بھاوج..." آپا نے دانت پیس کر کہا۔ "ہر کام بے ٹیم کرتی ہے۔ اس کم تو مجھ سے سدا کا بیر تھا۔ کیا منہ دکھاؤں، پہلے پو کو بخار آیا ہوا تھا۔ پھر چنٹو کو ڈینگو نے کاٹ لیا۔ اتنے دن سے پارلر ہی جانا نہیں ہوا۔ منہ فٹے منہ ہو رہا ہے۔"

ہک ہا... تو یہ سارا سیاپا تھا۔ جنہوں نے جیتے جی جینا حرام کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑ رکھی تھی۔ ان سے بعد از وفات کیا توقع رکھی جا سکتی تھی۔

اچانک ایک زوردار چیخ بلند ہوئی اور ہماری ایک کزن فرام ٹنڈو آدم نے اپنے دس سالہ بیٹے ٹیپو کے ساتھ انٹری دی۔ یہ چیخ دراصل ٹیپو ہی کی تھی۔

"ہائے میری خالہ! راجر فیڈرر کی مسلسل شکست کے صدمات نہ سہ سکیں بے چاری..."

"اف خدایا! کاش کہ اللہ میاں ہمیں دو منٹ کی شارٹ بریک دے دیتے تو ٹیپو کو ایسا ریکٹ ٹھونکتے کہ اس کا منہ نڈال جیسا ہو جاتا۔ مانا کہ فیڈرر کی شکل کچھ بھلی سی ہے اور بیک ہینڈ بھی اچھا مار لیتا ہے۔ لیکن ایسا بھی کوئی ہمارا پھوپھی دا پتر نہیں کہ اس کی ہر شکست کے بعد مرکا بیگم تو اپنا وزن مزید دو پاؤنڈ بڑھا لیں اور ہشاش بشاش بیٹھی فوٹو گرافیاں فرماتی رہیں اور ہم یہاں ہزاروں میل دور بیٹھے اپنی جان سے ہی گزر جائیں۔"

شکر کہ کوئی اس گدھے کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کے قریب اس کی ماں ہی تھی جو اپنا مکمل آئی کیو دوبارہ استعمال کرکے بھی لفظ راجر فیڈرر کو کسی سگریٹ، شیمپو یا کسی آفٹر شیو کا نام سمجھ سکتی تھی یا زیادہ سے زیادہ اس بات پر خوش ہو سکتی تھی کہ اس کا بچہ انگریزی میں لڑ رہا ہے۔

چند خواتین کو اس بات کا افسوس تھا کہ اس اچانک سانحے پر ان کے پاس کوئی نیا سوٹ نہ تھا۔ سچ ہے کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ وہ کسی بھی وقت آسکتی ہے اور ضروری نہیں کہ وہ وقت اپنا ہی ہو، کسی اور کا بھی ہو سکتا ہے، اس لیے ایک سوٹ تو بارہویں کھلاڑی کی طرح موجود ہونا ہی چاہیے۔

اب لوگوں میں چہ مگوئیاں شروع ہوگئی ہیں۔ ہر کوئی اشاروں کنایوں میں ایک دوسرے سے ہماری رخصتی کا وقت پوچھ رہا ہے۔ کسی نے "میرا سلطان" کی قسط دیکھنی ہے، کسی نے "کہرا سچ" سننا ہے۔ حتی کہ میاں جی کی بھی خواہش ہے کہ مصباح کی بیٹنگ کے دوران ہی یہ کام بھی انجام پذیر ہو جائے تو اچھا ہے۔

اور آپ لوگ بھی یہ مت سمجھ لیجیے کہ ہر دوسرے ڈرامے، تیسرے افسانے اور سرسید احمد خان کے "گزرا ہوا زمانہ" کی طرح ہم اٹھ بیٹھیں گے اور ہماری آنکھیں دونوں طرح سے کھل جائیں گی تو ایسا کچھ نہیں ہے۔

☆

ناولٹ

آمنہ ریاض



باقرلودھی اپنے منجھلے بیٹے تقی کی غیرذمہ دارانہ طبیعت سے سخت نالاں ہیں اور اسے ہروقت ہڈحرامی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ تقی کو شوبز میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ لودھی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رضی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔

شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لاڈلی ہے مگر عمیر کی بیوی سماہر کو اس سے شدید جلن ہے۔ وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔

سماہر اور عمیر کی شادی کے ابتدائی دنوں میں شفا سماہر سے بہت بدتمیزی کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ہروقت عمیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی اور جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر اسے عمیر سے ڈانٹ پڑوا دیتی۔ رات کے کھانے پر پاستا نہ بنانے پر اس نے سماہر سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر جانے کا الزام سماہر پر لگا دیا کہ سماہر نے اسے دھکا دیا ہے۔ اس بات پر عمیر، سماہر کو دو تھپڑ مار دیتے ہیں۔ سماہر کو بہت دکھ ہوا ہے۔ شفا خود بھی گنگ ہو جاتی ہے۔

تقی کے گہرے دوست سمیر کے ابا اپنی پسند سے اس کی منگنی کر دیتے ہیں۔

شفا عمیر کو ساری بات بتا کر ان سے اور سماہر سے اپنی پچھلی تمام باتوں پر معافی مانگ لیتی ہے۔ عمیر اسے معاف



کردیتے ہیں مگر ساہر' شفا سے بیر باندھ لیتی ہے اور غلط بیانی کر کے دونوں بہن بھائی میں غلط فہمیاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح وہ عمیر کے منع کرنے کے باوجود جھوٹ بول کر شفا کو کالج ٹرپ پر بھجوادیتی ہے۔
کاسٹنگ ڈائریکٹر جاثم تقی کو اپنے ڈرامے میں لیڈنگ رول کی آفر کرتا ہے۔ تقی اپنے ابا کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہوجاتا ہے۔

تقی اور سمیر بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ مری جاتے ہیں اور اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتے ہیں' جہاں شفا کا گروپ ٹھہرا ہوتا ہے۔ وہاں سمیر کو ثمر پر اپنی منگیتر کا گمان ہوتا ہے۔ ٹرپ کے دوران دونوں گروپوں کے درمیان ہلکے پھلکے ٹاکرے ہوتے رہتے ہیں۔ اور باقاعدہ منگنی پر دونوں کو پتا چلتا ہے کہ وہ واقعی ثمر ہے۔ وہ دونوں منگنی تو کرلیتے ہیں مگر سخت غصے میں ہوتے ہیں۔ منگنی کے بعد سمیر ٹرپ کے دوران مذاق میں کہی شفا کی بات کہ "ثمر کا نکاح ہوچکا ہے" اپنی ماں کو بتا کر منگنی توڑ دیتا ہے۔ ثمر کے والد شکیل صاحب سمیر کے والد سے سخت ناراض ہوجاتے ہیں۔ ثمر کی والدہ یہ جان کر کہ ثمر کے نکاح کی افواہ شفا نے اڑائی ہے۔ وہ شفا سے خفا ہوجاتی ہیں۔ ساہر انہیں مزید بھڑکاتی ہے۔ ساہر اور عمیر تقی سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ مہک' تقی کا پورٹ فولیو بنوالیتی ہے۔ تقی کو آفرز آنے لگتی ہیں۔ وہ ایک دو کمرشلز میں کام کرلیتا ہے۔ رضی کی بدولت مہک کے والد سے باقرلودھی کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ تقی کے لیے مہک کو پسند کرلیتے ہیں۔ جری کے میڈیکل میں ایڈمیشن ہونے کی خوشی میں باقرلودھی ایک چھوٹی سی تقریب کرتے ہیں۔ انہیں تقی کے شوبز جوائن کرنے کی خبر مل جاتی ہے۔ وہ بھری محفل میں اسے سخت بے عزت کرتے ہیں اور چھڑی سے مہمانوں کے سامنے خوب پٹائی لگاتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں۔

وہ متضاد سوچوں میں گھرا جارہا تھا' اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ عمیر اسے اپنے ہاں لے آتے ہیں اور جب تک گھر کا بندوبست نہیں ہوجاتا' اسے اپنے گھر رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ تقی ممنون اور شرمندہ سا ان کے گھر رہنے لگتا ہے۔ شفا اور وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں' مگر زیادہ بات چیت نہیں کرتے۔ شفا کو عمیر کی نظروں میں گرانے کی ساہر کی سازش کا اسے علم ہوجاتا ہے۔ وہ ساہر کو منع کرتا ہے' مگر ساہر بجائے شرمندہ ہونے کے' اسے اس معاملے سے دور رہنے کی تاکید کرتی ہے۔ وہ کمرشلز اور ڈراموں میں مصروف ہوجاتا ہے۔ سمیر کے آفس میں ثمر انٹرن شپ کے لیے آتی ہے۔ سمیر اس کی طرف مائل ہونے لگتا ہے' مگر وہ اس کی جانی دشمن بنی ہوئی ہے۔

ساہر' شفا سے انتقام لینے میں اتنی آگے بڑھ جاتی کہ اپنی دوست کے بھائی روحیل کو شفا کا موبائل نمبر اور تصاویر دے کر اس کے پیچھے لگا دیتی ہے۔ وہ شفا کو بلیک میل کرنے لگتا ہے اور عمیر کو بھی اطلاع دے دیتا ہے جبکہ وہ اپنی تصاویر لینے کے لیے مجبوراً اس سے ملنے آتی ہے۔ اس کے بعد روحیل کو گھر پر بلوالیتی ہے۔ روحیل الٹا ساہر سے بے تکلف ہونے لگتا ہے۔ ان ہی دنوں ان کے گھر عمیر کے دور کے تایا آئے ہوئے تھے۔ وہ چھت پر مردانہ سایہ دیکھ کر فائر کردیتے ہیں۔ روحیل بھاگ جاتا ہے اور ساہر' ثمر کے گھر کود جاتی ہے۔ دوسری طرف تایا شور مچادیتے ہیں کہ شفا چھت پر کسی مرد سے بات کررہی تھی۔ تقی کو ساہر کی ان منصوبہ بندیوں کا علم ہوتا ہے۔ وہ عمیر کی عزت کے خیال کرتے ہوئے اپنی شوٹنگ ادھوری چھوڑ کر گھر آجاتا ہے' جس کا خمیازہ اسے شفا سے نکاح کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔

— 9 —

نویں قسط

دو دن خاموشی سے گزر گئے۔ دانستہ ہی سب اس موضوع پر بات کرنے سے گریز کررہے تھے اور یوں ظاہر کرتے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو لیکن یہ خاموشی کہتی تھی' کچھ تو بات ہے۔

تقی کی اپنی پریشانی۔ فردوس صاحب کے پروجیکٹ کا ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب تھا' ہر آنے والے

پروجیکٹ کو پیشگی الوداع کہنا۔

شفا دو روز سے اپنے کمرے سے نہ نکلی تھی۔ کسی نے جاکر اس کی خبر نہ لی' کیا کھایا' کیا نہیں۔ زندہ بھی ہے یا مرگئی۔ تیسری صبح تایا جی کی بہو کو خیال آیا تو زبردستی اسے باہر نکال لائی۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں اور چہرے سے رتی بھر بھی غم نہ جھلکتا تھا۔ ہاں سنجیدگی بہت تھی۔

ساہر کو تو اسے دیکھ کر اور بھی تاؤ آنے لگا' وہ تو اس کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ تھی کجا کہ پوچھنا۔ اس نے تو اگلے روز ہی جاکر تقی سے صاف کہہ دیا تھا۔

"تمہیں ابھی کے ابھی شفا کو طلاق دینی ہوگی۔۔۔ جس کی شکل میں ساری زندگی نہیں دیکھنا چاہتی تھی اسے اپنی بھابھی کیسے بننے دے سکتی ہوں۔" اس کی حالت ایسی تھی جیسے خود پر بہت جبر کرکے بول رہی ہو ورنہ دل تو ایسے جیسے پھٹنے کے قریب ہو۔

"پاگل پن کی باتیں مت کرو۔" تقی نے ناگواری لیکن تحمل سے کہا تھا۔ "میرا بھی اس رشتے کو نبھانے کا ارادہ نہیں ہے لیکن اس طرح سے طلاق نہیں دے سکتا اسے۔"

"پھر کیا ساٹھ ستر گواہوں کی موجودگی کی ضرورت ہے؟ کیا کیا سوچا تھا میں نے' سب برباد کردیا۔ کہاں تو میں ساری زندگی اس شفا کی بچی کو جلتے دیکھنا چاہتی تھی' کہاں میرا شہزادوں جیسا بھائی لے اڑی۔" اس کے غم ان گنت تھے۔ تقی کو ہنسی آگئی جسے وہ کمال خوب صورتی سے چھپا گیا۔

"وہ بے چاری کہاں لے اڑی' تمہاری حماقت نے ہی تمہارے شہزادوں جیسے بھائی کو اس کی جھولی میں ڈال دیا۔"

"بس کرو تقی! بار بار مجھے ہی قصوروار ٹھہرانا بند کرو۔ مان لو کہ غلطی تمہاری ہے۔ تمہیں اس معاملے میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

تقی خاموش رہا لیکن اس کی خاموشی کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ خود کو قصوروار ماننے کے لیے راضی ہے۔

"لیکن ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا' ابھی ابھی میری بات مان لو۔ شفا کو طلاق دے دو۔" وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے تقی فوراً اس کی بات مان ہی لے گا۔

"یہ زیادہ بہتر ہے کہ تم میری بھلائی سے زیادہ اپنی بھلائی پر دھیان دو۔ یہ تو ٹھیک بات ہے کہ مجھے شفا کو چھوڑنا ہی ہے لیکن اس طرح سے ہرگز نہیں جس طرح تم چاہ رہی ہو۔ صرف ایک بار اس بات پر غور کرو اپنے ذہن کو ہر خیال سے فارغ کرکے کہیں بیٹھ کر سوچو۔ تم کیا کر بیٹھی ہو۔ سالن میں نمک زیادہ ڈال دینا' جھوٹ بول کر اپنے کام کروالینا' غلط فہمی پیدا کرکے ناردرن ایریاز بھجوادینا' سیڑھیوں سے دھکا دے دینا چھوٹے معاملات ہیں۔۔۔ اتنے چھوٹے کہ اگر ان کو بار بار گنا نہ جائے تو یاد بھی نہ رہیں لیکن کسی کی عزت داؤ پر لگادینا ہرگز بھی چھوٹا معاملہ نہیں ہے۔ عمیر بھائی کو پتا چلا تم نے ان کی بہن کے ساتھ جو کچھ کیا ہے تو وہ تمہیں طلاق دیں گے یا ویسے ہی چھوڑ دیں گے دونوں صورتوں میں نقصان تمہارا ہے۔ تمہارا گھر برباد ہوجائے گا تمہارے بچوں کا گھر بکھر جائے گا۔ بکھرے ہوئے گھروں کے بچے کیسے ہوتے ہیں۔ جانتی ہو۔۔۔ اور جب انہیں شعور آئے گا اور پتا چلے گا کہ ان کی ماں۔۔۔"

"تمہارا بہت شکریہ تقی! تم نے تو میری آنکھیں کھول دیں۔" وہ تڑخ کر بولی تھی۔ "مدد تو کر نہیں سکے تصویر کا بدصورت پہلو ہی دکھانا۔۔۔"

ایک بار پھر تقی اسے قائل کرسکا نہ وہ تقی کو۔ وہ فوں فاں کرتی وہاں سے چلی گئی اور یوں دو دن خاموشی سے گزر گئے۔

مزید دو دن بعد تایا جی اینڈ فیملی نے رخصت ہونا تھا لیکن اس سے بھی پہلے دی گریٹ تایا جی نے شوشا چھوڑ دیا جسے سن کر تقی کا دل چاہا' ان کی عمر کا لحاظ کیے بنا ان کے منہ پر اتنے گھونسے مارے کہ دوبارہ بتیسی لگاکر کھانا کھاتے بھی انہیں تکلیف ہو۔

وہ چاہتے تھے' شفا کی باضابطہ رخصتی کردی جائے۔

تقی تو اس مطالبے پر اکتایا سو اکتایا۔ عمیر بھی پریشان ہو گئے۔

"وہ شفا کو لے کر کہاں جائے گا؟ آپ عجیب باتیں کر رہے ہیں تایا جی!"

"دیکھو' میں جو بھی کہہ رہا ہوں' اس میں تمہارا فائدہ ہی ہے۔ مجھے اس لڑکے کے انداز کچھ کھٹک رہے ہیں۔ کوئی پتا نہیں' کس وقت دھوکا دے کر نکل جائے۔ پاؤں میں بیڑیاں ڈالو اور لڑکی رخصت کرنے والی بات کرو۔" اپنی طرف سے ایک اور بہت عقل والا مشورہ آیا تھا۔

"اور جس پر آپ کو بھروسا نہیں اسی کے ساتھ آپ مجھے اپنی بہن رخصت کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ آپ کمال ہیں تایا جی!" عمیر عاجز ہی آگئے تھے۔

"سنو میاں برخوردار! میں نے جو بھی کیا' تمہاری بھلائی کے لیے کیا اور اب بھی جو کہہ رہا ہوں' اس میں بھی تمہاری ہی بھلائی ہے۔ نہیں ماننا نہ سہی لیکن بعد میں پچھتاؤ گے یہ میں ابھی سے بتا رہا ہوں۔ لڑکا ہاتھ سے نکل گیا تو سر پکڑ کر رونا پڑے گا۔"

"خیر نکلنا ہو تو بعد میں بھی نکل سکتا ہے۔ گارنٹی تو کسی بھی چیز کی نہیں۔" عمیر اس بات پر مزید پریشان ہو گئے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ تایا جی کی بات سے کسی قدر متفق بھی ہو ہی گئے تھے لیکن اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"وہ اسے لے کر جائے گا کہاں؟ تقی کے پاس کوئی ٹھکانا ہوتا تو وہ یہاں رہ ہی کیوں رہا ہوتا۔"

"کہیں لے کر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں ایک کمرے سے دوسرے میں شفٹ کر دو۔ بس تقی کو پتا ہونا چاہیے کہ شفا کی باضابطہ رخصتی ہو چکی ہے۔"

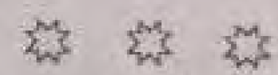
پھر انہوں نے جھک کر عمیر کے کان میں رازداری سے کچھ کہا جسے سن کر عمیر کا چہرہ کانوں تک لال ہو گیا۔ وہ جو سمجھا رہے تھے' وہ عمیر کی سمجھ میں بھی آ رہا تھا۔ وہ کوئی دودھ پیتے بچے نہیں تھے لیکن کچھ باتیں صرف سمجھنے کی ہوتی ہیں۔ کہہ کر دوسروں کو شرمندگی میں مبتلا کرنے کی نہیں اور پھر تایا جی کو اپنی اور عمیر کی عمر کا لحاظ کرنا چاہیے تھا۔ یہ بھی نہیں تو عمیر اور شفا کے آپس میں رشتے کا لحاظ بھی کر لیتے۔

عمیر قدرے جھنجلا کر اٹھ گئے اور تقی کے پاس ہی آئے۔

چونکہ وہ خود بھی رخصتی کے حق میں تھے سو کہہ بھی دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ مدعا سارا تایا جی پر ڈالا۔ دراصل انہیں خاندان میں تایا جی کی زبان سے اپنی عزت بچانا بھی سو ان کی بات ماننا ضروری لگ رہا تھا۔

تقی جل بھن گیا۔ آئیں بائیں شائیں کی لیکن۔۔۔

"پھر ایک کمرے سے دوسرے میں لے جا کر کیا کروں گا۔ جب رخصت کرنا ہی ہے تو میں اسے کہیں اور لے جاتا ہوں۔ تایا جی خوش ہو لیں۔" اس نے تایا جی کے اصرار پر نہیں' عمیر کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر فیصلہ کیا تھا۔ یہ رشتہ تو اس کے گلے ہی پڑتا جا رہا تھا۔



لیکن رخصتی سے متعلق ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔ عمیر' تایا جی اور خصوصاً" تقی تذبذب کا شکار تھے کہ اچانک عبدالباقر صاحب آگئے۔ اب یہیں سے تقی اور شفا کی کہانی نے ایک نیا موڑ لیا۔ یہ کارستانی تھی سماہر کی۔ پہلے وہ صرف شفا کے خلاف تھی۔ اب تقی کے بھی ہو گئی اور ان دونوں کے خلاف اس کے پاس ترپ کے دو ہی پتے تھے جن میں سے ایک کو اس نے چل دیا اور باقر صاحب کو فون کر کے تقی کے خفیہ نکاح کی خبر دے دی۔

باقر صاحب تقی کے پہلے ہی خلاف تھے۔ انہیں یقین تھا اس نے آج تک جو بھی کام کیا۔ خاندان کا نام ڈبونے کے لیے ہی کیا۔ نکاح کی خبر سن کر سخت صدمہ پہنچا لیکن نکاح سے پہلے والی کارستانی نے تو دماغ ہی اڑا

دیا۔ یعنی جس تھالی میں کھایا' اسی میں چھید بھی کر دیا۔ عمیر کے گھر میں رہ کر اسی کی بہن پر بری نظر ڈالی۔۔۔۔ توبہ توبہ۔۔۔۔

ان کے دل میں تقی کے لیے جو ناپسندیدگی تھی' اسے سماہر کے جھوٹ نے اور بھی ہوا دے دی۔ دل تو چاہا۔ اب ساری زندگی ہی اس کی شکل نہ دیکھیں لیکن اپنے خاندان کے ماتھے پر ایسا سیاہ داغ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ دماغ پھٹ رہا تھا لیکن اب اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ حکمت عملی سے کام لیں' وہ سماہر کے گھر آگئے۔ اکیلے نہیں آئے۔ بیوی اور بڑا بیٹا رضی بھی ساتھ تھے اور آنے سے پہلے وہ بیوی کو غلط تربیت پر خوب لتاڑ کر آئے تھے۔ رضی الگ پریشان تھا لیکن وہاں جا کر کسی نے اس متعلق کوئی بات نہیں کی۔

تقی ان سب کو سامنے پا کر ہکا بکا رہ گیا۔ چونکہ اصل معاملے کی خبر نہیں تھی۔ یہی سمجھا ابا اس کی محبت میں آگئے ہیں۔ خوش ہو کر ان سے لپٹ جانا چاہتا تھا لیکن انہوں نے ایک غصے اور نفرت سے بھری نگاہ ہی اس پر ڈالی اور عمیر کی ہمراہی میں دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

اس نے امی کی طرف دیکھا۔ وہ الگ روئی روئی سی تھیں۔

"یہ تم نے کیا کیا تقی!"

تقی ان کے انداز پر حیران ہوا لیکن اس سے قبل کہ کچھ کہتا' سماہر نے کہا۔

"آئیں امی! میں آپ کو شفا سے ملواتی ہوں۔"

اب وہاں صرف وہ اور رضی ہی رہ گئے۔ تقی نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا تو وہ بھی عجیب سی نظر اس پر ڈال کر اسی کمرے کی طرف چلا گیا جس میں عمیر ابا کو لے کر گئے تھے۔

تقی اکیلا احمقوں کی طرح کھڑا گتھیاں سلجھاتا رہا۔ اندر ابا اور تایا جی ہم خیال نکل آئے۔

تایا جی نے تو دبے لفظوں میں شک ظاہر کیا تھا کہ چونکہ تقی نے کسی ہبڑ دبڑ میں نکاح کر لیا ہے سو ایسا نہ ہو بعد میں مکر جائے۔ نئی نسل کا آج کل کچھ پتا نہیں چلتا۔

ابا اور رضی نے اصل قصہ چھیڑا ہی نہیں کہ جو خبر ان تک پہنچی' اس کا ذکر کرنے میں نری شرمساری ہی شرمساری تھی۔ البتہ ابا جیسے انسان بھی سر جھکا کر بات کر رہے تھے تو یہ ان کی شرمساری کا اظہار ہی تھا۔ جبکہ عمیر اور تایا جی کے تو فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ کیا سن کر آئے ہیں۔

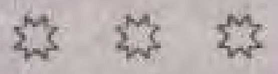
یعنی بالا ہی بالا سب طے ہو رہا تھا۔

اور تایا جی نے تو سرسری سا شک ظاہر کیا تھا۔ ابا نے بنا لحاظ ان کے شک پر مہر لگا دی۔

"بھائی صاحب بالکل درست کہہ رہے ہیں' ہے تو میرا بیٹا لیکن مجھے خود بھی اس پر بالکل بھروسا نہیں ہے۔" پھر انہوں نے عمیر کی طرف دیکھا۔

"آپ بالکل بے فکر ہو جائیں عمیر بیٹا! شفا بیٹا آج سے ہماری ذمہ داری ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں' اسے رخصت کر کے سسرال بھجوا رہے ہیں بلکہ یہ سمجھیں' وہ بھائی کے گھر سے رخصت ہو کر اپنے باپ کے گھر جا رہی ہے۔"

عمیر کو اچھی خاصی تسلی ہو گئی۔ جس طرح نکاح ہوا اس میں تو ناکامی کے اسی فیصد چانسز تھے لیکن تقی کے والد کی مداخلت کے بعد ان کا مطمئن ہو جانا کچھ ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ انہوں نے رخصتی کے لیے ہامی بھر لی۔



جس طرح نکاح ہوا تھا۔ رخصتی اس سے بھی زیادہ عجیب انداز میں ہوئی اور صرف شفا کی ہی نہیں ہوئی تقی کی بھی ہو گئی یعنی اسے بھی گھر آنے کی اجازت مل گئی لیکن سارا راستہ ابا غضب ناک صورت بنائے سنجیدہ بیٹھے رہے۔ اگلی سیٹ پر تھے۔ رضی ڈرائیو کر رہا تھا۔ تقی اور شفا امی کے ساتھ پچھلی سیٹوں پر تھے۔ تقی بار بار بیک ویو مرر میں ابا کو دیکھتا اور ان کے خیالات

تک رسائی حاصل کرنے کا تکا لگاتا لیکن ہر بار ناکام ہی رہتا۔ ان کی شکل دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا۔ شفا کی مروت میں اسے بھی ساتھ لے آئے ہیں ورنہ ان کا بس چلتا تو گھر میں قدم رکھنے کی اجازت بھی نہ دیتے۔

گھر پہنچ کر پتا چلا "معاملہ کچھ نہ کچھ نہیں بلکہ پورا کا پورا ایسا تھا کہ اسے حقیقتاً "شفا کی مروت میں آنے کی اجازت ہی دی جارہی تھی۔

ابا تو سیدھے اندر چلے گئے۔ شفا کو امی ساتھ لے گئیں۔

"معاملہ کیا ہے؟" اس نے الجھ کر رضی سے پوچھا' جواب میں جو سننے کو ملا۔ اس نے اسے ہکا بکا کر دیا' دماغ اڑا دیا' تقی کھڑے کھڑے مرنے والا ہو گیا۔

"کیا کہا ساحر نے کہ میں نے شفا کے ساتھ ......"

اس سے آگے لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکلے اس قدر فضول بات "اتنا گھٹیا الزام۔

ساحر نے تو اسے کچھ سوچنے کے قابل بھی نہ چھوڑا تھا کجا کہ کچھ کہنا۔

لیکن اب سچ اگلنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا سو اس نے رضی کو ہی سچ بتا دیا۔

رضی کو شاک لگا۔

"ساحر نے اتنا بڑا جھوٹ بولا ...... وہ ایسی کب سے ہو گئی۔"

"مجھے نہیں پتا "ایسی کب سے ہو گئی۔" تقی نے بیزاری سے کہا "میں صرف اتنا جانتا ہوں' میری نیکی میرے گلے پڑ گئی ہے۔ میرا کردار تک مشکوک بنا دیا ساحر نے۔ ابا کی نظر میں تو پہلے ہی کچھ نہیں تھا۔ اب تو اور بھی گر گیا۔ کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چھوٹی بات ہے؟! اتنی بڑی بات کس آرام سے کہہ دی اس نے۔"

وہ جس کیفیت میں تھا۔ اس کا کوئی ایک واضح نام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"میں جا رہا ہوں۔ شام تک آجاؤں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہے ہو' میں اس طرح تمہیں نہیں جانے دوں گا۔" رضی نے تیزی سے کہا تھا۔

"بے فکر رہیں۔ بھاگ نہیں رہا۔ واپس آجاؤں گا لیکن ذرا کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہوں۔"

"لیکن تقی!"

"پلیز بھائی......"

"اچھا ٹھیک ہے لیکن بائیک لے جاؤ۔"

بائیک اسی کی تھی لیکن جب گھر سے نکالا گیا تو گھر میں موجود اس کی ہر چیز سے بھی بے دخل کر دیا گیا۔

تقی نے رضی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا جس میں بائیک کی چابی تھی۔

"رہنے دیں۔ ابا خفا ہو جائیں گے۔"

"بے فکر رہو۔ میں سنبھال لوں گا۔ لیکن بائیک تم لے جاؤ اور سنو' جلدی واپس آجانا۔"

رضی نے تاکید کرنا ضرور سمجھا۔

تقی بائیک لے کر نکلا تو دن کے ڈھائی بجے تھے وہ رات گیارہ بجے تک سڑکوں پر بائیک دوڑاتا رہا۔ ایک بار بھی گھر جانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ کیوں سوچتا' وہاں تھا بھی کیا۔ صرف شک اور ابا کی بد گمانی۔ جو اسے ہرگز نہ چاہیے تھی۔

اتنا بھی خیال نہ آیا۔ ایک لڑکی ہے جسے اپنا نام لگانے کی پاداش میں اس کے ابا ساتھ لے آئے ہیں۔ معمولی غلطی کی بھی اتنی بڑی سزا۔ بھئی کمال ہے۔



تقی کی امی نے اسے باری باری سب سے ملوایا۔

"یہ رضی ہے' تقی سے بڑا اور یہ جری ہے۔ تقی سے چھوٹا۔ یہ رضی کی بیوی اور اس کی بیٹی اور میں تقی کی ماں ہوں۔ تمہاری بھی ماں ہوں۔ تم کبھی مجھے غیر نہ سمجھنا۔ زندگی میں آزمائشیں آجایا کرتی ہیں۔ ان پر دل برداشتہ نہیں ہوا کرتے۔ گو کہ جو بھی ہوا برا ہوا لیکن آگے جو بھی ہو گا۔ اچھا ہی ہو گا ان شاءاللہ مجھے افسوس ہے۔ تمہیں پورے چاؤ سے رخصت نہیں کروا سکی۔ تقی کی جلد بازیاں بس ایسی ہی ہیں۔ تمہارے بھی تو کچھ نہ کچھ ارمان ہوں گے۔ ہر لڑکی کے ہوتے ہیں۔ لیکن تم دیکھنا' ولیمہ ہم پوری دھوم دھام سے کریں گے۔" وہ جتنا ہو سکا "اسے تسلی دیتی رہیں شفا نے کچھ سنا کچھ نہیں۔

اس پر تو صحیح معنوں میں قیامت ٹوٹی تھی اور عجیب ہی انداز سے ٹوٹی تھی۔ نکاح کر کے رخصت نہیں کیا گیا تھا۔ نکاح کر کے گھر سے نکالا گیا تھا۔

عمیر بھائی نے اس سے کہا تھا۔

"تمہاری رخصتی ہے۔ ضروری سامان پیک کرلو۔" اس نے صاف کہہ دیا۔

"جب گھر سے نکال ہی رہے ہیں تو سامان دینے کی بھی کیا ضرورت ہے۔"

پھر شاید تایا جی کی بہو نے اس کا سامان پیک کیا اور اس کے کان میں گھس کر بولی۔

"بد گمانی دل میں لے کر گھر سے نہ جاؤ شفا! جب طوفان آتا ہے تو گرد و غبار کو بیٹھنے میں وقت لگتا ہے۔ تمہارے بھائی نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔ یہاں رہو گی تو زمانے کی اٹھی ہوئی انگلیاں تمہارا جینا مشکل کردیں گی۔"

لیکن شفا کے کان بند تھے سن نہ سکی۔ اس کا تو دل ٹوٹا تھا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی بھی ــــ جلد جڑ جاتی ہو گی لیکن ٹوٹے ہوئے دل کو جڑنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔

اور اب وہ یہاں تھی۔ اس کے گرد موجود افراد ہنس بول رہے تھے اور چاہتے تھے وہ بھی ان کی گفتگو میں حصہ لے۔ غالباً" ان سب کی خوش مزاجی کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اس کیفیت سے نکلے لیکن وہ گھس سی بیٹھی رہی۔ زیادہ سے زیادہ بھی ہوں ہاں کر کے خاموش ہو جاتی تھی۔

تب تقی کی امی اسے کمرے میں چھوڑ گئیں۔

"تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو......"

"آنٹی! میں کچھ نہیں کھاؤں گی صرف سونا چاہتی ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں ہاں۔ تم سو جاؤ۔" وہ اسے چھوڑ کر چلی گئیں شفا نیم دراز ہو گئی اور کچھ ہی دیر میں گہری نیند سو گئی۔



تقی رات گئے واپس آیا گو کہ دل راضی نہیں تھا پھر بھی آگیا۔ کوئی اور ٹھکانا بھی تو نہیں تھا کہ وہیں چلا جاتا۔

رضی اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ تقی کی لٹکی ہوئی شکل دیکھی تو محبت سے اس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

"پریشان کیوں ہوتے ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اب تک تو ہوا نہیں پھر کب ہو گا۔" اس نے اور منہ لٹکا کر کہا اور لاؤنج کے صوفے پر گر گیا۔

"سب سو گئے؟"

"ہاں۔" رضی بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"شفا؟" تقی نے گردن موڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"امی اور شفا جری کے کمرے میں۔"

تقی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے' میں یہاں نہیں رہوں گا۔ شک کے سائے میں رہنا بہت مشکل ہے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا "ایسے جیسے نیند میں ہو۔

"اچھا تو پھر کہاں جاؤ گے؟"

"کہیں بھی چلا جاؤں گا ..... لیکن یہاں نہیں ..... میں انہیں اصل بات نہیں بتا سکتا کہ ساحر کی عزت ان کی نظروں میں جاتی رہے گی اور بتانے کا کچھ خاص فائدہ ہو گا بھی نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں' وہ یقین کریں گے ہی نہیں ..... یہاں رہا تو وہ اپنے جملوں سے ماردیں گے بلکہ جملوں کی تو نوبت ہی نہیں آئے گی۔ ان کی نظریں ہی مجھے زمین میں گاڑنے کے لیے کافی ہوں گی' میں چلا جاؤں گا۔ ان کا خیال ہے' مجھے گھر لا کر انہوں نے میرے گناہ پر پردہ ڈالا ہے۔ وہ نہیں جانتے وہ گناہ تو میں نے کیا ہی نہیں ..... میں نہیں رہوں گا۔ چلا جاؤں گا۔"

وہ صوفے پر ہی سو گیا۔ رضی نے لا کر کمبل اوڑھا

دیا۔



شفا کو زیادہ گہری نیند نہیں آئی۔ اسی لیے صبح بھی جلد آنکھ کھل گئی۔ تقی کی امی بھی جاگ چکی تھیں اور وہ بیڈ سے اٹھ ہی رہی تھیں۔

"جاگ گئی ہو بیٹی!" اسے آنکھیں کھولتا دیکھ کر انہوں نے مسکرا کر کہا۔ شفا بھی تکلفاً" مسکرا کر اٹھ بیٹھی۔

"نماز پڑھ کر میں کچھ دیر کے لیے دوبارہ آنکھ لگا لیتی ہوں' دراصل جوان عمری کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ سال بچے دار ہو جاؤ تو نیند کو تو بھولنا ہی پڑتا ہے اور پھر آدھی سے زیادہ عمر گزار کر نیند ویسے ہی کم ہو جاتی ہے..... لیکن آج میں کچھ زیادہ ہی سو گئی۔"

"میں بھی نماز کے لیے تو اٹھتی ہوں۔" اس نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔

"رات سونے میں ہم سب کو ہی دیر ہو گئی تب ہی تو آنکھ نہیں کھل پائی۔ اچھا اٹھو قضا ہی پڑھ لیتے ہیں۔"

وہ اٹھیں تو شفا بھی ان کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں نے قضا نماز کی ادائیگی تک بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں کر ڈالیں بلکہ زیادہ تر تو وہی بولتی رہیں' شفا صرف سنتی رہی یا ہوں ہاں میں جواب دیا۔

پھر وہ اسے کچن میں لے آئیں۔

"ثمین میری بہو ہی نہیں بھانجی بھی ہے۔" انہوں نے بتایا' شفا مسکرا کر خاموش ہو رہی۔

"آپ کچھ نہ بتائیں خالہ! کیونکہ میری اور شفا کی تو بہت دوستی ہونے والی ہے۔" وہ خوشگوار مزاج والی تھی جلد ہی شفا سے باتیں کرنے لگی۔ دو تین بار شفا نے کوشش کی کہ اس کا ہاتھ بٹا دے لیکن ہر بار ثمین نے اسے منع کر دیا۔

"روایتی نہ سہی لیکن ابھی پہلے دن کی دلہن ہو ساری زندگی پڑی ہے کام کرنے کے لیے۔ اس لیے ابھی رہنے دو اور میرے ہاتھوں کا لذیذ ناشتہ کھاؤ۔ پھر بتانا ایسا لذیذ ناشتہ تم نے پہلے کبھی کیا ہے..... تمہارا میاں کھانے پینے کا اتنا شوقین ہے کہ تمہاری باقی کی زندگی ویسے بھی کچن میں ہی گزرنے والی ہے۔" وہ نان اسٹاپ بول رہی تھی۔ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ اس کے ناشتہ بناتے ہاتھ زیادہ تیزی سے چل رہے ہیں یا زبان۔

شفا سنتی رہی۔ مسکراتی رہی لیکن یہ تھا کہ تھوڑی بہت ہی سہی لیکن ان دو خواتین کی وجہ سے اس کی جھجک کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔



اگلی صبح وہ دیر سے بیدار ہوا۔ اتوار تھا اور وہ اتنا دھت' ہو کر سویا تھا کہ ایک بار بھی احساس نہ ہوا اگرد گرد کتنی چہل قدمی بڑھ گئی ہے۔

آنکھ کھلتے ہی کچھ دیر بے دھیانی سے چھت کو گھورتا رہا۔ ذہن بالکل خالی سا ہو رہا تھا پھر چھوٹے سے صوفے پر بمشکل کروٹ بدلی تو سامنے ہی شفا نظر آ گئی۔ لاؤنج اور کچن کے درمیان جو کھڑکی تھی اسی سے وہ باتیں کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ بول رہی تھی' ہنس رہی تھی۔

"ہنس تو ایسے رہی ہے جیسے بڑا خوشی کا موقع ہو..... ہونہہ۔"

تقی کو آگ ہی لگ گئی لیکن ابا کی کھنکھار نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"صبح ہوئے بہت دیر گزر چکی ہے۔" آواز تھی کہ طنز میں ڈوبا نقارہ۔ تقی اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن کمبل سے نہیں نکلا۔

"لیکن ناکارہ لوگوں کو کیا پتا' صبح کس چڑیا کا نام ہے اور جلد بیدار ہونے کی کتنی برکت ہے۔"

"گھما پھرا کر سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کے گھر سے جا ہی رہا ہوں۔"

"اچھا! ذرا میں بھی تو سنوں' وہ کون سے محل ہیں جو آپ نے کھڑے کر رکھے ہیں اور یہاں سے نکل کر وہاں جانے کا ارادہ ہے۔ جنہوں نے رحم کھا کر اپنے گھر میں رکھا تھا۔ انہیں تو تم اچھا سبق سکھا آئے ہو کہ آئندہ کسی پر رحم کھانے کی غلطی نہ کریں۔ میں تو

تمہیں نالائق ہی سمجھتا تھا لیکن تم تو احسان فراموش بھی نکلے۔"

"بس۔" وہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ گھر کے سب افراد اکٹھے ہو گئے۔ شفا بھی اب تو ان میں شامل تھی اور رضی نے بے اختیار سر پر ہاتھ مارا تھا۔ وہ کل رات اس کا انتظار کرتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ تقی کو تاکید کرے گا جب ابا اس سے بات کریں تو وہ خود پر اپنی زبان پر کنٹرول کرلے۔ ابا کے سامنے کہا ہوا ایک بھی جملہ اس کے نمبر مزید گھٹا سکتا تھا لیکن وہ بھول گیا اور اس کی بھول اب سامنے آگئی تھی۔

"جنہوں نے احسان کیا۔ ان کی فکر آپ نہ کریں۔ ان کے ساتھ اپنے معاملات میں خود سنبھال لوں گا باقی جہاں تک بات محلوں کی ہے تو میں سڑک پر رہنا زیادہ پسند کروں گا بہ نسبت آپ کے اس گھر کے۔ کم سے کم وہاں کوئی باربار احسان جتانے تو نہیں آئے گا۔ ساری دنیا کے باپ اپنی اولاد کو پالتے ہیں ان کے لیے محنت کر کے اپنی اوقات سے اچھا لائف اسٹائل فراہم کرتے ہیں لیکن کوئی بھی اس طرح جتاتا نہیں ہو گا جس طرح آپ بچپن سے مجھے جتا رہے ہیں۔"

"تمہاری یہی زبان درازی مجھے سخت ناپسند ہے۔" وہ گرجے۔

تقی کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ "آپ کو میں ہی ناپسند ہوں۔"

"تو تم نے ایسا کون سا کام کیا جو میں تمہیں پسند کروں؟"

"ماں باپ کی محبت تو کبھی مشروط نہیں ہوتی پھر آپ مجھ سے محبت کرنے کے لیے ہمیشہ جواز کیوں تلاش کرتے رہے ہیں۔" اس نے سوچا۔ کہا نہیں اور کھڑا ہو گیا۔

"آپ کو آپ کا محل مبارک ہو۔ میں کچھ دیر میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بات نے ابا کو اور غصہ دلایا۔

"تم ہو بھی اسی قابل کہ سڑکوں پر رُلتے رہو۔"

"جی بہتر۔" اس نے تحمل کی انتہا کردی۔

"شفا بیٹی یہیں رہے گی۔" ابا نے غرا کر فیصلہ سنا دیا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

تقی نے چند پل کا توقف کیا اور اطمینان سے بولا۔

"ٹھیک ہے..... اسے یہیں رکھیں۔"

ہاتھ میں چائے کا مگ پکڑے خاموش کھڑی شفا کی روح پر ایک اور ضرب لگی۔ یہ تو اوقات تھی اس کی کہ اسے خالی سوٹ کیس کی طرح کہیں بھی چھوڑ دیا جائے۔

"پاگل پن کی باتیں مت کرو تقی! بس اب یہیں رہو۔" امی تیزی سے درمیان میں آئیں اور منت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں فیصلہ کر چکا ہوں امی! یہاں رہوں گا تو ابا کے لیے ایک مستقل ٹینشن۔ اچھا ہے ان کی نظروں سے دور ہی رہوں۔" وہ ڈرا یا جھجکا نہیں تھا بے دھڑک کہہ دیا تھا۔ ابا نے زور کا "ہونہہ" کہہ کر منہ موڑ لیا۔ امی نے آس سے ان کی طرف دیکھا لیکن وہ تو منہ موڑ چکے تھے۔ وہ سمجھ گئیں مزید کچھ نہ سنیں گے۔

"ٹھیک ہے..... جانا ہی ہے تو شفا کو ساتھ لے کر جاؤ۔ شوہر کے بغیر وہ یہاں کیونکر رہ سکتی ہے۔" امی کے دماغ میں جانے کیا آئی۔ انہوں نے آنکھوں میں آنسو بھرے تیزی سے کہا تھا۔

"میں کہہ چکا ہوں۔ شفا بیٹی یہیں رہے گی۔" ابا از سر نو غرائے۔

"یہاں کون سے لڈو بٹ رہے ہیں کہ یہاں رہے۔" امی نے سادگی سے کہا۔ "جس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے' رہے بھی اسی کے ساتھ۔"

"لیکن امی.....!" تقی نے اس فیصلے کے حق میں مزاحمت کرنا چاہی لیکن امی نے چپکے سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

"ہاں' یہ اس کا اپنا گھر ہے سو بار آئے لیکن شوہر کے ساتھ۔ جو حق ہے اسے پورا ہونے دیں۔"

ابا کو دھچکا لگا' سالہا سال سے بیگم کے منہ سے جی حضور' جی حضور سننے کے عادی ہو چکے تھے۔ یہ کھلی

مخالفت برداشت کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

"تم کون ہوتی ہو فیصلہ کرنے والی؟" ابا کی چنگھاڑ۔ باقی سب نے تو جو محسوس کیا سو کیا' تقی کا دماغ پھٹنے والا ہو گیا۔ شفا کے سامنے اس کی ماں سے کس طرح بات کر رہے تھے۔

"معاف کیجئے گا ابا! لیکن فیصلہ کرنے کا اختیار تو آپ کے پاس بھی نہیں ہے۔ یہ فیصلہ میں اور شفا کر سکتے ہیں اور میرا فیصلہ ہے' شفا میرے ساتھ ہی جائے گی..... امی ! ٹھیک کہہ رہی ہیں' جہاں میں رہوں گا وہیں میری بیوی بھی رہے گی۔" اس نے تحمل سے کہا اور گردن موڑ کر شفا کو دیکھا۔ "چلو شفا!"

اتنا دوستانہ انداز تھا کہ ایک پل کو شفا بھی حیران ہوئی۔

ابا ہونہہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔ ساتھ ہی رضی کو بھی ساتھ آنے کا حکم دیا۔

رضی تیزی سے ان کے پیچھے لپکا۔

"امی! مجھے میرے اور یجنل ڈاکیومنٹس چاہییں"

وہ اس کمرے کی طرف چلا گیا جو اس کا اور جری کا تھا اور آج کل صرف جری کے زیر استعمال تھا۔

اسے چند منٹ لگے تھے اپنا مطلوبہ سامان سمیٹنے میں۔ ان ہی چند منٹوں میں رضی اس کے پاس آیا۔

"یہ لو۔" اس کے ہاتھ میں چابیاں تھیں۔ تقی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"جوہر ٹاؤن والا مکان پچھلے مہینے کرایہ داروں نے خالی کر دیا تھا۔ ابا کہہ رہے ہیں' تم وہاں شفٹ ہو جاؤ۔"

"اب یہ عنایت کس لیے؟" تقی کس قدر حیران ہوا اور کسی قدر جھنجلا کر کہا۔

رضی مسکرا دیا۔

"جب خود اپنے ہی جیسے ایک بیٹے کے باپ بن جاؤ گے تو اس سوال کا جواب تمہیں مل جائے گا۔"

"اب اس بات کا کیا مطلب ہے؟" وہ اور جھنجلایا جب آپ خود کو درست سمجھ رہے ہوں اور کوئی آپ کو بالواسطہ بھی یہ جتا دے کہ کچھ نہ کچھ تو آپ بھی غلط ہیں تو جھنجلاہٹ تو ہوتی ہے ناں۔

"اور ویسے بھی مجھے ابا کا کوئی احسان نہیں چاہیے۔"

"پاگل پن کی باتیں مت کرو۔ اب تم اکیلے نہیں ہو کہ جہاں سینگ سمائے وہاں رہ لیے۔ شفا کی ذمہ داری ہے تم پر اور عورت کی ذمہ داری معمولی نہیں ہوتی۔ اس طرح پھر گھر سے نکل رہے ہو' ایک بار بھی سوچا ہے اسے کہاں رکھو گے؟"

بات عقل والی تھی اس کی سمجھ میں آگئی تو جھجکتے ہوئے چابیاں پکڑ لیں لیکن "اکڑ" ابھی بھی نہیں گئی تھی اس کی۔

"میں جلد ہی گھر کا بندوبست کرلوں گا۔"

رضی نے سر ہلا دیا۔ "پیسے چاہئیں؟"

تقی کا سر شرمندگی سے لیکن اثبات میں معمولی سا ہلا۔

رضی نے فوراً" والٹ نکال کر اسے کچھ نوٹ پکڑا دیے۔

"ابھی اتنے ہی ہیں میرے پاس۔ کل بینک سے نکلوا کر اور دیتا ہوں۔"

"یہ بھی میں واپس کر دوں گا۔" تقی نے شرمندگی سے کہا تھا۔ رضی نے ہنس کر اس کے کندھے پر چپت لگائی۔

"فکر نہ کرو۔ اب وہ دور نہیں رہا کہ میں تمہیں اپنے پیسے چھوڑ دوں۔ اتنے بڑے اسٹار بن گئے ہو' سارے قرض سود سمیت وصول کروں گا۔"

یہ بڑے بھائی کا پیار بھرا انداز تھا۔ تقی کے دل میں اسٹار والی بات بری سی گڑی لیکن ابھی وقت نہیں تھا کہ رضی کو بیٹھ کر خود پر بیتی داستان سناتا' سو وہ بھی ہنسا اور جب ہنسا تو جری بھی اندر آگیا۔

"بھائی! تم بائیک بھی لے جاؤ۔ تمہارے کام آئے گی۔ میں کالج لوکل سے چلا جایا کروں گا۔ ٹائر پنکچر ہوا تھا۔ میں نے لگوا دیا اور آئل ابھی پچھلے ہفتے بدلوایا تھا آپ گئے تو بیڈ پر میں نے سونا شروع کر دیا تھا لیکن آپ آئیں گے تو آپ کا بیڈ چھوڑ دوں گا۔ پہلے کی طرح

کارپٹ پر میٹرس بچھالیا کروں گا۔" وہ تقی کو خوش کرنے کے لیے سادگی اور سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ تقی اور رضی کی مسکراہٹیں گہری ہوئیں۔

"صرف بیڈ ہی نہیں کمرا چھوڑنے کے لیے بھی تیار رہو کیونکہ اب تقی آئے گا تو اس کی بیوی بھی ساتھ ہوگی۔" رضی نے کہا تھا۔ جری نے ایسے تاثرات دیے جیسے کہہ رہا ہو اس پر سوچے گا۔

"اتنے برے ابا کے ہم کتنے اچھے بیٹے ہیں۔" تقی نے بناوٹی دکھ سے کہا تھا' حالات نے اسے سنجیدہ کردیا تھا ورنہ ہڈی تو وہی پرانی تھی۔

"ابا برے نہیں ہیں۔" جری نے فوراً" کہا۔

"تم ساری زندگی ابا کے چمچے ہی رہنا۔ دیکھ لینا۔ تمہارے بچوں کے نام کے آگے بھی تمہارے نام کے بجائے "چمچہ" ہی لگے گا۔ یعنی تم نے اپنے بیٹے کا نام سعد رکھا تو اس کا پورا نام "سعد چمچہ" ہوگا۔"

اس بات پر وہ تینوں ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔



بھائی نے اچانک گھر سے نکال دیا اور جس کے ساتھ نام نہاد رخصتی کی' وہ اسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر جوہر ٹاؤن لے آیا۔

تقی کی امی نے نکلتے ہوئے اس کا ہاتھ دبا کر کہا تھا۔

"کرائے داروں نے جاتے ہوئے گھر کی صفائی کروائی تھی تب سے ویسے ہی پڑا ہے۔ پہلے پتا ہوتا تم لوگ وہاں رہو گے تو صفائی کروادیتی اور کچھ ضرورت کا سامان بھی رکھوادیتی لیکن تم ابھی جاتے ہی پریشان نہ ہوجانا۔ ایک دو دن تک سب ہوجائے گا۔ ابھی فوری طور پر میں تمہارے ساتھ بھی نہیں جاسکتی کہ تقی کے ابا برا مانیں گے' لیکن کل میں ضرور چکر لگاؤں گی۔"

شفا نے گھوم پھر کر دیکھ لیا' گھر اچھا تھا' اتنا گندا بھی نہیں تھا لیکن چونکہ کافی دنوں سے بند پڑا تھا تو صفائی کی ضرورت تو بہرحال تھی اور اس کے لیے اسے کچھ بنیادی چیزوں کی ضرورت تھی۔ وہ ذہن میں ان چیزوں کی لسٹ بناتی رہی۔ فرنیچر کے نام پر ایک پلنگ تھا۔ دو کرسیاں' ایک چھوٹی میز کچن میں رکھی تھی۔ دو بیڈ روم تھے۔ ان کے درمیان میں لاؤنج۔ کچن' ایک طرف ڈرائنگ روم' کچن کے ساتھ چھوٹا سا کچن گارڈن۔ اوپر کا پورشن بھی اسی طرح تھا۔

جب وہ گھوم پھر کر دیکھ چکی تو تقی منہ بناتا پتا نہیں کہاں سے برآمد ہوا۔

"پانی نہیں آرہا۔ موٹر خراب ہے۔ میں مکینک کو لے کر آتا ہوں۔" وہ جاتے جاتے رکا۔

"تمہیں اکیلے ڈر تو نہیں لگے گا؟"

شفا نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ چلا گیا۔ شفا اکیلی تنہا گھر میں گھومتی رہی۔ دو تین صفائی سے متعلقہ چیزیں بھی اسے مل ہی گئیں تو اس نے کام بھی شروع کردیا۔ اچھا ہی تھا۔ بیٹھ کر سود و زیاں کا حساب کرتے رہنے سے تو بہت اچھا تھا خصوصاً" تب جب آپ جانتے ہوں' نفع نقصان کا دس بار پڑتا لگالو آخر میں جو ہاتھ آئے گا' وہ نرا خسارہ ہی ہے تو بہتر ہے' اس پر سوچو ہی نہیں۔

سو اس نے بھی یہی کیا۔ خود کو مصروف کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ ذہن میں کوئی خیال آئے ہی نہیں۔ لیکن خیال تو خیال ہے' اس کا دل چاہے گا تو وہ آئے گا۔ نہیں تو نہیں آئے گا۔

تقی مکینک کو لے کر آیا تب تک وہ کچھ اور سامان بھی تلاش کرچکی تھی۔ موٹر ٹھیک ہوئی پانی آگیا۔ شفا نے بالٹیاں بھر بھر کے پانی بہانا شروع کیا تو تقی نے بنا کہے جھاڑو اٹھالی' لیکن وہ اناڑی پن سے جھاڑو لگا رہا تھا۔ شفا سے رہا نہیں گیا تو اس کے ہاتھ میں بالٹی پکڑا کر اس کے ہاتھ سے جھاڑو لے لی۔ ڈیوٹی بدل گئی' لیکن بالکل خاموشی سے اور دوستانہ پن کے ساتھ۔ منٹوں میں سارا گھر دھل دھلا کر نکھر گیا۔ فرنیچر تو کوئی تھا نہیں کہ دقت ہوتی۔

جب وہ دونوں فارغ ہو کر بیٹھ گئے تو تقی دوبارہ گھر سے چلا گیا۔ تقریباً" آدھ گھنٹے بعد واپس آیا تو ڈسپوزیبل پیکنگ میں چائے اور فروٹ کیک لایا تھا۔

"ابھی اسی پر گزارہ کرو۔ پھر کھانے کے لیے بھی کچھ کرتا ہوں۔"

شفا نے ان چیزوں کو ایسے وصول کیا جیسے نعمت غیر مترقبہ ہاتھ لگی ہو۔ صبح چھ بجے کا ناشتا کیا ہوا تھا' اب شام کے چار بج رہے تھے۔ وہ وہیں فرش پر بیٹھ کر کھانے لگی۔ تقی نے اسے دیکھا پھر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانے لگا۔

"ناشتا بھی نہیں کیا۔ اب تو بھوک سے مرنے والا ہوں۔" انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔ کھانے کے لیے۔۔۔" شفا کا جملہ ابھی یہیں تک تھا کہ اس نے اچک لیا۔

"اب اتنا بھی کنگلا نہیں ہوں کہ دو وقت کا کھانا بھی نہ کھلا سکوں۔"

شفا دوبارہ نہیں بولی۔

اگلے کچھ منٹ وہ دونوں کیک کھاتے اور خاموشی سے چائے کے گھونٹ بھرتے رہے اور ٹکر ٹکر دیواروں کو دیکھتے رہے۔ پھر تقی کو ہی بے چینی لاحق ہوئی کہ وہ بولنے کا ہمیشہ سے شوقین رہا تھا۔

"میں نے بچپن میں ایک فلم دیکھی تھی۔ اس میں ہیرو ہیروئن گھر سے بھاگ کر جنگل میں جاکر رہنے لگتے ہیں اور وہیں درخت کاٹ کر اپنا جھونپڑا بنالیتے ہیں۔ پھر اس جھونپڑے میں ضرورت کا ہر سامان آجاتا ہے۔۔۔ ہمیں درخت کاٹنے نہیں پڑیں گے۔ جھونپڑا بنا بنایا مل گیا ہے۔"

شفا کو ہنسی آگئی۔ اس کا انداز ہی ایسا تھا۔

اس بات اور ہنسی نے گویا ان کے درمیان حائل خاموشی کے پردے میں سلوٹیں ڈال دیں۔

"دیکھو شفا! کچھ باتیں ہیں جنہیں ہمارے درمیان ابھی سے ڈسکس ہوجانا چاہیے۔" تقی نے اس کی ہنسی سے تقویت پکڑتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے۔ تمہیں ایسا لگے کہ یہ باتیں کرنے کے لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے' لیکن یقین مانو اس سے زیادہ مناسب وقت ہمیں دوبارہ نہیں مل سکے گا۔۔۔ ہماری شادی عام شادیوں کی طرح تو ہے نہیں کہ سب کچھ نارمل لگے۔ عجیب و غریب انداز کی شادی ہے۔۔۔ اتنی افراتفری میں تو لوگ اپنے بچوں کے عقیقہ نہیں کرتے جتنی عجلت میں ہماری شادی کردی گئی ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو' میں کہیں اور کمیٹڈ تھا۔ مجھے اسی سے شادی کرنی ہے۔ مہک کے بغیر زندگی کا سوچ بھی نہیں سکتا میں۔۔۔ تمہاری تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے میری زندگی میں۔۔۔ یہ بات تلخ ہے لیکن۔۔۔ تم سے نکاح کے لیے ہامی میں نے عمیر بھائی کے فورس کرنے پر بھری تھی۔ میں نہ کرتا تو کسی ایب نارمل بندے سے تمہاری شادی کردی جاتی۔۔۔ میں تمہیں اس مشکل سے نکالنا چاہتا تھا' اسی لیے میں نے ہاں کردی اور میں نے نکال بھی لیا۔ لیکن اب آگے اپنے لیے کیا کرنا ہے' یہ تمہیں خود ہی سوچنا پڑے گا۔ میں اتنا ہی کرسکتا تھا تمہارے لیے۔ اس سے زیادہ کی امید مت رکھنا۔ ویسے بھی زندگی میں ہمیشہ خود پر ڈیپینڈ کرنا چاہیے۔ خود سے توقعات لگانا چاہئیں۔ کسی دوسرے سے لگائی گئی توقعات ہمیشہ تکلیف دیتی ہیں۔"

جب وہ اپنی طرف سے ایک موثر تقریر کرچکا تو اس نے جواب تک دانستہ شفا کی طرف نہیں دیکھا تھا' اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل سنجیدگی سے بلکہ ایسے بے زار بیٹھی دکھائی دی جیسے واقعی وہ کوئی بورنگ تقریر سن رہی ہو اور اسے بے زار ہو کر جمائیاں آنے لگیں۔

"کب چھوڑیں گے مجھے؟" اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر شفا نے پوچھا۔

"ایں؟" تقی ہونق بن گیا۔

"ان ساری باتوں کا یہی مطلب ہے نا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھیں گے اور ایک نہ ایک دن چھوڑ دیں گے۔۔۔؟ تو میں یہی پوچھ رہی ہوں' کب چھوڑیں گے؟"

تقی اور بھی ہونق بن گیا۔ اس کا تو خیال تھا' پہلے تھوڑا رونا دھونا ہوگا جذباتی قسم کے مکالمے بولے جائیں گے' ممکن ہے' اسے بریشرائز بھی کیا جائے (مجبوریاں اپنی جگہ درست سہی۔ اس جیسے بندے سے دست بردار ہونا اتنا آسان بھی تو نہیں اور یہ اس کی

ذاتی ہی رائے تھی۔

باہر کوئی آیا تھا' تقی اپنی حیرانی چھپانے کی ناکام کوشش کرتا اٹھ گیا۔ باہر جبری اور رضی کھڑے تھے۔ امی نے چپکے سے ان دونوں کی ضرورت کا کچھ سامان بھجوا دیا تھا۔ رات کا کھانا بھی تھا۔ سامان میں گدے اور کمبل وغیرہ تھے۔ کچھ برتن بھی تھے۔ سامان تو ان تینوں بھائیوں نے مل کر گاڑی سے نکال لیا پھر ان چاروں نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا۔ زیادہ تر وہ تینوں بھائی ہی بولتے رہے۔ شفا تو بس سننے والوں میں سے تھی' لیکن خیر آج کا دن بھی جیسے تیسے گزر ہی گیا۔



رات کو خاموشی سے ان دونوں نے اپنے لیے کمرے چن لیے۔ شفا چاہتی تھی۔ تقی کا بستر اس واحد پلنگ پر لگا دے۔ جو ایک کمرے میں پہلے سے موجود تھا۔

"یہ گھر آپ کا ہے۔ یہاں کی ہر آسائش کو استعمال کرنے کا سب سے پہلا حق آپ کا ہے۔" شفا نے تقی سے کہا تھا۔

"ہم مہمان نواز لوگ ہیں۔ یہ میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ میں آسائش سے فائدہ اٹھاؤں اور مہمان بے آرام رہے۔" اس نے ڈائیلاگ جھاڑا اور اس ڈائیلاگ کا نتیجہ اگلے ہی دن بھگت بھی لیا۔ فرش پر بستر لگا کر سویا تھا تو ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ صبح تک بخار سے برا حال تھا۔ بمشکل کمرے سے باہر آیا۔ شفا نے دھوپ میں کرسی رکھ دی پھر اس کے لیے چائے بنا لائی میڈیسن تو کوئی تھی نہیں البتہ اس کے فون سے رضی کو کال کر کے بتا دیا۔

تقی نیم دراز ہو کر سستانے لگا۔ دھوپ کی حرارت جسم میں اتر کر سکون پہنچا رہی تھی۔

ذرا دیر گزری تو گیٹ دھڑ دھڑایا جانے لگا شاید رضی یا جبری ہوں گے۔ اس نے اٹھ کر گیٹ کھول دیا اور گیٹ کے کھلتے ہی اسے لگا جیسے آسمان اس کے سر سے ہل گیا ہو۔ سامنے مہک کھڑی تھی۔

"تم... یہاں۔" لفظ اس کے منہ سے مشکل سے نکلے تھے۔

"تم سے ملنے آئی ہوں۔ اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے؟" مہک بہت سنجیدہ لگ رہی تھی' تقی اس سے اپنے نکاح کی خبر کسی نہ کسی طرح چھپانے کا ارادہ کر چکا تھا' لیکن اب وہ یہاں پہنچ گئی تو اس بات کا چھپنا مشکل تھا۔

"میں تو یہاں کسی کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ گھر بالکل خالی ہے۔ تم اندر آ کر کیا کرو گی... اور... اور تمہیں یہاں کا ایڈریس کس نے دیا۔"

"مجھے اندر آنے دو تقی! دروازے پر کھڑے ہو کر میں کوئی بات نہیں کر سکتی۔" وہ اسے ہاتھ سے ہٹاتی اندر آ گئی۔ شفا کچن کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر مہک رک گئی۔ تقی کو ایسا لگا جیسے اس کی سانس بھی رکی ہو۔

"ان کی تعریف؟" اس کی آواز دھیمی تھی۔

"یہ... وہ..." تقی الجھ گیا کہ کیا کہہ کر تعارف کروائے۔

"تم تو کہہ رہے تھے تم گھر میں اکیلے ہو..." مہک نے پھر کہا تقی خاموش رہا۔

"خرید کر لائے ہو کیا؟" لفظ چابک کی طرح تقی اور شفا کو لگے تھے۔

"مہک!" تقی کی اونچی آواز پورے گھر میں گونجی تھی۔ "یہ عمیر بھائی کی بہن ہے۔"

"تو خالی گھر میں ان کی بہن تمہارے ساتھ کیا کر رہی ہے...؟ بھگا کر لائے ہو کیا؟ چند دن عیاشی کرنے کے لیے۔"

"آپ زبان سنبھال کر بات کریں تو زیادہ اچھا ہو گا۔" شدت ضبط سے شفا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال تقی کا بھی تھا لیکن اسے مہک کی بھی پروا تھی۔

"تم بیچ میں مت بولو... میں تقی سے بات کر رہی ہوں۔"

"اور میں تقی کی بیوی ہوں... پرسوں ہمارا نکاح ہوا تھا۔ میرے پاس نکاح نامے کی کاپی بھی ہے۔ آپ کی

تسلی کے لیے وہ بھی دکھا سکتی ہوں۔ تقی میں تو اتنی غیرت نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی کے لیے اتنے گھٹیا الفاظ استعمال کرنے والے کا منہ نوچ لے، لیکن میں آپ کو اپنے لیے ایسی فضول باتیں کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔" شفا نے ترنت کہا تھا اور اس کا لہجہ بہت سخت تھا۔

مہک نے صرف لفظ بیوی اور نکاح سنا۔ وہ یہاں سننے بھی یہی آئی تھی۔

"کیا یہ سچ کہہ رہی ہے تقی؟" مہک نے پوچھا اس کی آواز اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"پاپا ٹھیک کہہ رہے تھے، میں نے تم پر بھروسا کرکے غلطی کی۔ مجھے تو تمہیں اسی وقت سمجھ جانا چاہیے تھا، جب تمہارے فادر نے ہمیں تم سے خبردار کیا تھا۔ باپ سے زیادہ تو بیٹے کو کوئی نہیں جان سکتا۔ اور اب جب ساحر آپا نے فون کیا تو پاپا نے کہا، تقی کی بہن بھی جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا تقی! وہ لڑکی پسند آگئی ہے کیا۔ تم نے مجھے ڈانٹ دیا اور اب اس سے نکاح کرکے بیٹھے ہو۔ منگنی مجھ سے۔ نکاح اس سے۔ یہ تم نے کیا کیا ہے میرے ساتھ۔" وہ اب رونے لگی تھی۔

تقی کے پاس لفظ ہی ختم ہوگئے تھے۔ ساحر اتنے سیاہ دل کی ہو سکتی ہے۔ یہ تو اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود تقی نے اب تک نہ سوچا تھا۔

"پاپا میرے ساتھ آنا چاہتے تھے لیکن میں نے آنے نہیں دیا۔ میں اکیلی ہی آگئی، صرف اس لیے کیونکہ مجھے یقین تھا۔ یہاں کوئی لڑکی ہوگی ہی نہیں۔ ساحر آپا نے جھوٹ بولا ہوگا کہ تم نے کسی لڑکی کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ لیکن تم نے صرف ساتھ نہیں رکھا۔ تم تو نکاح کرکے لائے ہو۔ گناہ سے بچ گئے، لیکن میرے مجرم ہمیشہ رہو گے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ سسکتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھی اور جاتے جاتے انگلی سے انگوٹھی اتار کر اس کی ہتھیلی پر پٹخ گئی۔

وہ باہر نکلی تو امی اور رضی اندر آگئے۔ حیران و پریشان۔

تقی ہتھیلی پر رکھی انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا۔ ہمدردی ہمدردی کے اس کھیل میں سب خسارے اسی کا مقدر ٹھہرے تھے۔

امی اور رضی بار بار ان دونوں کو دیکھتے ان دونوں کے چہروں پر ایسی خاموشی پھیلی تھی جیسے زلزلہ آکر گزر گیا ہو، تباہی چھوڑ گیا ہو۔

"کیا ہوا ہے؟" رضی نے اس خاموشی کو توڑنا چاہا اور تقی کا ڑانس بھی ٹوٹ گیا۔ اس نے انگوٹھی کو پہلے مٹھی میں بھینچ لیا پھر پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔

شفا سٹپٹا کر پیچھے ہٹی۔ انگوٹھی دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گری اور گول گول گھومتی اس کے پیروں میں ساکت ہوگئی۔

"تم کیوں آئیں مہک کے سامنے؟ اندر نہیں رہ سکتی تھیں اور آہی گئی تھیں تو کیا بولنا ضروری تھا؟" وہ زور سے چیخا۔ ویران گھر میں اس کی آواز ضرورت سے کچھ زیادہ ہی گونجی تھی۔

"وہ مجھے خریدا ہوا کہہ رہی تھی۔ میرے کردار پر انگلی اٹھا رہی تھی۔"

"انگلی اٹھا رہی تھی...؟ تم ہو کیا، کبھی غور کیا ہے اس بات پہ... روحیل کے ساتھ دوستیاں کیوں بڑھائی تھیں، اس سے ملاقاتیں کرنے کیوں جاتی تھیں۔ چھت پہ اس کے ساتھ کیا کر رہی تھیں... تمہیں مہک کی بات بری لگی؟ اس کے انگلی اٹھانے پر اعتراض ہے حالانکہ تم پر تو اب ہر وہ شخص انگلی اٹھائے گا جو اس رات تمہارے گھر آگیا تھا۔ پھر بھی میں نے تم سے نکاح کیا... صرف یہ سوچ کر کہ یہ نکاح تم پر سے الزام دھو دے گا اور تم نے کیا کیا میرے ساتھ... میں نے تمہیں ہر کرائسس سے بچایا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس سے میں محبت کرتا ہوں وہی مجھے چھوڑ گئی... میرے احسان کا اتنا ہی خیال کر لیتیں کہ زبان بند رکھتیں۔"

"تقی بس کرو۔" امی نے سہم کر اسے ٹوکنا چاہا

لیکن اس کا دماغ جیسے بالکل آؤٹ ہو چکا تھا۔

"تم سے ہمدردی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے کاش... کاش میں نے یہ غلطی کی ہی نہ ہوتی۔"

وہ دھپ دھپ کرتا اندر چلا گیا۔ امی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اسی کے پیچھے چلی گئیں۔ رضی نے ساتھ لایا ہوا سامان اتروانا تھا، وہ باہر نکل گیا اور شفا... وہ اکیلی رہ گئی۔ ایک آنسو اس کی آنکھ سے نکلا اور فرش پر گری انگوٹھی کے قریب گر کر فرش پر پھیل گیا۔



"کیا ضرورت تھی اتنا بولنے کی؟" امی اس کے پیچھے ہی آگئی تھیں۔

"اب آپ اس کی حمایت شروع نہ کریں۔ میرا دماغ پہلے ہی گھوما ہوا ہے آپ کو بھی کچھ الٹا سیدھا بول دوں گا۔" اس نے جیکٹ اتار کر میٹرس پر پھینکتے ہوئے کہا تھا۔

"تم بھول گئے۔ میرے پیر میں جوتی سات نمبر کی آتی ہے اور اتنی زور سے پڑتی ہے کہ بندے کی عقل ٹھکانے آجاتی ہے۔" امی نے غصے سے کہا تھا اور ان کی جوتی کے زور سے تو وہ سب بھائی واقف تھے۔ گو کہ یہ دھمکی ہی تھی، تقی جانتا تھا پھر بھی اس نے امی کو خفگی سے دیکھا تھا۔

"مجھے پتا ہے۔ آپ کو وہی صحیح لگے گی۔ میرے مقابلے پر تو کوئی بھی آجائے، آپ کو تو اسی کی بات ٹھیک لگتی ہے۔"

"اتنے بڑے ہوگئے ہو لیکن تمہارے بچپن والے شکوے نہ گئے۔" امی نے کہا۔ "میں کسی کی حمایت نہیں کر رہی نہ ہی اس بات کا فیصلہ کر رہی ہوں کہ تم دونوں میں سے کون حق پر ہے، میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ ابھی جتنا بھی تم بولے ہو، وہ انتہائی غلط باتیں تھیں اور اس پر.... تمہارا انداز اور بھی نامناسب۔ شفا سے تم نے نکاح کن وجوہات کی بنا پر کیا۔ یہ رضی مجھے بتا چکا ہے۔ ساحر نے جو بھی کیا، وہ سب سن کر مجھے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ ایسی تربیت تو اس کی میں نے کی تھی نہ اس کی ماں نے... پھر بھی... شفا کا اور اس کا جو بھی معاملہ تھا سو تھا۔ لیکن تم نے نکاح کر ہی لیا تو اس طرح جتانے کی کیا ضرورت ہے۔ مہک کو تو جب بھی پتا چلتا، اس کا رد عمل یہی ہوتا تھا۔"

"شفا خاموش رہتی تو میں معاملہ سنبھال لیتا۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"تمہاری غلط فہمی ہے۔" امی نے رسان سے کہا۔ "مہک کو کیا سمجھا کر قائل کرتے تم۔ اگر تم اسے ساری بات بتا بھی دیتے تو بھی وہ شفا کی موجودگی میں تمہاری دوسری بیوی بننے پر کبھی راضی نہ ہوتی۔ اب کیا اس بات پر باقی کی ساری زندگی شفا کو یہ جتاتے رہو گے کہ اس سے نکاح کی وجہ سے مہک نے تمہیں چھوڑ دیا۔"

"شفا کی موجودگی... ساری زندگی؟" اس نے ناک چڑھا کر کہا۔ "آپ پتا نہیں کیا سمجھ رہی ہیں۔ ساری زندگی اسے ساتھ نہیں رکھوں گا۔ میں نے محض وقتی طور پر اسے مشکل سے بچانے کے لیے نکاح کیا ہے۔ آگے اپنا بندوبست وہ خود کرے گی..." وہ سنجیدگی سے کہتا واش روم میں گھس گیا تھا۔

"ہیں...!" اس کے عزائم جان کر امی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"تو آپ کا کیا خیال تھا، میں اس عجیب و غریب شادی کو ساری زندگی نباہوں گا۔" وہ واش بیسن کے سامنے کھڑا سامنے شیشے میں ان کے عکس سے مخاطب تھا۔

"نہ ہماری لو میرج نہ ارینج... نہ وہ مجھے اچھی لگتی ہے نہ بری... میں نے تو آج تک اس کی شکل بھی غور سے نہیں دیکھی اور میرا خیال ہے اس نے بھی میری نہیں دیکھی ہوگی۔ ہم دونوں تو حادثاتی طور پر اکٹھے ہوگئے ہیں۔ ایسے جیسے سڑک پر دو گاڑیاں آپس میں ٹکرا جائیں اور کوئی راہ چلتا مسافر زخمی کو اٹھا کر اسپتال لے جائے... بس اتنا ہی ساتھ ہے ہمارا۔ لیکن یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ راہ چلتے کو بھلائی کی اتنی

بڑی سزا ملنا چاہیے۔"

"تم واقعی بھول چکے ہو' میری سات نمبر کی جوتی کتنے زور سے لگتی ہے۔" امی ڈپٹ کر بولی تھیں۔

"نکاح کوئی تمہارے بچپن کا کھیل نہیں ہے کہ جب دل چاہا شروع کر لیا جب دل چاہا ختم کر دیا۔ اپنی طرف سے تو تم نے بڑا احسان کیا' لیکن اس بچی پر کیا گزرے گی جب اسے پتا چلے گا تم اسے اپنانے سے پہلے ہی چھوڑنے کا ارادہ کیے بیٹھے تھے۔۔۔ حد ہے تقی! اس سے تو اچھا تھا تم بے چاری بچی کا نکاح اس پاگل سے ہی ہو جانے دیتے۔ کم سے کم وہ اسے چھوڑ کر زمانے کے سامنے رسوا تو نہیں کرتا۔"

"بے چاری بچی۔" تقی نے طنز سے کہا۔ "بے چاری بچی کا اپنا بھی یہی ارادہ ہے یقین نہ آئے تو جا کر پوچھ لیں۔"

"جتنی تم نے اس کے سامنے بکواس کی ہے نا اور جتنا جتایا ہے کہ نکاح کر کے اس پر احسان کیا ہے' اس کی جگہ کوئی بھی ہوتی' وہ یہی سوچتی۔" امی تڑخ کر بولی تھیں۔

"لیکن میں بتا رہی ہوں' یہ خناس اپنے دماغ سے نکال دو۔۔۔ ورنہ میں سچ مچ تمہاری طبیعت سیٹ کر دوں گی۔۔۔ بتاؤ بھلا۔۔۔ کیا ہو گیا ہے آج کل کے بچوں کو۔ نکاح نہ ہوا بچوں کا کھیل ہو گیا۔" امی بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ تقی نے شیشے میں انہیں جاتے دیکھا اور دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر منہ پر زور زور سے پانی کے چھپاکے مارنے لگا۔



شفا کچن میں تھی وہ وہیں آ گئیں۔

شفا۔۔۔ بیٹی! تقی کی باتوں کا برا مت ماننا۔ اسے بنا سوچے سمجھے بولنے کی عادت ہے۔ کچھ دیر میں غصہ اترے گا تو دیکھنا' لگے گا ہی نہیں کہ اتنی بکواس کر کے گیا ہے۔" وہ آتے ہی وضاحتیں دینے لگیں۔

شفا بے وجہ ہی وہاں کھڑی تھی۔ خاموش ہی رہی۔

"میں آپ کے لیے چائے بناتی آنٹی! لیکن گھر میں کچھ ہے ہی نہیں۔" چند منٹ بعد اس نے اتنا ہی کہا۔ امی کو لگا' وہ موضوع بدل رہی ہے سو انہوں نے گہری سانس بھر کر اس موضوع کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھا اور مسکرا کر بولیں۔

"تم اب بے فکر ہو جاؤ۔ میں گھر کا بیشتر ضروری سامان لے آئی ہوں۔ باقی کا آہستہ آہستہ آتا رہے گا۔ تمہیں ان شاء اللہ کوئی دقت نہیں ہو گی۔ کل اصل میں ہم سب تقی کے ابا سے ڈرے بیٹھے تھے' وہ کچھ اور طرح کے مزاج کے ہیں' بعض اوقات بڑی سے بڑی بات پر رد عمل ظاہر نہیں کرتے اور بعض دفعہ معمولی باتوں پر بھڑک جاتے ہیں۔ تقی ٹی وی پر کام کرنے لگا تو اس سے ناراض ہو گئے' لیکن کل انہوں نے خود ہی تم لوگوں کو یہاں رہنے کی اجازت دے دی تو مجھے بڑی خوشی ہوئی لیکن ہم سب سمجھے' وہ اب بھی لاتعلق رہیں گے' اسی لیے کل میں نے رضی اور جری کے ہاتھ چپکے سے کھانا بھجوایا تھا' لیکن آج صبح وہ غصہ کرنے لگے کہ کسی نے جا کر شفا بٹیا کی خیر خبر بھی لی ہے یا نہیں۔ اسے ضروری سامان پہنچاؤ' اسے الگ گھر میں رکھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے لاتعلق ہو کر رہا جائے۔۔۔ میں اتنا خوش ہوئی کہ اسی وقت ضروری سامان گاڑی میں رکھوا کر یہاں آ گئی۔ وہ تو شکر ہے کہ رضی نے آج لیٹ آفس جانا تھا' اسی لیے مجھے لے آیا۔

بنی! گھر کا صرف نام ہی آسان ہے۔ گھر بستے بستے بڑا وقت لگ جاتا ہے۔ بہت سی باتوں پر صبر کرنا پڑتا ہے' بہت سی باتوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ صبر' تحمل' برداشت۔۔۔ سمجھو گھر بسانے کے گر ہیں۔ تقی کے ابا۔۔۔ جوانی سے ہی اتنے سخت مزاج تھے بلکہ اب تو پھر بھی ان کے مزاج میں کچھ نرمی آ گئی ہے جب میری شادی ہوئی تو شروع میں تو میں بڑی جلدی گھبرا جایا کرتی تھی۔ ان کی آواز ذرا سی اونچی ہوتی اور میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگتے' لیکن پھر میں ان کے مزاج کو سمجھنے لگی تو سب آسان ہوتا چلا گیا۔ غصے میں کیا کیا نہیں بول دیا کرتے تھے' لیکن میں نے بہت کچھ برداشت کیا

بہت سے آنسو اندر اتارے۔۔۔ میری یہ بات پلو سے باندھ لو' مرد جب غصے میں ہو تو اس کے سامنے ایک لفظ زبان سے نہ نکالو۔ ہاں جب غصہ اتر جائے تو دو چار سنا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔" آخری بات انہوں نے ہنس کر کہی تھی۔ شفا بھی ہنس دی۔

"تقی بہت اچھا ہے۔ تم یہ نہ سمجھنا میں اس کی ماں ہوں تو ایسی بات کہہ رہی ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم پر بھی اس کے دل کی اچھائی واضح ہوتی جائے گی۔۔۔ غصہ کم کرتا ہے لیکن سال میں جو دو تین بار کرتا ہے تو پھر جم کے کرتا ہے' لیکن تم فکر مند نہ ہونا۔ جلدی اتر جائے گا اس کا غصہ۔ تم ہماری بیٹی ہو یہ بھی نہ سمجھنا۔ ہم نے تمہیں آتے ہی گھر سے نکال دیا۔ ہمارے لیے تو تم بڑی ہی خوش قدم ثابت ہوئی ہو۔ تقی کے ابا کی اس سے ناراضی ختم ہوئی یا نہیں' کم سے کم تمہاری وجہ سے انہوں نے اسے گھر تو آنے دیا۔"

وہ یہیں تک پہنچی تھیں کہ رضی آ گیا۔ امی خاموش ہو گئیں اور اس سے بات کرنے لگیں۔

اس کے بعد ان تینوں نے مل کر ہی کام کر لیا' تقی تو کمرے سے نکلا ہی نہیں۔ رضی نے سارا سامان اندر رکھوایا۔ چولہا فٹ کیا تو وہ چائے بنانے لگی۔ چائے کا سامان بھی وہ لوگ لے آئے تھے۔ امی سے چینی کا پوچھنے گئی تو انہوں نے صاف کہہ دیا۔

"یہ آنٹی وانٹی کا تکلف تم باہر والوں کے ساتھ رکھ لینا۔ مجھے امی ہی کہو۔ تقی کی ماں ہوں تو تمہاری بھی ہوں۔"

شفا نے مسکرا کر ان مہربان خاتون کو دیکھا۔ ان کی باتوں میں جو اپنائیت تھی وہ اسے اس کے خول سے نکال رہی تھی۔

شام گئے تقی کمرے سے نکلا' بخار شاید اب نہیں تھا۔ امی نے زبردستی دوائی کھلا دی تھی۔

"اسٹوڈیو جا رہا ہوں۔" وہ بھاگم بھاگ باہر نکل گیا۔ امی روکتی رہ گئیں' لیکن جب اس نے ایک نہ سنی تو چڑ کر بولیں۔

"ضد میں تو بالکل ہی باپ پر گیا ہے اور دلچسپ بات یہ کہ ان ہی سے اس کی بالکل نہیں بنتی۔" وہ سارا دن اسے وقتاً "فوقتاً" تقی کی مختلف عادات کے بارے میں بتاتی رہی تھیں۔

"کھانے پینے کا بہت شوقین ہے۔ بریانی میں تو اس کی جان ہے۔۔۔ تمہیں آتی ہے بنانی۔۔۔ نہیں تو میں سکھا دوں گی۔ جب بھی اس کا موڈ خراب ہو' بنا کر سامنے رکھ دیا کرنا۔ منٹوں میں مان جائے گا۔"

"جرابوں کے معاملے میں بہت برا ہے۔ میں خیال نہ رکھوں تو دنوں گندی سڑی جرابیں پہن کر پھرا کرے۔"

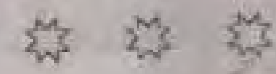
"کبھی کبھی میری بیٹی بن جاتا تھا۔ کچن میں آ کر سبزی کٹوا دیتا تھا۔ کام والی نہ آئے تو واٹپر بھی لگا دیتا تھا۔۔۔ لیکن میں کوشش کرتی تھی' یہ میرے کاموں میں مداخلت نہ ہی کرے کیونکہ مدد کے چکروں میں میرا کام ہمیشہ بڑھا دیتا تھا۔"

شفا ان کی باتیں سنتے ہوئے کئی بار بے ساختہ ہنسی تھی۔

رات سے پہلے ابا۔۔۔ منال کو لے کر آ گئے۔ شفا کا سر تھپتھپایا' حال احوال پوچھ کر ایک طرف ہو گئے۔ پھر جری بھی اسٹور سے وہیں آ گیا۔ تقی کا انتظار تو کیا لیکن وہ آ کر ہی نہیں دے رہا تھا' تب سب نے اس کے بغیر وہیں کھانا کھا لیا۔ ابا سارا وقت بڑبڑاتے رہے۔

"احساس ذمہ داری دیکھ لو۔ یعنی اتنی رات ہو گئی' لیکن میاں صاحبزادے کی کوئی خبر ہی نہیں۔"

دس بج گئے تھے سردیوں کی راتوں میں یہ وقت آدھی رات کا لگتا ہے تقی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا تو امی نے اس کے پاس رکنے کا ارادہ کر لیا۔ بین پریگننٹ تھی۔ صبح اس کی طبیعت خراب تھی انہیں اس کی بھی فکر تھی' لیکن شفا کو بھی تو اکیلے چھوڑا نہیں جا سکتا تھا سو وہ رک گئیں اور باقی سب چلے گئے۔



تقی کی واپسی اگلے روز گیارہ بجے تک ہوئی۔ دیر سے ہی سہی اس نے رضی کو فون کرکے بتا دیا تھا' شوٹنگ کی وجہ سے لیٹ ہو جائے گا۔ فردوس صاحب نے بلوایا تھا۔ وہ اسے ڈانٹ رہے تھے۔

"گدھے! کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی تو انفارم تو کردیتے۔ اس روز تو میری چچازاد بہن کا انتقال ہو گیا تھا' شوٹنگ وہیں روکنا پڑی' لیکن تمہاری کوئی خبر ہی نہیں تھی کہ کہاں گئے ہو۔۔۔ اب فوراً" پہنچو۔ باقی کے سین آج پورے کریں گے۔" وہ تو اڑتا ہوا پہنچا۔

آگے ایک اور اچھی خبر منتظر تھی۔ فردوس صاحب نے اپنے اگلے پراجیکٹ کا لیڈ رول اسے آفر کردیا' صرف یہی نہیں وہ اسے کچھ عرصہ کے لیے اپنے پروڈکشن ہاؤس کے ساتھ باؤنڈ بھی کرنا چاہ رہے تھے۔ یہ زیادہ خوش آئند بات تھی۔ اس نے اکثر بڑے اداکاروں کو کہتے سنا تھا کہ ابتدا میں انفرادی طور پر کام کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ کسی کے انڈر کام کیا جائے۔ ہاں کچھ سالوں بعد جب نام مستحکم ہو جائے تو انفرادی طور پر کام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

سوچنے کی ضرورت تو نہیں تھی پھر بھی اس نے رسماً وقت مانگا اور کام ختم کرکے جب گھر آیا تو بہت خوش تھا۔ غصہ وصہ سب اتر چکا تھا۔ ہاں دل میں خلش البتہ ابھی باقی تھی۔

"اب شفا سے دوبارہ کوئی الٹی سیدھی بات مت کرنا۔" امی جاتے جاتے اسے تاکید کر گئی تھیں اور کیسی بھولی تھیں جو سمجھ رہی تھیں کہ کہہ دیا ہے تو وہ واقعی کرے گا ہی نہیں۔

آتے ہی وہ لمبی تان کر سو گیا' بخار کی تو پروا ابھی نہیں تھی' ایسے ہی کوئی وقتی آرام کے لیے دوا لے لی تھی۔ اب سونے سے پہلے دوا ابھی کھائی تو نیند بھی خوب جم کر آئی۔ تین چار گھنٹے بعد اٹھا تو تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھا تو پہلا خیال شفا کا ہی آیا۔ چائے کی طلب بھی ہو رہی تھی۔

کیا ہی اچھا ہو جو شفا اس کی اتنی بکواس کے باوجود خود ہی چائے بنا کر اسے دے جائے۔۔۔ لیکن ہائے ری قسمت۔۔۔ اس نے مایوسی سے بازو پھیلا کر جمائی لی پھر اٹھا اور منہ پر پانی کے چھپاکے مار کر کچن میں آگیا۔ گھر کی بدلی ہوئی حالت بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔ اس سے یہ اندازہ بھی لگالیا کہ کچن بھی آباد ہو ہی چکا ہوگا۔

کچن کی کھڑکی سے شفا سیڑھیوں پر بیٹھی نظر آئی تقی نے لحظہ بھر کو سوچا پھر چائے بنانے لگا۔ یہ الگ بات کہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے جان بوجھ کر کھٹکا کر رہا تھا کہ وہ آہی جائے اور آکر اپنی خدمات پیش کرے کہ "آپ کیوں چائے بنا رہے ہیں۔ میں بنا دیتی ہوں' مرد یہ کام کرتے اچھے نہیں لگتے وغیرہ وغیرہ۔" اور یوں ہی بات کرنے کی کوئی سبیل نکل آئے۔

لیکن وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی مجال ہے جو اتنے شور پر بھی ایک بار گردن موڑ کر دیکھ ہی لیا ہو۔ تھک ہار کر اس نے خود ہی چائے بنائی۔ ایک کیبنٹ میں امی کے ہاتھ کے بنے بسکٹ بھی مل گئے۔

"جیو میری ماں۔" اس نے زیر لب کہا۔ ایک بسکٹ دانتوں میں دبایا' دو جیب میں رکھے اور چائے کا مگ لے کر باہر آگیا۔

شفا نے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنی تھی۔ مڑ کر پھر بھی نہیں دیکھا۔ وہ آخری سیڑھی پر بیٹھی تھی۔ تقی دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ان کے سامنے وہ چھوٹا سا قطعہ تھا جس پر سبزیاں اگائی جاتی تھیں اور اب وہ خودرو گھاس سے اٹا ہوا تھا۔

شفا سوچ رہی تھی' اسے صاف کرکے یہاں کچھ اچھے پھولوں کی قلمیں اور سبزیاں لگالے گی۔

تقی نے بات کرنے سے پہلے کھنکھار کر گلا صاف کیا تھا۔

"میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں سن رہی ہوں۔" سنجیدگی سے جواب آیا۔

تقی اتنی سنجیدگی پر بدمزا ہوا۔

"میں معافی مانگنا چاہ رہا تھا۔" پھر کہا۔

"مانگو۔" تقی اور بدمزا ہوا۔ بڑی ہی بدلحاظ لڑکی تھی نہ آکر چائے کا پوچھا نہ ہی اب تکلف والے جملے دہرا رہی تھی۔

"سوری۔" اس نے اتنا ہی کہہ کر منہ بسور لیا لیکن وہ پھر بھی خاموش رہی۔

"کل میں جتنا بھی بولا' اس پر بہت شرمندہ ہوں۔۔۔ مجھے واقعی اتنا نہیں بولنا چاہیے تھا' لیکن تم میری پوزیشن کا بھی اندازہ کرو۔ جس سے آپ محبت کرتے ہوں وہی آپ کے خلوص پر شک کرے۔ آپ کو چھوڑ دے تو آپ پر کیا گزرتی ہے؟ مہک میں جان ہے میری۔ میں نے عمیر بھائی سے کہا تھا' مجھے مہک کو کانفیڈنس میں لینے دیں لیکن۔۔۔ تمہارے کھڑوس تایا جی نے ایسی قیامت مچائی کہ سب کچھ "آناً فاناً" کرنا پڑا۔۔۔ اور۔۔۔"

"اور تم نے اپنی محبت کی قربانی دے کر مجھ پر احسان کیا۔ مجھ سے نکاح کرلیا۔"

شفا نے اچانک سرد مہری سے کہا تھا۔ تقی چپ سا رہ گیا۔

"تمہارا شکریہ۔۔۔ کہ تم نے مجھے بچالیا' لیکن یہ کہاں لکھا ہے کہ جو آپ پر احسان کرے' اس سے وابستہ کسی بھی دوسرے انسان کو خود پر انگلی اٹھا لینے دو۔ وہ آپ کو برائے فروخت سمجھے تو سمجھ لینے دو۔ آپ کو بدکردار کہے تو کہنے دو۔۔۔ خود کو جسٹی فائی نہ کرو' جو وہ کہے اسے کہہ لینے دو۔۔۔؟ تمہاری زندگی میں مہک کی جو جگہ ہے' اس سے مجھے کوئی اختلاف نہیں۔ ظاہر ہے میں اختلاف کرنے والی ہوتی بھی کون ہوں' لیکن ہمارے درمیان جو کاغذی سا رشتہ ہے' اس کے تحت اتنا فرض تو بنتا تھا تمہارا کہ مہک کو مجھ پر انگلی نہ اٹھانے دیتے اور اگر تم اسے روکنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے تو تمہیں مجھ سے نکاح جیسا بڑا فیصلہ بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر کوئی یہ سمجھ رہا تھا۔ چھت پر میں روحیل کے ساتھ تھی تو سمجھنے دیتے۔۔۔ کسی پاگل سے نکاح ہو رہا تھا تو ہونے دیتے۔ پرسوں جب ہماری بات ہوئی تو مجھے لگا' ہمارا ساتھ رہنا تو ممکن نہیں' لیکن میری طرف انگلیاں اٹھانے والوں کو اپنے خیالات بدلنے پر مجبور کرنے میں تم ضرور مدد کرو گے' لیکن جب تم مہک کو ہی منع نہیں کر سکے' وہ جو میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی تم اسے ہی نہیں روک رہے تھے۔ کسی اور کو روکنے میں کیا خاک مدد کرو گے۔

جب تم نے میرے کردار پر لگے داغوں کو دھونا ہی نہیں تھا تو تمہیں کیا ضرورت تھی کہ انسانیت کے تحت بھی میری مدد کرتے؟ اور ایک بات بتاؤں۔ تم نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا جو بھی کیا' انسانیت کے تحت کیا' اپنے ضمیر کے ورغلانے پر کیا۔ اپنی بہن کو ان بددعاؤں سے بچانے کے لیے کیا جو مجھے کسی جہنم میں بھیج کر ان کے حصے میں آتیں۔۔۔ مان لو تقی! تم نے جو بھی کیا' اپنی بہن کے لیے کیا۔ ان کا گھر بچانے کے لیے کیا اور ایک اور بات بتاؤں۔۔۔؟ تم نے تو ان کو بچانے کے لیے نکاح کیا ہے' میں نے تو اپنے ماتھے پر بدکرداری کا داغ ہی لگوالیا۔"

اس کا لہجہ اور بات دونوں ہی ایسی تھیں کہ تقی بے اختیار سیڑھیاں اتر کر اس کے سامنے آیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جب روحیل چھت پر تھا تو میں اسٹور میں تھی اور میں جانتی ہوں' روحیل کے ساتھ اور کوئی نہیں بلکہ ساہر بھابھی تھیں۔" اس نے سنجیدگی سے تقی کے سر پر بم ہی پھوڑ دیا تھا۔

"ان دونوں کی اس خفیہ ملاقات کی میں چشم دید گواہ ہوں۔ لیکن میں خاموش رہی کیونکہ میں بولتی تو ساہر بھابھی کو عمیر بھائی کے ہاتھوں سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ وہ برباد ہوتیں' ان کے بچوں کا گھر بکھر جاتا۔۔۔ اتنی بری نہیں ہوں میں کہ کسی کو بے گھر ہی کردیتی تمہیں بھی نہ بتاتی کہ کسی بھی بھائی کے سامنے اس کی بہن کے کردار کی پرتیں کھولنا مناسب نہیں لگتا' لیکن تم نے احسان احسان جتا کر میرا دماغ خراب کردیا ہے پھر میں نے بھی فرشتہ بننے کی کوشش کرکے دیکھ لیا۔ نقصان ہی ہوتا ہے نرا۔۔۔ اس طرح ہمارا حساب برابر ہوا' اگر تم کو لگتا ہے تم نے مجھے بچا کر احسان کیا تھا تو میں نے تمہاری بہن کو بے گھر ہونے سے بچا کر

اس احسان کا بدلہ چکا دیا۔ اب تمہارا مجھ پہ کوئی قرض نہیں ہے' اس لیے اگلی بار میرے سامنے اپنے کسی احسان کا پہاڑا نہ پڑھنا۔"

وہ اٹھی اور سرد مہری سے کہتی اندر جانے لگی۔ تقی جواب تک ہکا بکا کھڑا تھا ہڑبڑا ہوش میں آیا۔

"تم کیا چیز ہو شفا! اگر پتا تھا تو اس وقت کیوں نہیں بولیں۔ اپنے حق میں کچھ کہتیں تو اور کوئی نہیں کم سے کم عمیر بھائی ضرور یقین کر لیتے۔۔۔ تم کیوں نہیں بولیں اپنے حق کے لیے۔ بولنا بلکہ لڑنا چاہیے تھا۔ میں تو سمجھا چاہے کسی بھی وجہ سے لیکن۔۔۔ تم ہی ہو گی روحیل کے ساتھ۔۔۔"

"میں نے کہا نا' میں سماہر بھابھی کے لیے خاموش رہی۔ بول پڑتی تو ان میں اور مجھ میں کیا فرق رہ جاتا' لیکن میرا خیال تھا' انہیں کہیں تو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گا۔ کم سے کم وہ مجھے گھر سے نکلنے نہیں دیں گی۔۔۔ لیکن بھابھی نے تو میری ہر امید پر ہی پانی پھیر دیا۔۔۔ ان کا دل اتنا سیاہ ہو سکتا ہے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ سچ کہوں تو غلطی میری ہی ہے' میں نے خاموش رہ کر بڑی حماقت کر دی۔ میں پہلے بھی ان کی چالاکیاں دیر سے ہی سہی لیکن جان لیتی تھی۔ نہیں نہ کہیں مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ مجھے بھائی کے سامنے برا کرنے کے لیے ایسا کرتی ہیں' لیکن ان کی وہ سب حرکتیں مجھے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچاتی تھیں تو میں خاموش ہی رہتی تھی کہ بھائی کو جا کر کیا بتانا اور یہ کہ بھابھی کا حق بنتا ہے۔ جب میں نے انہیں اتنا زچ کیا تو اب تھوڑا وہ بھی مجھے کر لیں لیکن مجھے کبھی اندازہ نہیں تھا' وہ مجھے سر اٹھانے کے قابل ہی نہیں چھوڑیں گی۔ اب کڑیاں ملا رہی ہوں تو بہت کچھ واضح ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے کئی بار سوچا تھا۔ روحیل کے پاس میرا سیل نمبر اور تصویریں کیسے پہنچ گئیں۔۔۔ اب سب سمجھ میں آ رہا ہے۔" وہ متاسف سی کہہ رہی تھی۔

"اور انہوں نے تو تمہیں بھی نہیں بخشا۔ تم سے بھی بدلہ لے لیا۔" اپنی ناراضی سے نکل کر اب وہ تقی کے لیے افسردہ ہو گئی تھی۔

"لیکن تم فکر مت کرو' مہک سے میں خود بات کروں گی۔۔۔ اچھی لڑکی لگی ہے۔ مجھے امید ہے کہ بات سمجھ لے گی۔۔۔ ایک منٹ۔" اسے اچانک کچھ یاد آیا تو تیزی سے اندر چلی گئی۔ تقی اس کے پیچھے آیا تھا شفا نے کچن کے ایک کیبنٹ سے انگوٹھی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

"اسے سنبھال کر رکھو۔ میں مہک کو سمجھاؤں گی تو وہ تم سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے گی پھر تم یہ رنگ اسے واپس کر دینا۔ ابھی تو غصے میں پھینک گئی ہے' دوبارہ لے لے گی۔"

تقی نے انگوٹھی کو دیکھا پھر شفا کو دیکھا پھر انگوٹھی کو دیکھا پھر شفا کو دیکھا۔

"اور اگر نہ لی تو۔۔۔؟"

"کیوں نہیں لے گی؟ ضرور لے گی' میں کہہ تو رہی ہوں میں اسے سمجھاؤں گی۔ اور تمہیں نہیں پتا' مجھے سمجھانے کا بڑا اچھا طریقہ آتا ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر۔۔۔" تقی نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"میں بھی عمیر بھائی کو سمجھاؤں گا کہ تم اچھی لڑکی ہو انہیں کسی کی بات پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔"

شفا کی سادگی پر آس غالب آ گئی۔

"تمہیں بھی سمجھانے کا اچھا طریقہ آتا ہے؟"

"آتا تو نہیں ہے' لیکن اب سیکھنا پڑے گا۔" اس کا انداز ابھی بھی پرسوچ تھا۔ "لیکن خیر۔۔۔ تم نے کچھ پکایا ہے؟ نہیں۔۔۔؟ چلو اچھی بات ہے تمہیں باہر کھانا کھلاتا ہوں ویسے بھی میں آج بہت خوش ہوں۔۔۔ مجھے ایک بڑا پراجیکٹ ملا ہے۔ ٹریٹ دیتا ہوں تمہیں۔ کھانے کے بعد آئس کریم بھی۔ کیسا؟"

اس نے یوں کہا جیسے شفا نہ ہو سامنے کوئی چھوٹی بچی ہو اور بچی بہل بھی گئی بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ دونوں بچے بہل گئے۔ دونوں میں دوستی ہو گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سائرہ رضا

اجڑی مری نگری

موسم گرما تھا۔ اس پر بارش کے بعد کا حبس..... مٹی کی سوندھی مہک جو پہلے اعصاب کے لیے باعث سکون تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا فسوں بھی ٹوٹ گیا تھا۔ سہ پہر سے شام کے بعد تک بارش سے جی بھر کے لطف اٹھانے والے..... اب تھکاوٹ اوڑھ کر بستروں میں جا گھسے تھے۔

فضا سے پکوڑوں، سموسوں اور ایسی دیگر اشیا کی خوشبو معدوم ہو چکی تھی۔ اور اب دروازوں کا زنگ..... گیلی لکڑی اور نیچے دبی مسلی گھاس کی مہک حاوی ہونے لگی تھی۔ سیلن، خاموشی، اڑتے پتنگے بھیگے پھڑتے کانوں کو جھٹکتے حواس باختہ کتے، جھینگر سب اپنے ٹھکانوں پر جا پہنچے تھے۔

دور کہیں کسی چھت کا پرنالہ اب تک بہہ رہا تھا۔

کبھی ہوا چلتی تو، پتوں کی اوک میں ٹھہرا پانی زمین بوس ہو جاتا۔ گیلی سڑک اپنے اصل رنگ میں پلٹ کر نکھری ستھری تھی۔

کبھی کبھار کوئی سائیکل سوار بے آواز گزر جاتا یا بائیک والا زن سے نظروں سے اوجھل ہوتا۔

کوئی پیدل، رات کا مسافر.....

اچانک بھک کی آواز سے دھماکا ہوا اور سارا علاقہ گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ ایک غصیلا بے بس، تھکا ہوا سا "اوہ" کورس میں ابھرا۔ ہلکے سے شور اور ہلچل کے بعد دوبارہ سناٹا چھا گیا۔ اب کہیں موم بتیوں کی لرزتی روشنی تھی اور کہیں گیس لیمپ کی زرد روشنی۔ کسی خوش ذوق ماضی پرست نے لالٹین کی لو بھی بڑھائی تھی۔

اپنے کام سے لگے لوگ..... اپنے اپنے ٹھکانوں پر.....

صرف وہی ایک بے ٹھکانا دکھائی دیتا تھا۔ (دوسروں کو) اپنے تئیں تو وہ جیسے اب اصل منزل پر پہنچا تھا۔ وقت، موسم، رات، سناٹا کوئی شے اس پر اثر ہی نہ کرتی تھی۔ وہ ہر روز یہاں آکر ایسے ہی کھڑا ہو جاتا تھا۔ ایک امید اور دعا کے سہارے، ایک یقین کے ہمراہ۔ اسے "دیر" سے کبھی کوئی شکوہ نہیں ہوا تھا۔ اسے

"سویر" پر یقین تھا۔

اس کی نگاہیں سامنے کھڑکی پر مرکوز تھیں۔ جہاں لائٹ جانے پر مدھم سی سرخ روشنی نمودار ہوئی تھی۔ کھڑکی کے پٹ کھل گئے تھے۔ مگر پردے ہنوز تھے۔ ایک نسوانی سایہ نظروں کے سامنے آکر معدوم ہو گیا۔ کچھ آوازیں بھی ابھری تھیں پھر مکمل خاموشی۔

مگر اسے کوئی فرق نہ پڑا، وہ جب تک چاہتا وہیں رہتا تھا، ٹکٹکی باندھ کے کھڑکی کو دیکھتا ہوا۔

مکمل ناول



☼ ☼ ☼

چائنا کا مال بیچنے والے بچے، چھٹی ہونے سے پہلے ہی موزوں جگہ پر چوکس کھڑے ہو کر آوازیں لگانے لگتے۔ وہ پانچ پانچ، دس دس روپے کی ارزاں چیزیں بیچتے تھے۔ خوشبو والا ربڑ، سیفٹی پنز، بہت بڑے ہو جانے والے رنگین غبارے، چھوٹی ڈائریاں وغیرہ وغیرہ۔

ہنستی کھلکھلاتی لڑکیاں گیٹ سے نکل رہی تھیں۔

لمبی موٹی، کالی ناٹی، ڈھکی چھپی، کھلی ڈلی لڑکیاں، اردگرد سے ناآشنا لگتی تھیں اپنے آپ میں گم۔

آج وہ جب سیاہ گیٹ سے باہر نکلی تو چوکنی تھی۔ اس کا پورا وجود متجسس تھا۔ وہ ہر ذی روح کو کھوجتی نگاہوں سے گھورتی تھی۔ کاش ایسا ہو پاتا کہ وہ چیختی آواز میں پکار پاتی کہ "کون ہو تم اور کہاں ہو؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟ ایک بار سامنے آجاؤ۔"

اس نے چائنا مال بیچنے والے لڑکے کو دیکھا۔ وہ ہر شے سے بے نیاز آوازے لگا رہا تھا۔ اسی بچے نے تو اسے اول روز وہ رقعہ لا کر دیا تھا۔ جسے اس نے ناسمجھی کے عالم میں تھام لیا تھا اور قریب تھا کہ وہ سرعام تہ شدہ کاغذ پھیلا کر کھولتی اور پڑھنے لگتی کہ دماغ کے الارم نے اسے چوکنا کر دیا۔

"ارے... یہ رقعہ... اور اسے ہی کیوں دیا گیا ہے، کیا اس بچے نے...؟"

بچہ رقعہ دینے کے بعد یوں تھا جیسے کچھ جانتا ہی نہ ہو۔

وہ آگے بڑھ کر اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ اسے یہ کیا دے گیا ہے۔ موبائل کے زمانے میں ایسی نامہ بری... ضرور اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ رقعے بازی نامی احساس نے جو سنسنی رگ و پے میں مچائی تھی۔ وہ غلط فہمی، نامی خیال نے ڈھیلی کر دی۔ وہ بچے کے سر پر پہنچ گئی۔

"یہ آپ ہی کے لیے ہے۔" بچے نے یکدم چائنا مال، چائنا مال کی چلاتی گردان روک کر دھیمے سے کہا۔ اس بار اس کی آنکھوں سے شدید تحیر اور ہتھیلی سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اب میں نے ایسی بھی بات نہیں کی کہ تمہیں چپ ہی لگ جائے۔" جاذبہ نے بے پروائی سے ہاتھ چلایا۔

"شادی مرگ طاری ہے۔ گنگ رہ گیا ہے صاحبزادہ!" سلطان حیدر نے اپنے حساب سے تجزیہ کیا تو اس نے بھنا کر باپ کی صورت دیکھی۔

"اچھی خاصی سمجھ دار خاتون ہیں آپ۔ سمجھ میں نہیں آتا ایسے آئیڈیاز آتے کہاں سے ہیں آپ کے پاس۔" وہ تاسف آمیز بے یقینی کا شکار تھا۔

"میں نے کہا تھا نا، کسی کو تمہاری عقل پر بھروسا نہیں کہ تم اتنا بہترین بھی سوچ سکتی ہو۔" سلطان صاحب نے جاذبہ کو دیکھا۔ پھر بیٹے کی جانب رخ موڑتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کے عاجزی سے جھکے۔

"میں نے سجھائی ہے انہیں یہ راہ... ورنہ یہ تو نمک مرچ سے باہر ہی نہیں نکلتی ہیں۔"

اس نے باپ کو اس بری طرح گھورا کہ وہ سٹپٹا گئے۔

"مجھے شک ہو رہا تھا۔ اس بیان میں آپ پورے کے پورے شامل ہیں۔"

"تو کیسے نہ ہوں۔ میں نے اول دن قسم کھالی تھی۔ بیگم کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہوں گا، تو زندگی شانتی کا نمونہ ہوگی۔ تم بھی یہی عہد کرنا۔" انہوں نے بیٹے کو گر کی بات بتائی۔

"امی...!" وہ بھنا کر چلایا۔ "آپ لوگوں کو اور کوئی کام نہیں ہے۔ فارغ بیٹھے رہتے ہیں تو الٹی سیدھی باتیں ہے۔"

"تو اب اس ارادے کے بعد کہاں رہیں گے فارغ... تمہیں کیا خبر، کتنے کام نکلتے ہیں۔" جاذبہ نے

کہا اور تائید طلب نگاہوں سے شوہر کو دیکھا۔ جنہوں نے زور زور سے سر ہلایا۔

"پہلے ہی سب فرینڈز میرا مذاق بناتے ہیں۔ آپ میری عمر تو دیکھیں۔" وہ بال نوچنے والا ہو رہا تھا۔

"تمہاری محبت اور فکر مذاق ہے جاذب؟" جاذبہ کا لہجہ دکھی ہو گیا۔

"اوہ نو..." ماں کا اترا چہرہ اسے نامنظور تھا۔ اچک کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ لیکن..." اسے کچھ نہ سوجھا کہ وہ ماں، باپ کے اس (بے ہودہ) ارادے سے انہیں کیسے باز رکھے۔ کافی دیر تک تو وہ مذاق ہی سمجھتا رہا تھا۔

"بالکل چاند جیسی دلہن لاؤں گی اپنے چاند کے لیے۔" جاذبہ کے ارمان جاگے۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ وہ تو پھر رات ہی میں نکلا کرے گی نا۔ دن کے وقت واپس۔ میرے دوستوں کو خبر نہیں ہوگی۔" اس نے جل کر جیسے شکر کیا۔

"تم پاگل ہو۔" سلطان صاحب بدمزا ہوئے۔

"پوری شان و شوکت اور دھوم دھڑکے سے بیاہ کر لاؤں گا اپنی بہو... مہینوں چرچے رہیں گے۔ اخباروں میں تصاویر لگے گی۔ ہر نیوز چینل پر پٹی چلے گی۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے، ہیں؟"

"امی! لوگ کیا کہیں گے؟" باپ کی تفصیل سن کر سر گھوم گیا۔ اس نے مدد طلب نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

"لوگوں سے پوچھے گا کون؟" جاذبہ بولیں۔

"مجھے لڑکیوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

"لڑکیاں کیوں... بس ایک لڑکی، پیاری سی موہنی سی، جو ہمارے پورے گھر میں رونق بکھر دے۔ جو..."

"آپ کوئی تعمیری کام کیوں نہیں کرتیں۔ غریب لڑکیوں کی شادیاں کروا دیں۔ سلائی مشینیں بانٹ دیں۔"

"تو تمہاری شادی کیا تخریبی کام ہے۔ دہشت گردی کا ایکٹ لگتا ہے اس میں؟" وہ برا مان گئیں۔

وہ ناسمجھی اور افسوس کے عالم میں ماں کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اب جو دماغ میں سما گئی تھی، وہ کر کے ہی دم لیتا تھا۔

☼ ☼ ☼

مائدہ نے موٹر سے پیر اٹھایا اور فل اسپیڈ سے چلتی مشین کو ہاتھ سے روک کر فاتحانہ سرشاری سے سب کو دیکھا اور قینچی سے دھاگا کاٹ کر پرسکون سانس لیتے ہوئے قمیص ہوا میں لہرا کر جیسے سب کے سامنے نمائش کے لیے پیش کر دی۔

"کیسی سلی ہے؟" اس کا انداز جتاتا ہوا سوالیہ تھا۔ جواب کی منتظر تو تھی، مگر جانتی تھی کہ کیا ہوگا۔

ماجدہ آگے ہو کر قمیص اٹھا کر جیسے اب ہر ٹانکے کو تنقیدی و تعریفی نگاہ سے جانچنا چاہتی تھی مگر اس سے پہلے تاباں مجاہد نے اسے جھپٹ لیا۔

"میں پہن کر آتی ہوں، پھر دیکھنا۔"

"ارے سنو تو... ابھی آستین تو جوڑی ہی نہیں ہیں۔" مائدہ چیخی۔

آف وائٹ دودھیا فراک کلیوں کا ڈھیر تھا۔ دامن پر سیاہ ویلوٹ کی فال تھی۔ بین کالر اور سامنے کی کرتا پٹی بھی اسی ویلوٹ کی بنائی گئی تھی۔ باریک جارجٹ خوب لچک رہی تھی۔

"تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں بھی تو ذرا فیل کروں کہ سلیولیس سوٹ پہن کر کیسا لگتا ہے۔" وہ دائیں آنکھ میچ کر شوخی سے کہتی پردے کے پیچھے چلی گئی۔ جو لڑکیوں کے اس کمرے میں بطور اسٹور استعمال ہوتا تھا۔

"حسن جاناں کی تعریف ممکن نہیں، آفرین آفرین!

جو بھی دیکھے اگر، وہ کہے، ہم نشیں دل نشیں!"

تاباں گاتی ہوئی پردے کے پیچھے سے جلوہ گر ہوئی وہ ریمپ پر چلنے والی ماڈلز کے سے انداز میں کمرے کے دوسرے سرے تک گئی پھر جھٹکا کھا کر پلٹی اور بالکل

درمیان میں آکر دونوں ہاتھ کمر پر جما کر گردن تھوڑی اکڑا، ٹھوڑی اٹھا کر بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی۔

وہ تاباں کو بغور دیکھنے لگی۔ فراک واقعی بے حد خوب صورت سلا تھا جب فیشن میگزین سے تاباں نے اس ڈیزائن پر انگلی رکھی تب سلائی کی شوقین اور نت نئے تجربے کرنے والی مائدہ بھی پریشان ہو اٹھی تھی کہ کیا وہ بے حد باریک جارجٹ پر ہمراہ استر اسے تیار کر سکے گی۔ مگر بہر حال... اس نے کر دکھایا تھا۔

تاباں کا دل خود کو دیکھ دیکھ کر بھر ہی نہ رہا تھا۔ وہ الٹی سیدھی ہو کر دائیں بائیں خود کو دیکھ رہی تھی اور سراہ رہی تھی۔ اس نے بالوں میں لگا کلپ کھول کر سر کو ہلکا سا جھٹکا یا تو ریشمی بال شٹرنگ کر کے کمر پر پھسل گئے۔

تب پہلی بار ان تینوں کے چہرے پر بھی ستائش پھیل گئی۔ تاباں کے بال بے حد خوب صورت تھے۔ بہت گھنے نہیں تھے۔ چوٹی بھی موٹی نہ بنتی، مگر وہ بے پناہ سلکی تھے۔ اوپر سے نیچے تک ایک جیسے... کھلے ہونے کی صورت میں شکل یوں بنتی جیسے شوکیس میں سجی باربی ڈول کے بال ہوتے ہیں۔

تاباں نے ایک دوبار بالوں کو آگے پیچھے کرنے کے بعد پھر اپنے بازو کمر پر رکھے پھر سینے پر لپیٹے پھر دائیں ہو کر سیدھا ننگا بازو دیکھا... پھر بائیں۔

"میرے خیال سے تمہیں فراک سے زیادہ اپنے ان ننگ دھڑنگ بازوؤں کو دیکھنے میں انٹرسٹ ہے۔" مائدہ بولی۔

"کتنا برا لگ رہا ہے لگتا ہے ننگی ہی کھڑی ہو گئی ہو۔ پتا نہیں کیسے پہن لیتی ہیں عورتیں ایسے لباس... میں تو کبھی قمیز بھی بغیر آستین کے نہیں بناتی۔" ضوفشاں نے کہا۔

"تم لوگوں کو فیشن کا پتا نہیں ہے۔" تاباں کو افسوس ہوا۔

"تمہاری خیر ہے۔" ماجدہ نے لاپروائی سے کہا۔ "ہمیں پتا ہو یا نہ ہو... مگر یاد رکھو! ہمارے اباؤں کو ضرور پتا ہے کہ کون کون سا فیشن اس گھر کی دہلیز لانگھ سکتا ہے۔ اب اس سے پہلے کہ کوئی ادھر آنکلے مجھے شرافت سے قمیص واپس کرو، میرا وقت بھی بہت قیمتی ہے اور دوسرے کمر تختہ ہو گئی ہے۔" مائدہ تنگ آگئی تھی۔

"ویسے کیا خیال ہے؟ اگر اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا جائے یعنی سلیولیس..."

"بالکل چھوڑا جا سکتا ہے۔" ضوفشاں اپنے ناول کے مڑ جانے والے صفحات ہاتھ سے پریس کر رہی تھی۔ "مگر اس صورت میں جب ابا "شعلے کے گبر سنگھ" کی طرح تمہارے دونوں بازو جڑ سے اکھاڑ دیں... جیسے اس نے "ٹھاکر" کے اتارے تھے۔"

مائدہ اور ماجدہ کے منہ سے زور کا قہقہہ برآمد ہوا مگر ضوفشاں متوجہ نہیں تھی۔

"مگر ایسی سلیولیس قمیص تب بھی تمہارا مقدر نہیں بنے گی۔ ہر قمیص کے پورے بازو ہی سلیں گے۔ دائیں بائیں جھولتے ہوئے اور ہم سب آتے جاتے ان سے اپنے ہاتھ اور ناک پونچھا کریں گے۔ سمجھیں تم۔"

ماجدہ اور مائدہ لوٹ پوٹ ہو گئی تھیں۔

"تم سب مجھ سے جلتی ہی رہنا۔" تاباں کے لیے بہت ہو گئی تھی۔ وہ پیر پٹختی اسٹور کی جانب چلی گئی۔

ماجدہ اور مائدہ ایک بار ہنس پڑی تھیں۔



کالج میں رنگ و بو کا طوفان مچا تھا۔ چونکہ یونی فارم کی سختی سے پابندی کروائی جاتی تھی۔ سو اسٹوڈنٹ ویک کے اس آخری دن جب سول ڈریس الاؤ کیا گیا تو لڑکیوں نے جی بھر کے ارمان نکالے تھے اور جہاں جہاں زیور ٹانکا جا سکتا تھا، ٹانک لیا۔ میک اپ کٹ کا ہر رنگ خود پر پھیر دیا۔ لینس، نقلی پلکیں، نیل پالش، نقلی لمبی چوٹی، نقلی جوڑا، نوے فیصد نے بال کھول رکھے تھے۔ قیمتی، ہلکے، پینڈو اسٹائلش ہر طرح کے لباس میں

لڑکیاں بے فکری سے گھوم رہی تھیں۔ ہنسی بلاوجہ، قہقہے فلک شگاف اور لایعنی باتوں کا نہ تھمنے والا سلسلہ سب مگن تھیں۔ خود میں اور دوسروں میں... تعریفی انداز، تنقیدی انداز، مگر سچی بات یہ تھی کہ سب کی سب بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ بے فکری، کم عمری، لاابالی پن... فکر نہ فاقہ...

لیکن ایسے میں چند ایک ایسی بھی تھیں، جو نمایاں تھیں اپنے ناز و انداز میں یا لباس کے حوالے سے یا پھر حسن خداداد پھوٹا پڑ رہا تھا، نکھر کر سامنے آرہا تھا۔ یعنی تاباں مجاہد...

اس نے اپنی چونکا دینے والی فطرت کا مظاہرہ آج بھی کیا تھا۔

سب سے پہلے تو گھر ہی میں مائدہ اور ضوفشاں کو قسمیں، ترلے، منتیں اور دھمکیاں دے کر اس بات پر قائل کیا تھا کہ وہ اس جیسا لباس زیب تن نہ کریں ورنہ اس کی شوماری جائے گی۔

"ہر گھر میں کیبل لگی ہے بی بی... سب کو سب پتا ہے۔ کیا ان ہے اور کیا آؤٹ... تمہیں کیا لگ رہا ہے صرف تم ہی منفرد نظر آنے کے لیے دماغ لڑاتی ہو۔ سب کو پتا ہے آج کل گھیردار کلیوں والے لمبے فراک ان ہیں۔ ہر دوسری لڑکی نے پہن لیے ہوں گے۔" ضوفشاں نے جل کر اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا تھا۔

"بھلے پہن رکھے ہوں۔ مگر بس تم دونوں نہ پہننا۔" وہ ہٹیلے پن سے بولی۔

"اور ویسے بھی میرا فراک گلابی ہو گا۔ فرق صاف ظاہر ہے۔" ضوفی نے یاد دلوایا۔

"مگر ڈیزائن تو وہی ہے ناں۔" اس نے زور دے کر کہا۔ "بس تم اپنا وہ ریڈ والا پہن لو۔ یا میرا بلیو جو تمہیں پسند آیا تھا۔ یا میں تمہارے لیے کچھ بھی کر دوں گی جو تم چاہو۔"

"پہلی بات وہ میرے بھیا کی بارات نہیں کہ سرخ انگرکھا چڑھا لوں۔ دوسرے میں بلیو رنگ پسند ہی نہیں کرتی۔ اور تیسرے تم اتنی مجبور ہو گئی ہو کہ کچھ بھی کرنے پر راضی ہو تو پیاری بہن! تم میری خاطر کچھ اور پہن لو میں تو یہی گلابی پہنوں گی۔ ہاں۔" ضوفی نے صاف صاف بات کرتے ہوئے مائدہ کو دیکھ کر اشارہ کیا۔ ہاں۔" ضوفی نے صاف صاف بات کرتے ہوئے مائدہ کو دیکھ کر اشارہ کیا "اب دیکھنا۔"

اور واقعی تاباں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ضوفشاں کی صاف گوئی۔ اس کے پتے اسی پر الٹ دیے۔

"میں نے ڈیزائن ڈھونڈا تھا اور پہلے میرا سلا ہے۔ اس لیے میں تو وہی پہنوں گی۔" وہ دوبارہ کمر کس کے میدان میں کودی۔

"لیکن میرا بھی سل چکا ہے۔" ضوفی نے بے نیازی سے کہا۔

"میں آج کے بعد کمرا بند کر کے اپنے ڈیزائن بنواؤں گی۔ تم نے چوری کی ہے۔"

"اب تو کر لی ہے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" ضوفی لاپروائی سے بولی تھی۔

"بلاوجہ کی بحث ہے یہ تاباں! بہنیں ایک جیسے کپڑے پہنتی ہی ہیں۔" مائدہ بحث سے تنگ آگئی۔

"ہونہہ۔ وہ سیمحن سسٹرز ہوتی ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا پھر ذرا دھیمی ہو گئی۔ "میں تو بس سب سے منفرد نظر آنا چاہتی تھی۔"

"تو یہ کون سا مسئلہ ہے۔" ضوفی نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ "ایسا کرنا تم یونیفارم میں چلی جانا۔ قسم خدا کی سب کے سب بس پھر تم کو ہی دیکھیں گے۔"

"بلکہ اس دن امی سے بالوں میں تیل ڈلوا کر پراندا بھی ڈال لینا، جب وہ کھینچ کھینچ کر چوٹی گوندھیں گی اور آنکھیں اور بھنویں جاپانیوں کی طرح کس جائیں گی



تب خدا کی قسم تم سا منفرد اور کوئی نہ ہوگا۔ رنگ برنگی لڑکیوں میں تم سب سے الگ نظر نہ آئیں تو میرا نام بدل دینا۔ پاکیزہ پاکیزہ اجلی اجلی بھئی واہ۔ ہی ہی ہی۔"

ضوفی کے جملے کے اختتام تک تاباں کا چہرہ کھنچتا گیا اور مائدہ کا کھلتا چلا گیا۔ خود ضوفی کو اپنی ہی بات کا اتنا مزہ آیا کہ زور سے ہنس دی۔ تب تاباں پیر پٹختی واک آؤٹ کر گئی۔

اس نے دونوں سے بات چیت بند کر دی اور اگلے روز اسی کو سناتے ہوئے سب کے گوش گزار بھی کر دیا کہ وہ جائے گی ہی نہیں۔ ضوفی پر خاک اثر نہ ہوا۔ وہ مزے سے پاپ کارن کھاتی رہی۔

اس نے اپنی کلاس فیلوز اور دوستوں کو اٹھتے بیٹھتے باور کرا دیا تھا کہ ابھی تو پھوپھی کی بیٹی کی شادی میں کپڑے بنے ہیں اور سب ایک سے ایک پیارے اور قیمتی۔ سو وہ کیوں نئے سرے سے فنکشن کے ایک دن کے لئے ٹینشن پالے۔ کچھ بھی پہن لے گی۔

سب دوستوں نے بڑے انہماک سے فوٹو البم دیکھ رکھے تھے اور تاباں کے سارے جلوے بھی۔ تاباں کو مختلف اسٹائل سے تصاویر بنوانے کا بھی شوق تھا۔ اپنا ذاتی البم۔ دوستوں نے اندازہ لگا لیا کہ تین سوٹ تھے۔ سیاہ۔ سرمئی اور پیلا۔ اب تاباں نے جب کہہ دیا ہے تو وہ ان ہی میں سے کوئی زیب تن کرے گی۔ چاروں بیسٹ فرینڈز نے ان ہی رنگوں کا انتخاب کیا۔

ڈیزائن بھی کاپی ہو گئے۔

مگر آگے بھی تو تاباں تھی۔ اس نے سب کو چلایا تھا۔

ضوفشاں نے پورا ہفتہ اسے جی بھر کے تنگ کیا۔ چڑایا اور جتایا۔ کبھی گلابی کلپ ڈھونڈ کر۔ کبھی میچنگ جوتے ساتھ رکھ کے۔ تاباں سب دیکھتی اور نظر انداز کرنے کا تاثر دیتی۔ فنکشن میں نہیں جانا۔ یہ تو طے کر ہی چکی تھی مگر فنکشن کی صبح مائدہ اور ضوفشاں دونوں جب تیار ہو کر آئیں تو وہ حیران رہ گئی۔

دونوں نے پھوپھی کی بیٹی کی شادی والے لباس زیب تن کر رکھے تھے اور وہ اسے جلد از جلد تیار ہونے کا کہہ رہی تھیں۔

"وہ گلابی سوٹ۔۔۔"

"وہ تو میں تمہیں تنگ کر رہی تھی۔ میں نے تو شروع دن ہی سے طے کر لیا تھا کہ مجھے کیا پہننا ہے۔ سال کا واحد فنکشن۔ میں ابھی اتنی بڈھی نہیں کہ اسٹائل کے نام پر بالکل ہی سادہ سوٹ لٹکا کر چلی جاؤں۔ ہونہہ! میں تو سولہ سنگھار کر کے ہی جاؤں گی۔" ضوفشاں نے مزے سے کہا۔

"ضوفی کی بچی!" تاباں اس کی چال بازی کو سمجھ کر چلائی تھی اور پھر جتنی تیزی سے اسے تیار ہونا پڑا۔ مگر تیاری کے حوالے سے بھی اس کا ذہن واضح تھا۔ اس نے ایسا میک اپ کیا جو نہ تو دکھتا تھا نہ چھپتا۔ تقریباً ہر لڑکی نے اپنے بال کھول رکھے تھے اس نے سب کو سمیٹ کر دائیں جانب ڈال دیا۔

دراز قامت تھی۔ کھسے اور فلیٹ جوتے پسند تھے۔ مگر آج سیاہ ویلویٹ خوب لمبی ہیل پہن رکھی تھی۔ چوڑی دار پاجامہ اور آستین بھی چوڑی دار۔ کانوں میں سیاہ رنگ کے چوڑی برابر گول رنگ ڈال لیے۔

وہ اپنے ناز و ادا میں اپنی مجموعی شخصیت میں واقعی منفرد نظر آتی تھی کچھ فطری طور پر اور کچھ شعوری کوشش سے۔

کئی لڑکیوں نے بے حد قیمتی لباس بھی زیب تن کر رکھے تھے۔ وہ خوب صورتی میں اس سے بہت آگے تھیں مگر پھر بھی پلٹ پلٹ کر اسے دیکھتی تھیں۔

"تم تو کہہ رہی تھیں شادی والے کپڑے پہنو گی؟" گولا گنڈا اپنی دوست نے آخر کہہ ہی دیا۔

"ہاں ارادہ تو یہی تھا۔" اس نے شان بے نیازی سے گردن ہلائی۔ "مگر پھر سوچا کالج میں کون سا روز روز فنکشن آتے ہیں۔ سال کا ایک موقع۔ بس اس لیے۔"

"تو یہ کب بنایا۔ تم نے ذکر بھی نہیں کیا؟" دوسری طوفان بنی سہیلی نے بھی پوچھا۔ اب اتنی محنت راتوں رات تو ہو نہیں سکتی تھی۔

"یہ۔!" اس نے یہ کو کھینچا۔ "بڑے دنوں سے

ڈیزائن سلیکٹ کر رکھا تھا۔ مائدہ ہی سی رہی تھی۔ بس پرسوں اس کا پورا کرنے کا موڈ بن گیا۔ اچھا اب چھوڑو میرے کپڑوں کا ذکر۔ آؤ اسٹالز پر چلتے ہیں کچھ کھاتے پیتے ہیں۔ موج کرتے ہیں۔"

وہ ان لوگوں میں سے تھی جنہیں کبھی چنا نہیں جاتا۔ مگر وہ گروپ کے لیڈر ہی ہوتے ہیں۔ پیدائشی رہنما۔

دوستیں جو ذرا بجھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی حال میں پلٹیں کہ آج تو فقط انجوائے کرنے کا دن ہے۔

تاباں سارے گروپ کو اپنے جلو میں لیے آگے بڑھتی تھی۔ کبھی رک جاتی۔ کبھی ہنس دیتی۔ کبھی کچھ خریدنے لگ پڑتی۔ کھانا پینا تو آج کے دن کا سب سے اہم کام تھا۔ کچھ اسٹالز پر بڑے اسپیکر رکھ کر میوزک کا بھی اہتمام تھا۔ اور کالج جیسی بورنگ جگہ جہاں بے تاثر عمارت ہوتی ہے اور پروفیسرز کے احترام میں جھکے دبے سہمے پھول پتے۔ اس جیسی جگہ پر اونچی آواز میں میوزک سننا کیا مزے کا تجربہ تھا۔ سو وہ ہر جگہ سے دو چار گانے سن کر ہی اٹھتیں۔

لڑکیاں تصاویر بنوا رہی تھیں۔ گروپ فوٹوز۔ بعض پروفیسرز کی منتیں کر کے انہیں بھی قائل کرتیں کہ میم بس ایک پکچر پلیز۔ قیمتی نیو ماڈل کے موبائل مگر تاباں کے پاس رول والا کیمرا تھا۔ اسے البم بنانے کا شوق تھا اور دوسرے ان کے گھر میں ابھی تک لڑکیوں کو موبائل کی اجازت نہیں ملی تھی۔

صبح نو بجے شروع ہونے والا فنکشن چار بجے تک تھا مگر لڑکیوں کا جوش و خروش کسی صورت کم نہ ہوتا تھا۔ وہ ہنوز تازہ دم تھیں۔

اختتام پر تقسیم انعامات تھی۔ سب سے زیادہ کمانے والا اسٹال۔ سب سے بہترین سجاوٹ اور ڈسپلے۔ لاجواب آئٹم۔ فینسی ڈریس شو کا نتیجہ اور کچھ سرپرائزنگ انعامات و اعلان۔

سب سے انوکھا اور اچھوتا منفرد لباس۔۔۔ یہ انعام بی اے فائنل کی سحر حسین نے جیت لیا۔ وہ کھلتے گلابی رنگ کے کھری پیس میں تھی۔ اس نے سیونٹیز کی زیبا کا سا انداز اپنایا تھا۔ تنگ پاجاما۔ اونچی بند چاک فٹنگ کی قمیض۔ چنا دوپٹا۔ بالوں کا اسٹائل ہو بہو زیبا جیسا اونچا پھولا پف اور بالکل سوٹ کی میچنگ کا گلاب کا پھول۔

یہ انعام پروفیسرز کی جانب سے سرپرائز تھا۔ ان کا ایک گروپ لڑکیوں میں گھوم پھر کے سب کو دیکھ چکا تھا۔

سب سے باوقار اور اسٹائلش لباس و انداز کا انعام سیکنڈ ایر کی تاباں مجاہد کے لیے دیا گیا۔

تاباں کا دل بلیوں اچھلا۔ وہ بھنگڑے ڈالتی اور باقاعدہ سب کو منہ چڑاتی اوپر جانا چاہتی تھی مگر لفظ باوقار کانوں میں موجود تھا۔ دوسرے بھنگڑے ڈالنے کا کام اس کے گروپ نے انجام دیا۔ مائدہ ویسے ہی چھت تک اچھل رہی تھی۔ ساری محنت تو اس کی تھی اور تاباں نے اس کا نام لے کر اسے بھی اسٹیج پر بلوالیا تھا۔ ضوفشاں کے منہ میں سیٹی تھی۔ جسے وہ رکے بنا بجائے جا رہی تھی۔

تاباں کا اسٹیج پر چڑھنا۔ انعام لیتے ہوئے مدھم سا مسکرانا اور خمیدہ ہو جانا۔ آسکر لیتے وقت کوئی بیسٹ اداکارہ بھی کیا مشکور و ممنون ہوتی ہوگی۔

فنکشن کے اختتام پر گاؤن چڑھا کر گراؤنڈ سے نکلنے تک ہر جگہ تاباں تاباں تھا اور اس پر تاباں کے نخرے اف توبہ۔

مخالف گروپ کی لڑکیاں جو باقاعدہ چڑتی تھیں۔ اب سڑ رہی تھیں۔

"جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔"

اس کی کلاس فیلو ثمرہ نے اپنے منگیتر کی بائیک پر سوار ہوتے ہوئے با آواز بلند کہا تھا۔ وہ لبرل گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور منگیتر تایا کا بیٹا۔ وہ بہت اسمارٹ بندہ تھا اور اکثر اسے لینے آتا تھا۔

اگر آپ کالج میں ہیں اور ایک عدد منگیتر بھی رکھتی ہیں تو یہ آپ کی ساری قابلیت پر بھاری خوبی ہے۔ جسے رٹے لگا کر پورا نہیں کیا جا سکتا۔

تاباں سمیت اس کا سارا گروپ آگ ہو گیا۔ تاباں

بائیک کے بالکل نزدیک چلی گئی۔ منگیتر موصوف شان بے نیازی سے کھڑے تھے۔

"صحیح کہہ رہی ہو۔ جنگل میں مور ناچا۔ کس نے دیکھا۔ کس نے دیکھنا ہے۔ ظاہر ہے جنگلیوں ہی نے دیکھنا ہے۔۔۔ ہی ہی ہی۔"



وہ تینوں مسلسل بولتے ہوئے اور ہنستے ہوئے کامن روم میں داخل ہوئی تھیں۔ اپنے ہینڈ بیگ لاپروائی سے یہاں وہاں ڈال دیے۔ تاباں نے ایوارڈ بھی اچھال دیا۔ وہ صوفے پر کشن کی آڑ میں جاکر پھنس گیا۔

"بڑی خوش لگ رہی ہو۔ کیا ہوا۔" ماجدہ اندر داخل ہوئی۔

"وہی جو ہونا تھا۔" تاباں نے ادائے بے نیازی سے ہاتھ دو اطراف پھیلائے۔

"بیسٹ لباس پر انعام ملا ہے تاباں کو۔" مائدہ کی خوشی کی وجہ تھی۔ وہ اس ایوارڈ کی اصل حقدار تھی۔

"دکھاؤ تو ایوارڈ ہے کہاں۔" ماجدہ پر تجسس تھی۔

"ہوگا یہیں کہیں۔" تاباں نے لاپروائی سے ادھر ادھر دیکھا۔

"کوئی ایسے پھینکتا ہے تاباں۔" ماجدہ کی حیرت بھری سرزنش پر ضوفی اور مائدہ نے تائیدی سر ہلایا۔ "ضوفی والے ریک پر جگہ بنا کر سجا دیتیں۔"

"یہ سجانے والا ایوارڈ نہیں ہے۔" تاباں نے کہا "یہ بس جیتنے کے لیے تھا۔ جیت لیا۔ کام ختم۔ ضوفی کے تو تعلیمی ایوارڈ اور شیلڈز ہیں۔ مجھے جیت میں دلچسپی ہے۔ میرے ہاتھوں میں آنے کے بعد اس کی اہمیت ختم۔ کسی اور کو نہیں ملنا چاہیے تھا بس۔"

"عجیب ہو تم۔" ماجدہ بولی۔

"اور یہ گھر میں اتنا سناٹا کیوں ہے۔ کہاں ہیں ہم سب کی والدہ ماجدہ ائیں۔ اور ان کے گلشن کے پھول اور کلیاں۔" تاباں ہی کو سناٹا محسوس ہوا۔

"پھول اور کلیاں بھنورے کے قبضے میں ہیں یعنی کوچنگ ماسٹر تشریف لے آئے ہیں۔ دوسری خبر یہ ہے کہ راشدہ آپا کے گلشن میں ایک پھول کا اضافہ ہوا ہے۔"

"پھول؟" مائدہ چیخی۔ "یعنی بیٹا۔ اوہ یا!" اس نے ہوا میں مکا لہرایا۔ ضوفی کے ہونٹوں پر بھی مسکان آرکی۔

"اب ان کے سو گناہ معاف ہوگئے اور یہ بھی اچھا ہوا کہ پہلی اولاد بیٹا ہوگیا۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں ہم جیسے خاندان جو ذات برادری سے باہر جھانکنے کا تصور ہی نہیں کرتے۔ ان کے پاس پہلی اولاد بیٹا ہی ہونا چاہیے۔ اب ہمارے اس گھر کا حال دیکھ لو۔ ہم چار بہنیں ہوئیں اور پھر کہیں جاکر ایک بیٹا ہوا۔ پھر تایا جی کے یعنی تم لوگوں کے ہاں بھی تین بیٹوں کے بعد دو بھائی تشریف لائے۔ پہلے راشدہ باجی پھر ماجدہ پھر یہ مائدہ اور بعد میں بھائی صاحبان۔۔۔۔ اب آجاؤ چھوٹے چاچو کی طرف۔ انہوں نے پہلے بیٹا پیدا کیا۔ چلو ماجدہ ٹھکانے لگی پھر وہ وحشی جٹ پیدا کیا۔ پھر دوسرا بے درد گجر۔ جو نہ کام کا نہ کاج کا۔ آخیر میں سونیا اور رانیہ۔"

"اس سب بکواس کا مطلب؟" ماجدہ کو اپنے ہونے والے دیوروں کا یوں مذاق بننا پسند نہ آیا۔

"دیکھو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لڑکے پہلے آجاتے تو لڑکیاں مزے سے ٹھکانے لگ جاتیں۔ اب ڈھیر لڑکیوں کا پڑا ہے اور لڑکوں سے بڑا ہے۔ سب ہی 'آپا' باجی کہتے ہیں۔

ہماری دونوں بہنیں تو چلو نانکوں میں کھپ گئیں۔ ہمارا کیا بنے گا۔"

بہت ہلکی ٹون میں بولتے بولتے اس نے یکدم بین ڈالنے کے انداز میں سر پر ہاتھ مارے۔ "ہائے ہمارا کیا بنے گا۔ اف۔۔۔!"

"تو وہ جو میرے وحشی اور بے درد دیور ہیں وہ۔" ماجدہ کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ تاباں اچھل ہی تو پڑی۔

"ان کے پلے بندھنے سے بہتر ہے۔ بندہ کوئی بلا پال لے۔"

"تاباں!" ضوفی کی ششدر آواز نکلی۔ آنکھیں مائدہ اور ماجدہ کی بھی ابلیں۔

"وہ ہمارے چاچو کے بیٹے ہیں۔ تم نے ان کے لیے کتنا غلط لفظ استعمال کیا۔ تمہیں پتا ہے پلاکس کے بچوں کو کہتے ہیں؟"

"اچھی طرح پتا ہے۔" وہ ہٹ دھرمی سے اپنے جملے پر قائم تھی۔

"مگر یہ کون سی کتاب میں لکھا ہے کہ چاچو کے گناہوں کا کفارہ ہمیں ادا کرنا ہوگا۔ نہ بی بی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔" وہ صاف گوئی کی انتہا پر تھی۔

"جو بھی کہو مگر تمہارا جملہ انتہائی نامناسب ہے۔ اگر چاچو سن لیں تو۔" مائدہ بھی ضوفی کی ہمنوا تھی۔

"اب تم بات کو کھینچو مت۔ دونوں لڑکے اپنے ماموؤں پر گئے ہیں اونچے لمبے تڑنگے۔ ان کے منہ اور شانوں کے حدود اربع کا ریکارڈ پٹواری کے پاس ہے۔ اتنے بڑے بڑے منہ۔ اوپر سے ہنستے ہیں تو حلق کا کوا تک دکھائی دیتا ہے۔ یہ بڑے بڑے ہاتھ۔ برفانی آدمی لگتے ہیں پورے۔"

"تم پھر جمیل کے بارے میں بھی ایسی ہی رائے رکھتی ہوگی؟" ماجدہ کی آواز مدھم اور لہجہ بالکل ٹوٹا سا ہو گیا۔ لگے ہاتھوں اپنے منگیتر کے بارے میں بھی معلومات لے لی جائیں۔

"نہیں۔" تاباں نے قطعی پن سے سر نفی میں ہلایا۔ "جمیل بھائی لگتے ہیں چاچو کے بیٹے۔ تم خوش نصیب ہو۔ باقی رہیں۔ سونیا' رانیہ تو وہ ہمارے ساتھ رہ کر ہمارے جیسی ہو جائیں گی۔ مگر تم ہمارے انکار کو دل پر مت لو ہونے والی بھابھی محترمہ۔ ابھری پڑی ہے ہماری برادری جو محض ذات کی میچنگ کو دیکھ کر ہاتھ پیر جوڑ کر تمہارے دیوروں کو داماد بنائیں گے۔ مگر ہمیں بہرحال معاف رکھو۔"

"تم اتنی بری رائے رکھتی ہو تاباں۔ اتنا ناپسند کرتی ہو شکیل اور عقیل کو۔" ماجدہ ابھی تک صدمے میں تھی۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی تھی۔ یہ صحیح تھا چاچو کے دونوں بیٹے پہلے پڑھائی سے بھاگے اور اب بس آوارہ گردیاں ہی کرتے تھے۔ چاچی کچھ پینڈو سی تھیں۔ ان دونوں پر اپنے ماموؤں کا زیادہ اثر تھا۔ شکل و صورت میں بھی اور عادات تو مکمل طور پر۔

"تمہیں تو میری ناپسندیدگی کا صدمہ ہی لگ گیا۔ یہ بیٹھی ہیں دونوں' پوچھ لو۔ یہ مائدہ آپ کی اپنی سگی بہن اور یہ ضوفی میری چھوٹی بہن۔" تاباں نے رخ موڑ کر دونوں کو دیکھا۔

"کیوں بھئی! بننا چاہو گی اپنی بہن صاحبہ کی دیورانی۔"

دونوں نے تاباں کو دیکھا جو جواب جانتی ہی تھی پھر ماجدہ کو جو بڑی متوقع نگاہوں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی' پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور بے ساختہ کورس میں بولیں۔

"نہیں۔ کبھی نہیں۔"

تاباں قہقہہ لگا کر ہنستی چلی گئی۔ ہنسی میں مائدہ اور ضوفی بھی شامل ہو گئیں۔

ماجدہ کے چہرے پر جھینپی جھینپی ــــ مسکان آر کی تھی۔



"کہاں جا رہے ہو چھپ چھپ کے میرے سوہنے شہزادے!" تاباں نے یکدم آگے آ کر کاشان کا راستہ روکا۔ وہ پورا مرد بن کر بڑے دبدبے سے قدم اٹھاتا اندر جا رہا تھا۔ سوٹ پر کلف لگا تھا سو چال میں بھی ایک اکڑاہٹ آ گئی تھی۔ تھوڑی چوڑی ٹانگیں۔ بازو بھی جسم سے ذرا دور رکھے تھے۔

تاباں نماز پڑھ کر آئی تھی۔ چہرے کے گرد دوپٹا کسا تھا۔ اسے دیکھتے ہی آنکھوں میں شرارت عود کر آئی تھی۔

"اتنے پیارے لگ رہے ہو' ہمیں لفٹ ہی نہیں کراتے۔" تاباں نے اسے بغور دیکھا۔ دھلا نکھرا معصوم چہرہ۔ جس پر سنجیدگی کا خول چڑھا رکھا تھا۔ اب ہراساں سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ میرے سارے کپڑے خراب' چڑمڑ ہو جائیں گے۔" اس نے گریز کی اصل وجہ بتانے میں عافیت جانی۔ "مجھے ابھی عصر کی نماز بھی انہی کپڑوں میں پڑھنے جانا ہے۔"

"او کے۔" تاباں نے مصالحانہ ہاتھ اٹھائے۔ "تو پھر تم مجھے شرافت سے پیار کرنے دو۔" تاباں نے بھی مطالبہ رکھ دیا۔

"نہیں۔" وہ اس کے چٹاچٹ گال چومنے سے بہت چڑتا تھا۔ چار بڑی بہنوں کا اکلوتا چھوٹا بھائی ہونے کے فائدہ تو بہت سے تھے مگر نقصان بھی بے حد تھے۔ بچت ہو گئی اگر جو وہ ذرا بے خبر ہوتا تو تاباں نے اسے جھپٹ کر لپٹا ہی لینا تھا۔ وہ آج اپنے ابا اور تایا چاچا اور دیگر بھائیوں جیسے حلیے میں خود کو بہت معتبر مدبر سمجھ رہا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے مان لیا۔ "اور میرے کپڑے خراب نہ ہوں اور آپ چھپا بھی نہیں ڈالیں گی۔"

اس نے اپنی شرائط پیش کیں۔ تاباں نے تسلیم کیں۔ ایک قدم تاباں نے بڑھایا۔ ایک قدم اس نے۔

لیکن اس سے پہلے کہ تاباں قریب ہوتی وہ غچہ دے گیا۔ سرپٹ اندر کی جانب دوڑا۔ پہلے تو تاباں کی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اس کے پیچھے بھاگی۔ مگر سنبھل کر وہیں رک جانا پڑا۔

کامن روم میں سب گھر والے براجمان تھے۔ بڑے صوفے پر ابا اور جمیل بھائی۔ کاشان انہی کے درمیان جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہوبہو ابا کے انداز نشست کو نقل کیا تھا اور جب تاباں پر نگاہ پڑی تب بھی تاثرات نہ بدلے۔ وہ ابا کی سی سنجیدگی سے تایا کو سن رہا تھا۔ تاباں کو بھی مودب ہونا پڑا۔ اس نے سانسیں درست کرتے ہوئے دوپٹا سلیقے سے جمایا اور ایک کرسی پر ٹک گئی۔ ساجد چاچا بیچ میں جملے جوڑ دیتے تھے۔ عقیل اور شکیل بھی بڑے باادب بیٹھے تھے۔ قصہ ختم ہوتا۔ کھانا لگتا پھر ابا وغیرہ قیلولہ کے لیے جاتے تب ان کی مشکل آسان ہوتی۔ (بائیکس نکال کر آوارہ گردیوں پر جاتے۔ شور مچاتے۔ ریس لگاتے۔)

خواتین ہمہ تن گوش تھیں۔ دلچسپی عروج پر تھی۔ آنکھوں میں ستائش تھی۔

"کس نے غلط فہمی پال لی کہ اسلام قبضہ گروپ جیسی ذہنیت رکھنے والا مذہب ہے؟ آقائے دو جہان نے تو مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے یتیم بھائیوں سے زمین بھی قیمتاً لی تھی اسلام میں جارحیت نہیں ہے۔ زور زبردستی نہیں ہے۔ اسلام میں اذیت اور تکلیف نہیں ہے۔ لیکن لوگ اسلام کا نام لے کر جائز ناجائز سب کرتے ہیں اور اعتراض کرنے والے کو دائرہ اسلام سے خارج کرنا تو زبان کی نوک پر دھرا ہوتا ہے۔"

"پھر ابا آپ نے فیصلہ کیا دیا؟" ضوفشاں کو جلدی تھی۔

"کیا فیصلہ کرنا تھا۔ وہ تو ہم بھائی ہیں۔ اور تمہارے تایا۔ حمایت کے لیے بہت سے۔ دوسری جانب مولانا صاحب تھے۔ اشرفی صاحب تھے۔ وکیل بھی تھا۔ اور اپنے محلے کے ڈاکٹر۔ اصل والا بھی۔ اور وہ نقلی ڈھکن ڈاکٹر بھی۔" وہ ہنسے۔

قصہ یوں تھا کہ ہر جمعے کو یا پھر کبھی کبھار اتوار کو بڑے مدرسے سے مبلغین اور علماء درس دینے کے لیے آتے۔ اس دن مسجد میں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی۔ گلی محلے کے علاقے لوگ دور دور سے بھی آتے۔ گاڑیوں پر موٹر سائیکلوں پر۔ ایسے میں گلی کے آخر تک گاڑیوں کی قطاریں لگ جاتیں۔ اور یہ قطاریں بنگلوز کے دروازوں کو جام کر دیتیں۔ نہ آ سکتے ہیں نہ جا سکتے ہیں۔ ایک اذیت اور تکلیف۔ کچھ لوگ مذہبی معاملے کے حوالے سے احتراماً خاموش رہتے اور اپنے کام نبٹا لیتے کہ دوپہر سے رات گئے تک پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ لیکن کچھ لوگ اعتراض اٹھانے لگے دبی زبانوں میں۔ اور دبی زبانوں کے اعتراض پر مذہبی جنونی ٹائپ لوگوں نے با آواز بلند جارحانہ اعتراض کیا کہ "دین کی راہ میں لوگ اتنی قربانیاں دیتے ہیں اور یہ تھوڑے دو چار گھنٹے کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یعنی تکلیف بیان کرنے پر شکایت لگانے والوں کو لعن طعن کا سامنا کرنا پڑا۔ آج اسی چیز کا فیصلہ

ہوتا تھا۔ مشاہد تاج اور مجاہد تاج اس فیصلہ سازی کے اہم رکن تھے۔ اور ان ہی کا کہا حرف آخر بنا۔

"تمام آنے والوں کو خوش آمدید۔ مگر وہ اپنی گاڑیوں کو قریبی میدان میں پارک کریں تاکہ گھروں کے سامنے۔ دین اسلام آزار پہنچانے کا نام نہیں ہے۔"

سب نے اس فیصلے کو مانا اور مجاہد تاج کے دبنگ لہجے دوٹوک فیصلے کے بعد کسی کو بھی ایک حرف کہنے کا موقع نہ ملا۔

"میں ہوتی تو میں بھی یہی فیصلہ کرتی۔" ضوفشاں نے ساری روداد سن کر آرام سے کہا۔ "آپ کو پتا ہے ابا۔ دنیا کے باقی مذاہب فرد پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ فقط اسلام فرد کے جیسا ہو جاتا ہے۔ جیسی فرد کو سہولت ہو 'جیسا فرد چاہے۔ بس یہ ہے کہ بندے کو اس کا احساس نہیں کہ یہ دین فطرت ہے۔ لوگوں نے خوامخواہ اسے جبر کا نام دے رکھا ہے۔ دین اسلام کو اگر ایک جملے میں ڈیفائن کرنا ہوتا تو صرف یہ کہ اسلام فرد کی آسانی و سہولت کا نام ہے۔ بس! ہم میں سے اکثر کو اس کی خبر نہیں ہو پاتی۔"

گھر میں مردوں کے سامنے باادب رہنے' سرہلا کر تسلیم کرنے اور عورتوں کے لیے اپنی رائے محفوظ رکھنے کا رواج تھا مگر ضوفشاں کو جو کہنا ہوتا صحیح یا غلط 'وہ کہہ دیا کرتی تھی۔ غلط البتہ اس نے کبھی کہا نہیں۔ اب بھی نماز کے سے اسٹائل میں دوپٹا لپیٹے وہ اپنی کہہ کر اب ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھی تھی۔

شکیل نے اسے گھورا تھا اس کا بے پناہ اعتماد اسے اکثر کھلتا تھا۔ عقیل کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مائدہ نے سوچا کہ اگر وہ اپنے جملوں کو دہرا دے تو اسے زیادہ وضاحت سے سمجھ آئے گا۔ یہی سوچ تایاں کی بھی تھی۔ ماجدہ ہلکا سا سرہلاتے ہوئے مان رہی تھی۔ رانیہ 'سونیا باادب تھیں۔

اور مرد حضرات... ابا ششدر رہ گئے اور تایا بھی۔ پھر دھیرے دھیرے تنے عضلات ڈھیلے پڑے اور ہلکی مسکان گہری ستائش میں بدل گئی۔

"میرے خیال میں اگر جانے سے پہلے میں تم سے تھوڑا ڈسکس کر کے جاتا تو میری بات زیادہ مدلل ہوتی۔ میں نے تو وہاں سیدھی سیدھی چار سنائیں۔ بلکہ صاف کہوں فیصلے کا اختیار تھا۔ بس فیصلہ سنا کر آگیا۔ تم تو بڑی قابل بچی ہو۔"

ضوفی نے سرہلا کر حق سے تعریف وصول کی۔ مجال ہے جو سنجیدگی میں فرق پڑا ہو۔ البتہ امی کا چہرہ کھل کر گلاب ہو گیا تھا۔ سارے بچے ایک طرف ضوفشاں مجاہد ایک طرف۔

"یہ بھی پوچھ لیں۔ کون سی کتاب سے رٹے لگا کر آئی ہے۔" عقیل نے جیسے بھانڈا پھوڑا۔

"رٹے پر الزام نہ دو۔ کتاب پر غور کرو۔ کچھ بھی کیا ہو 'کتاب بہرحال کھولنی ہی پڑتی ہے۔" اس نے ذرا جھجکے بغیر اوچھے وار کا کڑا جواب دیا۔ وہ منہ کی کھا کر رہ گیا۔ نالائق ایک زمانے میں ضوفی سے دو کلاس آگے تھا اور اب ضوفی اس سے دو جماعت آگے۔ رقابت بنتی تھی۔

چاچی جی کو ضوفی کا جملہ برا لگا۔ جبکہ چاچا ساجد ہنس دیے۔

"ہاں ابا! تو پھر آپ مجھے ڈاکٹر بنا رہے ہیں ناں؟" ذہین لوگ موقع ضائع نہیں کرتے۔

"ہمارے خاندان میں آج تک کوئی لڑکا ڈاکٹر نہیں بنا۔ تم تو پھر لڑکی ہو۔" چاچی جی نے اسے جتایا اور سب کو بتایا۔

"ہمارے خاندان میں آج تک مریض تو بے شمار بنے ناں۔" ضوفی نے اپنے حساب سے جواب دیے۔ "ہمیشہ نقصان کا سودا ہی کیوں کیا جائے۔ ابا آپ جواب تو دیں۔"

"بھئی وہ میں نے سنا ہے کہ ڈاکٹر بننے کے لیے بہت سے نمبر وغیرہ چاہئے ہوتے ہیں۔" ابا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے حاضرین کی جانب بھی دیکھا۔

"اب یہ بات آپ کے منہ سے کم از کم میرے لیے تو نہیں جچتی ابا!" ضوفی نے صدمے میں گھر کے کہا۔ "پیپرز کے اوپر صرف رول نمبر درج ہوتا ہے اگر

جو پوسٹل ایڈریس ہوتاں تو اگلے گھر آکر نمبر دے کر جائیں۔ اور آپ کہتے ہیں کہ...."

"میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ڈاکٹری کی پڑھائی پر بہت پیسہ خرچ ہوتا ہے۔" مجاہد تاج آستین فولڈ کر رہے تھے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب کھانا کھائیں گے۔ دستر خوان لگا دیا جائے۔

"ابا!" ضوفی کے ہاتھ ڈھلک گئے۔ وہ کھڑی ہو گئی اور جیسے صدمے سے گنگ رہ گئی۔ "آپ کے منہ سے ایسی بات ابا!"

اس کی بے ساختگی نے مجاہد تاج کے چہرے پر مسکان بکھیر دی۔

"میں نے تو مذاق کیا تھا بھئی۔" انہوں نے ضوفی کا گال تھپتھپایا۔

"یعنی آپ مجھے ڈاکٹر بنائیں گے؟" ضوفی نے پکا وعدہ لینا ضروری سمجھا۔

"ایسا نہ کریں تمہیں تھوڑا بہت سامان ابھی لادیں جیسے ڈاکٹروں والا کوٹ اور بی پی آپریٹس اسٹیتھسکوپ۔ تھرمامیٹر وغیرہ پریکٹس شروع کرنے کے لیے۔" ضوفی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جبکہ عقیل و شکیل نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ ہنسی سب ہی کی نکلی تھی۔

"مجھے تو ڈاکٹر نہیں بننا ابا!" کاشان دستر خوان پر بھی ابا اور تایا کے درمیان بیٹھا تھا اور دونوں کو بغور دیکھ کر ان ہی کی طرح سے منہ بناتا اور جسم کو حرکت دیتا تھا۔

"مجھے تو بس آپ لوگوں جیسا بننا ہے اور داڑھی بھی رکھنی ہے اور فیصلے کرنے ہیں۔"

"بہت خوب۔" ابا بہت خوش ہوئے۔

"ضرور ضرور کیوں نہیں۔ اللہ عمر دراز کرے۔ ماں باپ کا سہارا بنو۔" تائی جی نے فوراً "دعا دی۔ تایا شاہد نے زور سے آمین کہہ کر پھونک بھی مار دی۔ چھوٹے بھائی ساجد کو اللہ نے پہلے تین بیٹے عطا فرمائے۔ پھر انہیں تین بیٹیوں کے بعد دو بیٹے "جو کسی دینی مدرسے کے ہاسٹل میں زیر تعلیم تھے صرف مجاہد تھے جو چار بیٹیوں کے باپ تھے۔ اور بیٹا نہیں مگر جب وہ مایوس ہو چکے تو اللہ نے انہیں کاشان کی صورت میں بیٹا عطا فرمایا۔ وہ گھر بھر کی خوشی تھا۔

"امی!ویسے میں اکیلا مسجد جاؤں نا تو مجھے آخری صفوں میں جگہ ملتی ہے۔ مگر آج میں ابا اور تایا جی کے درمیان کھڑا ہوا اور جب مجلس میں سب فیصلہ کر رہے تھے نا تو بھی ابا نے مجھے اپنے ساتھ بٹھایا اور جب چائے مٹھائی ملی تو مجھے بھی... میرے سارے دوست جو سامنے دائرے میں بیٹھے تھے نا 'مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب مجھے ہنسانے کی کوشش کر رہے تھے 'مگر میں تو فیصلہ کرنے والوں میں سے تھا نا.... میں بالکل بھی نہیں ہنسا بلکہ میں نے انہیں دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ بعد میں میرے پیچھے آئے کہ اب ان کے ساتھ کھیلوں مگر میں تو اب بڑا ہوں نا۔ ایسے گلی میں کھیلتا کیا اچھا لگوں گا۔ میں تو سنجیدہ ہو گیا ہوں۔ ابا مجھے اپنے ساتھ اور سب جگہوں پر بھی لے کر جائیں گے اور میں...."

وہ معصوم لہجے میں تیز تیز بولتا ہوا سب کچھ کہہ دینا چاہتا تھا۔ موقع جو ابھی ملا تھا۔

"اور پتا ہے بڑے مولانا صاحب نے بھی مجھ سے ہاتھ ملایا۔" اسے یاد آیا۔

سب ہی کھانا چھوڑ کر اسے سن رہے تھے۔ وہ گھر میں سارا دن لڑکیوں یعنی بہنوں کزنوں اور اپنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اسے جلد از جلد بڑا آدمی بننے کا بہت شوق تھا۔ ہر کام میں تایا' ابا اور چاچا کی نقل کرتا تھا۔ عام طور پر خاموش رہتا تھا مگر ابا وغیرہ کے سامنے خوب بول لیتا۔

اسے اپنے ابا وغیرہ کی عزت بہت بھاتی تھی۔ ان کے پاس اچھی گاڑیاں تھیں اور لوگ انہیں سلام کرتے تھے۔

وہ عزت' بے عزتی' مقام و مرتبہ کی اہمیت و جوہات سے تو ناواقف تھا' مگر اسے یہ سب چیزیں بہت دلچسپ لگتی تھیں کہ اس کا گھر گلی کا سب سے خوب صورت گھر ہے۔ بہت بڑے بڑے لوگ 'اس کے ٹیچرز اور وکیل صاحب اور ریٹائرڈ فوجی انکل بھی اس کے ابا کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اور وہ جب ابا کے ساتھ ہوتا تو

سب اسے بھی ابا ہی کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے اسے ادراک نہیں تھا مگر اسے اچھا خوب لگتا تھا۔

اب بھی تڑتڑ زبان چل رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک قہقہہ۔۔۔

"کوئی ڈاکٹر صاحبہ کو بھی کھانا نکال دے۔" ساجد چاچا ہی نے ضوفی کو دیکھا تھا' جو بسورے منہ کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔

سب متوجہ ہوئے ضوفی ویسے ہی بھُس رہی

"یعنی ابھی سے ڈاکٹروں والے نخرے شروع۔۔۔" جمیل بھائی پہلی بار بولے ان کا سارا دھیان ماجدہ کی طرف تھا۔ صرف جمعہ کے دن کھانا اس طرح اکٹھے کھایا جاتا تھا۔ باقی ماجدہ کا اور ان کا سخت پردہ تھا وہ اتنی دیر سے کسی جانب متوجہ ہی نہ تھے بس اسی آڑ کو دیکھتے تھے۔ جہاں سے نیلا دوپٹا جھلک دکھاتا تھا۔

"بھئی' اتنا حق تو بنتا ہے نا۔۔۔!" ابا نے اس کے عمل کو جائز قرار دیا۔

ضوفی بری طرح چونکی۔ "یعنی آپ مجھے ڈاکٹر بنا رہے ہیں؟"

"بیٹا! ہمارے پورے خاندان میں پہلے کبھی ایسا ہوا نہیں اس لیے۔۔۔"

"ابا! پورے خاندان میں مجھ جیسی قابل لڑکی بھی پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئی۔" ضوفی نے تڑپ کر کہا۔ اسے خود پر یقین تھا۔

ابا اس کی برجستگی پر ذرا ٹھٹکے۔ "چلو پھر دیکھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ضوفی نے ڈونگا اپنی جانب کھسکایا۔ بھوک ہڑتال ختم ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"تین دن کے حساب سے نو فلمیں دیکھی جا سکتی تھیں۔" تاباں نے انگلیوں پر حساب لگایا۔

"صرف ابا' تایا' چاچا اور ان کے وہ دو نکمے سپوت۔۔۔ تبلیغی اجتماع میں گئے ہیں۔ جمیل بھائی گھر پر ہیں اور ہماری امیاں بھی گھر پر ہیں اور بقائمی ہوش حواس اپنے سرتاجوں کی غیر موجودگی میں وہ زیادہ فرض شناس ہو جایا کرتی ہیں۔" ضوفی نے سارے حساب کا ستیاناس مارتے ہوئے حقیقت کی تلخ دنیا دکھائی۔

تاباں' مائدہ کو دیکھتے ہوئے ذو معنی انداز میں مسکرائی۔ "فلمیں ہم امیوں کی غیر موجودگی میں دیکھیں گے اور رات کو دیکھیں گے اور اپنے جمیل بھائی' وہی تو ہمارے کمرے تک کیبل وائر جوڑیں گے۔ بس انہیں مناسب سائز کا ٹوٹا نہیں مل رہا۔"

"جم۔۔۔ جمیل۔۔۔!" ماجدہ نے بری طرح چونکی۔

"تم نے ان سے کہا ہے؟"

"ہاں تو کیا اب ہم لڑکیاں چھتوں پر چڑھ کر کیبل گزاریں گی یہاں سے وہاں۔۔۔ عقیل شکیل کے کمرے سے یہاں تک کتنا فاصلہ ہے' کچھ اندازہ ہے تمہیں؟" تاباں کا انداز ڈپٹنے والا تھا۔

"لل۔۔۔ لیکن وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے کہ۔۔۔ میں۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں فلمیں دیکھتی ہوں۔"

"بالکل! انہوں نے یہی سوچا۔ بلکہ سوچا کیا میں نے انہیں بتایا کہ ہم لڑکیاں کتنی بور لائف گزارتی ہیں۔ اب ہم تینوں یعنی میں مائدہ اور ضوفی تو کالج جاتی ہیں۔ مگر ماجدہ بے چاری کی زندگی میں تو کوئی تفریح ہے ہی نہیں ہے۔۔۔ بس ہانڈی روٹی۔۔۔ گھر سے باہر بھی کوئی سرگرمی نہیں ہے۔۔۔ تو۔۔۔"

"تت۔۔۔ تم نے میرے شانے پر بندوق رکھ کر چلائی۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔"

"سوچنا کیا ہے۔ فلموں کی ایک لسٹ بنا لیں گے جو شادی کے بعد تمہیں دکھانی ہوں گی! انہیں۔"

"لیکن ہمیں ضرورت ہی کیا تھی اس طرح سے فلمیں دیکھنے کی۔"

"تمہیں پتا ہے دنیا چاند پر پہنچ گئی ہے۔" تاباں شروع ہوئی۔

"فلمیں دیکھنے؟" ماجدہ نے حیرت سے کہا۔ تاباں نے سنی ان سنی کر دی۔

"اور ہمیں یہی نہیں معلوم کہ آج کل کون سی فلمیں چل رہی ہیں۔ لڑکیاں جب کلاس میں باتیں

کرتی ہیں ناتب ہونق بن کر ان کا منہ دیکھنے سے جو سبکی ہوتی ہے' تمہیں اس کی کیا خبر۔۔۔ لہٰذا اپ ڈیٹ رہنے کے لیے۔۔۔"

اور پھر نو کی جگہ اٹھارہ فلمیں دیکھ لی گئیں گھر کا ماحول سخت تھا۔ لڑکیوں کے کمرے میں ٹی وی نہیں تھا۔ کامن روم کے ٹی وی پر مخصوص چینل سیٹ تھے اور آنکھ بچانے جتنی بے ایمانی بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ "سارا دن خبریں چلتی تھیں یا کارٹون۔۔۔ یا پھر کچھ مخصوص ڈرامے۔۔۔

کیبل موجود تھی اور عقیل شکیل کے کمرے میں دنیا کے سارے چینلز آتے تھے۔ وہ دونوں دنیا میں عیش کرنے آئے تھے۔ باپ کا اچھا بزنس تھا اور بڑا بھائی مددگار۔۔۔ اسکول کالج جانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ جب تک ابا کا ڈنڈا چلتا رہا جاتے رہے اور مارے باندھے میٹرک ایف تک پہنچ گئے۔ ان کی اپنی دنیا تھی جہاں دوستوں کے جلو میں شوماری جاتی۔ اچھی بائیک اور اونچے لمبے تڑنگے۔۔۔

علاقے میں باپ دادا کی عزت تھی اور دولت نے عزت کے شملے پر تنگ لگا رکھے تھے' سو جہاں جاتے گروپ لیڈر ہوتے۔

کسی بدفعلی یا بدکرداری کے مرتکب کبھی نہیں رہے' مگر بس شوباز' آوارہ تھے۔ اچھے لباس میں اڑے پھرتے بے فکرے۔۔۔ من مانی کرنے کی کافی حد تک کوشش بھی کرتے۔

اس بار بھی جب وہ بڑوں کے جانے پر کوئی مزے دار سا پروگرام ترتیب دینے والے تھے تو بڑے پہلے ہی انہیں اپنے ساتھ باندھ کر لے گئے کہ کچھ نیک بن کر لوٹیں گے۔

جمیل معتدل مزاج تھا۔ وہ اتنی چھوٹی موٹی تفریح کو برا نہیں سمجھتا تھا۔ لہٰذا۔۔۔

"میں کرینہ سے زیادہ خوب صورت ہوں۔" تاباں نے خود آئینے میں گھنٹوں دیکھا۔

"اس کی بیوٹی تو مہنگے ترین میک اپ اور ٹریٹمنٹ کی محتاج ہے جبکہ میں صرف منہ دھو کر ہی۔۔۔ ماشاء اللہ۔۔۔"

مائدہ نے چونک کر دیکھا تھا اور پھر تائیداً مسکرا دی۔

"مگر خدا کے لیے مجھے کرشمہ سے مت ملا دینا۔" ضوفی نے فوری کہا تھا۔ "میں بہن ہونے کی اتنی بڑی قیمت ادا نہیں کر سکتی۔"

"ہاہاہا۔۔۔!" تینوں دل کھول کر ہنس دیں۔ تاباں نے کوئی آدھا گھنٹہ اپنے بالوں میں برش پھیرا۔

"گھر سے بھاگنے میں کتنا تھرل ہے نا!" تینوں نے بری طرح چونک کر اس کا تبصرہ سنا۔ یہ رائے تھی فیصلہ یا سوال۔۔۔

وہ آئینے میں اپنی بہنوں کے اڑے رنگوں کو دیکھ کر زور سے ہنس دی۔

"میں فلم کی بات کر رہی ہوں۔"

"یا اللہ۔۔۔!" مائدہ نے سر ہاتھوں پر گرا لیا جبکہ ضوفی کو حیرانی نے اس کی مہلت بھی نہ دی۔

"بہت خوب کیا سبق سیکھا ہے؟" ماجدہ نے کہا۔

"نہیں میرا مطلب ہے۔۔۔ کہ کیسا خوابوں کا گھر تھا۔۔۔ نہ کوئی بکھیڑا نہ الجھن۔۔۔ ہرے بھرے جنگل میں بسیرا۔۔۔ قناعت والی زندگی۔۔۔ اور محبت۔۔۔"

"الو۔۔۔ عملی زندگی میں کوئی ایسا کرے نا تو سب سے پہلے ہاؤس بلڈنگ والوں نے آ کر مشکیں کس دینی ہیں کہ تم نے کیسے سرکاری زمین پر "خوابوں کا بسیرا" قائم کر لیا۔ پھر بھتہ خور۔۔۔ اور اتنے بڑے ہرے بھرے گھر میں کبھی دیوار پر تصویر ٹانگنی ہو تو کیل نہیں ملتی۔ فلم اور حقیقت الگ الگ چیزیں ہیں۔" ضوفی نے ادھیڑ کر رکھ دیا ایک منٹ میں۔۔۔

ماجدہ ہنستی چلی گئی جبکہ مائدہ عش عش کر اٹھی۔ تاباں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کی حقیقت پسند بہن۔۔۔ اف۔۔۔

"اور یہ تو چلو مذاق کی بات ہے مگر فینٹسی۔۔۔"

"گھروں سے بھاگنے والی لڑکیاں۔۔۔ اپنے باپ دادا کے نام' ان کی زمانوں کی کمائی عزت اپنے پیروں تلے روند دیتی ہیں۔ پیچھے ماں باپ نے دنیا کے کیا کیا طعنے سنے۔۔۔ بہن بھائی کیسے منہ چھپا کر نکلے۔۔۔ ان کے

مستقبل کی راہیں مسدود کر کے اپنا مستقبل بنانے نکل پڑی ہیں اور نکل بھی جاتی ہیں تو کیا جو کچھ سوچتی ہیں وہ مل جاتا ہے۔ عزت۔۔۔ نہیں ملتی۔ شان۔۔۔ کمان سے نکلے تیر کی طرح ناقابل واپسی۔ جس کے ساتھ بھاگتی ہیں وہ بھی دامن چھڑاتا ہے۔ جس گھر میں جاتی ہیں وہاں کتے سے بھی بدتر۔۔۔ اور اگر قسمت سے یہ سب نہ ہو تو نافرمان اولاد جنم دیتی ہیں۔ لاعلاج مرض میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ خون تھوکتے مرتی ہیں، تمہیں کون سی فینٹسی دکھائی دے گئی۔" ضوفی کا سانس پھول گیا۔

ماجدہ اور مائدہ۔۔۔ ضوفی کی حقیقت پسند فطرت سے واقف تھیں۔

ضوفی عمر میں ان تینوں سے چھوٹی تھی مگر اس کی ذہنی عمر بہت زیادہ تھی۔ وہ چیزوں کو بہت گہرائی سے دیکھتی تھی اور جانچتی تھی۔ معمولی سے معمولی چیز بھی اس کے علم میں آجایا کرتی تھی۔ بے حد محنتی۔۔۔ ایک معتدل مزاج لڑکی۔۔۔ ہاں اسے جنون تھا پڑھائی کا ڈاکٹر بننا اس کا خواب تھا جس کے لیے وہ دن رات محنت کرتی تھی۔

برجستہ تھی۔ معاملہ فہم، موقع شناس، ذہین حساس، دردمند۔۔۔

گھر کے مرد، عورتوں سے بوقت ضرورت مخاطب ہونے کی فطرت رکھتے تھے۔ بس کام کی بات مگر ضوفی۔۔۔ سب کے بیچ خبریں سننے بیٹھ جایا کرتی تھی۔ جب سب مرد اسٹر ــــ حضرات کے جملوں کو صحیفہ سمجھ کر سرہلا رہے ہوتے۔۔۔ وہ بڑے مزے سے اونچی آواز میں انکار کر دیتی کہ نہیں یہ یہاں غلط کہہ رہا ہے۔ ایسے نہیں ایسے۔

اور اپنی رائے میں وہ اتنی دوٹوک ہوتی کہ بڑے حیرت زدہ رہ جاتے چونک پڑتے۔

سب نے دیر ہی سے سہی۔۔۔ بڑی مشکل ہی سے مگر جان لیا کہ وہ خاص الخاص بچی ہے اور بھلے خاندان میں کسی نے اعلا تعلیم حاصل نہیں کی۔۔۔ مگر وہ کرے گی اور بھلے سے پورے خاندان میں ایک بھی فرد ڈاکٹر نہ تھا، وہ ڈاکٹر بھی بن جائے گی۔ وہی ضوفی اب تاباں کے احمقانہ جملے کو کیسے ہضم کرتی۔ سو شروع ہو گئی۔

"تم تو پیچھے ہی پڑ گئیں میں نے تو صرف فلم کو پسند کیا تھا۔" تاباں ذرا شرمندہ خفا تھی۔

"تمہیں اپنی پسند ناپسند کا معیار بلند کرنا ہو گا۔" ضوفی نے قطعیت سے کہا۔

"حقیقت کی دنیا میں آنا ہو گا جہاں مشکلات ہیں۔ کٹھنائیاں ہر قدم پر پیچ۔۔۔ ناقابل یقین۔" مائدہ نے کہا اور ماجدہ نے سرہلایا۔

ہونہہ! اوڈی استانیاں۔" تاباں نے بے ساختہ کہا۔ تینوں کی ہنسی نکل گئی۔



"مجھے تین بار پتا چلا کہ آپ ملنے آئی تھیں مگر میں ہی گھر میں نہ تھی دراصل ہمارا تو کام ہی ایسا ہے کہ گھر سے باہر نکلے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔" آپا تسنیم نے معذرت خواہانہ انداز میں عذر رتایا۔

"کوئی بات نہیں ۔ میں جانتی ہوں۔" جاذبہ مسکرائیں۔ "تب ہی یہ پیغام دیا کہ آپ جب فرصت سے ہوں تو خود ہی چکر لگالیں۔ ورنہ کبھی تکلیف نہ دیتی۔"

"ارے آپ معذرت کیوں کرتی ہیں۔ میں نے کہا نا ہمارا تو کام ہی۔۔۔"

"وہ بات ٹھیک ہے۔" جاذبہ نے دھیمے مگر مہذب انداز میں آپا تسنیم کا جملہ کاٹا "مگر اچھے میل ملاپ کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ جسے کام ہو وہی پیش قدمی کرے۔" تسنیم ہنس پڑیں۔

"یہ آپ کی سوچ ہے اور ایسی باتوں ہی سے خاندانی لوگوں کا پتا چلتا ہے۔" جاذبہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے ہنس پڑیں۔ "یہ رول تو لیں۔۔۔ ابھی صبح ہی بنائے ہیں۔" جاذبہ نے کہنے کے ساتھ ہی رول پلیٹ میں ڈال دیے۔

"اب آپ مجھے بتا ہی دیں۔ کس لیے ملنے کی اتنی بے چینی تھی۔ سب خیریت ہے نا۔" جب بیٹ میں

ذرا گنجائش نہ رہی تب انہیں دھیان آگیا۔

جاذبہ دل سے مسکرائیں۔ "آپ کو کیوں بلایا جاتا ہے؟"

"آپ نے رشتے کے لیے؟" آپا حیرت سے ان کی صورت دیکھنے لگیں۔

"اس میں اتنی حیرانی کیوں؟ اللہ کے فضل سے ہم بھی ایک بیٹے کے والدین ہیں الحمد اللہ۔" جاذبہ کے چہرے پر تشکر پھیل گیا اور آنکھیں حسب معمول جھلملا گئیں۔

"مگر۔۔۔ وہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اٹھارہ انیس کا۔"

"بیس سال تین ماہ کا ہے۔ ماشاء اللہ سے۔۔۔"

جاذبہ منٹ اور سیکنڈ بھی بتانے والی تھیں۔

"ہاں' ہاں۔۔۔ ماشاء اللہ بیس برس کا ہے مگر رشتے کے حساب سے بہت چھوٹا ہے ابھی۔ آپ اتنی جلدی اور پھر آپ کا تو اپنا بھرا پرا خاندان ہے۔" جاذبہ کے بے حد مہذب لہجے نرم آواز مناسب جملوں کے آگے آپا تسنیم نے بھی اپنی حیرانی و تجسس کا اظہار سلیقے سے کیا۔

جاذبہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب سی گئیں۔

"آپ بھی سب کچھ جانتی ہی ہیں۔۔۔ کم عمری میں شادی ہوئی اور اتنی طویل بے اولادی کے بعد ملنے والا بچہ۔۔۔ بڑھاپے کی اولاد ہے۔ ہم دونوں ہی چھوٹے ہیں اپنے اپنے گھروں کے۔۔۔ ہمارے بہن بھائیوں نے تو بچوں کے بچے بھی بیاہ دیے۔ اب اول تو کہیں کوئی بچی ہے ہی نہیں۔ جو ایک دو ہیں۔ وہ عمر میں بڑی ہیں اور جو چھوٹی ہیں۔ ان کی ماؤں کا دور دور تک خیال ہی نہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر اکلوتا بیٹا ہے۔ ہر شے کا وارث۔۔۔ تو جس طرف سے نہ لوں وہی ناراض۔۔۔ بس اسی لیے۔۔۔ باہر سے لاؤں گی۔"

"یہ تو آپ نے بالکل صحیح کہا۔ مگر بائیس چوبیس برس تک کی لڑکیوں کو تو مائیں جوان مانتی ہی نہیں ہیں۔ رشتے کی تلاش کے لیے پچیس کے بعد بلواتی ہیں۔ پھر آگے جتنے مرضی سال لگیں۔"

آپا تسنیم نے چند جملوں میں حقیقت بیانی کی حد کر دی۔ ان کا صبح شام کا کام تھا۔

"لیکن اگر۔۔۔" آپا ہچکچائیں "آپ کو برا نہ لگے تو۔۔۔ اللہ خیر مگر اتنی جلدی کیوں؟"

"اس میں برا ماننے کی تو بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ بڑھاپے کی اولاد ہے یہ۔ اس کی پڑھائی اور کیریر کا انتظار کریں تو۔۔۔ ڈرتے ہیں عمر مہلت دے نہ دے۔ جب سے سلطان ہارٹ پیشنٹ ہوئے ہیں۔ ہر گزرے دن کو بونس سمجھتے ہیں اور پھر بہو آئے گی تو رونق ہوگی۔ ایک نیا بندہ۔۔۔ آگے پھر اللہ رب العزت کا کرم ہو تو سارا آنگن بھر جائے گا۔ بڑا خوب صورت خواب بنا ہے آپا۔۔۔ بس آگے جو اللہ کا حکم اور آپ کی محنت۔۔۔"

جاذبہ کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ آپا تسنیم کا سر بھی زور زور سے ہل رہا تھا۔

"بہت ہی اچھا ارادہ ہے۔۔۔ میں بس کل ہی سے شروع کرتی ہوں۔"

"بس اب میرا بیٹا بھی آپ کی ذمہ داری ہوا۔ پھر میں ہو جاؤں ناں بے فکر۔۔۔ آپ کے کرائے رشتے ماشاء اللہ۔۔۔"

"میں کیا اور میری بساط کیا۔۔۔ بس اللہ نے عزت بنا کر رکھی ہے۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔" آپا تسنیم عاجزی سے دہری ہو گئیں۔

"ہاں مگر آپ نے اپنی شرائط نہیں بتائیں اور تصویر بھی۔"

"تصویریں میں آپ کو ابھی دے دیتی ہوں اور شرائط کیا ہوتی ہے۔ عمر بیس تک چلے گی اوپر نہ ہو۔۔۔ کوئی دولت دربان اور شاہی نہیں چاہیے بس عزت دار ہمارے جیسے لوگ۔۔۔ ذات کی قید نہیں۔۔۔ مگر مراثی تیلی نہ ہوں۔ بس بچی ہو معصوم اور خوب صورت۔۔۔ میرے بیٹے کے ساتھ کھڑی جچے۔ اب ایک ہی بہو تو لانی ہے میں نے۔۔۔ بیٹا تو آپ نے دیکھ ہی رکھا ہے۔ شریف ہے۔ مغرب کے بعد کبھی گھر سے باہر نہیں رہا۔ پڑھتا ہے۔ لڑکی پڑھنا چاہے تو کھلی چھوٹ ہوگی۔ اور رہا کیریر۔۔۔ ہمارا سب کچھ اسی کا تو ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھی بھیج سکتے ہیں۔ کوئی معاشی تنگی ہو۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ان شاء اللہ میں جلد آپ کو خوشخبری دوں گی۔"

آپا تسنیم کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کھڑکی بند کرنا پسند نہیں کرتی تھی مگر بارش کے بعد شام بے حد ٹھنڈی تھی۔ ٹھٹھرا دینے والی۔۔۔ آج رات بہت جلدی آگئی تھی۔ روڈ خالی ہو گیا تھا۔ بعض اوقات لگتا ہوا کے اندر برفیلی ٹکڑیاں ہیں جو جسم پر سوئیوں کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔

گرم کپڑے بھی ناکافی محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے گرم شال اپنے گرد لپیٹی۔ ہیٹر کی گرمائش کمرے کا موسم بدل رہی تھی مگر پھر بھی لگا کہ نجانے کن کن درزوں سے ہوا اندر گھس رہی تھی۔

وہ یونہی شبہ دور کرنے کو کھڑکی تک آئی۔ پردے برابر تھے اور کھڑکی مضبوطی سے بند تھی۔ وہ سردی سے پھریری کھا گئی۔ جتنی جلدی گرم لحاف میں گھسا جائے۔ وہی بہتر۔۔۔ وہ پلٹی مگر پلٹتے پلٹتے ٹھٹکی۔ اسے ایک خیال آیا' جسے اس نے جھٹکا مگر پھر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے' سوچ کر اس نے اپنی ناک ٹھنڈے یخ شیشے سے چپکا دی۔

"اوہ نو۔۔۔!" سردی کی جھرجھری سے زیادہ اس بار وہ خوف سے کانپی تھی۔

وہی لڑکا بڑے مگن انداز میں اس کے گھر کو دیکھ رہا تھا۔ بلکہ اس کی اسی کھڑکی کو۔۔۔ وہ کبھی ٹہلنے لگتا اور اب جب یکدم رکا تو اسے بھی اس کا ٹھٹک کر رکنا محسوس ہو گیا۔

یقیناً" وہ شیشے میں اس کا عکس دیکھ چکا تھا۔ اب اس کی نظریں جیسے اس جانب چپک گئی تھیں۔ وہ سردی کا سارا احساس فراموش کر کے جیسے جم گئی۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔

پھر سر جھٹک کر سیدھا چلنے لگے گا۔ اس نے پلٹ کر ایک بار بھی پیچھے نہیں دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

جاذبہ اور آپا تسنیم صوفے پر برابر بیٹھی تھیں۔ درمیان میں آپا تسنیم کا کھلا بڑا بیگ تھا۔ حسب معمول چند البمز کھلے تھے۔ سامنے میز پر دھری چائے کے اوپر براؤن سی تہ جم چکی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ بہت دیر سے رکھی تھی مگر معاملہ اتنا گمبھیر تھا کہ انہیں دھیان ہی نہ تھا۔

جاذب سلطان نے اندر داخل ہوتے ہی صورت حال کو بھانپ لیا تھا۔ جاذبہ کے ہونٹ گولائی میں سکڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی بھینچی ہوئی۔۔۔ آنکھوں میں مایوسی سی۔۔۔

آپا تسنیم کا انداز الجھن آمیز پھر تسلی دیتا ہوا ہو جاتا۔ یعنی گاڑی وہیں کھڑی تھی۔ جہاں سے چلی تھی۔ چھ ماہ ہونے کو آئے تھے مگر جاذبہ کو گوہر مقصود نہ ملا تھا۔

"آپ تو کہہ رہی تھیں بے عیب رشتہ ہے۔ چٹ پٹ ہو جائے گا۔" جاذبہ نے مایوسی و بے زاری سے البم کو پرے سرکاتے ہوئے ٹھنڈی چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا۔ پھر بے حد بدمزا ہو کر کپ کو گھورنے لگیں۔

"بالکل کہہ رہی تھی بلکہ اب بھی کہہ رہی ہوں۔ مگر کہنا آپ کے کوائف کے حوالے سے تھا۔ لڑکی ڈھونڈنے میں تو ٹائم لگتا ہے ہی۔" آپا نے سبھاؤ سے کہا۔

"کیا ٹائم۔۔۔؟ ہر گھر میں لڑکیوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ ایک میرے ہی بیٹے کے لیے نہیں۔"

"یہی تو اصل مسئلہ ہے۔ ڈھیر اتنا اوپر تک چڑھا ہے کہ نیچے والوں پر نظر جاتی ہی نہیں۔ اب اٹھارہ بیس برس تک کی لڑکی بچی بچی گڑیا کھیلتی ہی لگتی ہے۔ جب تیس پینتیس برس کی آپا' باجی گھر میں بیٹھی ہوں۔ ہمیں ان ہی کے رشتوں کے لیے بلوایا جاتا ہے۔ اگر میں کوئی لڑکی پسند آجانے پر آواز منہ سے نکال بھی لوں

توچوٹی سے پکڑ کر باہر کردیں گی کہ دس پندرہ سال بڑیوں کو چھوڑ کر چھوٹی کا نام بھی کیسے لیا۔ بلکہ سوچا بھی کیوں۔" آپا تسنیم نے تلخ لہجے میں تلخ بیانی کی انتہا کر دی۔

"مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔ آپ کی فیلڈ کے اندر اتنی پنچائیت ہے!" جاذب اتنی دیر سے گویا سانس روکے سن رہا تھا۔ جیسے ہی آپا رکیں۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

آپا ہنس پڑیں اور بیٹے کے چہرے کے تاثرات نے جاذبہ کے ہونٹوں پر مسکان بکھیر دی۔

"دنیا کا کوئی کام آسان نہیں..... محنت طلب، صبر انتظار۔" جاذبہ نے دھیرے سے کہا۔

"ارے میری ماں..... اتنی دل گیر زخمی مسکراہٹ" وہ تیزی سے اٹھا اور ماں کی پشت پر کھڑے ہو کر دونوں بازو ان کے شانوں کے گرد لپیٹ کر تیزی سے گالوں کے بوسے لیے۔ جاذبہ نے بھی ذرا سی گردن گھما کر اس کے بال چوم لیے۔ آگے آتے ہاتھوں کا بوسہ لے لیا۔

آپا کے چہرے پر بھی مسکان بکھر گئی۔

"خوامخواہ میں آپ نے یہ ٹینشن پالی۔ اچھی بھلی ہماری زندگی میں اب صبح و شام ایک ان دیکھی انجانی لڑکی کا ذکر رہنے لگا ہے۔ اور کوئی کام کرنے کو ہے ہی نہیں....."

"اور تم خوش ہوتے ہو..... کہ چلو جی جان چھوٹی" جاذبہ نے روٹھے پن سے کہا۔

"کہاں ماں..... میں کہاں خوش..... آپ فکر مند ہوں اور میں بے فکر..... ایسا کبھی ہوا ہے۔" وہ اچنبھے سے پوچھنے لگا۔ "میں دماغ ہوں تو آپ سوچ..... میں دل ہوں تو آپ دھڑکن..... میں کان ہوں تو آپ سماعت..... میں۔"

"بس کرو..... میں میں کی تکرار!" جاذبہ ہنسیں "اور جاؤ دو کپ چائے بنا کر لادو، میرا سر دکھ گیا ہے۔ ڈھونڈ ہی لوں گی میں بہو..... جلدی نہ سہی تھوڑا دیر ہی..... بلکہ اچھا ناں ہوا تسنیم آپا! میں نے ابھی سے یہ کام شروع کرلیا..... ہے ناں؟" آپا نے زور زور سے سر ہلایا۔

"آپا ہی کے سر پر سارا بوجھ کیوں ڈالتی ہیں۔ اب تو میں بھی جہاں لڑکیاں نظر آتی ہیں رک جاتا ہوں۔ غور سے دیکھتا ہوں لیکن اس سے پہلے کہ نتیجے پر پہنچوں وہ مجھے غور سے دیکھنے لگتی ہیں پھر مجھے اندازہ ہوتا ہے وہ غور سے نہیں گھور کے دیکھ رہی ہیں، سو میں جائزہ ادھورا چھوڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہوں۔ دراصل میں نے اندازہ لگایا ہے۔ لڑکیاں انتہائی بے اعتباری قوم ہیں۔ یہ دکھتی کچھ ہیں اور دکھاتی کچھ ہیں۔ آپ کو لگے گا یہ اپنے پیروں کی پائل دکھا رہی ہیں چھن چھن مگر حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ لمبی ہیل..... بندے کو خبر تب ہوتی ہے جب وہ سر پر برس رہی ہوتی ہے تابڑ توڑ۔"

"جاذب کے بچے..... ادھر آؤ ذرا سامنے۔" جاذبہ تو حق دق ہی رہ گئیں۔

بازو پکڑ کر کھینچا اور اپنے سامنے پڑی میز پر دھکیلنے کے انداز میں جبراً" بٹھایا۔ "میں تو تمہیں بڑا شریف سمجھتی تھی اور تم لڑکیاں دیکھتے ہو۔"

"وہ بھی اتنے غور سے....." آپا کی آواز میں ہنسی تھی۔

"تو وہ تو آپ لوگ بھی تو دیکھتی ہیں۔ ہر روز ہی دیکھ رہی ہیں۔" وہ ترنت بولا۔

"تو وہ تو ہم بہو تلاش کر رہے ہیں۔" جاذبہ نے سر پیٹا۔

"تو میں بھی تو بہو ہی تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اس نے ان ہی کے لہجے میں کہا "آپ کے لیے۔"

"رہنے دو تم..... کسی دن پٹ پٹا کر آجاؤ گے۔ جس کا کام اسی کو ساجھے۔" آپا نے کہا۔

"بس اسی بات سے میں ڈر جاتا ہوں..... اپنی غیرت بہت پیاری ہے بھئی!"

"اور جان بھی....." جاذبہ نے ماتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر ٹکڑا لگایا۔ ان کا بیٹا خاموش طبع تھا۔ انہیں ہنسانے اور ان کا دل لگانے کے لیے ان کے ساتھ لگا رہتا۔ باتیں کرتا ہنستا مگر اس کا جزوی تاثر خود میں گم اردگرد سے بیگانہ لڑکے کا تھا۔ یا یہ شاید جاذبہ کے ہاتھوں دی گئی تربیت کا اثر تھا۔ بڑھاپے کی اولاد..... وہ اسے پل بھر کے لیے خود سے دور نہ کرتی تھیں۔ ان کے لیے وہ سب کچھ تھا اور اس کے لیے ماں باپ اور گھر کی چار دیواری.....

وہ اسے گھر سے باہر بھی بہت ردو کد کے بعد جانے دیتیں۔ بس چلتا تو ساتھ چل پڑیں۔ اس کے دوستوں کے لیے جو کہ چند ایک ہی تھے گھر میں بہترین اہتمام کرتیں کہ وہ خود ہی آئیں اور اندر رہنے پر ہی ترجیح دیں۔

دوستوں کے گروپ میں بھی وہ خاموش رہتا تھا مگر خوش رہتا تھا۔ دوست بھی کیسے اوٹ پٹانگ، شوخے وہ ان کے بہت سارے جملوں میں ٹکڑے لگاتا تھا مگر کبھی چپڑ چپڑ بولا نہیں، خاندان میں بھی رشتوں کا ڈھیر تھا ساسی، چاچی، تائی وغیرہ وغیرہ..... وہ ان سے سلام دعا سے آگے نہ بڑھتا۔ ہاں بس ماں کے آگے جوہر کھلتے تھے۔ اب اگلے جملے نے جاذبہ کے ہوش اڑا دیے۔

"لکی کہتا ہے حسینوں سے پٹنے میں یا ان کے باپ بھائیوں کے ہاتھوں گھونسے مکے کھانا اور پھر پتھر گرم کر کے سکائی کرنا، جوانی کی کتاب کا بہت سنہرا باب ہوتا ہے۔"

جاذبہ کا ہاتھ بے یقینی سے ہونٹوں پر جا رکا..... ان کا سیدھا شریف بیٹا اور ایسے اقوال زریں۔

"میں نہیں کہتا ماں..... لکی کہتا ہے۔"

"اور یہ بھی کہ جوانی کی غلطیاں بڑھاپے کی ہوشمندی کی ضمانت ہوتی ہیں۔ جوانی میں آپ جس قدر جی بھر کے ذلیل ہوں گے بڑھاپے میں اتنے ہی متقی اور پرہیز گار بن کے ابھریں گے۔"

"ہائیں!" اس بار تسنیم آپا کی بھی آنکھیں ابلیں۔

"میں نہیں کہتا۔" اس نے زور زور سے نفی میں گردن ہلائی۔ "لکی ہی کہتا ہے۔" اس نے ہاتھ جھاڑ کے اپنی صفائی دی۔

"لکی ایسی باتیں کرتا ہے۔ میں تو اسے بہت شریف بچہ سمجھتی تھی۔ ہر سال پورے اسکول میں ٹاپ کرتا رہا ہے۔" جاذبہ خود کو بھی بتا رہی تھیں اور آپا کو بھی..... "تم آج کے بعد لکی جیسے لڑکوں سے قطعاً" نہ ملنا جاذب.....!" جاذبہ نے سہمے لہجے میں تادیب کی۔

"صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے بیٹے....." آپا نے بھی تائیداً" کہا۔

"اوکے.....!" جاذب نے مصالحانہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ "تو نتیجہ یہ نکلا کہ میں آپ کی بہو تلاش مہم کا حصہ نہ بنوں..... تو ٹھیک ہے میں آج کے بعد کسی کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔"

"ویسے..... وہاں لینگویج کلاس میں تو تمہاری ہم عمر لڑکیاں ہی آتی ہوں گی۔ کبھی کوئی لگی اچھی.....؟" جاذبہ نے کچھ چونک کر پوچھا۔

"آتی ہیں، بہت آتی ہیں چھوٹی بڑی سب آتی ہیں امی..... اچھی بری سب..... مگر میں لڑکیوں کو نہیں دیکھتا کبھی بھی..... لڑکیوں کی عزت ہوتی ہے تو کیا لڑکوں کی نہیں ہوتی؟ کوئی کیوں کہے یا سوچے کہ جاذب سلطان ایسا ویسا لڑکا ہے۔ کتنی انسلٹنگ بات ہوگی کہ میرے دیکھنے یا گھورنے سے لڑکیاں ان ایزی ہوں یا اس راستے سے گزرنا چھوڑ دیں جہاں میں کھڑا ہوں یا اپنے دوپٹے وغیرہ درست کرنے لگیں۔ ویری بیڈ۔"

جاذبہ اور آپا تسنیم مبہوت ہو کر اس کے سیدھے صاف جملے سن رہی تھیں۔ یہ اس کی اعلیٰ سوچ ہی تھی، جو چہرے پر پاکیزگی نور بن کر جھلکتی تھی۔ اس کے ہونٹ اور آنکھیں کسی معصوم بچے کی سی دکھائی دے رہی تھیں۔

جاذبہ بے خودی کی انتہا پر جا پہنچی تھیں۔ آگے بڑھ کر اس کا سلکی بالوں والا سر چوم لیا۔ خود سے لپٹا لیا۔

آپا تسنیم کی آنکھوں میں ستائش ہی ستائش تھی۔ رشک پیار عزت..... اولاد انعام کی طرح ہوتی ہے۔ انہیں یقین ہوا۔

"اور دوسرے لڑکیاں.....!" اس نے لڑکیاں کو

کھینچا۔ ”انتہائی احمق مخلوق ۔۔۔ قربانی کی گائے کی طرح ہروقت تیار شیار رہتی ہیں۔ وہ مہندی تو اتارتی ہی نہیں ۔۔۔ اور کاجل اتنا ڈھیر ۔۔۔ اتنا ہنستی ہیں کہ انجان بندہ سمجھے لینگویج سینٹر نہیں پاگل خانہ ہے۔“

”اور ابھی یہ کہہ رہا تھا۔ لڑکیوں کو دیکھتا تک نہیں۔“

جاذبہ نے آپا تسنیم کو دیکھا۔ وہ بھی ہنس پڑیں۔

”ہاں تو بالکل نہیں دیکھتا۔ اب ہمارے ٹیچر بہت تیز ہاتھوں سے بلیک بورڈ پر لکھتے ہیں اور بولتے بھی تیزی سے ہیں۔ سب کو تیز تیز ہاتھ چلانے پڑتے ہیں کہ کوئی ورڈ مس نہ ہو جائے۔ اس کلاس میں یہ لڑکیاں جب تیز تیز لکھنے لگتی ہیں تو ہاتھوں کے چھلے گھنگرو چوڑیاں کڑے سب بجنے لگتے ہیں۔ ایک منٹ کے لیے آنکھیں بند کرکے فیل کرو تو ۔۔۔ بس چھن چھن ۔۔۔ چھن چھن اور کن کی آواز ہوتی ہیں۔ ذرا سا سر ہلائیں تو بندے بجتے ہیں۔ بالوں کے کلپ اور پنیں بھی بجنے والی خریدتی ہیں۔ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

جاذبہ اور آپا تسنیم ہنستے ہنستے دہری ہو گئیں۔

”اتنی بے زاری لڑکیوں سے؟“

”بات بے زاری کی نہیں ہے۔ ان کے اردگرد بجنے والی اتنی چیزیں ہوتی ہیں کہ حد نہیں۔ لمبے ناخن، ہیل والے جوتے یہ سب نہ ہوں تو لڑکیوں سے اچھی مخلوق دوسری کوئی ہے نہیں۔ دراصل پھول کے ساتھ کانٹے ہوتے ہی ہیں۔“

جاذب بات مکمل کرکے چائے اٹھاتے ہوئے جانے لگا۔ ماں اور آپا کا کھلا منہ دیکھا۔

”میں نہیں کہتا ۔۔۔ لکی کہتا ہے ماں ۔۔۔!“ اس نے دہائی دینے کے انداز میں ماں کہا۔

جاذبہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ دھمکاتے لہجے میں بولیں۔

”اس لکی کی کلاس میں خود لوں گی۔ اس کے اقوال پر ایک کتاب مرتب کر ہی لوں۔“ جاذب زور سے ہنس دیا۔

☼ ☼ ☼

خط کے اندر کوئی لفاظی نہیں تھی۔ نہ گھٹیا پن نہ حسن و عشق کے قصیدے ۔۔۔ بس اک نظر دیکھ لینے کی خواہش ۔۔۔ ساتھ کی تمنا ۔۔۔ اک تحیر تھا کہ وہ اس کے عشق میں اتنا غرق ہو چکا ہے کہ موت ٹھوڑی کے پاس آکر رک گئی ہے۔ کوئی پل جاتا ہے کہ پانی ہونٹوں اور ناک سے گزر کر ترسی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے شانت کر دیے ۔۔۔ وہی ہاتھ دے تو دے ۔۔۔ ورنہ اور کوئی آسرا تو زندگی کی طرف لانے کی قدرت رکھتا ہی نہیں ۔۔۔

کتنے دنوں سے چند حرفی رقعے بازی جاری تھی۔ پہلے وہ خوفزدہ چوکنی ہرنی کی طرح گزرا کرتی تھی اب متجسس نگاہیں ۔۔۔ قدموں کی رفتار کی بیڑی بن گئی تھیں۔ وہ ہر شخص میں اس کو ڈھونڈتی ۔۔۔ مگر کوئی چہرہ ایسا نہ لگتا کہ جو ان جملوں کے ساتھ جچ جاتا۔

اس سحر انگیز تحریر کا مالک عام ہو ہی نہیں سکتا۔

وہ چاٹ نما مال والے لڑکے کے پاس سے گزرتی تو قدم ڈھیلے پڑ جاتے اور وہ بھی اتنا حضرت تھا۔ نہ مسکرا کر دیکھتا تھا نہ شناسائی سے ۔۔۔ اسے متوجہ دیکھ کر وہ خوش ہو جاتا۔

”یہ لو ناں باجی ۔۔۔ یہ بالوں کی رنگین پنیں ’زنگ نہیں لگتا اور یہ سیفٹی پن برقعے پر لگانے کے لیے۔“

وہ اس کی بڑھائی چیزوں کو غائب دماغی سے چھوتی ۔۔۔ اور اس کی آنکھوں میں جھانکتی مگر وہ پھر سے معصوم بچہ بن جاتا۔ وہ کچھ نہ لیتی تو جھٹ لڑکیوں کے دوسرے ریلے کی جانب متوجہ ہو جاتا۔

وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کون ہے وہ جو اسے رقعے دیتا ہے؟

وہ کم عمر تھی اور دنیا کو اتنا نہیں دیکھ رکھا تھا کہ چہرہ شناسی کا دعویٰ کرتی یا کہتی کہ اسے سب خبر ہے۔ دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ اور کیا کیا کرتے ہیں۔ مگر وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ اس طرح کے پیغام رساں بچے کتنے طرار ہوتے ہیں۔ آنکھیں مٹکاتے ہیں۔ وقت سے

پہلے ذہنی لحاظ سے بڑے ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات ایک بلیک میلر بن کر ابھرتے ہیں مگر یہ بچہ ۔۔۔ بالکل مختلف تھا۔ وہ رقعہ دیتے وقت رازداری اور احتیاط پسندی کا مظاہرہ کرتا تھا اور بعد میں یوں ہو جاتا جیسے کچھ نہیں جانتا ۔۔۔ کچھ ہوا ہی نہیں ۔۔۔

خط کا مالک بہت خاص ۔۔۔ خط کے الفاظ انمول ۔۔۔ اور پیغامبر بھی سب سے الگ وہ پہروں سوچتی۔ ہر پہلو کا جائزہ لیتی مگر یہ خیال ایک بار بھی نہ آیا کہ وہ خود بھی تو کتنی خاص ہے ۔۔۔ یا ہو چکی ہے کسی کی نگاہ میں؟ کیوں کب کیسے؟

☼ ☼ ☼

”انسان محبت کھو دے تو یوں ہوتا ہے جیسے اپنے آپ کو کھو دیا ہو اور محبت کو پالے تو جیسے اپنے آپ کو پا لیا۔“

سیاہ لبادے میں سر تاپا ڈھلکی کتنی ہی لڑکیاں روز میرے سامنے سے گزرتی ہیں۔ مگر پتا نہیں تمہیں کیسے پہچان لیتا ہوں۔ تم ابھی بہت دور ہی ہوتی ہو مگر میری گردن خود بخود تمہاری جانب گھوم جاتی ہے۔ اس بے اختیاری کو کیا نام دوں؟

اپنی حالت خود اپنے لیے انکشاف ہے کہ یوں بھی ہو سکتا ہے؟

عذاب ہے۔ کب تک جھیلوں ۔۔۔ اور کیسے؟

ثواب ہے۔ اتنا محو ہو جاتا ہوں کہ دنیا کے ہر جھمیلے سے آزاد ہو کر بس تم ہی کو سوچتا ہوں۔

اور تم ہو کیا؟ ایک ساکت شبیہہ ۔۔۔

کبھی ایمان لگتی ہو ۔۔۔ کہ دل ایک انچ سرکنے کو تیار نہیں۔

کبھی گناہ لگتی ہو ۔۔۔ کہ لذت ہی لذت کوئی نصیحت اثر نہیں کرتی کہ راہ راست ملے۔

کیا میرے یہ رقعے تمہارے لیے باعث اذیت ہیں الجھن ہیں؟ کیا تم پریشان ہو جاتی ہو۔ مگر کاش میں تمہیں بتا سکتا۔ اذیت کیا ہوتی ہے۔ الجھن کیسی ہوتی ہے اور پریشانی ۔۔۔

مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں اس طرح منہ کے بل گروں گا۔

اگر میرے ۔۔۔

آگے ورق سادہ تھا۔ اس نے کتنی ہی بار ان الفاظ و جملوں کو پڑھا تھا۔ جو اپنے فہم کی حد سے بہت اونچے لگتے تھے۔

یہ کون تھا؟ وہ پہلی بار خوفزدہ ہو گئی اور پہلی بار کی بات ۔۔۔ رقعہ بازی کے اس سلسلے نے اسے اول روز سے اب تک حیران کیا تھا یا پریشان ۔۔۔ گدگدی ۔۔۔ سنسنی ۔۔۔ ایسا کوئی عنصر تو دور تک تھا ہی نہیں۔

”یہ کون تھا اور ساکت شبیہہ کا کیا مطلب؟“

وہ کسے کرے اس راز میں شریک ۔۔۔ کس سے رائے مانگے۔

کیا کوئی اسے بے وقوف بنا رہا تھا۔ آزما رہا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔

”میں چھپا ہوا نہیں ہوں ۔۔۔ تم کہو تو ابھی سامنے آجاؤں ۔۔۔ مگر میں چاہتا ہوں تم میرے وجود قد کاٹھ ۔۔۔ عمر آواز شکل و صورت کے تناظر میں میرے حق میں فیصلہ کرنے کے بجائے میرے دل کو دیکھو ۔۔۔ جو تمہاری محبت سے سرشار ہے۔

ہو سکتا ہے تم دیکھتے ہی پسندیدگی کی سند دے دو۔ یا مسترد کر دو ۔۔۔ مگر میں تمہیں خود کو سمجھانا چاہتا ہوں۔

تم ایک بار کہہ دو گی تو میں انکار نہیں کروں گا سامنے آجاؤں گا ۔۔۔ مگر ۔۔۔“

اس نے ایک اور چرمر رقعے کی تہہ کھول کر اسے نجانے کتنی بار پڑھا۔ کوئی شاعر ۔۔۔ یا جنونی ۔۔۔ لیکن اس نے اسے کہاں دیکھ لیا۔ وہ تو عرصہ دراز سے جسم اور چہرہ ڈھانپ کر باہر نکلا کرتی تھی پھر ۔۔۔ اس کا استعجاب خوف کے نئے رنگ میں ڈھلتا۔

کیا وہ کہے اس شخص سے کہ وہ اسے دیکھنا چاہتی ہے؟

مگر ۔۔۔ پھر اس کے بعد کیا کرے گی۔ اسے پاس کر دے گی تو کیا حاصل ہو گا ۔۔۔ یا اسے فیل کر دے گی؟

اسے احساس نہ ہوا لفظ فیل پر اس کا دل سکڑ کر پھر دوبارہ بمشکل دھڑکا تھا۔

اپنی حیران کن اور خوفزدہ کیفیات سے بہت پرے ایک بے حد عام سا احساس یہ بھی تھا کہ کوئی اسے اس طرح مخاطب کرتا ہے۔ وہ اس احساس کو اوپر آنے نہیں دیتی تھی مگر یہ احساس تہہ ہی میں کہیں موجود ضرور تھا کہ اسے ہی کیوں.....

اس نے سن رکھا تھا خوب صورت لڑکیوں پر جن عاشق ہو جاتے ہیں۔ پرچھاوے اور بد روحیں.....

لیکن..... اگلے ہی پل دل نے سختی سے تردید کی۔ یہ روح اسے بد تو ہرگز نہ لگتی تھی۔ مگر کیا ایسے نظر نہ آنے والے عاشق خط لکھتے ہیں؟

مگر! اسے نیا خیال سوجھا۔ جن لڑکیوں پر ایسے سائے ہوتے ہیں وہ تو پھر پاگل ہو جاتی ہیں۔ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی ہیں۔ دورے پڑتے ہیں انہیں.....

ہاں تو سچ ہے ناں..... اگر کچھ عرصے تک یہی صورت حال رہی تو وہ کون سا ہوش مند رہے گی؟

اسے کسی نہ کسی کو تو اس راز میں شریک کرنا ہی ہو گا۔

مگر کس کو.....

☼ ☼ ☼

شدید گرمی اوپر سے لوڈشیڈنگ..... ساری نیند کا مزا خراب ہو گیا تھا۔ تاباں کو کمرا بند کر کے پردے گرا کر سونے کی عادت تھی۔ اب کھڑکیاں کھول کر من پسند ماحول بنانے کی تگ و دو میں نیند نجانے کہاں غائب ہو گئی۔ پنکھے کی گھرر گھرر گویا لوری تھی۔ بے جان پروں کو چند لمحے گھورنے کے بعد وہ بستر سے اٹھ آئی۔ سونے کی کوشش کرنا درحقیقت سر درد بن کر ابھرتا۔ دوسرے کچن سے آتی چائے کی مہک..... اس کے اونگھتے بے زار اعصاب بیدار ہو گئے۔

گرمی کو گرمی کاٹے گی..... جیسے لوہے کو لوہا..... اسے یاد آیا۔

دونوں ہاتھوں کو کچن سلیب پر جمائے آگ کے شعلوں کو گھورتی مائدہ صرف جسمانی طور پر حاضر تھی۔ چائے ابل رہی تھی مگر مائدہ کے دھیان کا پنچھی کسی اور جہاں کی اڑان کو لگا تھا۔ اس کی بلا سے چائے اب چھلکے کہ تب.....

ٹرے میں سموسوں کی پلیٹ تھی۔ ساتھ بسکٹ اور کیچپ..... اس کڑی دوپہر میں ایسی کون سی آفت پڑی تھی کہ مائدہ اپنی چائے کے لیے ایسا انتظام کرتی۔ یقیناً کوئی مہمان.....

"مہمان چائے پئیں گے یا امی لوگوں نے کاڑھا بنانے کی فرمائش کر دی ہے۔" تاباں نے آگے بڑھ کر چولہا بند کیا اور ساتھ ہی مائدہ کو لتاڑا۔

"آں..... ہاں..... وہ۔" مائدہ نے اسے دیکھا۔ چائے کو دیکھا پھر جیسے بے تاثر چہرے سے اسے دیکھنے لگی کہ اس نے کیا کہا ہے۔ وہ سن نہیں پائی۔

"کچھ نہیں کہا میں نے..... کون آیا ہے؟" تاباں نے ایک سموسہ اڑانے کے لیے پلیٹ اٹھائی کہ بعد میں ملے نہ ملے۔

"اور یہ تمہیں کیا ہوا ہے۔ سوچنے کے لیے یہ کون سی جگہ اور کون سا وقت ہے بھئی۔"

"نہیں کچھ نہیں..... بس یونہی!" مائدہ نے چہرے سے سوچ کی کئی آڑی ترچھی بدرنگ تحریر مٹانے کی سعی میں لہجہ بے ضرر سا بنایا۔

"نہ بتاؤ....." تاباں نے شانے اچکائے "مگر ایسا ہے کہ....." تاباں کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ ایک قہقہہ کان سے ٹکرایا۔

"اچھا تو..... وو۔" اس نے تو کو حتی الامکان کھینچا۔ "کیا تمہارے رشتے والے آئے ہیں اس شکر دوپہرے....." مائدہ نے سر نفی میں ہلایا۔

"اچھا..... اچھا۔" تاباں نے دوبارہ ایک ٹرے کے اہتمام کو دیکھا۔ رشتے والوں کے لیے تو امی وغیرہ ٹرالیوں کی ساری منزلیں بھر دیا کرتی تھیں۔

"رشتے والے نہیں آئے ہوں گے..... رشتے والی آنٹی آئی ہوں گی۔ وہی ہیں جو کہیں بھی، کسی بھی وقت پہنچ سکتی ہیں کسی نیوز رپورٹر کی طرح۔" تاباں نے صحیح سمت میں سوچا۔

"مگر تم صم بکم کیوں تھیں؟"

مائدہ نے نفی میں سر ہلایا اور چائے کپوں میں انڈیلنے لگی۔ تاباں نے بھی زور نہ دیا۔ وہ چائے لے کر خود ہی جائے گی اور سب پتا لگا لے گی۔

"لاکھ سن لیں..... مدح سرائی..... سارا جہان ایک آواز ہو کر چیخے مگر یقین تو دیکھ کر ہی آتا ہے ناں....."

آپا تسنیم کے لہجے میں خفگی تھی اور جو وہ کہہ رہی تھیں۔ وہ تاباں کو فوراً" سیاق و سباق کے ساتھ سمجھ میں آگیا۔ پھر وہی قصہ..... گھر کی تینوں سرکردہ خواتین موجود تھیں۔

گھر کی روایت کے عین مطابق اسے ٹرے رکھ کر پلٹ جانا چاہیے تھا۔ مگر پلٹ جاتی تو سب سن نہ پاتی۔ لہٰذا..... ایک فوری حکمت عملی کے تحت..... اس نے سلام کے بعد ٹرے رکھی۔ آواز قصداً بھاری کر چکی تھی۔ ساتھ ہی ناک سکوڑی۔

امی نے چونک کر اسے دیکھا۔ قدموں کی چاپ پر وہ مدھم تو پہلے ہی ہو چکی تھیں۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

تاباں نے کسلمندی سے بالوں میں ہاتھ پھیرے "میرے سر میں درد ہے اور گلے اور ناک میں بھی..... مجھے لگتا ہے مجھے بخار چڑھ رہا ہے یا میرا بی پی ہائی ہے..... یا پھر لو ہے، پتا نہیں چلتا۔"

"تو گولی لے لینی تھی، جا کر لیٹ جاؤ..... آرام ملے گا۔"

"کہاں لیٹوں۔ کامن میں ایک سنگل صوفہ بھی خالی نہیں ہے۔ میں آپ کی گود میں سر رکھ لوں تائی امی.....!"

اس نے سخت جھنجلائے لہجے میں کہتے ہوئے ساتھ ہی تائی کی گود میں سر رکھ دیا۔ ساتھ ہی ہلکی کراہ..... تھوڑا ہلی جلی جیسے سخت بے آرام ہو..... ناک بھی سکوڑی۔ پھر ذرا سا کسمساتے ہوئے اس نے گود میں سر رکھ کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا..... اب وہ ساکت اور پرسکون تھی۔ جیسے غافل ہو رہی تھی۔

امی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے آپا کو اشارہ کیا کہ وہ چائے لیں۔

آپا نے اس گھر کی سب سے خوب صورت، نازک سی لڑکی کو ٹھنڈی سانس بھر کر دیکھا۔ بیٹوں کی مائیں..... واضح الفاظ میں یا ڈھانپ ڈھونپ کر جس چاند کے ٹکڑے کی تلاش کا ذمہ انہیں سونپ دیا کرتی تھیں۔

تاباں مجاہد ہو بہو وہی ٹکڑا تھی جو بہنوں کے ارمانوں، ماؤں کے خوابوں اور لڑکوں کے دلوں میں دھڑکتا ہے مگر کیا فائدہ..... اتنی ڈیمانڈ والی لڑکی ان کے لیے ایک لحاظ سے بے کار ہی تھی۔

وہ بدمزا ہو کر چائے کی جانب متوجہ ہوئیں۔

آپا تسنیم کا انداز البتہ خفگی بھرا تھا۔ وہ بھی سچ بات ہے۔ عاجز آ چکی تھیں چکر لگا لگا کر۔ بھلے سے انہیں ہر بار پیسے ملتے تھے۔ مگر خالی خولی چکر..... بے نتیجہ۔ ہاں کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا رشتہ بھی لے آتیں جو نا معلوم کس وجہ سے آگے نہیں بڑھ پاتا تھا۔

چائے کے آخری گھونٹ ذرا تیزی سے حلق سے اتار کر اب وہ رخصت چاہتی تھیں۔ اپنا موبائل پرس میں ٹھونستے ہوئے وہ خفا نظر آتی تھیں۔ امی نے اپنے بٹوے سے ایک نوٹ نکال کر کرائے کے لیے دیا اور ساتھ ہی اپنے گاؤں سے آئے آموں کا ایک بڑا شاپر آگے بڑھایا۔ مگر آپا کے انداز نہ بدلے۔ تائی کے شاپر کی جانب اشارہ کرنے پر وہ جو اٹھنے کو کھڑی ہو رہی تھیں۔ ٹھنڈی سانس بھر کے دوبارہ بیٹھ گئیں۔

"میرے لیے کیا مشکل ہے مائدہ کی امی! کہ یوں ہی مہینے پندرہ دن میں آپ کے گھر کا چکر لگا لوں۔ مفت میں نوٹ ٹھونسوں۔ ایک تھیلا کھانے پینے کی چیزوں کا لوں اور خدا حافظ مگر یہ میرا کام تو نہیں ہے ناں..... تیس سال سے اس شعبے میں ہوں۔ اتنے جوڑ ملائے کہ اب یاد نہیں کوئی راستے میں مل کر سلام جھاڑے اور بتائے کہ فلاں کی بیٹی ہوں، بیٹا ہوں اور میرا رشتہ لگایا تھا تو مجھے یاد تک نہیں آتا۔ کئی تو اب اپنے بچوں کے رشتے مجھ سے کرواتے ہیں ایسے میں آپ لوگوں کی بے اعتباری..... مجھے اب بے عزتی لگنے لگی ہے۔ یہ

میرا روٹی پانی ہے۔ اللہ مصیبت سے بچا کر رکھے کیا آپ لوگوں کو یہ لگتا ہے کہ میں تصاویر لے کر کہیں خدانخواستہ ان کا غلط استعمال کروں گی...."

امی کو اتنی صاف گوئی کی توقع نہیں تھی۔ شدید شرمندگی میں گھر کر انہیں ٹوکنے کے لیے بولنا چاہا تو آپا نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کو کہا۔

"آپ تصویر دینا ہی نہیں چاہتی ہیں۔ میں لاکھ تعریفیں کروں اگلی فوراً" تصویر مانگتی ہیں۔ بندے کا ذہن بنتا ہے ناں عورتوں ہی کو دکھائی ہوتی ہیں۔ اور تصویر دکھا دینا اچھا ہوتا ہے۔ ناپسند ہوئی تو وہیں منع کر دیتی ہیں' یہ کیا کہ پورا لانگا ٹورا (خاندان) بھر کے لائیں کھائیں پئیں اور آخر میں انکار کر کے چلتے بنیں۔"

آپا نے امی کو دیکھتے دیکھتے تائی امی کو دیکھا بجن کا رنگ اڑ گیا تھا۔

"بہرحال میں کوشش تو کروں گی۔ ایک آپ تصویر نہیں دیتیں دوسرے ذات زبان کی قید.... بڑا مشکل کام ہے۔ بس جب اللہ کا حکم ہو گا تو گھر آجائیں گے ایک روز...."

آپا نے ایک بار پھر بیگ بند کر لیا۔ وہ جانے کو تیار کھڑی تھیں۔

تاباں نے کانی آنکھ سے تائی امی کا چہرہ دیکھا جو ملتجی نگاہوں سے دیورانیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک ڈری نگاہ آپا تسنیم پر بھی تھی۔

"آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں آپا جی...." چاچی نے پہلی بار لب کشائی کی "مگر ہمارے گھر کے مرد.... چہ" انہوں نے جملہ موزوں کرنے کے لیے خاموشی اختیار کر لی۔

"مرد کہاں سمجھتے ہیں ان نزاکتوں کو.... اب آپ ہی کی ذات برادری کا رشتہ ہے مگر آگے لڑکی کے کسی بھی اوصاف سے پہلے تصویر دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کے کہنے پر لے آؤں۔ میرا کیا جاتا ہے؟ مگر کوئی ان کی ناک پر چڑھتی نہیں۔ بچی ہی کا دل برا ہوتا ہے اور آج کل بچیاں حساس بھی بہت ہیں۔ یہ لڑکا ہے بہت اچھا.... بس اسی لیے میں آئی تھی۔ باقی...."

"دے دیں تائی امی.... دے دیں تصویر...." تاباں نے یکدم اچھل کر ان سے کہا۔

امی نے چونک کر بیٹی کو گھورا۔ میسنی بلی بن کر اس نے ساری باتیں سنی تھیں۔ گھر کا ماحول روایتی تھا رشتوں کی باتوں میں کنواری لڑکیوں کی موجودگی.... کیوں؟ اور بولنا تو یہ۔

تائی امی نے گومگو کیفیت میں دیورانیوں کو دیکھا' وہ کیا کہیں گی۔ ان کی آنکھیں رنگ رنگ کیفیات کی مظہر تھیں۔ بے چین' مایوس' ہار....

"ایسا کریں کوئی گروپ فوٹو دے دیں۔ کسی بچے کی سالگرہ وغیرہ کی جس میں بہت سے لوگ ہوں یا کہیں باپ بھائیوں ہی کے ساتھ کھڑی ہوئی ہو۔" آپا تسنیم نے ایک قابل عمل حل پیش کر دیا۔

امی اور چاچی کے چہروں پر روشنی سی پھوٹی اور تائی جی کی آنکھوں سے جھلکنے لگی۔ تاباں اچھل کر کھڑی ہوئی۔ بے حد تیزی سے....

"میں لاتی ہوں.... ابھی لاتی ہوں۔ رانیہ کے ختم قرآن پر بعد میں جو گروپس بنے تھے۔ رانیہ کے ساتھ تاباں اور کاشان ہیں.... وہی والی...."

"بھئی کہاں ہیں سب گھر والے.... کوئی دروازے پر آئے تو یہ سامان پکڑے ناں.... انار یوڑ بھر کے رکھا ہے۔ پہلے بازار سے چیزیں خریدو' پھر کیا گھر میں لا کر سب کے منہ میں بھی ڈالی جائیں گی۔ نا ہنجار اولاد...."

تاباں واپس آچکی تھی۔ جب چاچا جی کی آواز سے چرند پرند بھی با ادب ہو گئے۔ آپا تسنیم نے تصویر پکڑنے اور تاباں نے پکڑانے میں تیزی دکھائی تھی۔

"میرا دل کہتا ہے رشتہ ہوا ہی ہوا.... آپ بس چند دن انتظار کریں۔ عمر گزاری ہے میں نے اس پروفیشن میں۔"

آپا نے باہر نکلنے میں دیر نہ لگائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے جانے کے دن آنے والے ہیں پیاری مائدہ....!" تاباں کسی جوکر کی طرح اچھل کر کمرے میں آئی تھی۔ وہ ذرا سا جھکی تھی اور دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلا کر شوخی سے کہا تھا۔

"کہاں جانے کے دن؟" ضوفی اپنے پسندیدہ کام یعنی رٹا لگانے میں مگن تھی۔

"وہیں جانے کے دن...." تاباں نے آنکھیں خلا میں گھما کر جملہ موزوں کہنے کا وقفہ لیا۔ "جس کے خواب انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی دیکھنے شروع کر دیے تھے۔"

"اوہ!" ضوفی بدمزا ہوئی.... "اسے اسکول جانے کا بہت شوق تھا۔ پھر پھپھی کے گھر.... مگر پھپھی جب اپنے منڈے بیاہنے لگیں تو انہیں بھتیجی کا وہ پلٹ پلٹ کر دیکھنا یاد ہی نہ رہا۔ لے آئیں اپنے سرتاج کی بھانجی اور بھتیجیاں.... ہونہہ۔"

"بکواس بند کرو....!" مائدہ نے بھنا کر کہا تھا۔ ایک سایہ سا ماجدہ کے چہرے پر بھی لہرایا اور تاباں اتنے غلط قیافے پر جی بھر کے بدمزا ہوئی۔

"یا پھر سلائی اسکول.... اسے بچپن ہی سے سلائی سینٹر جانے کا شوق تھا۔ مگر بڑوں نے کہا اسے کیا ہم درزن بنائیں گے۔" ضوفی پر لتاڑ کا اثر نہ ہوا۔ اس نے مائدہ کے ابا کی ہو بہو آواز بنا کر کہا۔ "وہ تو درزن بننے کی خداداد صلاحیت موجود تھی۔ جو گڑیوں کے کپڑے سی سی کر آج ماہر فن ہو گئی۔"

"کیا تم اپنا منہ بند نہیں کر سکتیں۔" تاباں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اور کیا تم صاف اور سیدھی باتیں نہیں کر سکتیں؟" ضوفی نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

مائدہ کی گود میں میگزین دھرا تھا۔ اس نے اکتا کر دوبارہ کھول لیا۔

مائدہ کی بے زاری وعدم توجہی تیوں کو محسوس ہو گئی تھی۔

"تم صاف بات کیوں نہیں کرتیں تاباں!" ماجدہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "گھما پھرا کر بات نہیں کی جا سکتی۔ تم یہ کسوٹی کسی اور معاملے کے لیے اٹھا رکھو اور صاف بات کرنی ہے تو کرو ورنہ جاؤ۔" ماجدہ نے بڑی بہن کے چہرے پر آتے زلزلے والے تاثرات بھی دیکھ لیے تھے اور بعد میں پتھریلا پن بھی۔ ضوفی نے بھی تائید میں سر ہلایا۔ تاباں کو بھی یکدم ہی مائدہ کے حوالے سے صورت حال کا اندازہ ہوا۔

"صاف بات یہ ہے کہ آپا تسنیم آئی تھیں۔"

"وہ تو ہر ماہ ہی آتی ہیں۔ اس میں نیا کیا؟" ضوفی کا موڈ ہی خراب ہو گیا۔

"اور گزشتہ کتنے ہی برسوں سے آرہی ہیں۔" ماجدہ ناول اٹھانے والی تھی۔

تاباں نے بے ساختہ مائدہ کو دیکھا جو بظاہر بڑی توجہ سے میگزین دیکھ رہی تھی مگر چہرے پر آئے استہزائیہ تاثرات جن میں بے کسی کا رنگ ہی شامل تھا۔ نظروں سے اوجھل نہ رہ سکے۔ تاباں کو دکھ سا ہوا۔

"نئی بات یہ ہے کہ.... آپا تسنیم سو فی صد پر امید.... بلکہ پر یقین ہیں کہ رشتہ ہوا کہ ہوا...."

"وہ کئی سالوں سے کئی مرتبہ پر یقین ہو چکی ہیں۔" ماجدہ نے خود کلامی کی تھی۔ تاباں نے سنی ان سنی کر دی۔

"نئی بات یہ ہے کہ...." اس نے اپنے اونچے لہجے کو بہت دھیما کر دیا۔ "اس بار وہ تصویریں لے جانے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔"

"کیا....؟" ضوفی کے ہاتھ سے قلم چھوٹا.... مائدہ نے دل پر ہاتھ رکھا ماجدہ نے ہونٹوں پر....

"جھوٹ...." ضوفی بمشکل بولی۔

"میں نے خود دی ہیں۔" تاباں نے فخریہ کارنامہ بتایا۔

"تم نے...." ماجدہ چیخی اور باقی سب کی آنکھیں ابل پڑیں۔

"سب کی اجازت ہی سے بے وقوف.... بات دراصل یہ ہے کہ...."

☼ ☼ ☼

مائدہ مایوسی کی زندگی جی رہی تھی۔ وہ مایوسی جو ایک

کنواری لڑکی کو معاشرہ دے دیتا ہے۔ وہ خوش شکل نہیں تھی۔ وہ خوب صورت تھی۔ سلجھی ہوئی باادب سلیقہ شعار لڑکی۔۔۔ مگر ذات برادری خاندان کے بنائے اصولوں جو بالخصوص لڑکیوں کے لیے بہت ہی سخت تھے 'اسے مایوس کردیا تھا۔

برادری میں لڑکیوں کو جلد از جلد بیاہ دینے کا رواج تھا۔ سو اب ارد گرد ایسی لڑکیاں بھی تھیں جن کی اپنی بچیاں دس دس برس کو چھو رہی تھیں۔ مائدہ ستائیس کی ہونے والی تھی۔ اپنے گھر کے اندر رہتے ہوئے وہ مطمئن تھی مگر جب جب اپنی ان ہم عمروں سے ملاقات ہوتی یا آنے جانے والے اسے دیکھ کر ہمدردی سے آہ بھرتے یا نصیب کھلنے کی دعا بھی دیتے تو آہ بھالے کی صورت لگتی اور دعا ترحم بھرا جملہ۔

وہ کار گزار لڑکی تھی۔ بہن بھائیوں اور دیگر اہل خانہ کے ساتھ خوش و خرم رہتی تھی مگر پھر وہ چڑچڑی ہونے لگی۔ خاموش رہنے لگی۔ کبھی راتوں کو جاگ اٹھتی۔ اسے آنے والے وقت سے کوئی خوش امیدی نہیں تھی۔ ہر گزرتا پل اس کی خوبیوں پر گرد ڈال رہا تھا۔ اول تو حسب منشا۔۔۔ گھر تک ہی بمشکل آتے اور پھر آگے کے مرحلے۔۔۔ بعض اوقات وہ ناپسند کردی جاتی۔ بعض اوقات آنے والے مسترد ہوجاتے۔

ضوفشاں نے حل نکالا۔۔۔ اس نے امیوں کو مائل کیا۔ اور اباؤں کو قائل کیا دانتوں پسینہ آگیا اس عمل سے۔

مائدہ کا کالج میں ایڈمیشن کروا دیا گیا۔

وہ خود سے بہت چھوٹی ضوفی اور تاباں کے ہمراہ سفید یونی فارم پہن کر کالج جانے لگی۔ اس کے چہرے پر رنگ برسنے لگے۔ تفکر کا جال سرکنے لگا۔

ایک نئی دنیا' ایک نیا جہاں۔۔۔

مگر سفید یونی فارم پہن کر بیگ لٹکا کر۔۔۔ کالج بھی تو ساری زندگی نہیں جایا جا سکتا۔ ماں کی فکریں وہیں کی وہیں تھیں۔

بس گھر بیٹھے ہیں توکل کیے ہوئے کہ جس دن نصیب کھلنا ہوگا۔ دروازے پر دستک ہوگی اور مائدہ کے طلبگار اسے لے جائیں گے مگر اونٹ باندھ کر توکل کرنے کا حکم ہے۔ عورتیں اپنے حساب سے سوچتی تھیں۔

"رشتے کروانے والی عورتیں۔۔۔ اگر ان سے رابطہ کرلیا جائے تو۔۔۔؟"

"خبردار! ایسی عورتیں گھر کی بچیوں کے رنگ روپ 'اٹھنے بیٹھنے کی تفصیل باہر لے کر جاتی ہیں۔ گھر گھر چرچا کرتی ہیں کھلی بے حیائی۔" شاہد تاج نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "میں کیسے ایرے غیرے نتھو خیرے کو گھر میں بلالوں۔۔۔ اللہ جانے کون کون گھر میں گھس آئے عزت دار خاندانی بن کر۔۔۔"

"رشتے والی خاتون کو جب تمام کوائف شرطیہ بتا دیے جائیں گے۔ تو وہ حسب منشا ہی کو لائیں گی۔" تائی جی نے دبے لہجے میں کہا۔

مگر شاہد تاج کی اک خشمگیں نگاہ نے پتا پانی کردیا۔ سب پھر دم سادھ کر بیٹھ گئیں۔

تب ہی برادری ہی میں سے کسی بندے نے اپنی دو بیٹیوں کو ایک ساتھ بیاہا۔ سراسر غیر اجنبی لوگ مگر برادری ذات ایک تھی۔ بہت شان دار رشتے۔ تفصیل معلوم کرنے پر علم ہوا کسی رشتے کروانے والی نے جوڑ ملایا ہے۔

بے حد متاثر ہوجانے والے تایا جی نے آپا تسنیم کو خود فون کرکے گھر آنے کی دعوت دی۔ ماؤں پر شادئ مرگ طاری ہوگئی۔

مگر تایا جی کے پاس شرائط کی لمبی فہرست ہوگی۔ تایا جی نے آپا تسنیم کو بتایا۔ رشتے کیسے کروانے ہیں۔ آپا سرہلاتی گئیں مگر تب بری طرح چونکیں۔ جب تصویر دینے سے صفا انکار ہوگیا۔۔۔ بلکہ وہ بھڑک ہی اٹھیں۔

"تو پھر میں رشتہ کیسے چلاؤں گی؟" آپا نے باری باری مودب خواتین کو دیکھا۔ جو اس سارے وقت میں ایک لفظ نہیں بولی تھیں۔

آپا نے حق دق حامی بھرلی کہ رشتے بہرحال اللہ کے حکم سے ہوتے ہیں۔ وہ تو صرف زمین پر محنت کرتی ہیں۔

آپا تسنیم کی تک و دو۔۔۔ ناکامی یا خراب حکمت عملی معلوم نہیں۔

وہ بہت سیدھی بات بھی نہیں منوا پائی تھیں مگر آج۔۔۔ آج کا دن پتا نہیں کیا تھا۔ وہ تاباں کی عجلت سے۔۔۔ ماؤں کے متزلزل انداز سے۔۔۔ یا پھر وقت آگیا تھا۔ تصویر لے گئیں' تاباں نے دو چار تصاویر دے دی تھیں۔

اب وہ سب کے حیران چہروں پر نظریں گھماتے ہوئے گا رہی تھی۔

"مکھڑے پہ سہرا ڈالے آجاؤ آنے والے۔۔۔"

گھر میں ہر چہرہ کھلا ہوا تھا۔ لڑکے والوں نے پہلی تصویر دیکھ کر ہی مائدہ کو پسند کرلیا تھا۔ وہ اگلے روز رشتہ لائی تھیں اور اس سے اگلے ہفتے آج منگنی کردی گئی تھی۔ ان کی ایک بیٹی نے باہر سے آنا تھا۔ شادی ایک سال بعد۔۔۔

"میں تو سوچ رہی ہوں چپکے سے اپنی تصویر بھی آپا تسنیم کے حوالے کردوں۔" تاباں نے دور رسی کی انتہا کردی۔

"ابا لاش بھی چپکے ہی سے غائب کردیں گے۔" ماجدہ نے ڈرایا۔

"تم لوگ ہمیشہ تاریک پہلو کیوں دیکھتی ہو؟" وہ بھنائی۔

"اس لیے کہ روشنی کا نام و نشان تک نہیں۔۔۔ اور تمہیں بڑا شوق ہے شادی کروانے کا۔۔۔" مائدہ نے کہا۔

"لو جی ہم خوامخواہ کے بدنام۔۔۔ خود گلابی جوڑا پہن کر بیٹھی انگلی کی انگوٹھی سے کھیل رہی ہیں۔ زندگی گزر گئی میری۔" تاباں نے کسی بوڑھی عورت کی طرح آنکھیں گھمائیں۔ "کبھی جو کوئی زیور پہن کر اتنے دانت نکلے ہوں۔" اس نے حاضرین کو بھی تائید کے لیے دیکھا۔

"میرے شوق کو گننے لگی ہو۔۔۔ بے وقوف! جس طرح لڑکوں کی کمیابی ہے۔ آج کچھ سوچیں گے تو کل رزلٹ حسب توقع ملے گا ناں۔۔۔ میں تو بھئی سیریس ہوں۔ خاندان محلے میں دور نزدیک ہمارے جوڑ کا کوئی نہیں۔۔۔ ابھی سے ہاتھ پیر ماریں تو اچھا ہے ناں۔۔۔ میں تو ضوفی کی بھی تصویر دوں گی۔"

"کیا؟" آنکھیں موند کر لیٹی تھکی ضوفی اچھل پڑی "دماغ خراب ہوگیا خبردار جو۔۔۔"

"میں تمہاری بڑی بہن ہوں ضوفی! میں نہیں تمہارا خیال کروں گی تو کون کرے گا۔" تاباں کا لہجہ احساس ذمہ داری سے بھرپور ہوگیا۔

"مجھے نہیں چاہیے ایسا خیال۔۔۔ تم کرتی رہو مستقل کی یہ بے ہودہ پلاننگ۔ میں تو اپنی زندگی کا ایک مقصد طے کرچکی ہوں۔۔۔ مجھے صرف ڈاکٹر بننا ہے بس۔"

"تو کیا ڈاکٹرز شادی نہیں کرتیں۔" تاباں نے معصومیت سے پلکیں جھپکیں "بلکہ میں تمہاری پکچر کے نیچے لکھوا دوں گی۔ مستقبل قریب کی ڈاکٹر۔۔۔" تاباں نے نیا نکتہ نکالا۔

"پھر ایک اضافہ میں تمہاری تصویر پر بھی کروں گی مستقبل قریب کی لاعلاج پاگل۔۔۔!" ضوفی دھاڑی "۔۔۔ بلکہ نادم تحریر سکہ بند خبطی۔۔۔ جھلی۔"

"نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں۔ میں تو پیش بندی کر رہی تھی۔" تاباں نے شانے اچکائے۔

"تم یہ نیکی اپنے ابا کے مشورے سے کیوں نہیں کرلیتیں۔ بلکہ تصویر کا سلیکشن بھی ان سے کروالو۔۔۔" ماجدہ نے پہلی بار لب کھولے۔

"لو تو کیا پچھلی بار ابا کے مشورے سے نیکی کی تھی۔" تاباں نے آنکھیں نچا کر مائدہ کو دیکھا' جو ایک لحاظ سے گردوپیش سے انجان انگوٹھی پر نگاہیں جمائے کسی اور ہی جہان کو پہنچی ہوئی تھی۔۔۔ چہرے پر مسکان۔۔۔ آنکھوں میں جگمگاہٹ۔

"اے بہن۔۔۔ اب بس کرلو۔" ضوفی نے دھاڑ لگائی اور دونوں ہاتھ پٹاخ کی آواز سے جوڑ کر پیشانی سے ٹکرائے۔ "ادھر ہی رہے گی۔ تمہیں ہی دی گئی ہے۔ سال بھر کا وقت ہے۔ جی بھر کے دیکھتی رہنا۔ کیا تمہیں انگوٹھی کے نگ میں ان کی تصویر نظر آرہی ہے۔" وہ

حیرت سے پوچھ رہی تھی۔



"سنا ہے تم شادی کرنے والے ہو؟" مینا نے ایک ادا سے اپنے آگے آنے والے بالوں کو پیچھے کیا۔ "ویسے میں نے اتنا چھوٹا دولہا کبھی نہیں دیکھا۔" اس نے اب بالوں کو دوسری جانب سے آگے کیا تھا۔ "جب دولہا اتنا چھوٹا ہے تو دلہن اور بھی چھوٹی ہوگی۔"

جاذب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ بے یقینی سے سنا۔ اس بار اس کا گیٹ اپ بالکل بدلا ہوا تھا۔ جاذب کو اچھی طرح یاد تھا۔ پچھلی بار جب وہ اسے ملی تھی تب اس کے بال جیٹ بلیک تھے۔ اب سارے بال سنہری تھے۔ گولڈن نیل پالش۔ کانوں کے پاس گالوں پر سنہری رواں.....

وہ جواب کی منتظر تھی۔ ایڑی پر ہل رہی تھی۔ جاذب نے سوچا، وہ ان بے معنی سوالوں کا کیا جواب دے۔

"چاچی جان کو گڈے گڑیا کا بیاہ رچانے کا اتنا شوق ہے؟ ہی ہی ہی امیزنگ....."

جاذب نے طویل سانس لے کر پہلو بدلا۔ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

"تم تو بولتے ہی نہیں جاذب..... کیا نکاح کے وقت تمہارا سر بھی جبراً "ہلوایا جائے گا۔"

"آپ یہ سارے سوال اپنی چاچی جان ہی سے پوچھ لیں۔" اب اسے جواب دینا ہی تھا۔ "اور جب نکاح ہو رہا ہو گا تو آپ مردانے میں آجایئے گا۔ وہاں جو بھی ہو گا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے گا۔"

"ارے.....!" وہ حیرانی سے چلائی۔ "تمہیں تو جواب دینے آتے ہیں۔ کمال ہو گیا۔ پتا لگ گیا چاچی جان نے بالکل درست فیصلہ کیا۔ ہمیں ہی غلط فہمی ہوئی تھی کہ تم چھوٹے ہو۔"

اسے مزید برداشت کرنا اب مشکل تھا۔

"غلط فہمی سے جتنی جلدی نکل آئیں اچھا ہوتا ہے۔ آپ خوش قسمت ہیں۔" وہ جملہ مکمل کرکے آگے بڑھ گیا۔ مینا نے ایک اور دل نواز قہقہہ لگایا۔ وہ اس کی پشت کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔



"کل مینا سے باتیں ہو رہی تھیں....." جاذبہ نے کچن کاؤنٹر پر چیزیں جگہ پر رکھتے ہوئے بے حد سرسری لہجہ اپنایا۔ جیسے وہ کام میں مگن ہوں اور بس یونہی یاد آگیا ہو۔

جاذب کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے یکدم نگاہ اٹھا کر ماں کو بغور دیکھا۔ وہ تن دہی سے ڈبے پر کپڑا پھیر رہی تھیں۔ وہ لقمہ بنانے کے لیے جھک گیا۔

"باہم گفتگو تو نہیں کہہ سکتے، وہ بولتی جاتی تھیں..... میں تو سن رہا تھا۔" اس نے صاف لہجے میں کہا۔ وہ کھانا کھا رہا تھا ساری رغبت اور دلچسپی اسی میں تھی۔

"اچھی لڑکی ہے....." جاذبہ کچن چمکانے میں مگن تھیں۔

"صبح سے آئی تھی کل..... خوب رونق لگ گئی۔ اس کی ہنسی نے گھر بھر کو کھلکھلا دیا تھا جیسے..... ہنستی مسکراتی۔"

"وہ ہنستی نہیں ہے ماں..... ہنسی اڑاتی ہے۔"

"کیوں.....؟" جاذبہ نے کھیرا منہ میں رکھا۔

"آپ نے اپنا تجزیہ بتایا کہ اچھی ہنستی مسکراتی لڑکی ہے تو میں نے کلیئر کیا..... یا یوں سمجھ لیں اپنا نظریہ بیان کیا جو مجھے لگا..... یعنی جیسی وہ مجھے لگی۔"

"مگر ہے تو اچھی لڑکی ناں.....!" جاذبہ نے اصرار کیا۔

"اماں!" جاذب نے لاڈ سے جیسے ان کی نا سمجھی کو جھیلا "آپ نے اب تک اچھی لڑکی دیکھی ہی نہیں۔"

"تو کیا تم نے دیکھ رکھی ہے....." جاذبہ نے تیزی سے کہا تھا۔ جاذب ٹھٹکا۔

جاذبہ اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ اگر اس نے واقعی اچھی لڑکی دیکھی تھی تو سارا معاملہ ہی حل ہو گیا تھا۔

"نہیں.....!" جاذب کی آواز مدھم ہو گئی۔ "ابھی تک تو نہیں دیکھی مگر یہ ضرور پتا ہے اچھی لڑکی مینا جیسی نہیں ہوتی۔" جاذبہ مطمئن نہ ہوئیں۔ انداز گھومتا ہوا تھا۔

"تم نے آج نئی بات بتائی۔ مجھے تو کبھی کوئی لڑکی بری نہ لگی..... اور تم کہتے ہو اچھی لڑکی کوئی اور ہی ہوتی ہے۔"

"اماں....." وہ ان کے الجھن بھرے انداز پر مسکرایا۔ ٹیبل پر دھرے ان کے ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

"ہر شخص کی نگاہ اپنے حساب سے طے کرتی ہے کہ اچھی لڑکی کون ہوتی ہے۔"

"تم نے کرلی؟" جاذبہ نے دوبارہ پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں۔" وہ سچائی سے بولا۔ "لیکن میں اسے ایک نظر میں پہچان ضرور لوں گا۔"



جاذبہ نے وہ ساری گفتگو جو بیٹے سے کی تھی، سلطان صاحب کے گوش گزار کردی۔

"کہیں موصوف چھپ کر شاعری وائری کا شغف تو نہیں فرمانے لگے۔ کوئی خیالی پیکر ہو کہ..... خوابوں کی پری..... جو کبھی مل کے نہیں دیتی۔"

انہوں نے صاف گوئی سے کہا جاذبہ کو بہت برا لگا۔ وہم سا ہونے لگا۔ تیزی سے ٹوک دیا۔

"اللہ نہ کرے، جو مل کر نہ دے۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میرا بیٹا اپنی کسی بھی من پسند شے سے محروم کیوں رہے۔ میں تو چھین کر لا دوں۔" وہ پرعزم تھیں۔ سلطان صاحب کی آنکھوں میں ستائش ابھری۔

"اللہ خیر....." انہوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر گویا پناہ طلب کی۔ "ہمیں خدا نے اس وقت اولاد سے نوازا جب وہ سب اپنے بچے بیاہنے کا سوچ رہے تھے۔ الحمد للہ..... اب ان کے اپنے بچوں میں سے کوئی ایک بھی شادی کے لیے بچا نہیں ہے۔ یہ چھوٹے بھائی صاحب کی مینا ہے اور سدرہ، آپا کی بچی ہے۔ مینا تین برس بڑی ہے اور سدرہ ڈیڑھ برس، مگر اس نے دونوں ہی کو اچھی لڑکی کی فہرست میں رکھا ہی نہیں۔"

"سدرہ بھائیوں میں پلی بچی ہے۔ اس کی الماری میں ایک بھی شلوار سوٹ نہیں۔ شرٹیں چڑھائے پھرتی ہے۔" یہ شادی بیاہ کی بات سے پہلے ہی جاذب نے ایک دن ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

"تو وہ آپ کی آپا تسنیم کیا ہوئیں۔ ان کی کارکردگی کیا صفر رہی؟"

"نہیں..... بتاتی تو وہ بھی ہیں، بلکہ تین، چار جگہ میں گئی بھی۔ مگر اللہ معاف کرے، سب جاذب سے بڑی لگیں۔ دو، چار برس کی چھوٹائی بڑائی بھی نہ دیکھوں، دو برس بڑی بھی لے لوں مگر معصومیت الذہن تو نظر آئے نا۔ اب ہمارا بیٹا کم عمر تو ہے ہی، مگر چہرے کے خدوخال ایسے ہیں کہ اور چھوٹا لگتا ہے، معصوم سا تو ہے۔ آنکھیں دیکھیں ہیں خوابیدہ سی اور ہونٹوں کا کٹاؤ، ناک تو خیر ماشاء اللہ، چہرے پر نرمی اور ملائمت ہے۔ شرافت تو خیر..... سب سے بڑھ کر....." جاذبہ ٹاپک بھول گئیں۔

"ہائیں..... ہائیں..... آپ مجھے رشتے کی راہ میں حائل رکاوٹیں بتاتے بتاتے بیٹے کی مدح سرائی میں جت گئیں۔ کیا جب رشتہ دینے جاتی ہیں تو لڑکی کی ماں سے یہ سب کہتی ہیں؟" سلطان صاحب نے ان کی تیز گام کی رفتار سے چلتی زبان کو روکا۔

"خالی یہ ہی کیوں؟" جاذبہ نے برا مانا۔ "خاندانی..... اکلوتا..... تعلیم یافتہ..... قابل..... کبھی فیل نہیں ہوا..... نمازیں پڑھتا ہے..... غریب پرور اتنا ہے کہ اپنا سوئٹر کسی غریب کو دے آئے اور....."

"بس..... بس..... مجھے پتا لگ گیا۔ آپ کے پاس کوہ نور ہیرا ہے۔ بس وہ پیشانی نہیں مل رہی جس پر اسے سجایا جاسکے۔" سلطان صاحب نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں روکنا چاہا۔

"ہاں تو ہے نا میرا بیٹا ایسا ہی..... اس میں جھوٹ کیا ہے؟"

سلطان صاحب نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے بڑی جلدی ہار مان لی۔" آپا تسنیم نے مسکرا کر جاذبہ کو دیکھا۔ "بس۔۔۔" جاذبہ نے کہا تھا۔ "دھیان ضرور رکھیں اور جب کبھی کوئی لڑکی مناسب لگے تو بتادیں۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔"

"چلیے ٹھیک ہے۔ ایک لحاظ سے آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ورنہ لوگ تو اڑے رہتے ہیں۔ بھلے سے غلط ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔ یا اپنی شرائط سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹتے۔ اب کل جو رشتہ میں نے فائنل کروایا ہے' وہ چار سال سے میرے لیے درد سر بنا ہوا تھا۔ تین بیٹے تھے اور ماں کی فرمائش تھی ایک ہی گھر سے لڑکیاں لائی ہیں۔ پہلے تو ڈھونڈنے میں دانتوں پسینہ آگیا۔ انہوں نے تو عمروں کی حد بھی بتا رکھی تھی۔ لیکن اللہ ایسے ہی خیال دل میں نہیں ڈالتا۔ مل ہی گئیں ایک اور اماں جنہیں تین بھائی ہی داماد بنانے تھے' بس کام بن گیا۔"

آپا آج بہت خوش تھیں۔ جاذب سلطان قریب ہی بیٹھا بہت کم آواز میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی حیرانی سے اسے سن رہا تھا۔

"زبردست آنٹی۔۔۔ خالی بھائی مانگے تھے' جڑواں تڑواں تو نہیں مانگے تھے کہ آپ کو اسپتال کا ریکارڈ چھاننا پڑتا۔"

"ارے نہیں۔" آپا ہنسیں' جاذبہ نے بھی ساتھ دیا۔ "ان کی تو ایسی کوئی شرط نہیں تھی۔ مگر شکلوں میں مشابہت جڑواں جیسی ہی ہے۔" آپا نے اپنا بیگ ٹٹولا۔ جاذب اٹھ کر قریبی صوفے پر براجمان ہو گیا۔ دو تین البمز کے ورق پلٹائے مگر تصویر نہیں تھیں۔ وہ اپنا دوسرا تھیلا کھولنے لگیں۔ جاذب نے بھی ہر تصویر کو بغور دیکھنا شروع کیا۔

"یہ لڑکیاں تو نہیں ہیں آنٹی؟" جاذب نے پکارا۔

آپا نے نظریں اٹھائیں۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ لڑکیاں تو یہی ہیں' مگر لڑکے کہاں گئے؟" وہ تندہی سے دوبارہ ڈھونڈنے لگیں۔ جاذب نے ایک نگاہ کے بعد اشتیاق کی ماری ماں کو تصویر دے دیں۔ خود آپا کی مدد کرنے لگا۔

تب ہی ٹھٹک گیا۔ ایک علیحدہ سے تھیلی تھی۔ جو اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گری اور تصاویر باہر۔ وہ سوری کہتا جھکا اور بصد احتیاط تصاویر سمیٹنے لگا۔

وہ گھٹنوں کے بل زمین پر جھکا ہوا تھا۔ ٹیبل کے پائے کے پاس وہ تصویر۔۔۔

گھٹنوں کے بل جھکنا جسم کے لیے کسی قدر مشکل ہوتا ہے۔

مگر دل کے لیے مشکل ترین۔۔۔ اور دماغ کے لیے بھی شاید ہتک آمیز۔

پھر وہیں جھکا جاتا ہے جہاں دل مجبور کر دیتا ہو۔

یا عبودیت کی خاطر۔۔۔ یا محبوبیت کے کارن۔

اور کوئی پہلی نگاہ میں محبوب ہو سکتا ہے کیا؟

اور کیا کوئی معبود ہو سکتا ہے؟ کوئی معجزہ معبود کی پہچان کرا کر دلوں کو پھیر سکتا ہے۔ زبان سے بے ساختہ گواہی نکل آتی ہے۔

لیکن۔۔۔ محبوب کے پاس ایسا کیا ہوتا ہے؟

جس پر نگاہ پڑنے سے۔۔۔ یوں لگتا ہے جیسے دنیا کی گردش رک گئی ہو۔ ساری حسیں کام کرنا چھوڑ دیں اور پورا وجود فقط آنکھ بن جائے۔

اور ایسی بھی کیا بے اختیاری کہ جاذب سلطان جہاں کا تہاں رک گیا تھا۔

آنکھ کی پتلی ٹھہر گئی۔

"ارے دیکھو جاذب۔۔۔ یہ رہے وہ تینوں لڑکے۔"

آپا کی مسکراتی جوشیلی آواز پر وہ چونکا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی تصویر کو ایک بار پھر دیکھا اور ٹھنڈی نڈھال سانس لیتا کھڑا ہو گیا۔

جاذب نے تھیلی آپا کی جانب بڑھائی اور پھر وہ اکیلی تصویر۔۔۔ آپا کے چہرے کے عین سامنے کر دی۔

"یہ کس کی تصویر ہے آپا۔۔۔ کون ہے یہ لڑکی؟"

اس کی آواز ناقابل فہم تھی۔ جاذبہ نے ذرا سی گردن اچکا کر دیکھا۔

بوگن ویلیا کا گھنا سبز جھاڑ تھا۔ جس پر آتشی گلابی دہکتے پھولوں کے گچھے تھے۔ زمین پر پورے قد سے کھڑی لڑکی کا ہاتھ بساط بھر اونچا ہو کر ایک شاخ کو جھکا رہا تھا اور یقیناً" ہلا رہا ہو گا جو بہت سے پھول اس کے سر شانوں اور زمین پر گرے پڑے تھے۔

لڑکی کے چہرے پر بے پناہ جوش' خوشی کا بے پناہ احساس اور مسحور کن کیفیت تھی۔ اس کی ساحر آنکھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ اگر تصویر سے آواز آیا کرتی تو یقیناً" اس کی کھلکھلاہٹ کانسی کے برتن میں گرتے سکوں جیسی ہوتی یا مندر کی گھنٹی' یا پیتل کے تھال پر تواتر سے گرتے بارش کے قطروں جیسی۔۔۔ یا۔۔۔ یا؟

"ارے۔۔۔ یہ۔۔۔ تصویر!" آپا گڑبڑائیں۔ "یہ رشتے والی تصویر نہیں ہے۔۔۔ یہ تو۔۔۔"

☼ ☼ ☼

آنے والے مہمان۔۔۔ گھر کے ہر فرد کو بے حد پسند آئے تھے۔ مہذب' خوش شکل' خوش اطوار۔۔۔ ایسے لوگ جن سے ملنے کو دل کرے اور بار بار کرے۔ ایک خوشی کا مسلسل احساس ہو جیسے۔

لیکن بد قسمتی کی بات یہ تھی انہیں دیکھ کر فقط خوش ہی ہوا جا سکتا تھا۔ دل میں اگر کسی قسم کی ناگواری اتری بھی تو سامنے والوں کی شخصیت نے اس کے شدید تاثر کو زائل کر دیا تھا۔

اگر آنے والے پھلوں سے شاپر بھر کے لائے تھے اور آئس کریم کے پیک۔۔۔ تو گھر والوں نے بھی آداب میزبانی اور مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ٹیبل اور ٹرالی انواع و اقسام کی اشیائے خورد و نوش سے بجی ہوئی تھی اور بصد اصرار کھلائی جا رہی تھیں۔

اس حسن سلوک کے طفیل مہمان خوش امیدی کی ڈور کے سہارے اڑانیں بھرتے بھرتے آسمان کو چھو آئے تھے۔

خوش گپیاں۔۔۔

دوسری طرف میزبان قطعیت سے بھرپور تھے۔ وہ میزبانی میں کوئی حد نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

ایسی صورت حال بہت کم درپیش آئی تھی۔ کہ دروازے ہی سے پلٹا دیا جاتا تھا۔ مگر وہی تاکہ اس بار کے مہمان۔۔۔

اور یہاں آپا تسنیم بھی براجمان تھیں۔ اللہ کے بعد ایک وہی تھیں جو دلوں کے حال جانتی تھیں۔ انہیں دونوں افراد کی جانب سے شرمندگی جھیلنی تھی۔ ایک جانب سے مایوسی کی اور دوسری جانب سے شاید غصہ۔۔۔ کہ جانتے بوجھتے ہوئے۔

مہمانوں کو بڑے دن لگے تھے سمجھانے بجھانے میں۔۔۔ مگر وہ مصر رہے اور من مانی کی۔ آپا نے بھی نتیجے کو ان پر ڈال دیا۔۔۔ بلکہ ممکنہ نتیجہ بتا دیا تھا۔

میزبان ضد میں تیل کا داغ تھے۔ گھس لو' رگڑ لو' کاٹ پیٹ دو' مگر ایک آخری دھاگے سے بھی لپٹے رہنے والا نشان۔

آپا کو زیادہ شرمندگی میزبانوں سے تھی۔ مگر جب بات کھلی تو کوئی بھی ان پر خفا نہیں ہوا۔ دراصل مائدہ کے اتنے بہترین رشتے کے طے ہو جانے سے۔۔۔ آپا نے گھر بھر کی نگاہوں میں بہت اعلا مقام اور عزت حاصل کر لی تھی۔ سب ان پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرنے لگے تھے۔

مردا تنی گہرائی میں جاتے نہیں۔ انہوں نے وقت رخصت سلطان صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے اور بغل گیر ہوتے ملاقات کو بہت اچھی یاد سے تعبیر کیا تھا۔ جاذبہ کو ذرا سے خمیدہ سر کے ساتھ خدا حافظ۔۔۔ یہاں تک کہ جاذب سلطان کو بھی خوش دلی سے رخصت کیا تھا۔ جس کے چہرے پر مایوسی نے سفیدی سی پھیلا دی تھی اور وہ عجب بے اختیاری کے عالم میں اس دو منزلہ بڑے سے گھر کی بند کھڑکیوں کو کھوجتا تھا۔ دیوار پر زیرک نگاہی کا زور لگا' تاکہ کوئی شبیہہ ابھرے' کوئی چلمن' سر سراتا پردہ۔۔۔ کوئی کونا کھدرا۔

وہ اتنا زور دے کر تاباں ہی کا نام کیوں لے رہی تھیں۔ انہوں نے تاباں کو کب دیکھا۔ عورتیں سراسیمہ تھیں اور مہمانوں کی رخصت کے بعد تسنیم کو کٹہرے میں لے کر کھس پھس کر رہی تھیں۔

"وہ جو آپ نے مائدہ کے رشتے کے لیے تصاویر دی تھیں۔" آپا نے کہنا شروع کیا۔ "جلد بازی میں اس میں کچھ اور تصاویر بھی آگئی تھیں آپ گھر والوں کی۔۔۔ اسی میں تاباں کی بھی ایک تصویر تھی۔۔۔ وہ جو میں نے تین بھائیوں کا تین بہنوں سے رشتہ جڑوایا تھا نا۔۔۔ اس کا ذکر چل رہا تھا۔ تصاویر دکھانے لگی تو جاذبہ کی نگاہ تاباں کی ایک تصویر پر پڑ گئی۔۔۔ بس جی وہ تو فوراً "لٹو" ہو گئیں۔" آپا نے سارا الزام جاذبہ پر لگا دیا۔ اگر جو وہ کہہ دیتیں کہ جاذب سلطان ہی کی نظر پڑ گئی تھی اور گڑ گئی تھی تو۔۔۔؟

"نہیں دراصل جیسی بہو کی تلاش ہے نا۔۔۔ عمر۔۔۔ شکل قد کاٹھ۔۔۔ بس تاباں جیسے ان کے تصور کی اصل تصویر ہے۔۔۔ آپ کے ہاں تو آج لائی نا۔۔۔ انہیں تو ڈیڑھ ماہ سے سمجھا ہی رہی تھی۔ اب بھی جیسے میں عاجز ہو گئی۔ مجھے آپ لوگوں کا پتا ہے۔ مگر وہ مصر تھے کہ اپنے منہ سے کہیں گے تو۔۔۔ میں نے بھی سوچا۔۔۔ آپ لوگوں کے اپنے منہ سے سن کر ہی شانت ہوں گے۔ اس لیے لے کر آ گئی۔ اب معاملہ واضح ہو گیا نا۔"

آپا خود بھی ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھیں۔ اب روز کی بحث سے تو جان چھوٹی۔۔۔ بیٹھ جائیں گے ٹھنڈے ہو کر۔"

"وہ تو ٹھیک ہے تسنیم!" تائی جی نے لب کھولے۔ "مگر دیکھو نا اتنے پھل فروٹ اور آئس کریم۔۔۔ ہم کیسے رکھ سکتے ہیں اور وہ صاحب کہنے لگے کہ کسی کے گھر خالی ہاتھ کون جاتا ہے؟"

"میرے اعتراض پر بھی یہی کہا تھا۔" آپا بولیں۔

چاروں خواتین خاموش ہو گئیں۔ سب کے چہروں پر گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

تاباں کی امی کا چہرہ شدید کشمکش کا شکار تھا۔ تائی جی کے چہرے پر ملال اور چاچی کا چہرہ بے تاثر تھا۔ مگر ایک خاموش کیفیت وہاں بھی تھی۔

"بہت ہی اچھی فیملی تھی۔" تائی جی نے چپ توڑی۔

"جی۔۔۔" امی کے منہ سے جیسے کراہ نکلی۔ "بے عیب کہیں۔"

"بے عیب تو نہ ہوا۔ یہی تو سب سے بڑا عیب تھا جو ساری خوبیوں پر حاوی رہا کہ ذات برادری الگ تھی۔ باقی چیزوں کو کیا چاٹنا ہے۔" چچی نے صاف گوئی سے اکھڑ لہجے میں کہا۔ امی اور تائی جی انہیں دیکھ کر ہی رہ گئیں۔

"لڑکا بہت چھوٹا سا تھا اور بہت خوب صورت تھا۔" امی کی نگاہوں میں جاذب سلطان کا سائیڈ پوز گھوم رہا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں نہیں گئی تھیں۔ بس آڑ میں کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔" چاچی نے ہاتھ ہلایا۔ "مجھے تو نزاکت سی لگی اس میں۔" وہ لحیم شحیم عقیل شکیل کی ماں تھیں۔ بیٹے وہ جو ہو سولاڈ کے بھائیوں جیسے تھے۔

"نزاکت تو نہ کہیں۔" آپا کو برا لگا۔ "عمر ہی کتنی ہے۔ پڑھائی لکھائی والا لڑکا ہے۔ نہ کسی اچھائی میں نہ برائی میں۔۔۔ پھر بڑھاپے کی اکلوتی اولاد ہے تو ماں باپ متوجہ زیادہ رہتے ہیں' باقی لڑکا شان دار ہے' ماشاء اللہ۔" آپا نے صاف گوئی سے کہا۔

تائی جی کے چہرے پر تائید آن رکی تھی۔ جبکہ امی نے غیر ارادی طور پر سر زور' زور سے ہلا کر کہا۔

"بالکل۔۔۔ آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔"

"بھابھی کو تو صدمہ ہی لگ گیا۔" چاچی نے بے فکری سے ہنسی اڑانے کے سے انداز میں کہا۔ روایتوں میں جکڑی جواں بیٹیوں کی مائیں اعصابی کمزوریوں کا شکار ہوتی ہیں۔ انہیں ذرا سی سرد و گرم فوراً "لگ جاتی ہے۔

"بس اللہ سے دعا ہے۔ سب کی بچیاں وقت کے ساتھ ساتھ اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں۔ عزت کے ساتھ زندہ رہیں اور خوش رہیں۔"

"آپ نے تو بہت گہری بات کہی۔" آپا متاثر تھیں۔

امی پژمردہ سا مسکرا دیں۔ دل کے اندر کی سوچیں اتنی گہرائی بھی نہ لیں تو لعنت ہے ایسے دل والے ہونے پر۔

"بہر حال! آپ ایسا کریں۔" وہ سنجیدگی سے آپا کی جانب مڑی تھیں۔

"میری تاباں کے لیے بھی رشتہ دیکھ کر رکھیں۔ جیسی وہ ہے نا ویسا ہی۔۔۔ بلکہ اب کیا کہوں۔۔۔ جیسا رشتہ آپ آج لائی ہیں۔ اب اس سے کم کیا جچے گا۔ آگے جو نصیب۔"

تائی جی نے آنکھوں کے اشارے سے ہاں میں ہاں ملائی۔ آپا نے سر تسلیم خم کیا۔ جبکہ چاچی نے رکھائی سے تینوں کو گھورا تھا۔ ان کے عقیل' شکیل تھے نا۔ مگر۔۔۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے اس روز۔۔۔ وہ جو مہمان آئے تھے۔۔۔ ان سے کیا کہا تھا کہ۔۔۔"

میاں کا موڈ خوش گوار دیکھ کر زاہدہ کو ایک بات جو پھانس کی طرح گڑی تھی' کہنے کا خیال آ گیا۔

"کون سے مہمان؟"

"وہ جو آپا تسنیم لائی تھیں۔"

"کیا کہنا تھا' یہی کہا کہ ہم ذات برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے۔ تمہیں نہیں معلوم یہ بات۔" وہ تحیر کا مظاہرہ کرنے کے لیے ذرا سا چلائے تھے۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ بات نہیں۔۔۔ یہ تو میں نے بھی ان خاتون سے کہا تھا۔ میں اس دوسری بات کا کہہ رہی ہوں جو۔۔۔" زاہدہ اٹکیں۔

میاں خشمگیں نگاہوں سے بیگم کو گھور رہے تھے اور منتظر تھے کہ وہ کیا کہیں گی۔

"یہی کہ اول تو۔۔۔ رشتے ادھر ادھر کرنے کا رواج ہی نہیں اور پھر جب گھر میں لڑکے بھی موجود ہوں۔" زاہدہ نے توقف کیا۔ "آپ نے کن لڑکوں کا کہا تھا؟ کیا ساجد کے لڑکے۔۔۔" انہوں نے تیزی سے جملہ مکمل کیا تو جیسے اب سانس روانی سے آنے لگی۔

"ارے نہیں۔" میاں کا چہرہ جو تنا ہوا تھا' ڈھیلا ہو گیا۔ "وہ دونوں تو نکمے ہیں۔ ساجد کی بیٹیاں اچھی ہیں۔ بڑا بیٹا اچھا نکلا۔ یہ دونوں تو اپنے نانا' ماموں کی محبت میں رہ رہ کر بالکل ہی اوت لگے ہیں۔ انہیں کیوں دوں گا۔ وہ تو بس انہیں کہہ رہا تھا۔ اب جواب مدلل بھی تو دینا تھا اور کوئی ہوتا تو بس' ایک نہیں کہہ دیتا' مگر اچھے سلجھے شریف لوگ تھے۔ پھر عزت دار تھے اور کسی کی بہن' بیٹی کا رشتہ مانگتے وقت جو عاجزی انکساری ہونی چاہیے' وہ مجھے اچھی لگی۔"

"وہ خاتون بہت مایوس گئیں یہاں سے۔" زاہدہ کی نگاہوں میں جاذبہ کا پھیکا بے بس چہرہ گھوم گیا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن خیر ہے انہیں کس چیز کی کمی ہے۔ ابھی تو بہت وقت ہے ان کے پاس۔" مجاہد تاج کو بھی جاذبہ کی سوبر شخصیت یاد آئی تو تائید کر دی۔

"ہوتا ہے ماؤں کو چندے آفتاب ماہتاب بہو لانے کا شوق۔ مل جائے گی انہیں بھی۔۔۔ دنیا میں اچھی لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے۔"

"برائی تو ہماری بیٹی میں بھی کوئی نہیں تھی۔ کاش! وہ ہی وہ اچھی لڑکی ہو جاتی۔" زاہدہ کے دل کے چور خانے سے کوئی بولا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تو آپ کو پہلے ہی کہا تھا۔ بڑے کٹر ہیں سب کے سب۔۔۔ سائنس جتنی مرضی ترقی کرے جس دن لوگوں کے دل پھیرنے کا فارمولا ڈھونڈ کر لائے گی۔ میں تو تب جانوں۔" آپا نے کہا۔

"دل تو فقط دعا سے پھرتے ہیں۔" جاذبہ کے انداز میں شکستگی تھی۔

"تو پھر اب آپ دعا ہی مانگیے۔ دوا تو آپ کر چکیں' ذرا اثر نہ ہوا۔" آپا تسنیم ہلکا سا ہنس دیں۔

"وہ تو کر ہی رہی ہوں۔"

"چھوڑیے تاباں مجاہد کے رشتے کو' وہ جو میں نے آپ کو اتنے بہترین موزوں رشتے بتائے ہیں۔ وہ کیا ہوئے؟"

"مجھے تو اچھے لگے خاص طور پر فیملی اور لڑکی بھی بالکل میرے دل کو چھو گئی مگر جاذب۔"

"میری مانیے ان کے گھر چلے چلتے ہیں۔ آپ

جاذب کو بھی لے لیں۔ تاباں کی تو اس نے فقط تصویر دیکھی تھی۔ میں اس لڑکی کے گھر والوں سے بات کروں گی۔ اچھے لبرل لوگ ہیں' لڑکی ہی کو سامنے کردیں گے۔ جب جاذب آمنے سامنے ملے گا ناتو... تصویر کا عکس دھندلا ہو جائے گا۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ یہ لڑکی۔ بے حد خوب صورت ہے۔ تصویر ہی میں اتنی جادو گرنی جیسی ہے۔ سحر پھونک دینے والی تو سامنے سے تو..." جاذبہ کا لہجہ تھکا سا تھا۔

"انہوں نے تو گھر کی بچیاں دکھائی تک نہیں' میں واش روم کا بہانہ کرکے اندر بھی گئی مگر وہی تین خواتین تھیں۔ ایک دس' بارہ برس کی بچی نظر آئی تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھتے ہی اندر کہیں غائب ہو گئی۔"

"بہت سخت ماحول ہے۔ کھانے' پینے' پہننے' اوڑھنے کی سب آزادی ہے۔ مگر وہی دائرے کے اندر..."

"کیا سامنے سے بھی اتنی پیاری ہے؟" جاذبہ کا دھیان وہیں تھا۔

آپا نے جاذبہ کو دیکھا۔ وہ کیا جواب دیتیں۔

"ہاں پیاری ہی ہے۔" وہ گول مول سا بولیں۔

"آپا! آپ ایک بار جا کر دوبارہ ذکر تو کریں نا۔"

"کیوں میری عزت اور کاروبار کی دشمن بن رہی ہیں آپ۔"

"نہیں... اللہ نہ کرے' میں تو کہہ رہی تھی قطرہ قطرہ پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے تو..."

"قطرے کی طاقت سے کس نے انکار کیا ہے۔ مگر اس میں کتنا عرصہ لگتا ہے۔ یہ کیوں بھول رہی ہیں۔" آپا تسنیم کی برجستگی پر جاذبہ جو بہت ملول تھیں' دل سے مسکرا دیں۔

"ابھی تو یہ بھی ہوا کہ میں نے آپ ہی کی پسندیدگی کا ذکر کیا۔ اگر جو انہیں بھنک بھی پڑ جائے۔ میرا تو روٹی پانی اسی کام سے وابستہ ہے۔" آپا کو اپنی فکر پڑی۔ جانے انجانے میں ہی سہی تصویر پر لٹو تو جاذب ہی ہوا تھا نا۔

"ایک بات کہوں آپ سے۔" جاذبہ کا لہجہ پراسرار سا ہو گیا۔ "جو کچھ تھا وہاں ان کے اٹل ارادے' فیصلہ کن لہجہ... مگر مجھے لڑکی کی ماں کے انداز میں لچک سی محسوس ہوئی تھی۔"

آپا' جاذبہ کا چہرہ دیکھنے لگیں' منہ سے کچھ نہ کہا۔ مگر جاذبہ جواب کی متمنی نہیں تھیں۔ وہ اپنی چہرہ شناسی پر یقین رکھ رہی تھیں' بولتی چلی گئیں۔

اور ان کا مسلسل بولنا' اصرار اور یقین ہی تھا کہ آپا ایک بار پھر زاہدہ کے گھٹنے سے لگی بھن بھن کر رہی تھیں۔

زاہدہ کا مایوس چہرہ' نفی میں ہلتا سر' جاذبہ کا اندازہ درست تھا۔

زاہدہ دل و جان سے راضی تھیں۔ ایسے رشتے تو دعاؤں سے ملتے ہیں۔ جادو ٹونوں سے ہتھیائے جاتے ہیں۔ سازشیں رچائی جاتی ہیں۔ کاش! وہ کچھ کر سکتیں۔

جاذبہ کے پرزور اصرار پر وہ زاہدہ کے آگے ایک کوشش کر چکی تھیں۔ پھر جاذبہ سے معذرت بھی کی اور گزارش کہ انہیں اس معاملے سے دور رکھا جائے۔ وہ جو کچھ کر سکتی تھیں' کر چکی ہیں

آپا نے اپنے طور پر اس معاملے کو لپیٹ کر ہاتھ جھاڑے۔

اور اپنے گھر کی راہ لی۔ مگر...

☼ ☼ ☼

جمعہ کے دن مشاہد تاج اور مجاہد تاج سہ پہر کے بعد اپنے کام پر نہیں جایا کرتے تھے۔ آرام کرتے' کہیں آنا جانا... یا پھر مسجد میں بیٹھ جاتے۔ مشاہد تاج مسجد کو ملنے والے چندے کا حساب رکھتے تھے اور یہ کام وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے بڑے ذوق و شوق اور ایمان داری سے سرانجام دیتے تھے۔

چونکہ خود مالی لحاظ سے خود کفیل تھے۔ چلتا کاروبار... نشست و برخاست ہی بھرے پیٹ کو ظاہر

کرتی تھی۔ لہٰذا سب ان پر آنکھ بند کرکے یقین کرتے تھے اور سچی بات یہ تھی کہ یہ یقین بے جا نہیں تھا۔

سو آج ابھی کافی عرصے بعد رجسٹروں میں اندراج وغیرہ کے بعد اب وہ مولانا صاحب کی دی گئی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب گفتگو ادھر ادھر سے ہوتی معاشرے کے نئے رنگ ڈھنگ' نئی ترجیحات' نئے مسائل پر آکر رک گئی۔

اور ایسے موضوع پر آپ معلومات رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔ سیر حاصل گفتگو ضرور کر سکتے ہیں۔ یہاں تو پھر بھی مولانا صاحب تھے اور یہ دونوں بھائی... بمشکل اخلاقیات کے لحاظ میں دوسرے کے چپ ہونے کا انتظار کرتے اور پھر بولتے چلے جاتے۔

"نئے زمانے کے یہ بچے... آپ گھر کے اندر جیسا مرضی ماحول دے دیں۔ لاکھ سختی کر لیں۔ حد بندیاں کرلیں' مگر بیرونی اثرات زہر قاتل بن رہے ہیں اور سدباب کی کوشش تو کیا؟ کم عقل والدین احساس سے بھی عاری ہیں۔"

مشاہد تاج نے مولانا صاحب کے کسی جملے پر تبصرہ کے گل بوٹے ٹانکے۔

"بد چلنی اور آوارگی بڑھتی جا رہی ہے۔ لڑکے کیا... لڑکیاں بھی... سب پر نظر رکھنی بڑا مشکل کام ہو گیا ہے۔" مولانا صاحب تمام جملوں پر اعراب کا لحاظ کرتے ہوئے لفظ حلق سے نکال کر کہتے تھے۔

"بجا فرمایا... خاندانوں کی تو شناخت ہی ختم ہو گئی ہے۔ بس جہاں سینگ سمائے نکل پڑتے ہیں۔ میں نے کئی خاندان دیکھے ہیں۔ کسی خوشی غمی میں اکٹھے ہوں تو تعارف ہی مشکل مرحلہ بن جاتا ہے۔"

"کہنے کو ایک خاندان ایک ہو گا۔ مگر فلاں داماد آرائیں اور فلاں شیخ ہے۔ بہو راجپوت ہے تو دوسری جاٹ... تیسرا اللہ جانے کون..." مجاہد تاج نے برا برا منہ بناتے ہوئے کہا۔

مولانا صاحب کے حلق میں سارے... ح... اٹک گئے۔ وہ تو آج ایک خاص مشن پر تھے۔ لیکن... ایک ہلکی سی کوشش...

"یہ قبیلے اور خاندان تو اس لیے بنائے گئے ہیں کہ انسان ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ باقی اللہ کی نگاہ میں تو سب انسان برابر ہیں۔ ہاں کسی کو برتری حاصل ہے تو فقط تقویٰ کی بنیاد پہ... یہ ذاتیں تو ہم انسانوں نے اپنے مفادات کے پیش نظر بنا رکھی ہیں۔ ہم کسی کو اعلا کہہ دیتے ہیں' کسی کو کم تر... جبکہ یہ ہمارا کام ہی نہیں' سب چہرے اللہ کے چہرے' سارے رنگ اللہ کے۔ نئے رشتے ناتے بناتے وقت... اب آج کل کے دور میں اگر خود کو اتنا محدود کر لیا گیا تو دنیا تو بہت چھوٹی ہو جائے گی۔ پھر معاذ اللہ ہم شکوہ کناں ہوتے ہیں کہ اللہ ہماری سنتا نہیں ہے اور..."

"کہنے' پڑھنے' سننے میں یہ باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ مگر عملی مظاہرہ بہت مشکل ہے۔ اب نمازی پرہیزی ہونا سب سے بڑی خوبی صحیح... مگر میں اپنی بیٹی کسی میراثی کے گھر نہیں دے سکتا۔ یا پھر کسی چوڑے

کے گھر بارات لے جاؤں۔"

"نا۔۔۔ نا۔" مشاہد تاج نے مولانا صاحب کا جملہ کاٹ کر نفی میں زور و شور سے سرہلاتے ہوئے نہ کہا۔ چھوٹے بھائی مجاہد تاج نے بھی ایسی صورت حال میں بھائی صاحب کی بات میں زور و شور سے سر اثبات میں ہلایا۔

مولانا صاحب نے دونوں کے ہر عضو سے جھلکتی ہٹ دھرمی کو تولا۔ پورا وزن تھا۔ انہوں نے پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کیا مگر تب ہی زبان جیسے خود چل پڑی۔

"مگر سلطان حیدر تو میراثی چوڑے نہیں ہیں۔ مجھے تو وہ صاحب بے حد پسند آئے اور ان کا بچہ بھی ماشاء اللہ۔"

"کک۔۔۔ کون سلطان حیدر؟" دونوں بھائیوں نے مولانا صاحب کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو۔۔۔

سلطان حیدر نے فون پر غور کرنے کا کہا تھا۔ پھر ایک روز بندھے ہاتھ کی درخواست لے کر دفتر پہنچ گئے اور اب مولانا صاحب کے ذریعے سفارش۔۔۔ گھر کی بات اس طرح باہر نکلی۔ نہ جانے کس طرح اپنے طیش پر قابو پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

دھاڑ اور چنگھاڑ۔۔۔ اور بہت تیز اونچا بولنا ایک ساتھ۔۔۔ یہ اس گھر کا رواج کبھی نہیں رہا تھا۔ سو طیش بھری ان آوازوں کے کان میں پڑتے ہی گھر کے ہر کونے سے افراد باہر نکل آئے۔ آواز کے تعاقب میں سب کے قدم بیرونی کمرے تک آکر رک گئے۔ عجب لاعلمی سے ایک دوسرے کو دیکھنے والے جو شانے اچکا کر معاملے سے ناشناسی کا اظہار کر رہے تھے۔ اب اپنے کانوں پر بھروسہ کرتے ہوئے خاموشی سے اندر سے ابھرتی آوازوں کو سننے لگے۔ لڑکیوں کو وہ تمام کونے اور درزیں معلوم تھیں جن کے ذریعے اندر جھانکا جا سکتا تھا۔

وہ ایک دوسرے سے چپکی تھیں۔ آڈیو۔۔۔ ویڈیو میں بدل گئی تھی۔ تایا۔۔۔ ابا اور چاچا۔۔۔ اور تینوں کی بیگمات۔۔۔ جو مجرم کنیزوں کی مانند دکھائی دیتی تھیں۔

"کیا خاک سمجھا ہوا اچھا آدمی نکلا وہ۔۔۔ اب گھروں کے اندر کی باتیں باہر کے لوگوں کی زبانوں پر ہوں گی۔" تایا ابا کی آواز تھی۔

"اب لوگ ہمیں سمجھائیں گے کہ۔۔۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔ دین اور معاشرہ کیا کہتا ہے؟ جب ایک دفعہ کہہ دیا کہ الگ ذات برادری کے لیے ہم صفحہ ہی پھاڑ دیا کرتے ہیں تو۔۔۔ بات تو وہیں ختم ہو گئی نا بھائی صاحب!" چاچا نے اپنی رائے پر فیصلہ چاہا۔

"بالکل۔۔۔" دونوں بڑوں نے سرہلایا۔

"اور ذات برادری کی شرط کو چھوڑو۔" ابا نے لہجہ دھیما کیا۔ "میری بیٹی ہے۔ میں نہیں دیتا تو نہیں دیتا۔ کوئی زبردستی ہے کیا؟ جب ایک دفعہ منع کر دیا تو کر دیا۔"

تائی اور چاچی کا چہرہ "تائیدا" مسلسل ہل رہا تھا۔ امی خاموشی سے صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اس طرح سے لعنت ملامت کرنے کے بجائے اگر یہ تینوں بتا دیں کہ کیا ہو گیا تو۔۔۔ کتنا اچھا ہو۔

"لیکن ہوا کیا ہے؟" چاچی کا سوال سب کے دل کا ترجمان ہو گیا۔

"کیا ہونا ہے۔" تایا جی داڑھی میں انگلیاں پھیر رہے تھے۔ چاچی کو گھورا، پھر اپنی بیگم کو اور بعد میں تاباں کی امی کو۔۔۔ وہ نگاہیں چرا گئیں۔

"وہ۔۔۔ سلطان حیدر۔۔۔ کناڈی کا آدمی نکلا۔۔۔ پیار اور عزت سے بتا دیا تھا۔ تحمل سے سمجھا دیا تھا کہ بھائی اصل کہانی یہ ہے ہم آئے تمہارا شکریہ 'خدا حافظ۔ مگر اسے شرافت شاید راس نہیں' یا شاید ہمیں ڈھیلا سمجھ رہا ہے۔"

"یہ کیسی بات کر دی آپ نے تایا جی! ڈھیلا کن معنوں میں؟" ٹھنڈے مزاج جمیل نے بھی پہلو بدلا۔ ساجد چاچا نے بھی سرہلا کر یوں ظاہر کیا کہ جیسے انہیں بھائی کا جملہ بالکل نہیں بھایا اور بیٹے نے بالکل صحیح کہا ہے۔

"اول تو اسے پہلے چکر کے بعد آنا ہی نہیں چاہیے تھا اور چلو اگر آگیا تو اتنا اندازہ ہی کر لیتا کہ جواب کیا ہو گا اور اگر اندازے لگانے کی حس نہیں تھی تو ہم تو واضح جواب دے رہے تھے نا۔ پہلے وہاں دفتر پہنچ گیا۔ میں نے پھر بھی عزت دی۔ بھائی صاحب طبیعت صاف کرنے والے تھے۔ میں نے ہی منع کیا کہ کیا اونچا بول کر بات اچھالوں مگر وہ۔۔۔ وہ امام مسجد سے ملا۔۔۔ اور انہیں بیچ میں شامل کر لیا کہ وہ ہمیں سمجھائے کہ گورے کالے کو ایک دوسرے پر سبقت حاصل نہیں اور۔۔۔" تاباں کے ابا نے غصے میں بولنا شروع کر دیا۔ یہ سوچے بنا کے بعض جملوں پر حد لگتی ہے اور اللہ ناراض ہو سکتا ہے۔

"لیکن ہوا کیا ہے؟" امی کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"کیا ہونا ہے۔" ابا نے اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے سگریٹ سلگایا اور طویل کش لے کر دھواں چھوڑا۔ گویا غصے کو نکالنے کے لیے ایک اور راہ دی۔

تایا جی نے مسجد میں پیش آنے والا سارا واقعہ بیان کیا۔

سب حیرانی سے سن رہے تھے اور تبصرے کر رہے تھے۔ اپنی اپنی رائے اور باہر کھڑی لڑکیاں سراسیمہ تھیں۔ یہ کون سی کہانی تھی اور کب ہوئی اور کس کا ذکر خیر تھا۔

"تم بلاؤ اس تسنیم کو۔ میں خود بات کروں گا اس سے ہمارے صبر کو نہ آزمائے۔۔۔ اور اپنی زبان میں سمجھا دے' کیونکہ اگر ہم اپنی بولی بولنے پر آگئے تو۔۔۔ پھر زندگی بھر کچھ اور سننے کے قابل نہیں رہیں گے وہ۔"

مردوں کے انداز میں آنے والی قطعیت اور سفاکی خواتین کو ہراساں کر گئی۔ ہراساں لڑکیاں بھی تھیں۔ مگر ان کے پاس بہت سے سوال تھے۔ معاملہ پکا تھا اور یہ کون لوگ تھے اور کس کے لیے' کب کیسے۔

"تم لوگ چلو۔" ماجدہ بولی۔ "میں معلومات کرتی ہوں۔" وہ سب سے سینئر تھی۔ مائیں دل ہلکا کیا کرتی تھیں اس کے آگے۔

☼ ☼ ☼

آپا تسنیم کو سخت سنائی گئیں اور ان کی ہمراہی میں اگلے دن تائی جی اور چچی جی کو روانہ کیا گیا کہ اس عورت کو سمجھا دیا جائے۔ کیوں اکلوتے بیٹے سے ہاتھ دھونے ہیں اور شرافت کو بزدلی نہ جانیں۔ ہم اپنی آئی پر آئے تو بڑھاپے میں وہ۔۔۔ دو دکھ جھیلنے پڑیں گے۔ (اولاد کا بھی۔۔۔ اور بیوگی کا بھی)

عین نکلتے وقت تایا جی نے ضوفشاں کو بھی ہمراہ کر دیا کہ گھر کی عورتوں کو گائیڈ کرتی رہے اور صحیح صورت حال معلوم بھی کرے اور آکر بتائے بھی۔

"اور ہاں نقاب مت کھولنا۔" ایک اور ضروری تنبیہہ کی گئی۔ وہ سرہلا کر پیچھے بھاگی تھی۔

اور واپسی پر ایک رپورٹ وہ تھی جو اس نے اپنے ابا۔۔۔ تایا' چاچو کو دی مگر ایک دوسری رپورٹ بھی تھی۔ جو جزئیات نگاری کا شاہکار تھی اور امی اور لڑکیوں کے لیے تھی۔ جو کرید کرید کر پوچھتی تھیں اور مزید سے مزید تر جاننے کی خواہش مند تھیں۔

بہت دن پہلے آنے والے بہت سے فروٹس اور آئس کریم کے پیک یہ سن کر کھائے گئے تھے کہ ابا کے کوئی دوست سالوں بعد ملنے آئے تھے۔ وہی لائے مگر آج ضوفی نے بتایا۔ وہ یہی فیملی تھی۔

ضوفی نے اس عالی شان گھر کے بارے میں بتایا۔ بہت باوقار خاتون انکل اور ان کا بیٹا۔

وہ اتنا خوب صورت اور دل کش نوجوان تھا کہ اسے دیکھ کر دیکھتے رہنے کی خواہش پل بھر کو بھی ہٹتی نہیں تھی۔ وہ انہیں اپنے گھر میں دیکھ کر حیران تھا۔ پھر جیسے اس پر شادی مرگ طاری ہو گئی۔ وہ نہ جانے اس بات سے باعلم تھا کہ نہیں۔ وہ سب اس کے گھر کیوں آئی ہیں۔

مگر۔۔۔ وہ بولایا پھر رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کی خوشی اور ہڑبونگ ہر حرکت سے عیاں تھی۔ اس نے ٹیبل کو انواع و اقسام کی اشیائے خورد و نوش سے بھر دیا۔

وہ وہیں آکر بیٹھ گیا تھا۔ چاچی جی کے تلخ لہجے اور تائی جی کے سمجھانے والے معاملہ فہم انداز کو سن رہا تھا۔ جاذبہ کے چہرے پر پھیلی شرمندگی اور مایوسی اور معذرت۔ وہ سر جھکا کر سن رہی تھیں اور بیٹا مصر تھا کہ وہ کچھ تو کھانے کے لیے لیں۔ جبکہ وہ پانی بھی حرام سوچ کر گئی تھیں۔

جاذبہ نے معذرت قبول بھی کی اور ہاتھ جوڑ کر معذرت کر بھی لی کہ ان کی وجہ سے ان سب کو اتنی ذہنی اذیت سہنی پڑی اور ان شاء اللہ آئندہ انہیں شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔



سب خواتین نے گھر کے مردوں کو آکر وہ سب اسی پیرائے میں بتایا جو وہ سننا چاہتے تھے۔ ہو بہو وہی الفاظ جو انہیں رٹوا کر گھر سے روانہ کیا گیا تھا۔

حقیقت میں تائی جی نے ایک بار تو بے حد ملتجی لہجے میں جاذبہ سے یہ تک کہہ دیا تھا کہ ان کی جانب سے مسلسل اصرار ان کے گھر کی بچیوں کے لیے زندگی کو تنگ کر دے گا۔ لہٰذا۔۔۔ اور شکستہ تاثرات کے ساتھ جاذبہ نے اس بات کو سمجھ لیا تھا۔

راوی نے اگلے ورق پر اب چین کا باب لکھنا تھا۔

سب ٹھیک ہو گیا جیسے۔

ہر بندہ اپنے کام سے لگ گیا۔

مگر ہاتھ کام کر رہے تھے۔ ذہن و دل میں ہلچل تھی۔ ایک پل کا سکون نہیں۔ ادھورے سوال نامکمل معلومات۔

سکون بھری رات میں کچھ لوگوں کی بے چینی حد سے سوا تھی۔

زاہدہ نے ہر جانب سے تسلی کے بعد ضوفشاں کا ہاتھ پکڑا۔ وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے لیے دبے قدموں اپنے کمرے کی جانب بڑھیں۔ سب رات میں مگن تھے۔ مگر ایک اور روح بھی بے چین تھی اور دبے قدموں اور بھینچے ہونٹوں کے تعاقب میں تھی۔ وہ کھڑکی سے لگ کر کھڑی تھی۔

زاہدہ کے پاس سوالوں کا ڈھیر تھا۔ وہ جواب کا انتظار کیے بغیر تواتر سے پوچھتی جا رہی تھیں۔ ضوفی کی نگاہیں ان کے پریشان چہرے پر ٹکی تھیں۔

"امی!" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ وہ زیادہ بولنا نہیں چاہتی تھی۔

"گھر۔۔۔ شان دار جو ہر لڑکی کا بلکہ ہر ماں باپ کا خواب ہو۔ لوگوں کی عمریں لگ جاتی ہیں۔ ایسا خواب صحیح ترتیب سے آنکھوں میں سجاتے ہوئے ہی۔

ماں۔۔۔ باپ۔۔۔ زبردست۔ اور لڑکا۔۔۔" وہ قصداً رکی۔ "کیا کہوں؟ اگر لڑکی کو اختیار دے دیا جائے تاکہ چلو تم کو حق دیتے ہیں اور قوت کہ گھڑلو اپنے لیے اپنی پسند کی صورت۔۔۔ کوئی قید نہیں۔ بناتی جاؤ۔ مٹاتی جاؤ، پھر دوبارہ نئے سرے سے جب تک مطمئن نہ ہو، بناتی رہو۔ تب بھی، وہ اس لڑکے جیسے نہ بنا پائیں گی۔ جیسا کہ خوابوں کا شہزادہ اللہ نے بنا کر بھیج دیا تھا۔"

زاہدہ کو چپ لگ گئی تھی۔ وہ بہت دیر بعد بولنے کے قابل ہوئیں "تمہیں ایک بات بتاؤں۔ یہ سارا اصرار اور پسندیدگی لڑکے کی ماں کی طرف سے نہیں تھی۔" وہ دھماکا کرتے ہوئے بولیں۔

"تصویر دیکھ کر جاذبہ لٹو نہیں ہوئی تھیں۔" انہوں نے ٹھہر کر حلق تر کیا۔ "تصویر لڑکے نے دیکھی تھی۔"

"امی۔۔۔" ضوفی نے اپنا ہاتھ ان کے پیر پر رکھ کر تھپتھپایا۔

"باقیوں کا تو پتا نہیں ہے، مگر میں۔۔۔ میں نے لڑکے کو دیکھتے ہی جان لیا تھا۔ یہ سارا بکھیڑا اس کا پھیلایا ہوا ہے۔ اسی نے تاباں کی تصویر کو دیکھا اور۔۔۔"

"تمہیں کیسے خبر ہوئی؟" زاہدہ ہکلائیں۔

"دو آنکھیں ہیں امی۔۔۔ اور ان کا رہنما دماغ۔۔۔ جو بہت تیز چلتا ہے، یہ تو سامنے کی بات ہے کہ۔۔۔" وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ امی ہمہ تن گوش تھیں۔

مگر دوسری جانب دیوار سے لگ کر کھڑی تاباں۔۔۔ دیوار ہی ہو گئی تھی یا چنی گئی تھی۔ اسے بار بار یہی شک ہوا تھا۔ مگر شک میں ہاں اور نہیں کی تکرار یکساں ہوتی

ہے جبکہ یقین مستند ہوتا ہے۔

"وہ۔۔۔ شخص۔۔۔ اس کے لیے۔۔۔" اس نے اپنے چکراتے سر کو دیوار سے لگا کر لمبے سانس بھرنے کی کوشش کی تھی۔



وہ مین گیٹ کی ایک ایسی آڑ کے پاس کھڑی تھی۔ جہاں سے باہر کی دنیا بہت دور تک نگاہوں کی حد میں آ جاتی تھی۔ اس نے اس عرصے میں پلکیں جھپکنے کے دورانیے کو بھی قصداً" روک رکھا تھا کہ کچھ بھی اوجھل نہ رہ جائے۔ چاٹ مال والا بچہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ خوش گپیوں میں مگن تھا۔ وہ سب اپنے مال کو سجا رہے تھے۔

وہ جب باہر نکلی تو ہاتھ میں پیسے تھے۔ وہ سیدھا اس بچے کے سر پر پہنچی جو گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے مال کو بیچنے کی سعی کر رہا تھا۔ اور وہ اتنا گھنا تھا یا پڑھایا ہوا کہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر ذرا نہ چونکا۔ "لے لو باجی۔ یہ پھنی اور ربر اور غبارے۔"

"دس دس روپے کی سب چیزیں ڈال دو۔" اس نے پچاس کا نوٹ اس کے سامنے کیا۔

"نہیں۔" بچے کی باچھیں چر گئیں۔

"کس کے لیے لے رہی ہو غبارے۔" کوئی اس کے پیچھے بولا۔

"اپنے بھائی کے لیے۔ کل اس نے ہوم ورک اچھا کیا تھا۔ میں نے وعدہ کیا تھا۔" اس نے مڑے بغیر جواب دیا تھا۔

"آپ کا بھائی خوش ہو جائے گا باجی!" بچہ تیزی سے تھیلی لہرا رہا تھا۔

"آج تک تم پیغام لاتے رہے ہو۔ آج ایک پیغام لے کر بھی جانا۔ صرف اتنا کہنا۔۔۔ لکا چھپی کا کھیل ختم ہوا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے جاذب سلطان!"

پکا بچہ پہلی بار بری طرح چونکا تھا اور چار ماہ کی کہانی چہرے پر پھر گئی۔ تھی وہ تھیلی لے کر اس میں گم ہو گئی۔



آئینے نے کبھی جھوٹ نہیں کہا تھا۔ اس نے تاباں مجاہد کو دیکھ کر ہمیشہ سراہا ہی تھا۔ اگر جو وہ قوت گویائی رکھتا تو ایک آدھ غزل بھی کہہ دیتا۔ اشعار بھی۔ آنکھوں پر۔ ہونٹوں پر۔ نزاکت پر۔ لطافت پر۔ عارض ور خسار کو گلابوں سے ملاتا۔ قامت کو قیامت کہتا جو ہر بار دیکھنے پر نئے سرے سے دل پر پڑتی تھی۔

تاباں مجاہد کی خود شناسی کا عالم کیا خوب تھا کہ وہ خود کو جانچنے کے لیے نہ تو آئینے پر یقین رکھتی تھی، نہ کسی دوسرے کی آنکھ میں آنے والی ستائش کو تولتی تھی۔

وہ بخوبی جانتی تھی۔ آئینہ الٹا عکس دکھاتا ہے اور اکثر ناک چڑھی دکھائی دیتی ہے اور کسی دوسرے کی آنکھ جتنی مرضی سحر زدہ رہ جائے، کسر چھوڑ دیتی ہے۔

وہ خود کو فاتح مانتی تھی اور ارد گرد سے بے نیاز چلتی تھی۔

وہ جانتی تھی۔ وہ ساحرہ ہے اور دنیا کو مسحور ہونا ہے۔ یہ حق ہے اس کا کہ اسے دیکھ کر ششدر رہا جائے۔

مگر کیا ایسا ہی ہوا ہو گا کہ کوئی اجنبی اسے اس سے زیادہ جان لے گا اور وہ بھی فقط تصویر دیکھ کر۔ اس نے پاگلوں کی طرح اپنا البم ٹٹولا تھا۔ بہت جلد اس نے جان لیا کہ برستے پھولوں والی بے پناہ آرٹسٹک انداز میں کھینچی جانے والی تصویر غائب ہے۔

لیکن اس کے پاس تو اس سے بھی زیادہ خوب صورت تصاویر تھیں۔

اگر وہ ان میں سے کسی کو دیکھ لیتا تو۔

اور کیا فقط تصویر دیکھ کر کوئی اتنا پاگل ہو سکتا ہے کہ ایسے الفاظ لکھ بھیجے جو زمین کے نہ لگتے ہوں۔ بار بار پڑھنے پر بھی سمجھ میں نہ آتے ہوں۔

وہ قسم کھا سکتی تھی کہ اس نے اسے کبھی روبرو نہیں دیکھا۔ وہ خوف زدہ ہوئی۔ اگر وہ اسے روبرو دیکھ لے تو پھر کیا کہے گا؟

پہلی نگاہ عموماً" بے تاثر ہوتی ہے۔ یا پر تکلف بناوٹی

ہوتی ہے۔ پھر مقابل کے لب کھلتے ہیں اور دھیرے دھیرے شخصیت کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ تب تاثر مکمل ہوتا ہے اور فیصلہ صادر۔

ایسے ہوا میں تیر کون چلاتا ہے۔ وہ رات کے اندھیرے میں سر پکڑے بیٹھی تھی لیکن انجان تھی۔

ایسا ہی جانے انجانے میں چلایا جانے والا تیر۔ جاذب سلطان کے سینے میں عین دل کے مقام پر گڑ گیا تھا۔ بھل بھل کرتا خون۔ اور تکلیف انتہا کی۔ مسیحائی کی صورت؟

کوئی نہیں۔



تاج ہاؤس میں تینوں دیورانیوں جٹھانیوں کا خوب گٹھ جوڑ تھا۔ سب کام اکٹھے سرانجام دیا کرتی تھیں۔ مائدہ مشاہد اور تاباں مجاہد ایک ہی گھر کے اوپر نیچے والے پورشن میں رہائش پذیر تھیں جبکہ چھوٹے چاچو ساجد کی فیملی کے لیے ساتھ والا پلاٹ خرید کر علیحدہ سے گھر تعمیر کیا گیا تھا۔ ساجدہ کے نکاح سے پہلے ایک اندرونی راستہ تھا مگر بعد میں اسے بند کر دیا گیا۔ اب صرف باہر لان سے گھر ایک تھا۔ چاچی جی گھر علیحدہ ہونے کی بنا پر اور کچھ مزاجاً" بڑی دو بھابھیوں سے ذرا الگ دکھائی دیتیں، مگر یہ اہل خانہ کی رائے تھی۔ باہر والوں کے لیے سب ایک تھیں۔ ایک ساتھ بازار جاتیں، لباس بھی ایک جیسے خریدتیں، انہیں خوشی غمی میں جانا ہوتا تو تب بھی اکٹھے ہی۔

صبح کا ناشتے سے فراغت کے بعد یا تو کامن میں براجمان ہو جاتیں اور جس کو جو بھی قابل سرزنش بات لگتی، سارے گھر میں اس کی آواز گونجتی ورنہ ہوادار بیرونی کمرہ تو مسکن تھا ہی۔

اول تو میاؤں کی منشا بنا ایک پتا بھی نہ ہلتا تھا مگر جو چھوٹی موٹی اپنی چلائی ہوتی تو دزدیدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے فیصلے بھی صادر کر دیتیں۔ رازداری کی پکی شرط کے ہمراہ۔

مگر۔ زاہدہ کو اس بار دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے جٹھانی اور دیوانی دونوں کے کندھے انتہائی ناقابل اعتبار لگے۔ وہ عام طور پر شادی شادہ بیٹیوں کو فون کر کے بلوایا نہیں کرتی تھیں، مگر اس بار کہہ بیٹھیں۔ "اگر فرصت ہو تو ایک رات کے لیے آجاؤ۔"

بیٹیاں سگی بہن کی بہویں تھیں۔ دونوں بیٹیاں افشاں اور نازاں اگلے دن بچوں کے ہمراہ حاضر تھیں۔

رات گئے سب تھکے ٹوٹے اپنے بستروں میں گئے۔

تب زاہدہ نے دھیرے سے افشاں کا ہاتھ تھاما اور نازاں کو آنکھ سے اشارہ کرتے کمرے کی جانب بڑھیں۔

ضوفشاں پہلے ہی چائے کے کپ لیے موجود تھی۔

جس تکان کو سارا دن مصروفیات کا چولا پہنا رکھا تھا، وہ اتار کر پھینکا تو اندر سے اور ہی صورت کی زاہدہ برآمد ہوئیں۔

اداس، پریشان، بے بس، ناکام اور بہت بوڑھی سی غم زدہ۔

آغاز سے اختتام تک تفصیل سے سنانے میں جہاں ضوفشاں کے جبڑے دکھ گئے۔ وہیں ان دونوں کے چہرے تحیر سے بگڑ گئے تھے۔ اور یہ سن کر تو باقاعدہ خوف زدگی پھیل گئی کہ یہ سارا کھیل لڑکے کی ایماء پر رچایا جا رہا ہے۔

"کیا ابا لوگ جانتے ہیں کہ لڑکے نے ہی یہ سارا زور ڈلوایا اور۔" افشاں کی آواز دھم ہو گئی۔

"توبہ کرو۔" امی نے جھرجھری لی۔

"تو آپ کو کیسے پتا چلا کہ۔" نازاں بمشکل بولی۔

"چل گیا پتا۔" ضوفی نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "جیسا وہ لڑکا ہے ناں۔ لوگ گھر آکر اپنی چاندنیاں، چکوریاں چھوڑ جائیں۔ مائیں اپنے بیٹوں کی قیمت سے واقف ہوتی ہیں اور بیٹا بھی جاذب سلطان جیسا۔ ان آنٹی کے اپنے دل کا اصرار ہوتا ناں تو ہماری جانب کے ایک بار ہونہہ پر تھو کر کے چل پڑتیں۔ مڑ کر بھی نہ دیکھتیں۔ مگر ان کا بار بار کا اصرار، منت اور چکر پہ چکر اور بات کرتے ہوئے آواز اور آنکھ کا بھیگ جانا صاف بتاتا ہے۔ کتنی مجبور ہیں اور بیٹے کو من پسند چیز لا دینے کا کتنا جنون رکھتی ہیں۔"

"کیا بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔" افشاں کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔

زاہدہ نے ٹھنڈے سانس لے کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

ضوفی نے بھی ٹھنڈی سانس بھری اور یخ چائے کے کپوں کو گھورنے لگی۔

"بعض اوقات زندگی ٹھنڈی چائے کا کپ بن جاتی ہے۔ بدرنگ، بدذائقہ اور اوپر جمی بدشکل موٹی تہہ۔"

کہنے کو وہ دونوں بہت صحیح عمر میں سگی خالہ کے گھر بیاہی گئی تھیں۔ عمر کا جوڑ تھا مگر معمولی صورت شکل اور یہ ملائی جیسی لڑکیاں۔

خالو کے نام کی کمائی عزت کا منافع اولاد دونوں ہاتھوں سے اڑاتی تھی۔ چار لوگ سلام کرنے آتے تھے۔ گلی میں آسمان چڑھی بلڈنگ ملکیت تھی۔ سو لوگ سر اٹھا کر دیکھتے تھے۔

صاف کلف لگے کپڑے پہن کر مرد گھر سے باہر جاتے تھے تو کمی کمین راستہ چھوڑ دیتے۔ چہروں پر شرافت نجابت تھی۔ جو ابا کے نزدیک پلس پوائنٹ تھی۔

ایک اچھی تصویر۔

مگر تصویر کا دوسرا رخ دوسری ہی طرح کا تھا۔ بلڈنگ کے نچلے پورشنز کرائے پر چڑھے تھے۔ آخری پورشن اور چھت ان کے مصرف میں تھی۔ آمدنی محدود تھی اور سیدھی خالہ کے ہاتھوں میں، وہ تھوڑی رقم کی تقسیم میں پریشان رہتیں اور انہیں ہلکان رکھتیں۔ سب سے مشکل کام سفید پوشی کا بھرم تھا۔ دنیا کے سامنے سب اچھا کی تصویر پیش کرنا ہوتی تھی۔ اور یہ اتنا مشکل کام تھا کہ بس۔

دونوں کے شوہروں میں آگے بڑھنے کا جذبہ نہیں تھا۔ وہ صبح و شام جو کام کر سکتے تھے۔ کر لیتے اور بعد میں جرگے سجائے لوگوں کے مسائل حل کرتے۔

دونوں کے میکے میں ان کے باپ تایا کی بھی ایسی ہی مصروفیات تھیں مگر وہاں رزق کی فراوانی تھی اور آسائش تھی۔ سو یہ سب چیزیں بری معلوم نہیں ہوتی تھیں بلکہ فخر محسوس ہوتا کہ ان کے ابا وغیرہ کی اتنی عزت اور اہمیت ہے۔ مگر یہاں

نازاں کے تین بچے تھے۔ گھر بہت چھوٹا لگنے لگا تھا۔ اگر نچلا پورشن خالی کروا کر بچوں کے لیے کمرا سیٹ ہو جائے اور ایک اچھا مہمان خانہ۔

وہ پھول بوٹوں والے لان سے اٹھ کر ڈبل ڈیکر بس جیسے گھر میں اب تک ایڈجسٹ نہ کر پائی تھی۔

ابا نے صرف سگا رشتہ دار دیکھا ہر شے سے نظریں پھیر کر۔ افشاں کو شوہر کی صورت پسند نہیں آئی تھی۔ اس پر امی نے کہا تھا مرد کی صورت کون دیکھتا ہے؟ وہ کہہ نہ سکی۔ مگر بیوی تو دیکھتی ہے ناں۔

اور نازاں تھی۔ چھوٹے سے گھر میں اس کا دم گھٹتا تھا۔ وہ میکے آتی تو صبح کی پہلی کرن کے ساتھ لان میں نکل آتی اور رات گئے اندر بستر میں جاتی۔

"امی! اب ان باتوں کا کیا مقصد۔ وہ سونے کا بھی ہو تو بے کار ہے ناں۔" افشاں بولی تھی۔

"آپ نے صدمہ کس چیز کا لگا لیا۔ اور تاباں کو تو اس سب کی خبر نہیں ہے ناں؟" نازاں کو خیال آیا۔

"تاباں کو اتنی تفصیلی خبر نہیں ہے اور صدمہ اس چیز کا لگ گیا کہ اب اس سے کم پر دل راضی نہ ہو گا اور اس جیسا ملے گا نہیں۔ مجھے تو بس دل ہلکا کرنا تھا تم لوگوں سے۔ الٹا تم لوگوں کو پریشان کر دیا۔"

بیٹیوں کے آرزدہ چہروں پر نگاہ پڑی تو زاہدہ کو شرمندگی نے گھیرا۔

"آپ شرمندہ نہ ہوں امی! ہماری دل وزنی سل سے بڑھ کر تکلیف دیتا ہے۔ کون دیکھ رہا ہے کہ آپ رو رہی ہیں یا ہم رو رہے ہیں۔ اللہ سب کے لیے اچھا کرے گا اور تاباں کے لیے بھی۔ وہ آپ کی بیٹی ہونے سے پہلے اللہ کی بندی بھی تو ہے ناں۔"



اتنے دنوں سے مچی ہل چل جیسے سکون پا گئی۔ زندگی دوبارہ رواں دواں۔ وہی صبح و شام۔ یہ سب یوں لگا جیسے ساکت جھیل کے پانی میں کنکر پھینکا۔ اچھال۔

دائرے پھیلے۔ پھر واپس سکڑے اور معدوم ہو گئے۔ جھیل ایک بار پھر ساکت تھی۔ شانت پر سکون۔ پانی پر دائرے نشان نہیں چھوڑتے۔ کوئی ثبوت نہیں۔

مگر۔

مگر۔

تہہ میں پڑا کنکر اور دل پر پڑا بوجھ۔

تاباں کو سانس مشکل سے آتی تھی۔

اس کے جوابی پیام کے بعد چھوٹی سی چٹ پر ایک جملہ لکھا ہوا آیا تھا۔

اور اس کے بعد سے چائنا مال والا بچہ خاموش ہو گیا تھا۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیزیں بیچتا۔ وہ کئی بار اس کے پاس ٹھہری تھی کہ وہ کچھ کہے۔ کوئی اشارہ کوئی پیام یا چلو شناسائی کی لہر ہی آنکھوں میں دوڑ جائے تو اس کا دل تسلی پا جائے۔

تاباں کے پاس وہ تمام خط محفوظ رکھے تھے۔ پہلے حیرت تھی کہ کوئی اسے خط لکھ سکتا ہے۔

اور اب بے یقینی کہ کوئی اسے ایسے خط لکھ سکتا ہے۔

وہ اس چٹ پر لکھے آخری پیام کو پڑھتی۔

"تم نے صرف میرا نام پہچانا' کاش تم مجھے پہچان پاتیں۔"

کیسے پہچان پاتی؟ روڈ پر کھڑے ہر انسان کو تو دیکھا تھا۔ ہر حلیے شکل کو۔ اچھے کو برے کو۔

"میں ذی ہوش انسان ہوں۔ مادی دنیا کے تمام لوازمات پورے کرتا ہوں۔ خریداری کرنے جاتا ہوں تو چند روپوں کی بچت کے لیے دکاندار سے بحث کرتا ہوں۔

کبھی دوستوں کے ساتھ ہلڑ مچانا ہو تو یا یونہی موج مستی کا موڈ بن جائے۔ تو بھوسے کے ٹرک کے اوپر جست بھر کے چھلانگیں مارتا چڑھ جاتا ہوں اور اونچی آواز میں تانیں اڑاتے ہر شے کو بھول جاتا ہوں۔

کلاس روم میں دلائل دیتے ہوں تو سب کو پچھاڑ دیتا ہوں۔

دروازے پر آئے جمعدار سے جھگڑ پڑتا ہوں کہ وہ کچرا کونوں کھدروں میں کیوں چھوڑ جاتا ہے۔

اور ان سب بے حد عملی اقدامات کے بیچ تم دھیان کے در پر دستک دو تو۔ تو۔

اب کیا بتاؤں۔ تم سے یقین کرنے کی کیا درخواست کروں۔ جب کہ مجھے خود یقین نہیں آتا۔

یا ٹھٹک جاتا ہوں۔ یا ساکت ہو جاتا ہوں پھر نجانے کتنے پل بیت جاتے ہیں۔ تم کیفیت لگتی ہو جو طاری ہو جاتی ہے۔

جیسے شاعر جب کاغذ قلم لے کر بیٹھتا ہے تو مادی دنیا سے روحانی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ وجود نظر آتا ہے۔ باطن غائب۔

تم میری زندگی کے ان لمحات کی طرح ہو جن کے گزرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے اب کتنے کم رہ گئے۔ کہاں گئے؟

شاعر آفاقی لفظوں کو جملے میں ڈھال کر ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔

آسمانی حرفوں کو زمینی لباس پھر سے حاضر ہو جاتا۔

مجھے لگتا ہے تم اور تمہارا دھیان چولا ہے جسے اتار کر میں جاذب سلطان بن جاتا ہوں۔ پہنا رہوں تو مجذوب کہلاؤں؟"

"پھر اتنی لفاظی کے بعد اب تم کہاں غائب ہو گئے۔ یہ عشق تھا کہ اشک۔۔۔ جو دھمکی کی ذرا سی دھونی سے آنکھ سے بہہ کر لڑھک گیا؟"

تاباں نے سوچا۔ امی اور ضوفی کی گفتگو سے اس نے جاذب سلطان کے گھر کا اندازہ لگا لیا تھا۔ علاقہ۔ محلہ۔ وہ ہمت کرے اور جا کر صبح سویرے کھڑی ہو جائے اور جاذب سلطان کے نکلنے کا انتظار کرے۔ ایک بار دیکھ تو لے۔ بس ایک بار۔

"یہ تو بے ایمانی ہوئی ناں جاذب سلطان!" اس نے کہنی میز پر ٹکائی اور ہتھیلی کی کٹوری میں گال کو رکھ کر گردن ڈھلکا دی۔ دوسرے ہاتھ کی انگلی سے وہ ورق پر انگلی پھیر رہی تھی۔

پیپرز سر پر آ گئے تھے۔ ضوفی جیسے پڑھاکو بوریا بستر سمیٹ کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ وہ بھی کبھی کبھار

ضوفی کے پیچھے پڑھنے اسی کمرے میں آ جاتی۔ لیکن اب نصاب میں جی نہیں لگتا تھا۔ دل کسی اور ہی کتاب کا سبق پڑھتا تھا۔

کاش میں کسی سے تمہاری شکایت کر سکتی۔

کتنے دن گزرے اب کوئی رابطہ نہیں تھا۔ کلاسز آف ہونے کے بعد کالج جانا بند تھا۔ تیاری کی چھٹیاں۔۔۔ شاید وہ آتا ہو لیکن نہیں' وہ جتنا باخبر تھا تو جانتا ہی ہو گا کہ۔۔۔

لیکن۔۔۔ اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ وہ گھر جانتا تو ہے۔

ضوفی کے ہلکی سی کروٹ بدلنے پر وہ چونکی۔ اس کے سینے پر کتاب دھری تھی۔ جو دھم سے زمین بوس ہو گئی تھی۔ وہ دبے قدموں اٹھی کتاب اٹھا کر ضوفی کے پیروں پر پڑی چادر صحیح طرح سے اوڑھا دی۔ اب وہ زیادہ محتاط روی سے رقعوں کے پلندے کو سنبھال رہی تھی۔

اگر جو کسی کو اس راز میں شریک کر لوں' مگر کہوں گی کیا؟ کیا ضوفی کو بتا دوں؟ مگر ضوفی' وہ اس کا سر پھاڑ دے گی' ورنہ اپنا تو پھاڑ ہی لے گی۔

وہ اسے اتنی باتیں سنائے گی کہ وہ شاید آئندہ کے لیے قوت سماعت ہی سے محروم ہو جائے۔

اس نے رقعے لیے ہی کیوں اور اس نے اسے بتایا کیوں نہیں۔ وہ حلق کے بل چیخے گی اور اس چائنا مال والے بچے کے تو دو کان کے نیچے دیتی تو سب اگل دیتا۔

اور پھر جب سارا بھید کھل گیا ہے تو وہ اب تک ان خطوں کو گلے سے کیوں لگائے ہوئے ہے۔ پھاڑ کے پھینک کیوں نہ دیے۔

اور بس۔۔۔

تاباں کے پاس اس آخری سوال کا جواب نہیں تھا اور ضوفی۔۔۔ ضوفی تو پہلے مرحلے ہی پر سب پرزہ پرزہ کر دیتی۔

سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے تاباں مجاہد۔۔۔ تم نے۔۔۔ ارے اللہ۔

اور یہیں تاباں کے پاس فقط سر جھکا لینے کے کچھ نہیں تھا۔

وہ سنتی اور دیکھتی رہی تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا اور چیزوں کو دیکھنا سمجھنا شروع کیا۔ اس کے خاندان کا یہی چلن تھا۔ اپنے دائرے میں مقید لوگ۔۔۔ اسکول' کالجوں' محلوں میں دیکھ کر آ ہی جایا کرتے تھے لوگ دست سوال دراز کر کے۔۔۔ اور ان سے ہمیشہ بھاؤ سے معذرت کر لی جاتی تھی۔ لڑکیاں تو لڑکیاں۔۔۔ لڑکے بھی پاسداری کرتے تھے۔

ہاں کبھی کوئی مثال اگر دور پار سے تھی بھی تو۔۔۔ وہ کسی لڑکے ہی کی جرات یا ہٹ دھرمی کی تھی مگر لڑکیاں۔۔۔ وہ گھر بیٹھی رہ سکتی تھیں۔ دگنی عمر کے مردوں سے بیاہی جا سکتی تھیں۔۔۔ بے جوڑ رشتے جوڑ لیے جاتے۔۔۔ مگر۔۔۔ اپنی بات سے انچ پیچھے نہ ہٹتے۔

مگر۔۔۔ اس تاباں والے معاملے میں ذرا سے اصرار کے بعد کی خاموشی اور پیچھے ہٹ جانا کوئی حیرانی نہ تھی۔ مگر دوسری طرف جو تاباں مجاہد کے ساتھ ہوا' وہ بھی تو کبھی نہیں ہوا۔

وہ کیسے ہضم کرے اس سب کو۔۔۔ کیا ہو گا اس کا۔۔۔ کیا کرے وہ ان کاغذوں کا پھاڑ پھینک دے؟ جلا دے؟ دریا میں ڈال دے؟

مگر ان پر سے لفظ جو دل پر نقش ہو گئے تھے۔ کیا انہیں کھرچ سکتی ہے؟

"تم کہاں چلے گئے جاذب سلطان؟"

☼ ☼ ☼

ضوفشاں کا رنگ فق تھا' حلق خشک۔۔۔ اسے معدے میں گرہیں پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ بار بار خشک لبوں پر زبان پھیرتی تھی۔ کوئی ہمدردی' کوئی ڈھارس' نصیحت اثر نہ کرتی تھی۔

وہ مسلسل زیر لب کچھ پڑھنا شروع کر دیتی' مگر اس میں بھی اٹک کر دوبارہ شروع کرتی۔

"یہ دم کیا ہوا پانی۔ بسم اللہ کر کے پی لو۔ ابھی افاقہ ہو گا۔" تائی جی نے گلاس بڑھایا۔ ضوفی کے بے رنگ

چہرے پر قرار سا پھیلا۔
سارے اہل خانہ اسے دیکھ رہے تھے۔ بعض فکر مندی سے۔۔۔ بعض کو گدگدی ہو رہی تھی اور بعض بے فکر تھے۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا۔ جیسے جیسے امتحان کے دن نزدیک آتے۔ ضوفی اپنا اعتماد کھوتی جاتی‘ اسے لگتا اسے کچھ یاد نہیں رہے گا یا وہ چکر کھا کر گر جائے گی۔ دن رات جاگ جاگ کر پڑھتی‘ بمشکل آنکھ لگتی تو اس میں بھی اسے عجیب و غریب خواب آتے۔ جیسے ابھی کی بدحالی کا سبب یہ تھا کہ ایک تو آج پہلا پیپر تھا۔ دوسرا اس نے خواب دیکھا کہ اس نے تو بہت شان دار پیپر دیا لیکن جب ٹیچر پیپرز اکٹھے کر کے لے جا رہی تھی تو۔۔۔ پانی کا بھرا جگ اس کی کاپی پر الٹ گیا اور اس کا لکھا ہر حرف مٹ گیا۔ خواب میں وہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی۔
اور حقیقت میں چیخ مار کے بیدار۔۔۔ تب سے سارا گھر تسلی کے لیے اکٹھا تھا مگر اسے ایک پل کا قرار نہیں۔
بابا ابا نے اس کی حالت دیکھی تو مولانا صاحب سے ایک تعویذ لا کر بھی دے دیا۔
پانی پی کر قرار ملا۔ مجاہد تاج اسی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی سب بیٹیوں میں سب سے بااعتماد‘ بہادر‘ دوٹوک‘ سچی‘ ستھری بیٹی۔۔۔ مگر یہ تو اس کا بچپن کا وتیرہ تھا۔ اس بار اس کی حالت بہت بری تھی شاید اس لیے کہ یہ امتحان اس کے میڈیکل میں داخلے کے لیے اہم ترین تھا۔
”میں تمہیں پاس کروا دوں گا‘ میری بڑی اوپر تک جان پہچان ہے۔“ بابا جی نے کہا۔
”نمبروں کی فکر مت کرو۔ میں تمہیں سیلف فنانس پر پڑھا سکتا ہوں۔“ ابا نے بھی تسلی دی۔
اس نے دونوں کو کڑے تیوروں سے گھورا۔
”ابا! میں عزت اور آن سے جینا پسند کرتی ہوں۔ کوئی مجھ پر انگلی اٹھائے ہی کیوں؟ میں انگلی نہیں توڑوں گی‘ پورا ہاتھ ہی جڑ سے الگ کر دوں گی۔“
”بہت خوب۔۔۔“ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ انوکھی بچی پیدا کی تھی۔ زاہدہ کے چہرے پر بھی مسکان آگئی۔
”امی! مجھے الٹی آرہی ہے۔“ ضوفی یک دم واش روم کی سمت بھاگی۔
”امی! آج آپ مجھے چھوڑنے چلیں۔۔۔ بلکہ جب تک میں پیپر دیتی رہوں‘ وہیں بیٹھ کر وظیفہ کرتی رہیں۔“ منہ خشک کر کے آتے ہوئے اس نے نئی فرمائش جڑ دی۔
”میں؟“ زاہدہ نے سب کو دیکھا۔ مجاہد تاج نے پل بھر سوچا اور اثبات میں سر ہلا کر اجازت دے دی۔
”آپ کپڑے وغیرہ نہ بدلیں۔ بس چادر لیں اور آجائیں۔ وین والا ابھی سارے شہر سے لڑکیاں لے کر امتحانی مرکز تک لے کر جائے گا۔ میرا سر تو اس سفر ہی میں پھٹ پڑے گا۔“ وہ اب گاؤن پہن رہی تھی۔
”بس دو منٹ۔۔۔ ٹھہرو۔“ زاہدہ اندر بھاگیں۔
”ابھی تک تو وین آئی ہی نہیں ہے۔“ اس نے وال کلاک دیکھ کر نئی پریشانی سر پر سوار کی۔ طلائی گھڑی پر بھی نگاہ دوڑائی۔ چہرے پر تفکرات کا جال بچھ گیا۔ رنگ پھر اڑ گیا۔ دھپ سے صوفے پر بیٹھی۔ اب وہ اپنے بیگ‘ کتابوں کو گھور رہی تھی۔
مجاہد تاج کو صبح سے مچائی گئی اس تھرتھلی پر ہنسی آگئی۔ ساتھ ہی بیٹی پر ترس۔۔۔ پیپر تاباں کے بھی ہو رہے تھے۔ وہ آرٹس کی لڑکی تھی۔ اگر رات گئے پڑھتی تھی تو سب کے سر احسان چڑھاتی۔ صبح دیر گئے تک سوئی بھی رہتی۔ انہیں بیٹی کے ڈاکٹری کے جنون کی خبر تو بچپن ہی سے تھی۔ اپنی ساری گڑیوں کو انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں ہی داخل رکھا کرتی تھی۔ بلکہ جب گڑیوں سے دل بھر جاتا تو گھر کا جو بندہ ہاتھ لگ جاتا اس کے منہ میں تھرمامیٹر ڈال دیتی۔ فری میں گھر بھر کا بی پی چیک اپ تو بار بار ہوتا ہی۔۔۔ اسٹیتھسکوپ کان میں اتنی دیر رہتا تھا کہ کان۔۔۔ سرخ ہو جاتا۔
خود انہیں بھی کئی بار انجکشن لگوانا پڑا تھا۔
لیکن انہیں اب یقین آگیا کہ وہ کتنی جنونی تھی اپنے شوق کے ہاتھوں۔۔۔ سنجیدہ قطعی۔

انہوں نے پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ جو تیزی سے ورق پلٹتے ہوئے کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ ساتھ ہی گھڑی دیکھ لیتی۔ کبھی اندرونی کمرے کی طرف جہاں زاہدہ گئی تھیں۔
مجاہد تاج کی نگاہ بڑے بھائی مشاہد تاج پر گئیں تو وہ بھی اسی نہج پر سوچ رہے تھے۔ انہوں نے ضوفشاں کی بات پر کبھی سنجیدہ جواب نہیں دیا تھا۔ سن کر بس سر ہلایا تھا کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔۔۔ مگر۔۔۔
”کوئی مضائقہ نہیں۔“ چشمے کے شیشے صاف کر کے آنکھوں پر چڑھاتے ہوئے وہ مسکرا دیے تھے۔
”چھوڑو تم گاڑی والے کو۔۔۔ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔۔۔ بلکہ روز ہی چھوڑ دوں گا۔ جب تک پیپرز ہو رہے ہیں‘ لے بھی لوں گا۔“ وہ موبائل اور چابی اٹھا کر بولے۔
”جی۔۔۔“ ضوفی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
”بند کرو اپنا منہ۔۔۔ اور آواز دو اپنی ماں کو۔۔۔ اب دیر نہیں ہو رہی ہے۔“ وہ دبنگ لہجے میں بولے۔



مجاہد تاج کو اپنی غلط فہمی کی تصحیح کرنا پڑی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اس طرح کا کوئی کام کرنے جا رہے تھے۔ ضوفی کا امتحانی مرکز گھر سے بہت دور شہر کے دوسرے کونے میں تھا۔ دوسرے اس نے اپنی ایک عزیز از جان دوست کو بھی ہمراہ لے کر جانا ہوتا تھا جو اپنے کالج کے گیٹ پر اس کا انتظار کر رہی ہوتی تھی۔
مجاہد تاج نے دیکھا کہ شاید ہزاروں کی تعداد میں لڑکیاں تھیں۔ رنگ برنگی ہر طرح کی شکل و صورت اور حلیوں کے مالک۔۔۔ متفکر چہرے۔۔۔ تیز قدم۔ گردوپیش سے انجان رٹے لگاتی۔ کچھ ایسی جو آنے والے کڑے وقت پر لعنت بھیج کر خوش گپیوں میں مصروف رہتی تھیں۔ ایک ان کی بیٹی تھی۔ ہل ہل کر انگلش کے ناقابل فہم سائنسی ناموں کے رٹے لگاتی۔
ان کا خیال تھا کہ وہ اکیلے ہی ہیں جو یہ عظیم کام کرنے لگے ہیں کہ اپنی بیٹی کو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت دے رہے ہیں۔ مگر نہیں۔۔۔ یہاں ہر عمر کے لوگ تھے۔۔۔ مائیں۔۔۔ بہنیں۔۔۔ بھائی۔۔۔ باپ۔۔۔ دادا۔۔۔ نانا تک بچیوں کو چھوڑنے آرہے تھے اور وہ خود تو چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ یہاں کئی تھے‘ جو پورا وقت گیٹ کے باہر ہی کھڑے رہتے۔
پانچ بچوں کے باپ ہونے کے باوجود زندگی میں پہلی بار وہ اس قسم کی مصروفیت میں گھرے تھے۔
ادھر تاباں کا امتحانی مرکز گھر سے نزدیک تھا اور پیپرز کے دن بھی الگ تھے۔ وہ ضوفی جیسی قطعی نہیں تھی۔ پیپرز ہیں تو کیا؟ پاس ہی ہونا ہے نا ہو جائیں گے۔
تاباں مزے سے وین میں سوار ہو کر جاتی۔
ضوفی کے پیپرز کے اختتام سے دو پیپر پہلے تاباں فارغ ہو گئی۔ تو زاہدہ کی جگہ وہ ساتھ جانے لگی۔ ضوفی کا ہر پیپر میں حال‘ بے حال ہی ہو جایا کرتا تھا۔
”السلام علیکم ابا!“ یہ بھرپور آواز ضوفی کی تھی۔
”السلام علیکم ابا!“ دوسری چہکتی آواز تاباں کی۔
مجاہد تاج اپنی شان دار گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھے۔ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر دھرے تھے۔ سورج ونڈ اسکرین کے اوپر سیدھا پڑ تا تھا۔ مجاہد تاج کا نظر کا چشمہ۔
”تمہاری سہیلی کہاں ہے؟“
”آج آخری پیپر تھا نا ابا۔۔۔ وہ اپنے بہن‘ بھائیوں کے لیے رول‘ سموسے خرید رہی ہے۔ اتنے مزے کے سموسے ملتے ہیں ابا! اس کالج کی کینٹین سے کہ بس۔۔۔“
ضوفی نے تفصیلی جواب دیا۔ یہ پہلا دن تھا کہ اس نے پیپرز کے علاوہ ایک علیحدہ طویل جملہ کہا تھا۔ وہ جاتے وقت ورق پلٹ پلٹ کر رٹے لگاتی تھی۔ ہر سوال ہی اہم لگتا اور واپسی میں دیکھتی۔ آیا صحیح کر کے آئی ہے یا نہیں۔ ابھی بھی یہی مصروفیت تھی۔
”تو تم بھی لے لیتیں۔“ ابا بیک ویو مرر میں اسے دیکھ رہے تھے۔
”میں نے تو پہلے ہی خرید لیے ابا۔۔۔ کل کھا کر جب گھر میں تعریف کی تو سب نے کہا‘ لے کر آنا۔“ تاباں

نے ایک بڑا شاپر اٹھا کر دکھایا۔

"اتنا تو رش لگ جاتا ہے' چھٹی ہوتے ہی... جگہ ہی نہیں ملتی رش میں گھسنے کی' سموسے کیا خاک ملنے تھے۔" تاباں نے جوشیلے لہجے میں بتایا۔ ساتھ ہی ایک چاکلیٹ کا ریپر کھولا۔ ایمان داری سے دو حصے کیے۔ ایک ضوفی کی جانب بڑھایا۔ دوسرا اپنے نقاب کے اندر ہاتھ ڈال کر منہ میں رکھ لیا۔

ضوفی کی دوست ہانپتی کانپتی اجڑے حلیے میں آگئی تھی۔ السلام علیکم انکل کہہ کر سیٹ پر گر گئی۔ وہ اپنا عبایا اور نقاب جو اجڑ گیا تھا' اسے سیٹ کر رہی تھی۔

"تو تم مجھے کہہ دیتیں' جب میں نے اپنے لیے' لیے تو تمہارے بھی لے لیتی۔" تاباں بولی۔

"بس... ذہن سے نکل گیا۔"

"ابا! اب چلائیے نا گاڑی... آپ اب تک کیوں رکے ہوئے ہیں۔" سیٹ ہو کر بیٹھے' جب دیر گزری تو ضوفی نے چونک کر کہا۔

چونکہ مجاہد تاج کے چہرے پر تمازت سی تھی۔

"آں... وہ رش ہے ادھر..."

"آخری پیپر ہے نا ابا... آج کسی کو گھر جانے کی جلدی نہیں ہے۔" ضوفی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ تاباں کی کسی بات کو سننے کے لیے ترچھی ہو کر بیٹھی تھی۔

"اس میں ایسی کوئی شے نہیں بچی ہے کہ جو میں اسے پہچان سکتی۔ مگر جب وہ حلق پھاڑ کر ہنسی نا' وہ جناتی قہقہہ... تب میں چونکی اور پھر پہچان گئی۔ اتنی موٹی... اتنی موٹی پوری عورت لگ رہی تھی۔"

یہ تینوں ایک ہی اسکول سے میٹرک تھیں اور آج تاباں نے ایک ایسی کلاس فیلو کو دیکھا تھا جو میٹرک کے پیپرز کے اگلے ماہ بیاہی گئی تھی۔ آج اپنی کسی نند کے ہمراہ آئی تھی۔

"ضوفشاں... کیا تمہیں وہاں سامنے بلیک اور بلو ہیوی بائیک نظر آرہی ہے۔ وہ وہاں آئس کریم شاپ کے پاس؟" مجاہد تاج نے بہت ہلکے لہجے میں ضوفی کو پوچھا۔

مجاہد تاج کی آنکھوں پر چشمہ ہنوز تھا۔ وہ اس کی سمت جھکے ہوئے تھے اور نظریں اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں کے تاثر نے ضوفی کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑا دی۔ اس نے بے ساختہ ٹارگٹ کو دیکھا۔

"کیا تم اس لڑکے کو پہچان رہی ہو؟ دیکھا ہے نا اس کو پہلے؟"

"ابا میں... لڑکے کو..." ضوفی کی آواز گھٹی...

بائیک سوار نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلا کر سر کو دائیں بائیں زور سے جھٹکا دیا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر گھوما تو اس کا چہرہ بالکل سامنے ہو گیا۔ تب ضوفی کی آنکھوں میں سراسیمگی پھیلی اور متزلزل تاثرات والے مجاہد تاج کی آنکھوں میں درشتی کے بعد آگ کی لپیٹیں سی نکلنے لگیں۔

ضوفی کی ہتھیلیاں تر بتر ہو گئیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے باپ کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر پھر آئس کریم شاپ کی جانب دیکھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جیسے پورے جسم کی طاقت لگا کر بھاگتی آئی ہو۔ بائیک سوار کا چہرہ ہیلمٹ کی آڑ میں چھپ چکا تھا۔ فاصلہ بہت تھا۔ مگر ضوفی کو صاف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ان ہی کی گاڑی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ضوفی نے باپ کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے چھلکتی کیفیت کو وہ کوئی نام نہ دے سکی۔

اب وہ تاباں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں لیزر شعاعیں بن گئی تھیں۔ فیصلے کی گھڑی... مگر تاباں بہت ہلکی آواز... مگر تیزی سے اسکول فیلو کی شادی شدہ زندگی کو سنا رہی تھی۔

"ایک بیٹا ہے... رہتی تو کہیں پنڈی میں ہے۔ شوہر کی جاب ہے وہاں مگر سسرال ادھر ہے۔ جس شوہر کی تعریفیں کر رہی ہے نا' وہ اس وقت اس کا ماما لگتا تھا۔ مگر مجھے لگ رہا ہے اب یہ اس کی۔ ہی ہی ہی۔"

اتنے دن کی بور مصروف رٹے لگا لگا کر حلق خشک ہونے کے بعد نیا موضوع ہاتھ لگا تھا۔

ضوفی ذہین تھی۔ اپنی عمر کے حساب سے چہرہ شناس بھی... اور دوسرے وہ تاباں کی بہن تھی اور اسے جانتی تھی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ تاباں اس سب سے بے خبر ہے۔ اس کا سارا دھیان قصے کی طرف تھا۔ ابا کی موجودگی کا لحاظ تھا۔ سو آواز مدھم تھی۔

ضوفی کو اپنے دل کے کہے پر یقین تھا مگر ابا... کاش اس میں اتنی ہمت پیدا ہو سکے کہ وہ ابا کے چہرے کو جانچے... یا کم از کم ایک بار دیکھ ہی لے... مگر نہیں تو یہ...

مجاہد تاج نے گاڑی کو ریورس کر کے مین روڈ پر نہیں نکالا... جیسا کہ روز کرتے تھے۔ جس رش کا وہ ذکر کر رہے تھے۔ بہت تیزی سے وہ اسی میں سے نکلے۔ راؤنڈ اباؤٹ سے سیدھے جا کر جب ٹرن کر کے دوسرے روڈ پر آئے تو گاڑی سیاہ بائیک کے بالکل پاس سے گزری۔ یہ ایک فالتو کا لمبا چکر تھا مگر نہ جانے کیوں انہوں نے اسے اختیار کیا۔ ہیلمٹ میں چھپے چہرے کے تاثرات نظر نہیں آسکتے تھے۔ مگر ضوفی کو یقین ہوا۔ وہ مجاہد تاج کے عین پیچھے بیٹھی تاباں مجاہد پر ہی نظریں گڑائے بیٹھا ہے۔

اور اسی لمحے مجاہد تاج ویو مرر میں تاباں کو دیکھ رہے تھے اور ضوفی مجاہد تاج کو... زناٹے سے گاڑی روڈ پر بھاگی تھی۔

"یا اللہ اب کیا... بائیک سوار گاڑی کا پیچھا... ارے مالک..." ضوفی نے شدید خوفزدگی کے عالم میں آنکھیں میچ لی تھیں۔

مجاہد تاج نے گاڑی کے اسپیڈ میٹر کی جانب دیکھنا گویا گناہ سمجھا تھا۔

ضوفی کی دوست کو اتارا' وہ شکریہ انکل جیسے الفاظ بہت سجا بنا کر کہنا چاہتی تھی مگر اس کے حلق تر کرنے تک گاڑی زن ہو گئی۔

تاباں کا دل بھرا نہیں تھا۔ وہ اب ضوفی کو دوبارہ سب سنانا چاہتی تھی مگر ضوفی نے آنکھیں موند لیں۔ گاڑی گھر کے گیٹ پر رکی تو تاباں پرس اور سموسوں کا شاپر سنبھالتی سرعت سے اندر بھاگی۔ من من کے قدم تو ضوفی کے تھے۔ اس میں جنبش کی طاقت بھی نہ تھی۔

"کیا تم نے پہلے کبھی اس بائیک کو اپنے اردگرد کہیں دیکھا؟"

"نن... نہیں ابا!" ضوفی نے تیزی سے کہا۔ "کبھی نہیں... قطعی نہیں۔" اس کا لہجہ قطعیت سے بھرپور تھا۔ مجاہد تاج کی آنکھوں میں تشکیک کے رنگ حاوی تھے۔

"آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے ابا!" بات سچ اور جھوٹ کی تھی۔ ضوفی کے اندر کی صاف گو لڑکی کا لہجہ قطعیت سے بھرپور ہو گیا۔ مجاہد تاج نے آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

ضوفی کا دل مطمئن تھا۔ اس نے ایک بار بھی پلک نہ جھپکی۔

"کر لیا اعتبار... لیکن..." انہوں نے ٹھنڈا طویل سانس بھرا۔ وہ اب کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہے تھے۔

"کیا تم اتنے ہی یقین سے کہہ سکو گی کہ تاباں بھی اس کی موجودگی سے بے خبر تھی؟" ضوفی نے حلق تر کیا۔ اسے لگا یہ سب سے مشکل سوال تھا' مشکل مرحلہ...

مجاہد تاج کی نگاہیں لوہے کی گرم سلاخ تھیں اور اس کے چہرے پر داغی جا رہی تھیں۔

"وہ تمہاری بہن ہے۔ تم ایک کمرا' ایک بستر... ایک رستہ استعمال کرتی ہو ضوفی... میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔" ضوفی کی نگاہیں اپنی ہتھیلیوں پر جمی تھیں۔

"تاباں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

جملہ مکمل کر دینے کے بعد ضوفی کو لگا۔ وہ اتنی دیر سے ننگے تار پر کرتب دکھانے کے سے انداز میں چل رہی تھی۔ اچانک سرے پر پہنچ گئی ہو۔

جو طمانیت اس کے دل میں پھیلی تھی۔ اس نے اس کا عکس اپنے باپ کے چہرے پر بھی دیکھا۔ اسے دھیان آیا تو یکدم گردن گھما کر پیچھے گلی میں دور تک دیکھا۔

بائیک سوار ان کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ اس کی بے ساختہ حرکت مجاہد تاج کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔

”میں تمہیں ایک بات بتاؤں... جو یقیناً“ تم نہیں جانتی ہو گی۔ میں نے اس بائیک کو گلی کے کونے میں اسی رستے میں تین، چار بار یا شاید اس سے زیادہ مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ بس سوار کو آج دیکھا ہے۔“

”جاذب سلطان!“ ضوفی کے بس لب ہل سکے تھے۔ اس کے سر پر کسی نے لوہے کا وزنی گرز مارا تھا۔

”ہاں!“ اس کے منہ سے یوں ہی نکلا۔



ضوفی کے چہرے پر پھیلا سوچ کا رنگ اور آنکھوں کا اضطراب حیران کن نہیں تھا۔ اس نے اب رزلٹ آنے تک یوں ہی رنگ بدل بدل کر خود کو پریشان کرنا تھا اور اس بار چہرے پر تھکن بھی پہلے کی نسبت بہت زیادہ تھی۔ وہ خاموش تھی اور محفل میں ہوتے ہوئے بھی جیسے نہیں ہوتی تھی۔ یا تو سوچ کا گہرا ترین رنگ، یا آنکھوں میں بے حد خالی پن۔

دوسری جانب تاباں، جس نے امتحان دیے تھے کہ دینے ہی تھے۔ مگر فراغت کا جشن وہ زیادہ دھوم دھام سے منانا چاہتی تھی اور جشن کے ڈھنگ انوکھے...

”ماں! پانچ، سات سوٹ دلا دیں۔“

”پانچ، سات... یعنی بارہ سوٹ۔ بہن ہوش میں رہو، شادی مائدہ کی ہونی ہے تمہاری نہیں۔“ ماجدہ بولی۔

”میں مائدہ کی شادی کی بات نہیں کر رہی... مجھے تو بس کچھ نئے ڈیزائن پسند آ گئے ہیں۔ وہی ٹرائی کرنے ہیں۔“

”جو بھی کہو... میں اتنے بہت سے پیسے تم اکیلی کو کبھی نہیں دے سکتی۔ ایک، دو کی بات ہوتی تو مان بھی لوں۔“ امی نے صاف جواب دیا۔

”اچھا آپ اپنے والے ایک، دو کے پیسے دیں۔ باقی میں ادھر، ادھر سے مانگ لوں گی۔“ اس نے مصالحت کی راہ اختیار کی۔ ”ایک تو تائی جی بھی لے کر دے دیں گی۔“ تائی جی مسکرانے لگیں، جواب نہ دیا۔

”دراصل تائی جی... پھر اس مائدہ نے اپنی شادی کے کپڑے بنانے شروع کر دینے ہیں۔ تکیوں پر کڑھائیاں، لحافوں میں ڈورے... تو پھر میں بیچ میں اپنا کام ڈال دوں گی تو اچھا تو نہ لگے گا نا۔ میں تو ان فرصت کے دنوں سے فائدہ اٹھانا چاہ رہی تھی۔ پھر ماشاء اللہ مائدہ کے پاس اپنے کاموں کا وقت ہی نہ...“

”میں لے دوں گی۔“ تائی جی نے تصور کی آنکھ سے مائدہ کو جھلملاتے کپڑوں کے ڈھیر میں گھرا دیکھا۔ چہرے پر مسکان آن رکی۔ اللہ کے حکم سے وہ وقت بس آیا ہی چاہتا تھا۔

تاباں کی چال بازی پر سب نے اسے گھورا تو وہ شانے اچکا کر رہ گئی۔

تاباں کی عجلت... چال بازی... اور منوا کر ہی اٹھنے والی ان حرکتوں سے سب واقف ہی تھے۔ اس میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ اس نے جوطے کر لیا۔ وہ ہو کر ہی رہے گا۔ اب سب بازار جانے کا دن طے کر رہے تھے۔ تاباں بتا رہی تھی کہ اب اسے سب سے اچھے والے سوٹ کے پیسے ابا سے لینے ہیں۔

اور ابا اس وقت بیرونی کمرے کی اس کھڑکی کے ساتھ بیٹھے تھے، جو اندر کامن میں کھلتی تھی۔ وہ تاباں کو سن رہے تھے۔ اسے جانچ رہے تھے۔ کوئی قابل گرفت حرکت... جو بعد کا سرا پکڑا دے۔ مگر وہ مگن تھی۔ ہنستی مسلسل بولتی، سب کو بلاتی۔ بلکہ گفتگو میں ایک مرحلہ یہ بھی آ گیا کہ ضوفی بھی ان کے بیچ میں شامل ہو کر بڑھ چڑھ کر بولنے لگی۔

مجاہد تاج نے اس دن کے واقعہ کا کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ چھپانا مقصود نہیں تھا، مگر وہ سوچ رہے تھے کہ کیا کہیں گے یا کس طرح... انہوں نے سوچا کہ وہ سلطان حیدر کے گھر جا کر اب اپنے طریقے سے بات کریں، مگر یہ خیال بھی مسترد کر دیا۔ بڑے بھائی سے ہر معاملے میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ وہ اس دن سے آتے جاتے راستوں کو بغور دیکھتے ہر بائیک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے۔ لڑکیاں اب کالج نہیں جا رہی تھیں۔ وہ فرصت کے مزے لوٹ رہی تھیں۔

اس روز انہوں نے ضوفی پر اعتبار کیا اور پھر ضوفی کے اعتبار پر بھی اعتبار کر لیا۔

پہلے سگے بھائیوں سے ہر بات کہہ لینے کی عادت تھی، مگر اس بار تھوڑا جھجک گئے۔ ایک معمولی سا شک یا کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا آگا پیچھا کچھ نہ ہو۔ رشتہ آنے تک ٹھیک تھا، مگر جیسے جاذب سلطان کو وہاں کھڑا دیکھ کر ان کے ذہن نے بہت آگے تک کی بنت کر لی تھی۔ سننے والا بھی اپنی مرضی سے سوچے گا اور پھر زندگی بھر ان کی بیٹی کے نام کے ساتھ ایک واقعہ مثال کے طور منسوب ہو جائے گا۔

نہیں... بہتر ہے وہ خاموش رہیں۔ لڑکیاں اب گھر کے اندر تھیں اور گھر قلعے کی طرح تھا۔ ان کی منشا کے بغیر وہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ اگر خدانخواستہ آگے کچھ اور صورت حال ہو گی تو پھر اسے اس حساب سے دیکھ لیں گے۔ ابھی مصلحت بھری خاموشی اور پہلو تہی بہتر ہے۔

لیکن! بے حد ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچے گئے فیصلے کے باوجود جب آنکھوں کے آگے وہ بائیک آتی جاذب سلطان کا سر جھٹک کر بالوں میں انگلیاں پھیرنا تو لگتا جیسے جسم میں لہو کی جگہ آتش فشاں کا سیال بہہ رہا ہے۔

ساری مصلحت بھری سوچوں پر پانی پھر جاتا اور ایک ناقابل فہم کیفیت میں جسم جلنے بھننے لگتا۔

”وجہ کچھ بھی رہی ہو... بھلے سے وہ سڑک میری جاگیر نہیں ہے، مگر تمہیں وہاں کھڑے ہونے کی بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔“ مٹھیاں بھینچ کر سوچا تھا۔

اور اس سوچ کو اتنی جلدی عملی جامہ پہنانا پڑ جائے گا۔ اس کی خبر انہیں خود بھی نہیں تھی۔



جمیل بھائی لڑکیوں کے اس گروپ کو اپنی امی کی سربراہی میں بازار چھوڑ گئے اور کہہ دیا کہ جب فارغ ہو جائیں تو کال کر لیں۔ وہ آ جائیں گے۔

اب ادھر کہنے کو صرف کپڑے خریدنے تھے، مگر وہ میچنگ بیل کے لیے ہر گلی میں خوار ہوتیں پھر بٹن... پھر ڈوریاں... پھر فلاں اور ڈھمکاں... سوٹ پل بھر میں پسند کر لیتیں بس ان چھوٹی چیزوں پر گھنٹوں لگاتیں اور اب بھی شاپنگ مکمل نہیں ہوئی تھی، مگر دن ڈھل گیا تھا اور ہمت جواب دے گئی تھی۔ باقی کا کام اگلے کسی روز پر اٹھا کر واپسی کا قصد کیا۔

واپسی پر وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ جب جمیل بھائی کی جگہ مجاہد تاج کو ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھا۔

”ہاں، جمیل ہی آ رہا تھا مگر عین وقت پر کسی ضروری کام سے جانا پڑا۔“ چاچی جی کے استفسار پر انہوں نے سرسری لہجہ اپنایا اور یہ کوئی قابل گرفت وجہ نہیں تھی مگر ضوفی کا سر جھک گیا۔ وہ پیپرز کے بعد آج گھر سے نکلی تھیں۔ اس نے تاباں کو دیکھا وہ خاموش تھی اور تھیلوں کے اندر منہ گھسائے ہوئے اپنی چیزوں کو بصد شوق دیکھ رہی تھی۔

ضوفی نے ایک بار نظریں اٹھا کر باپ کو دیکھا۔ ان کا سارا دھیان گاڑی کی جانب تھا، مگر جب یونہی یک دم پل بھر کو نظریں چار ہوئی تھیں تب ان آنکھوں میں چھپا پیام۔

ضوفی کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اس نے گردن موڑ کر بھاگتی گاڑیوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ چاچی جی ماجدہ سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ ماجدہ ایک آدھ ٹکڑا لگا دیتی۔ تاباں گانٹھ کھولے بنا تھیلوں ہی میں گھسی ہوئی تھی، جب گاڑی کے ٹائر بری طرح چرچرائے کہ سب بری طرح اچھلیں اور آگے براجمان ضوفی کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا۔ کان کا پردہ پھاڑتی آواز نے کئی اور گاڑیوں کو بھی بریک لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سب کو یقین ہوا ٹائر سے چنگاریاں ضرور نکلی ہوں گی۔ سب نے حواس بحال ہونے پر مجاہد تاج کو دیکھا، جن کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور اسٹیئرنگ پر جمے ہاتھوں کی رگیں نمایاں ہو رہی تھیں۔

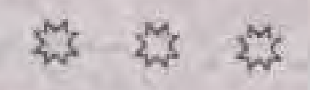
چاچی جی نے سنبھل کر ”بھائی جی“ کہا اور زیر لب آیات پڑھنے لگیں۔ لڑکیاں اپنی پیشانی مسلتے ہوئے حجاب درست کرنے لگیں۔ تاباں کے تو تھیلے ہی گر گئے تھے۔

فقط ضوفی کو کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے باپ کا چہرہ دیکھا۔ شام ڈھل چکی تھی اور چشمے کے شیشے چمک رہے تھے۔ اس نے باپ کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا اور اس کا دل بند ہو گیا وہ سیاہ بائیک ان کی گاڑی کے پاس غیر محسوس انداز میں ہلکی ہوئی اور پھر زن سے آگے نکل گئی۔ ضوفی نے تاباں کو دیکھا۔ اس کی ہتھیلی پر پانچ خوب صورت بٹن پڑے تھے۔ وہ بہت الجھن سے کہہ رہی تھی۔

"باقی کے تین نیچے گر گئے ہیں۔ کہیں پاؤں کے وزن سے ٹوٹ ہی نہ جائیں۔ دھیان رکھو۔" وہ متلاشی نگاہوں سے نیچے دیکھ ہی رہی تھی۔

مجاہد تاج نے یک دم گاڑی بڑھائی۔ اس بار رفتار بہت تیز تھی۔ وہ یقیناً" بائیک کا تعاقب کرنا چاہ رہے تھے، مگر بائیک کہیں نہیں تھی۔ ناکامی کا احساس سرخی میں بدل رہا تھا اور سرخی کالانت سیاہی۔۔۔

تب ہی ضوفی اور مجاہد تاج کی نگاہ گھر سے دور پارک کے گیٹ پر گئیں۔ جاذب سلطان ان ہی کے انتظار میں رک گیا تھا۔



زمین میں دبا بیج راز ہوتا ہے۔ ایک بار کونپل پھوٹ جائے تو سب عیاں ہو جاتا ہے۔ رنگ روپ نسل قد کاٹھ اور پھل۔۔۔

سب کونپل کو دیکھتے ہیں۔ زمین نے کلیجہ شق ہونے پر تکلیف کو کیسا جھیلا۔ یہ کبھی نہیں سوچتے زمین بتاتی نہیں ہے نا، مگر مجاہد تاج چیخ رہے تھے اور چلا رہے تھے۔ ضوفی کو تو پلک جھپکتے ہی کا سا وقفہ لگا۔ اس نے تایا اور چاچا کو تیز قدموں سے اندر آتے دیکھا تھا اور جمیل بھائی ــــ کا چہرہ سنجیدگی اور گمبھیرتا کی تصویر تھا اور شکیل، عقیل جو نا سمجھی کے عالم میں مجاہد تاج کو سن رہے تھے اور پھر ان کے جبڑے بھینچنے لگے۔ آنکھوں میں خون اترا۔ بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں اور کنپٹیاں سلگنے۔۔۔ انہیں سیاق و سباق سنایا جا رہا تھا مگر دلچسپی ندارد۔۔۔ انہیں کچھ ہدایات بھی دی جا رہی تھیں، مگر وہ انہیں ایک کان سے سن کر اڑا رہے تھے۔ انہیں آگے کا فیصلہ خود کرنا تھا۔

گھر کی عورتوں کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ان سب سے پوچھتی تھیں کہ تم سب ابھی باہر سے آئی ہو ہوا کیا ہے؟

ضوفی نے بھی سب کی طرح لاعلمی کا اظہار کیا۔ مگر پھر اس نے بھی سب کے ساتھ دیکھا۔ شکیل کے ہاتھ میں بیٹ تھا عقیل نے غسل خانے سے کھیس دھونے والا ڈنڈا اٹھا لیا تھا۔ نکلتا ہوا شکیل واپس پلٹا تھا' وہ اپنے کمرے سے کچھ تلاشتا ہوا آیا تھا۔ ضوفی کی زبان دانتوں تلے آ گئی اور باقی خواتین جن جن کی نظریں پڑی تھی۔ چار جڑی ہوئی پیتل کی انگوٹھیاں جس کے اوپر تیز دھار کونے ابھرے ہوئے ہیں اور جو مکا ماریں تو گوشت کے اندر تک دھنس جائیں۔ کھال نوچتی باہر آئیں۔ شکیل نے پہن لی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہو گیا ہے۔ کیا کرنے والے ہیں یہ سب لوگ۔۔۔"

چاچی جی کا حال زیادہ خراب تھا۔ ان کے لڑائی بھڑائی کے شوقین بیٹوں کو جنہیں سمجھا بجھا کر ٹھنڈا رکھا جاتا تھا' آج ان کو خود اپنے منہ سے کس آگ میں کودنے کے لیے بھیجا جا رہا تھا لیکن نہیں۔۔۔ ان کا سب سے سلجھا ہوا تمیزدار بیٹا جمیل بھی سرد جارحانہ تاثرات کے ساتھ۔۔۔ ان کے پوچھنے پر بمشکل ضبط کرتا اپنا شانہ چھڑا کر گاڑی لے کر نکلا تھا۔

"ایسا سبق سکھانا کہ آنے والی نسلوں تک یاد رہے۔" مجاہد تاج پیچھے سے چلائے تھے۔

"نسلوں کی کہانی۔۔۔ یہیں تک چلنا تھا وراثت کا قصہ۔۔۔ اب کیا میں نسلوں کو آنے دوں گا۔ یہی تھا خاندان کا آخری چشم و چراغ۔۔۔ جسے بجھا کر ہی آؤں گا۔" شکیل ان سے بلند آواز میں چلایا تھا۔ اس کے لیے مجاہد تاج کا پیغام اچنبھا تھا۔ وہ نسل لانے تک کا خیال سوچنا بھی بے وقوفی کہہ رہا تھا۔

"اوں ہوں۔۔۔ صرف سبق سکھا کر لوٹ آنا۔ اتنا سانس چھوڑنا کہ ڈور ٹوٹے نہیں۔ عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہے کہ اتنا چھوڑا تو کیوں چھوڑا۔۔۔ ہمیں کسی کی بددعائیں نہیں لینی۔ سمجھے۔"

مجاہد تاج کے سرد خوفناک لہجے نے جملوں کی نرمی پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ شکیل نے بڑی مشکل سے پورا جملہ سنا تھا۔ اسے بھی سب کے پیچھے بھاگنے کی جلدی تھی۔

"کس کا حشر کرنے نکلے ہیں یہ سب؟" تائی جی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ شدید بدحالی کے احساس سے نیم دراز ہی ہو گئیں۔ "ہائے اللہ میرے بچوں کی خیر۔۔۔"

"جن کو مارنے کے لیے اتنی پلاننگ سے نکلے ہیں۔ وہ کیا ہاتھوں میں چوڑیاں پہن کر بیٹھے ہوں گے یا تابعدار ہو کر سر جھکائیں گے کہ جی مار لو ہمیں جتنا مارنا ہے۔ کر لو شوق پورا۔۔۔ اللہ میرے بیٹے تو پہلے ہی پرائی آگ گھر لانے کے شوقین ہیں۔ ان ہی کے ہاتھوں میں تھما دیں لاٹھیاں ڈنڈے بلے۔۔۔ ہائے۔" چاچی جی نے ایک بار پھر دہائی دی۔

ان کے بیٹوں کو لڑنے کے لیے بھیجنا یوں تھا جیسے شکر خورے کو شکر کا پورا بورا دے دیا جائے۔

"اور اگر ان کے پاس اسلحہ وغیرہ ہوا تو؟" زاہدہ نے پہلی بار لب کھولے۔ وہ فق چہرے کے ساتھ ساکت تھیں۔

مجاہد تاج نے کھا جانے والی نظروں سے بیوی کو دیکھا اور باہر نکلے۔

"ہائے نہیں۔۔۔!" چاچی جی دل پر ہاتھ رکھ کے غش کھا گئیں۔ انہیں شاید سانس لینے میں بھی دشواری ہونے لگی تھی۔

"وہ نہتا ہے چاچی جی۔۔۔!" ضوفی کی تھکی پرملال آواز پر جہاں پہلے لمحے میں اپنے بیٹوں کے حوالے سے سکون محسوس ہوا' وہیں دوسرے خیال نے سب کو بچھو کے ڈنک جیسا اچھالا تھا۔

"کک۔۔۔ کون ہے وہ؟ اور تمہیں کیسے پتا؟"

"تم جانتی ہو ضوفشاں۔۔۔ یہ سب لوگ کہاں گئے ہیں۔۔۔ ہوا کیا ہے؟"

مائدہ' ماجدہ' تاباں اور دیگر خواتین کے منہ سے تابڑ توڑ سوالات برآمد ہوئے۔ وہ بھی تو ان ہی کے ساتھ تھی۔

"کس کے پیچھے گئے ہیں یہ سب۔۔۔" تائی جی کو لفظ نہتا کی حساسیت کا پہلی بار احساس ہوا۔

"جاذب۔۔۔ جاذب۔۔۔ سلطان۔۔۔" ضوفی نے قصداً" لب نہیں کھولے تھے بس منہ سے نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات سیاہ تھی کسی داغ کی طرح۔ خاموشی تھی موت کی مانند۔

سناٹا یوں تھا جیسے کسی ویرانے میں شام پھیلی ہو اور دور تک کسی ذی روح کا نام نشان نہ ہو۔

مگر۔۔۔

نیند نہ آنے کی ہزار تاویلیں ہوں، مگر رات میں ایک ایسا پہر آ ہی جاتا ہے جب پلک پلک سے جڑ جاتی ہے۔ سو ایک ہنگامہ خیز پر تشدد دن کے اختتام پر سب کہیں نہ کہیں آنکھیں موند چکے تھے۔

لڑکے سبق سکھا کر۔۔۔ بڑے نتیجہ سن کر۔۔۔ بس اتنی سانس چھوڑی تھی کہ کوئی الزام نہ لگے۔

ضوفی وہ سب جانتی تھی جو مجاہد تاج کے علم میں تھا' مگر منہ کھولنے سے پہلے اسے خیال آیا۔ پتا نہیں ابا نے کیا اور کتنا بتایا ہو۔

"آپ ابا ہی سے پوچھیے گا۔ میں تو بس اتنا ہی جانتی ہوں۔"

اور ابا نے آ کر سب کو بند کمرے میں سب سنا دیا تھا۔ یہ بڑوں کی میٹنگ تھی۔ سو باقی سب بے خبر ہی رہے مگر ایسی بے خبری جس میں سب باخبر ہوتے ہیں اور اپنی معلومات کو چھپاتے ہیں۔ نظریں چراتے ہیں۔ تاباں کی سوچیں منتشر تھیں۔

وہ ان خطوط کو دوبارہ پڑھنا چاہتی تھی۔ ضوفی نے سب کے سامنے لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا مگر وہ تاباں کے چہرے پر پھیلی سپیدی کو دیکھ کر چپ نہ رہ سکی۔ اس نے ایک آدھ جملہ کہنے کا ارادہ کیا تھا مگر پھر کہتی ہی چلی گئی۔

"تم فکر مند نہ ہو تاباں۔۔۔" ضوفی نے تشفی بھرا ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھا۔ "میں نے ابا کو بتایا بلکہ یقین دلایا کہ تم اس سے بے خبر ہو۔ تمہارے فرشتے بھی لاعلم ہیں۔"

تاباں نے بے ساختہ بہن کے چہرے کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

"اور ابا نے میرا یقین کیا ہے تاباں۔۔۔" وہ پر یقین تھی۔ اس کا گال تھپتھپا کر وہ اٹھ گئی تھی۔

مگر تاباں نے اپنے اندر ذرا سی بھی جنبش نہ پائی۔ شکیل عقیل کیا حشر کر کے آئے۔ مر گئے یا مار آئے۔ جیسے جیسے رات گزرتی جا رہی تھی۔ اسے ان سب فکروں سے کوئی سروکار ہی نہ رہا۔

"میں تو سمجھی تھی کہ خبطی سر پھرے نے یونہی۔۔۔ پہلے میں چونکی ڈر گئی پھر میرے لیے حیران کن تھے یہ الفاظ اور جملے۔ وہ بہت ہوشیاری سے مجھے فالو کر رہا تھا مگر پھر بھی۔۔۔ پھر بھی مجھے کبھی ایک عملی انسان نہیں لگا۔

کبھی مجھے لگا وہ نفسیاتی مریض ہے۔ جس کی کوئی کل ڈھیلی ہے۔ محض تصویر دیکھ کر کوئی ایسے کیسے؟"

تاباں رات کو سب سے پہلے بستر میں گئی تھی سب کی بھوک اڑ چکی تھی۔ جب تک سب کی واپسی نہ ہوتی۔ سب عورتیں جیسے گوند سے چپک کر بیٹھی تھیں۔ ان سب کے شاپنگ بیگز وہیں درمیان میں فرش پر اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ تاباں ہی نے اپنے لیے کھانا نکالا اور وہیں سب کے سامنے بیٹھ کر دل جمعی سے کھا لیا۔ وہ سب کو بہت نارمل دکھائی دے رہی تھی جبکہ اسے اپنا آپ ایک روبوٹ لگ رہا تھا۔ جسے فقط اعمال انجام دینے تھے۔ اس کے سسٹم میں سوچنا سمجھنا فیڈ ہی نہ کیا گیا ہو۔

لیکن رات کے اس پہر اس کی سوچیں بیدار ہو گئیں تب اس نے بہت پراسراریت سے اٹھ کر ان خطوط کو نکالا تھا جو اسے کچھ دنوں سے یونہی فالتو کے لگنے لگے اور شاید وہ انہیں پھاڑ کر پھینک دیتی۔ وہ عملی لڑکی تھی۔ یہ لفاظی کیا معنی اور کیا مقصد۔۔۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں ضوفی۔۔۔!"

جب الجھن بھری اذیت ناقابل برداشت ہو گئی تو اس نے سوئی ضوفی کو جگا دیا تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ پر اس نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھا۔ اپنی شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں پر اور اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ مائدہ، ماجدہ گہری نیند میں تھیں۔ وہ اسے لیے اسٹور میں آ گئی تھی۔ زیرو کے سبز بلب کی روشنی میں وہ دونوں زمین پر چوکڑی مارے بیٹھی تھیں اور درمیان میں کھلے کاغذ۔۔۔

ضوفی کی آنکھیں پھٹی پڑی تھیں اور چہرہ اتنا سفید جیسے کسی لاش کا۔۔۔

وہ منہ کھول کر تاباں کو دیکھتی تھی جو اس کی کیفیات سے قطع نظر بس بولتی جا رہی تھی۔

"میں بالکل سچ کہتی ہوں ضوفی۔۔۔" وہ زور دے کر بولی تھی۔

"میں نے ہر روز کالج آتے اور جاتے ہوئے پوری باریک بینی سے اس شخص کو کھوجا تھا۔ اس بچے سے پوچھا تھا، مگر میں اسے کہیں نہیں دیکھ پائی، کبھی بھی نہیں۔ بلکہ میں نے اب تک اس کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے کہ وہ کون ہے کیسا ہے؟ اور پھر جس روز میں نے فقط اس کا نام جانا میں نے اس بچے کو پیغام دیا کہ میں پہچان چکی ہوں تو پتا ہے اس نے کیا کہا؟

"کاش تم نام کے بجائے مجھے پہچان پاتیں اور اس کے بعد کی مکمل خاموشی آج کے دن تک۔۔۔

تم نے ابا سے سچ کہا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی لیکن جو میں جانتی تھی وہ۔۔۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تت۔۔۔ تم مجھے اب بتا رہی ہو تاباں!" ضوفی چیخ کر کہنا چاہتی تھی مگر بمشکل جملہ پورا کیا۔

"کیا بتاتی۔۔۔ ایک غلط فہمی۔۔۔ ایک بے تکی۔۔۔ ایک مذاق۔۔۔!"

"تم نے یہ پلندہ سنبھال کر رکھا ہوا ہے تاباں!"

"میں اسے پھینکنے ہی والی تھی۔"

"پھینکا تو نہیں نا۔۔۔؟"

"تمہیں پہلے ہی مرحلے پر مجھے بتانا چاہیے تھا۔ میں دو جھانپڑ لگا کر اس بچے کو سیدھا کرتی اور اصل بندے تک پہنچ کر اسے بھی سیدھا کر دیتی۔ ہم ایسی چیز افورڈ نہیں کر سکتے تاباں! تم بھول کیسے گئیں اور۔۔۔ اور مجھے اب بتا رہی ہو، جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تب۔۔۔"

"میں نے سوچا وہ پیچھے ہٹ گیا ہے۔ جب میں نے اس کا نام جان لیا تب۔۔۔ کہ اسے ہر چیز کا اندازہ ہو گیا کہ وہ یونہی وقت ضائع کر رہا ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں۔۔۔ اس کا وہ آخری پیغام دو ڈھائی ماہ پرانا ہے۔ اس کے بعد مکمل خاموشی۔۔۔"

"تاباں!" ضوفی نے یک دم اس کے ہاتھ پر جھپٹا سا مارا۔ "تم اپنی صفائی دے رہی ہو۔۔۔ یا اس کی۔۔۔؟"

ضوفی کی آواز بھی بلند ہوئی تھی۔ تاباں کو یک دم چپ لگ گئی۔ جو ضوفی کے اعصاب پر کوڑے کی مانند برسی۔ اس نے ایک جنون کے عالم میں ان خطوط کو پرزہ پرزہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کا یہ عمل اتنا اچانک تھا کہ تاباں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ خوف زدگی کے عالم میں ضوفی کو دیکھ رہی تھی، جو پرزوں پر اپنا پیر مار کے پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔

دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

"کیا وہ کوئی خبطی دیوانہ ہے ضوفی۔۔۔ اکثر اکلوتے بچے کچھ مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔" تاباں نے اپنا ایک خدشہ، جو سب پر حاوی تھا۔ کہہ دیا۔

سوچوں میں گم ضوفی چونکی۔

"میں یہ سب نہیں جانتی۔۔۔ مگر جو جانتی ہوں۔۔۔ اللہ سے دعا کرتی ہوں۔ اسے کچھ نہ ہو۔ وہ اتنے سلجھے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے کہ دیکھتے ہی دل سے دعا نکلتی ہے۔ اسے گرم ہوا بھی نہ چھوئے۔ وہ اتنے شرمندہ تھے مجبور اور بے بس۔۔۔ کہ دل کرتا تھا ان کے لیے آگ کے کنوئیں میں کود جائے، مگر مجھے ابھی پتا لگا۔ آگ کے کنوئیں سے بھی مشکل کام ہو سکتے ہیں جنہیں کیا نہیں جا سکتا۔"

ضوفی نے پیچ پیچ جواب دیا وہ بڑی احتیاط سے پرزوں کو سمیٹ رہی تھی۔

"اور تمہیں ایک نصیحت کروں؟ ان چھ ماہ میں کیا ہوا اور آج کے دن کیا ہوا اور ابھی اس رات میں۔۔۔ سب بھول جانا۔ تم پر شک نہیں کیا جا رہا، نہ تم مجرم ہو۔ مگر یاد رکھو! کچھ دیر بعد ہونے والی صبح تمہاری آزمائش ہے۔ سو کوئی ایسا عمل نہ کرنا کہ پکڑ میں آ سکو بلاوجہ ماری جاؤ گی۔"

"ضوفی!" تاباں نے اس کی نصیحت کو سنا تھا اور ہر ہر لفظ کی گہرائی میں چھپے معنی بمعہ تشریح سمجھ لیے تھے مگر۔۔۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔۔۔ کوئی شخص۔۔۔ کوئی شخص محض تصویر دیکھ کر؟"

"تا۔۔۔ با۔۔۔ں۔۔۔!" ضوفی ششدر رہ گئی۔

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا لیکن کاش! میں اس شخص کو ایک بار دیکھ ہی لیتی۔" اس نے یہ جملہ ضوفی سے کہا نہیں تھا۔ شاید سوچا تھا، مگر یہ سوچ خود کلامی میں ڈھل کر ضوفی کی سماعتوں کے لیے پگھلا سیسہ بن گئی۔ وہ پرزے سمیٹ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

دھپ سے نیچے بیٹھی۔ اس نے تاباں کے شانوں میں اپنی انگلیاں گاڑ دیں۔

"ہوش۔۔۔ تم ہوش میں ہو۔" اس نے ہلکی سی چپت سے اس کے گال پر رسید کی۔

تاباں چونکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"نامعلوم ملزمان کے خلاف کارروائی کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میں مجاہد تاج بات کر رہا ہوں۔ آپ نامعلوم ملزم کے خانے میں بے فکر ہو کر میرا نام لکھوا سکتے ہیں۔ میں نے شرفا کے طریقے سے ابتدا کی تھی۔ اگر یہاں تک پہنچا ہوں تو آپ سمجھ ہی لیں۔ آپ کی جانب سے شریفوں والی انتہا نہیں ملی۔ چند سانسیں اس لیے چھوڑ دیں کہ آپ کے بڑھاپے پر ترس آ گیا تھا۔ حالانکہ آپ کے بیٹے کی جانب سے ہماری عزت پر ترس نہیں کھایا گیا۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہے۔ میں اگلی بار پرسے کا فون نہیں کروں گا۔"

یہ فون کال گھر کے ہر فرد کے کانوں میں پڑی تھی۔ سلام اور دعا کے بغیر پورے اعتماد سے سلطان حیدر کو کی جانے والی کال۔

"بائیک چھیننے کی کوشش کی تھی۔" سلطان حیدر نے تفتیشی افسر کو بتایا۔ افسر نے بائیک دیکھ کر پہلی نظر میں جو قیافہ لگایا تھا۔ وہ درست ثابت ہوا اس نے حتاتی نگاہوں سے اپنے جونیئرز کو دیکھا۔ پورے شہر میں یہ اپنی طرز کی ایک ہی بائیک تھی۔ سلطان حیدر مدعی تھے مگر انہوں نے افسر کو خوب سارے نوٹ دیے۔

"میری ایک ہی اولاد ہے۔ مجھے کوئی ایف آئی آر درج نہیں کروانی۔ مجھے کوئی دشمنی نہیں پالنی۔" ان کے لہجے کی لجاجت انداز کی شکستگی و مجبوری۔

افسر نے جیب میں نوٹ ٹھونسے اور صاف الفاظ میں راست فیصلے کی تائید و توثیق کردی۔

"تمہیں ایک بار بھی ماں کا خیال نہ آیا جاذب!" جاذبہ نے کہا۔ "تم ایسے تو نہ تھے۔ تم نے کب سیکھا یہ چلن۔ راستوں، چوراہوں پر کھڑا ہونا۔ پیچھا کرنا۔" باقی کے دل گرفتہ سوال ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ اولاد کی خوشبو تھی جو انہیں بتا رہی تھی کہ پٹیوں میں جکڑا ان کا اپنا لخت جگر ہے، ورنہ سوجے نیل و نیل۔ پٹیوں سے ڈھکے جاذب سلطان کی شناخت ناممکن تھی۔

"ایسا کیوں کیا جاذب! مجھے تم سے تو یہ امید نہ تھی۔" سلطان حیدر سر پکڑے بیٹھے تھے۔

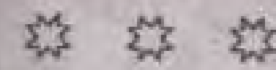
"بجائے اس کے کہ میں ان سے پوچھوں گریبان پکڑ کر۔ یا کلاشنکوف لہرا کر کہ میرے بیٹے کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ میں تو الٹا ان کا احسان مند ہوں۔ مشکور ہوں کہ تمہیں چھوڑ گئے۔ اگر وہ اتنا احسان بھی نہ کرتے تو۔ ذرا تصور کرو ہم دونوں اس وقت کیا کر رہے ہوتے؟ تمہیں رو رہے ہوتے۔ تمہیں اندازہ ہے بوڑھے والدین جب جوان اولاد کو روتے ہیں تو عرش و فرش بھی ہم نوا بن جاتے ہیں۔ تمہیں ایک بار ہمارا خیال نہ آیا۔" سلطان حیدر نے رونا شروع کردیا تھا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم ایسی حرکت کرو گے؟ مجھے اب تک یقین نہیں آرہا۔"

جاذب کی سوجی آنکھوں میں مسکان کی چمک ابھری۔

"مجھے خود بھی یقین نہیں کہ میں نے یہ سب کیا یا یہ کہ میں کیا کچھ کروں گا مگر میں بے بس ہوں۔"

"ہمیں آزمائش میں مت ڈالو بیٹا!" جاذبہ بڑبڑائی تھیں۔



"بس ٹھیک ہے بارہ جماعت۔ ہم نے کون سی نوکریاں کروانی ہیں۔" مجاہد تاج نے روایتی جملہ کہا۔

"تو؟" زاہدہ نے شوہر کی صورت دیکھی۔

"تو کا مطلب یہ ہے کہ رشتہ وغیرہ دیکھو۔ نہ ہی وہ ضوفی کی طرح پڑھائی کے معاملے میں جنونی ہے۔ نہ ہی کوئی خاص مضمون پڑھ رہی ہے۔ مائدہ کے ساتھ ہی ماجدہ کو نبٹانے کی بات کر رہے ہیں بھائی جان۔ اگر اللہ سبب بناوے گا تو ہم بھی اپنا فرض پورا کردیں گے۔"

"جی!" زاہدہ نے سات ماہ کے عرصے کو پل بھر میں گن لیا۔ "اتنی جلدی کیسے؟"

"میں نے اندازہ بتایا ہے اگر مل جاتا ہے تو کردیں گے۔ گھر بٹھانے کا کیا مقصد۔ یہ بے وقوفی سی بے وقوفی ہے۔ آج ایک رشتہ آیا ہے کل کو اور بھی آئیں گے۔ اب کمروں میں بند تو کر نہیں سکتے۔ حالانکہ لڑکیوں کو بند کمروں ہی میں رکھنا چاہیے۔" ان کا لہجہ آگ ہو گیا۔ زاہدہ نے نظریں چرالیں۔

"شادی نہ بھی ہو ایک نام ہو جائے تو لوگوں کے منہ بند ہو جاتے ہیں۔"

زاہدہ آگے ایک بھی لفظ نہ کہہ سکیں۔

"اب ایسے ہتھیلی پر سرسوں کون جماتا ہے۔" وہ جٹھانی کے آگے رو پڑیں۔ "ایسی جلد بازی میں تو للو پنجو ہی ملیں گے ناں۔ ابھی مائدہ وغیرہ کی شادی میں ساری برادری اکٹھی ہوگی تو سب ہی منہ پھاڑ کر مانگنا

شروع کردیں گے اور کہاں ہیں ہمارے خاندان میں اچھے لڑکے نہ تعلیم نہ عقل۔"

"اوپر سے اس کی صورت۔" زاہدہ کو پہلی بار بیٹی کی صورت بری لگی۔

"پاگل ہو تم۔ نکمے نکھٹووں کی مائیں رال ٹپکائیں گی۔ تو اچھے سلجھے بھی تو آئیں گے ناں۔"

"وہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اور وہ بھی پہلے سے بک ہیں۔ کیا کسی نے چھوڑے ہوں گے۔"

"ایک چیز صبر توکل بھی ہوتی ہے۔" تائی جی نے قصہ کوتاہ کیا۔

"پتا نہیں کیوں۔" زاہدہ کا جملہ اٹکا "مجھے تاباں کے لیے بہت ڈر لگنے لگا ہے میری چھٹی حس۔"

"اللہ خیر کرے گا۔ بھروسا رکھو۔"

چاچی جی کے کانوں میں یہ نئی بات پڑی تو وہ ہاتھ نچا کرکے سب کی موجودگی میں بول پڑیں۔

"اتنی تکلیف کس لیے بھئی! میرے بیٹے بھی تو ہیں۔ یا انہیں صرف لڑائی بھڑائی کرنے کے لیے پال رہے ہیں۔"

مجاہد تاج نے مشاہد تاج کو مسکرا کر دیکھا۔



زاہدہ نے میاں کے ساتھ ہونے والی گفتگو جس نے نیا رخ اختیار کرلیا تھا۔ نازاں اور افشاں کو فون پر سنائی۔ تب تاباں اور ضوفشاں نے بھی دل پر ہاتھ رکھ کر سب سنا۔ بے یقینی حد سے سوا تھی۔

"وہ کہتے ہیں کہ جوانی میں لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں لاپرواہ شوخ۔ اور یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے۔ اپنا کاروبار ہے۔ پھر سگے چچا کا بیٹا۔ کسی چھان بین کی ضرورت نہیں۔ میں نے پڑھائی کی بات کی تو جھاڑ دیا۔ تمہاری لڑکی بارہ اور وہ میٹرک میں نے کہا۔ میٹرک کے پیپر نہیں دیے تھے شکیل نے۔ دانت پیس کر بولے کہ نکاح نامے میں میٹرک کی سند لگانا بھی نہیں ہے۔ اور دوسرے انہوں نے کون سا شادی کے بعد کوچنگ سینٹر کھولنا ہے۔"

"ہاں ہیں وہ سگے چچا کے بیٹے۔ جمیل والی بات نہیں ہے ان میں۔ جمیل ددھیال میں پلا بڑھا اور وہ ننھیال میں۔ کسی نے لڑکپن کے زمانے ہی سے ان کی حرکات کو پسند نہیں کیا۔ سب نے اپنے طور سدھارنے کی کوشش کی۔ پھر ناکام ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ اب وہ بنے بنائے اپنے نانا ماموں ہیں۔ ایک جہالت سی ہے۔ عورت کی عزت قطعاً نہیں کرتے اور تاباں کا کوئی جوڑ ہے ان کے ساتھ؟"

ضوفی کا دھیان ماضی کی جانب گیا۔ تاباں بھی اس نہج پر سوچ رہی تھی۔ چاچی جی اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ان کی اماں کو لقوہ ہوا تو اکلوتی بیٹی ہونے کے ناتے وہ بھاگ بھاگ کر ان کی تیمارداری کے لیے جاتیں۔ بڑا جمیل اسکول میں پڑھتا تھا۔ پانچ سالہ شکیل چار سالہ عقیل ماں کے ہمراہ ننھیال۔ اماں شدید ترین بیماری کے ہمراہ سات سال زندہ رہیں۔ عقیل و شکیل نے زمیندار نانا ماموں کی تمام عادات و خصائل اپنے اندر کوٹ کوٹ کر بھر لیں۔ جب وہ گھر لوٹے تو سب سے الگ دکھائی دیتے۔ غلیل سے کھیلتے، مرغے لڑاتے۔ کتوں کو پچکارتے۔ اور لہجے اپنے ماموں جیسے بلند، ڈنگر، دو ٹوک۔ ہلکی بات پر بھی یوں لگتا جیسے لڑ رہے ہوں اور لڑتے وقت لگتا، مر رہے ہوں یا مار رہے ہوں۔

چاچی جی کے باقی تین بچے۔ جمیل۔ رانیہ، سونیا۔ اس گھر کے بچے لگتے اور وہ دونوں مہمان۔ ایسے مہمان جس کے جانے کا پل پل گنا جائے۔

بچپن کے شوق ختم ہوئے تو جوانی کے نئے شوق بھی نرالے تھے۔ اڑتی پڑتی سب سنتے تھے۔ بعض اوقات سرزنش بھی کی جاتی، بعض جگہ آنکھ بچا لیتے۔

"اور اب ابا نے کہا جوانی میں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ذمہ داریوں کے بعد سب سدھر جاتے ہیں۔ پہلے خود کہا تھا تاباں کا کوئی جوڑ نہیں ہے اور اب کہتے ہیں بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔"

نہر کے مین روڈ والے سرے پر چند ریڑھی فروش

کھڑے ہوتے تھے۔ سوپ والا۔ برگروالا گرم۔ خوشبو دار دودھ اور پاپ کارن۔ شدید سردی میں بھی لوگ اس یخ بستہ ماحول کو انجوائے کرنے کے لئے گاڑیاں روک لیتے تھے مگر یہاں اس کے گھر کے عین سامنے ایسی کوئی رونق نہیں تھی۔ پیچھے کھیت تھے جہاں صرف چارہ اگایا جاتا تھا۔ دن بھر میں چرواہے ہوتے اور گائے بکریاں۔

البتہ دوپہر کے بعد اور شام کے بعد تو سچ مچ کا سناٹا طاری ہو جاتا۔ کوئی بھولا بھٹکا۔ لیکن اگر وہ لڑکا بھولا بھٹکا تھا؟

تو ایک ہی بھول بار بار کیوں؟

وہ بار بار بھول کر ادھر آکر ہی کیوں رکتا تھا؟ یہ اور اس جیسے بہت سے سوال۔ جواب ندارد۔

آج وہ سائیکل بھی ساتھ لایا تھا۔ سائیکل کی باسکٹ میں کتابیں تھیں۔ تو وہ پڑھتا بھی ہے۔ ہاں تو کچھ لوگ پڑھنے کے لئے خاموش ویران جگہ کا انتخاب کرتے ہیں کہ یکسوئی برقرار رہے۔ اسے کچھ تسلی ہوئی۔ اس جانب دھیان کیوں نہ دیا۔ مگر تسلی کی عمر مختصر۔ وہ اس گہرے اندھیرے میں کیا پڑھ پائے گا۔

کیا پتا وہ کوچنگ وغیرہ سے واپسی پر سستانے بیٹھ جاتا ہو۔

مگر وہ اس کے گھر کی کھڑکی کو ہی کیوں دیکھتا تھا۔

اس نے مہنگی جیکٹ پہن رکھی تھی اور کالر اوپر کیے تھے۔ کانوں پر گن ٹوپ لگے تھے۔ جیکٹ کی آستین کھینچ کر اتنی دراز کر لی تھیں کہ بس انگلیاں باہر تھیں اور اس کے ہاتھ میں پاپ کارن کا پیک تھا۔

اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھنے پر وہ بہت دور دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے وہ ہمت کر کے مین گیٹ تک چلی آئی۔ وہ ایک جھری سے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ بہت واضح نظر آ رہا تھا۔

وہ بہت کم عمر تھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ گرم ٹوپے نے پیشانی کو چھپا رکھا تھا مگر پھر بھی اسے اندازہ ہوا' وہ بے پناہ خوب صورت تھا۔ دل موہ لینے والا نقشہ۔ اس کی آنکھوں میں مجموعی طور پر ایک خالی پن تھا۔ وہ جیسے ارد گرد سے بے پروا تھا کہیں اور مگن۔ آتی جاتی کسی گاڑی کا تعاقب کرتا جب تک وہ حد نگاہ میں رہتی۔ پھر دوبارہ اس کے گھر کی جانب دیکھنے لگتا۔ خاص طور پر کھڑکی کی طرف۔

بند کھڑکی دیکھ کر مایوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ نہر کے پانی میں کنکر مارتا۔ اندھیرا اب مزید سیاہی کی جانب مائل تھا۔ وہ یکدم ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی سائیکل کے پاس گیا پھر نیچے بیٹھ کر اس کے ٹائر کی ہوا چیک کی۔ چہرے پر اطمینان سا آگیا۔ سائیکل پر بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر اس کے گھر کی کھڑکی کو دیکھا تھا۔

کوئی مایوسی نہیں تھی۔ کوئی پریشانی بھی نہیں ہوئی۔

وہ سائیکل کو لے کر جب مین روڈ پر چڑھا تو مزید واضح ہو گیا۔ اس کی ناک بے حد خوبصورت تھی اور ہینڈل پر دھرے ہاتھ بہت نرم محسوس ہوئے۔ اس نے پیڈل مارا اور منٹوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ طویل سانس لے کر پیچھے ہوئی۔

اسے یکدم ٹھنڈ بڑھنے کا احساس ہوا۔ وہ اب اندر کی جانب بڑھ رہی تھی مگر چال کا ٹھہراؤ اور نپے تلے قدم بتاتے تھے گہری سوچ میں ہے۔

کس سے کہوں؟ اور کہوں بھی تو کیا؟ نہر میرے گھر کے پاس ہے مگر میری جاگیر تو نہیں۔ ہاں مگر میں باز پرس کر سکتی ہوں کہ تم میرے گھر کو کیوں دیکھتے ہو۔ اور میری کھڑکی کو۔

لیکن اگر وہ مکر گیا تو میرے پاس کیا ثبوت؟

مگر وہ ہے کون۔ لباس قیمتی تھا اور نیا بھی۔ سائیکل بھی بہت اچھی تھی۔ اور شکل و صورت سے کسی بہت اچھے شریف خاندان کا لگتا ہے۔

"خوب صورت ہے۔ خصوصاً "ناک۔"

سوچوں کا سرا ہاتھ سے چھوٹ گیا تو قدم رک گئے۔ اسے یکدم احساس ہوا۔ اسے یہ ناک جانی پہچانی لگی ہے۔ جیسے پہلے بھی دیکھی ہو۔ مگر کہاں۔ اور ہاتھوں کی ملائمت۔

مگر وہ ناک۔۔۔ اس نے بے ساختہ اپنی ناک چھوئی' جو برف بنی ہوئی تھی۔

اس کا دل چاہا وہ پلٹ کر جائے اور ایک بار پھر اس چہرے کو دیکھے۔ خاص طور پر وہ ناک۔

☼ ☼ ☼

"میرا رنگ اڑنے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے۔ تم اتنی حواس باختہ کیوں ہو ضوفی؟" تاباں کے سوال نے ضوفی کو چونکا دیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ جہاں تاباں مجاہد کو شکیل ساجد کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ وہیں ضوفشاں مجاہد کے لیے عقیل ساجد کا نام منتخب کر لیا گیا ہو۔ وہ کیا کہتے ہیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا یعنی لگے ہاتھوں۔" تاباں کے جملے نارمل تھے مگر لہجے کا طنز اور آنکھ سے نکلتے شرارے۔

ضوفی کا سر جھک گیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے چہرے کے تاثرات کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

"تو پھر جیسی بات ہے تم بتا دو۔ تمہیں شاید خبر نہیں تمہارا چہرہ آئینہ بن چکا ہے۔ سب نظر آ رہا ہے بس سمجھ میں نہیں آ رہا کہ۔"

ضوفی نے چاروں جانب دیکھا۔ اس کمرے کو وہ مائدہ اور ماجدہ کے ساتھ شیئر کرتی تھیں۔ ساتھ ہنستی بولتی روتی گاتی تھیں۔ لیکن پتا نہیں کب۔ وہ دو الگ ہو گئیں۔ ان دونوں سے کٹ گئیں۔ ان کے بیچ ایک ایسا راز آ گیا تھا جو مائدہ اور ماجدہ کو بتانے کا نہیں تھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے تاباں!" وہ تاباں کے نزدیک کھسک آئی۔

"ڈر۔ کس بات کا ڈر۔" تاباں بری طرح چونکی۔

"پتا نہیں مجھے تمہیں یہ بات بتانی چاہیے کہ نہیں۔" ضوفی کی ہچکچاہٹ ہر عضو سے عیاں تھی۔ "لیکن اگر میں کسی کو نہ بتاؤں تو میرا دل شاید پھٹ جائے۔"

"کیا بات ہے؟" تاباں کے چہرے پر سراسیمگی پھیلی۔ ضوفی اتنی آسانی سے پریشان ہونے والی چیز نہیں تھی۔

ضوفی چند لمحے تک تاباں کا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اٹھ کر دروازہ چیک کیا۔ اس کی اس حرکت نے تاباں کے تجسس کو ہوا دی۔

"میں نے۔ میں نے ایک بار اور پھر کئی بار اسے روڈ کے اس پار دیکھا ہے۔"

"وہ۔ وہ تو اسپتال میں تھا ناں۔ بہت عرصے تک حرکت کے قابل بھی نہیں تو۔ وہ کیسے۔"

"ہاں مگر وہ پٹیوں اور پلاسٹر میں جکڑا لنگڑاتا ہوا یہاں سے گزرا۔ اور وہ اکثر۔۔۔ شٹرنگ کی لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس کھڑا ہو کر ادھر ہمارے گھر کی جانب دیکھتا رہتا ہے۔ جیسے کچھ کھوج رہا ہو۔"

"تمہیں یقین ہے ضوفی۔" تاباں بہت دیر بعد بولنے کے قابل ہوئی تھی۔ ضوفی نے جواب نہ دیا۔ "اور تمہیں ڈر کس چیز کا لگ رہا ہے۔ کس کے لیے۔"

"بس مجھے کسی انہونی کا احساس ہو رہا ہے۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس۔۔۔"

"وہ کیا چاہتا ہے ضوفی!" تاباں نے یہ سوال خود سے ہزار بار کیا تھا۔ آج ضوفی سے بھی کر لیا۔

"تمہیں یقین ہے وہ۔ وہی ہے۔"

"میں نے اسے دیکھ رکھا ہے تاباں!" ضوفی نے سر پیٹا تھا۔

"اور۔" تاباں کے لب کھلے ضوفی اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ تاباں کا اور واضح تھا لیکن آگے کا جملہ خود کلامی میں ڈھل گیا۔ وہ جیسے کھو گئی تھی۔

"اور میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا ضوفی!"

"کیا؟ ضوفی کا رنگ فق ہو گیا۔ سادہ جملے کے اندر چھپا تجسس' قلق' بے چینی آمیز اشتیاق۔

ضوفی کو اپنے قدموں کے نیچے سے زمین سرکنے کا احساس ہوا تھا۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا ناکہ یہ لڑکی تو ویسے ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اسے ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

"خیر ایسی حماقت تو میرے بیٹے نے بھی کبھی نہیں کی میرے بی ہاف پر کسی کو امید دلانے کی حماقت۔" وہ بے لچک انداز میں بولے۔ "لیکن تمہیں اس بات کا مارجن دیا جا سکتا ہے کہ تم جن پہلوانوں کی اولاد ہو وہ دماغ کے بجائے معدے سے سوچنے کی جبلت جینز میں پرو کر تمہیں ورثے میں دے گئے ہیں تمہارا ابھی کوئی قصور نہیں۔"

—۲۲—

بائیسویں قسط



"تم نے کبھی سوچا ہے کہ تمہاری ماں ہوتی تو کیسی ہوتی اور تمہارا باپ ہوتا تو کیسا ہوتا؟"

کھاری کے سامنے بیٹھی اس عورت نے پوچھا۔ جسے دیکھتے ہی اسے خیال آیا تھا کہ وہ یقیناً "ان کالے لوگوں کے ملک سے آئی ہوگی" جو کبھی کبھار چوہدری سردار کی دعوتوں میں شامل ہوتے تھے اور جن کو دیکھ کر وہ شکر ادا کیا کرتا تھا کہ وہ ان سے تو کم ہی کالا تھا۔

اس نے یہ سوال سن کر چوہدری صاحب کی طرف دیکھا' جو مسکراتے ہوئے اسے آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کررہے تھے کہ اس کی بات کا جواب دے۔ اس نے نفی میں سرہلاتے ہوئے گویا انکار کیا۔ وہ اس عورت کی بات کا کیا جواب دے' جسے وہ جانتا تک نہیں تھا اور جس کے حلیے کو دیکھ کر اسے دل ہی دل میں ہنسی بھی آرہی تھی۔

"آپ نے اس کے منہ میں موجود زبان پر تالا لگا رکھا ہے غالباً" وہ عورت' جس نے کھاری کا مکمل جائزہ لینے کی خاطر آنکھوں پر چشمہ لگا رکھا تھا' چشمہ اتارتے ہوئے بولی۔ شاید اس کا جائزہ مکمل ہوچکا تھا۔

"یہ آپ کا رعب حسن ہے بیگم صاحبہ! جس کے آگے بے چارے کی زبان گنگ ہوگئی ہے' ورنہ یہ تو اچھا خاصا باتونی ہے۔" چوہدری صاحب نے ازراہ تفنن کہا۔

"مذاق اچھا کرلیتے ہیں آپ۔" چوہدری صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سرہلایا۔ "لیکن یہ کیوں نہیں بول رہا؟" اس نے دوبارہ کھاری کی طرف توجہ کی۔

"اوئے کاکا کھاری! بولے گا نہیں تو بیگم صاحبہ نے یہیں بیٹھے رہنا ہے۔" چوہدری صاحب نے کھاری کی طرف دیکھا۔

"میں کیا بولوں جی' میری تے سمجھ میں ہی نئیں آئی جی اناں دی بات۔"

کھاری نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے ہاتھ بغلوں میں گھسائے اور گردن تھوڑی اور اندر گھسالی۔ ایسے جیسے کسی وار کے خلاف اپنا دفاع کررہا ہو۔

"میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ کبھی اپنے ماں باپ کے بارے میں تم نے سوچا ہے کہ وہ کیسے ہوں گے؟"

بیگم صاحبہ اب کے قدرے کرخت لہجے میں بولی اور ایسے بولتے ہوئے اس کا انداز ہو بہو استانی حمیدہ جیسا ہوگیا جو لڑکیوں کے پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھی اور جس کو بے در و دیوار اسکول کے میدان میں چوکیوں پر بیٹھی بچیوں کو پڑھاتے اس نے کئی بار دیکھا تھا۔

"میری ماں تے باپ کوئی ہے ہی نئیں جی' ان کے بارے وچ کیا سوچنا۔" چوہدری صاحب کے اکسانے والے اشاروں کی شہ پر وہ بہت سوچنے کے بعد بولا۔

"اوہو! اگر وہ ہوتے تو کیسے ہوتے؟ میں نے یہ پوچھا ہے۔"

"اس بے چارے کو ایسی باتوں کے جواب کہاں آتے ہیں بیگم صاحبہ! میں نے آپ کو بتایا ناں کہ یہ ایک بھولا بھالا سیدھا سادہ لڑکا ہے۔" چوہدری صاحب نے تنگ آکر کہا۔

"یقیناً" یہ ایسا نہیں ہوتا' اگر آپ اسے ایسا نہ بناتے۔" وہ اپنے غم و غصے کو دباتے ہوئے بولی۔ "اگر آپ نے کوئی نیکی کرنے کا ارادہ کرہی لیا تھا تو پوری نیکی کرتے' اسے ادھورا کیوں رہنے دیا۔"

"غنیمت سمجھیں بیگم صاحبہ! کہ میں نے اسے نہ پورا کیا نہ ادھورا چھوڑا۔" چوہدری صاحب نے جواب دیا۔ "میں چاہتا تو آج یہ آکسفورڈ یا ہارورڈ میں پڑھنے والے نوجوان کی شکل میں بھی آپ کے سامنے موجود ہو سکتا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو آج آپ اس سے سوال نہ کررہی ہوتیں بلکہ اس کے سامنے جوابدہ ہو کر بیٹھی ہوتیں۔ ہماری نیتوں کی اصلیت یا تو ہم جانتے ہیں یا پھر ہمارا خدا جانتا ہے۔" پھر وہ سر جھکا کر بولے۔

"آپ نے اسے ڈس اون کردیا تو میرے لیے بھی یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ مجھے اسے کن خطوط پر اٹھانا ہے۔ اپنا لے پالک بناتا تو جو میری حیثیت اور پہچان اس دنیا میں ہے' اس کے حساب سے اس نے لے پالک ہی رہنا تھا۔ بے حیثیتی اور بے شناختی پھر بھی اسی کے حصے میں آنی تھی۔ یہ بتا کر اس کی کہانی شروع کرتا کہ تم فلاں ابن فلاں کے بیٹے ہو تو یہ اپنے غم میں گھلتا عمر گزار دیتا۔ میری محدود عقل میں یہ ہی بہترین شکل آئی جو میں اس کو دے سکتا تھا یا جو مجھے اس کو دینی چاہیے تھی' نہ کُل کا حصہ نہ کُل سے جدا۔"

"واہ چوہدری صاحب واہ..... ولائل زبردست پیش کرتے ہیں آپ' آپ کو تو وکیل ہونا چاہیے تھا وہ بھی سپریم کورٹ میں۔" چوہدری صاحب نے فلزا ظہور کو تن فن کرتے تو بولتے دیکھ کر کھاری کی طرف دیکھا۔

"میں جی چلتا ہوں فیر۔" کھاری نے چوہدری صاحب کے چہرے پر مزاج کا رنگ دیکھ کر اٹھتے ہوئے کہا' اسے یہ لمحہ فرار کے لیے غنیمت محسوس ہوا تھا۔

"بیٹھو تم!" استانی حمیدہ کی بہن جیسی خاتون ڈپٹ کر بولی۔ "چوہدری صاحب بتائیں اسے۔" اس نے چوہدری صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کھاری کی طرف اشارہ کیا۔ "بتائیں اسے کہ میں کون ہوں۔ بتائیں اسے کہ آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ آپ بتائیں گے اسے اس کی اور اپنی زبان میں یا میں بتاؤں۔" وہ چوہدری صاحب پر بھی رعب جماتی کوئی انوکھی ہی عورت تھی۔

"میری سمجھ میں ابھی تک یہ نہیں آرہا کہ گناہ کا تھیلا آپ مجھ غریب کے کندھے پر لٹکانے کی کوشش کیوں کررہی ہیں۔" چوہدری صاحب نے معصوم سی شکل بنا کر کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے' میں اسے سناتی ہوں "اس" کی کہانی۔ اس ٹرائیکا میں سے یہ خود ہی پہچان لے گا گناہ کے تھیلے کو لٹکانے کی کھونٹی کس کے کندھے پر سجی ہے۔" فلزا ظہور نے چیلنجنگ انداز میں چوہدری صاحب کو گھورا اور کھاری کی طرف دیکھا۔

"میں جی چلتا ہوں..... ڈیرے پر ماسٹر کمال اڈیکتا ہوگا۔" کھاری ایک دفعہ پھر اٹھا۔ وہ اس عورت کی نظروں کا سامنا نہیں کرپا رہا تھا۔ ایک عجیب سے خوف نے اسے یکدم آن گھیرا تھا۔

"میں نے کہا ناں' بیٹھو تم!" وہ کڑک کر بولی۔ "آج میں تمہیں بتانے آئی ہوں کہ تمہارا باپ کون ہے؟"

کھاری کی ٹانگیں کانپ گئیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔

"باپ ہی کیوں' یہ بھی بتائیے کہ اس کی ماں کون ہے۔" چوہدری صاحب نے خاتون کو لقمہ دیا۔

"بے فکر رہیے..... یہ بھی بتاؤں گی۔ نانا' نانی' ماموں' خالہ بھی بتاؤں گی' کون تھے۔"

"اور دادا' دادی' چاچا' پھوپھی؟" چوہدری صاحب نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہنہ..." اس کے چہرے پر استہزائیہ ہنسی پھیلی۔ "وہ تو شاید خود اس کے باپ کو بھی یاد نہ ہوں کہ کون تھے۔"



یہ دنیا اوٹ پٹانگا
گتے ہتھ تے کتے ٹانگا

گاڑیوں کے ہارن کی پوں پوں' پاں پاں

"میری بات مانو تو تم بھی اس کے اور اپنے تعلق کی نوعیت جاننے کی کوشش کرو۔ آنکھوں سے غصے اور بدگمانی کی عینک اتار کر اسے یاد کرو۔ اس کی باتیں' اس کا عمل' اس کی فیلنگز جو تمہارے ساتھ وابستہ تھیں۔"

"اگر تم وہ لڑکی ہو جو سعد کی کوئن آف ہارٹ ہے تو میرے پاس تمہاری کچھ امانتیں رکھی ہیں۔"

"کچھ امانتیں' کچھ امانتیں۔"

یہ دنیا واری داری
چگدے سارے نار ناری
توں کانوں بنیا بھکاری

ماؤف ہوتے ذہن اور شل ہوتے اعصاب کے ساتھ ایک مرتبہ پھر اس نے ہارن پر ہاتھ رکھتے ہوئے سوچا۔

توں کانوں بنیا بھکاری
ایدھے چگدے سبھے

اس نے زیر لب دہرایا۔ "جس کا پتا میں ساری دنیا میں بھکاریوں کی طرح ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ اس کا احساس' اس کے محسوسات تو میری ہی مٹھی میں بند تھے۔۔۔ ہائے میں کیوں سمجھ نہ پائی۔"

اس نے ہارن پر سے ہاتھ اٹھا کر بے بسی کے عالم میں اسٹیئرنگ پر مارتے ہوئے سوچا۔

"اور جب کہیں سمجھی اس وقت تک وہ خود نجانے کہاں غائب ہو گیا۔" اس نے آنکھوں سے بہتے پانی کو الٹے ہاتھ سے صاف کیا۔

"مگر وہ امانتیں۔۔۔ ہاں وہ امانتیں ایک بار جو ہاتھ آجائیں تو شاید کوئی پتا ملے' کوئی سراغ' کوئی راستہ۔"

اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ اس کی گاڑی کے آگے لگی گاڑیوں کی قطار آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگی تھی۔

اس نے تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا۔ اس کی گاڑی بھی آگے کھسکی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ٹریفک کے اس جمود سے باہر نکل کر کھلی سڑک کے چوطرفہ موڑ پر آنکلی تھی۔ ماہ نور نے گاڑی اپنی منزل کی طرف جانے والے راستے پر ڈالی۔ یہاں سڑک کشادہ اور ٹریفک یک طرفہ تھی۔ گاڑی کی رفتار بڑھنے لگی' اسے اپنی منزل تک پہنچنے کی جلدی تھی۔

☼ ☼ ☼

کھاری نے سر اٹھا کر باری باری چوہدری صاحب اور فلزا ظہور کو دیکھا۔ اسے اپنے سامنے کا منظر دھندلا نظر آنے لگا تھا۔ چوہدری صاحب اور فلزا ظہور کے چہرے جیسے دھوئیں کے بادل کے پیچھے چھپ رہے تھے۔

"بندے کو جب تک اپنی حقیقت کا پتا نہیں چلتا' وہ سوکھا رہتا ہے' جب اپنی حقیقت کا پتا چل جائے تو زندگی کے دیہاڑے (دن) بڑے اوکھے ہو جاتے ہیں۔"

یہ بات صرف ایک دن پہلے اس نے سعدیہ کلثوم سے کہی تھی۔ سعدیہ جو آپا رابعہ سے ان کی اور اپنی کہانی سن کر آئی تھی اور جس کے دل کو یہ غم لگ گیا تھا کہ اگر وہ پہلے اپنی حیثیت سے آگاہ ہوتی تو شاید اس کی زندگی کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

"اور جو مجھے پہلے اپنی حقیقت کا پتا ہوتا تو کیا میری زندگی کا نقشہ بھی کچھ اور ہوتا۔" اس نے اپنی تیز ہوتی سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

"تمہاری ماں میری دوست تھی اور تمہارا باپ دوست کا شوہر۔" فلزا ظہور نے ایک بار پھر اپنی بات بلند آواز میں دہرائی۔ "تمہاری ماں قتل ہوئی اور تمہارا باپ قتل کے الزام میں ملزم بنا۔ جب تک مجھے علم نہیں تھا کہ تمہارا باپ میری دوست کا شوہر تھا' میں تمہارے باپ کو دل میں بسائے اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھتی رہی اور وہ جو میرے فن کا پرستار تھا' کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ میرے لیے وہ کیا سوچتا تھا۔ میں تو بس ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار اس کے یہ پوچھنے پر کہ میرے ساتھ سفر کرکے میری منزل تک چلنے پر تیار ہو۔۔۔ اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ جوانی کی بے فکری' زندگی کی اونچ نیچ سے لاعلمی' بس رفاقت کی خواہش کی تکمیل' سامنے نظر آتے دیکھنے کا جوش' مجھے ایک ایسے راستے کی طرف لے گیا جس نے میری زندگی کے اردگرد پچھتاووں کی باڑھ اگا کر رکھ دی۔ عمر بھر نہ تو اس باڑھ سے الجھ کر اس سے باہر نکلنے کا حوصلہ کر پائی' نہ ہی اس کے اندر جینے کا حوصلہ خود میں پیدا کر سکی۔"

فلزا ظہور نے پچھتاوے کے کسی نادیدہ احساس کے ساتھ سر جھٹکا۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھے کھاری کے کانپتے ہوئے کمزور سے وجود کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم میری جنت میں آدھی رات گزارنے کی خواہش کا ثمر تھے افتخار احمد! جسے میں نے دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کی مجبوری کے دباؤ کے تحت اپنے ہاتھوں سے گنوایا۔ بقائمی ہوش و حواس' سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے۔ تمہارا باپ' بہت بڑا آدمی ہے افتخار احمد! دولت جس کے گھر کی لونڈی ہے اور جو ایسے دس فارم ہاؤس کھڑے کھڑے خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ جس میں اب

تک تم ایک ملازم کی طرح عمر گزارتے رہے ہو۔"

"تڑک۔۔۔ تڑک۔۔۔ تڑک۔" الفاظ تھے یا زہر میں بجھے نیزے اڑتے ہوئے آکر کھاری کے سینے میں پیوست ہو رہے تھے۔

"میں تو گناہ کے بوجھ تلے دبے آج تک سر اٹھا ہی نہیں سکی۔ لیکن یہ چوہدری صاحب۔" فلزا ظہور نے طنز بھری نظروں سے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ "انہوں نے تمہارے ساتھ کیا نیکی کی' جو تمہیں یہاں سے اٹھایا اور اپنی جاگیر پر کمی کمین کی حیثیت سے پال پوس کر یہ بنا دیا۔" اس نے کھاری کے سراپے کی طرف ہاتھ سے اوپر سے نیچے تک اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"او جی! چوہدری صاحب کو کچھ نہ کہیں۔" ٹرانس میں بیٹھا کھاری تڑپ کر بولا۔ "چوہدری صاحب میرے مائی باپ نیں۔" اس کی آواز کانپنے لگی۔ "چوہدری صاحب نہ ہوندے تو آپ جناب صاحب نے تو مینوں کتے بلیاں دے کھاون واسطے ادھر پھینک دیا تھا۔ میں آپ دی اولاد نہیں تھا نا۔ آپ کو تو بھل کے بھی یاد نہ آیا ہوگا۔ کھاری بچ گیا کہ مر گیا۔ تن حوصلہ چوہدری صاحب دا تھا جو کیڑے ورگا بچہ اٹھا کر لے آئے تے اپنے ڈیرے والیاں کو کہا کہ اسے اپنے بچے ورگا پالیں گے۔ اج جو میں ہوں۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "چوہدری صاحب دی وجہ سے ہی ہوں' زندہ سلامت' کتنے ہی کوڑھوں تے کجیوں توں بچا ہوا' میں سگرٹ نہیں پیتا۔ میں جوا نہیں کھیلتا ——— چوہدری صاحب نے ہی مجھے سکھایا ہے۔ کھاری پتر نک دی سیدھ چلنا ہے۔ سجے کھبے نہیں دیکھنا۔

اس نے جتانے والی نظروں سے فلزا ظہور اور فخر سے چوہدری صاحب کو دیکھا۔

"میں سبزیاں تے پھل' پھول توڑنا جانتا ہوں۔ ٹرک لوڈ کرا سکتا ہوں' میں جنوروں (جانوروں) کا دودھ دھوندا ہوں۔ تے ان کو پٹھے ڈالتا ہوں۔ چوہدری صاحب نے اس بے آسرا بال کو ہنر سکھایا ہے۔ کم دا بندہ بنایا ہے۔ محتاجی توں بچایا ہے۔ چوہدری صاحب نال کسی کا کیا مقابلہ' چوہدری صاحب تے مائی باپ نیں میرے۔" اس نے حقارت سے فلزا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم۔۔۔" فلزا نے کہنا چاہا۔

"او چھوڑو جی۔" کھاری نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "چوہدری صاحب ورگا حوصلہ کسی ہور کا ہو نہیں سکدا۔ میرا سگا پیو تو وہی تھا نا' جس نے آپ جیسی ڈین (ڈائن) کے حوالے کر دیا مجھے اور پھر پلٹ کر پتا بھی نہ لیا۔ اوئے ایسے سگے پیو کو دور سے ہی سلام۔" اس نے سلیوٹ کرنے کے انداز میں ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"جاؤ بی بی صاحب! اپنا کم کرو جا کے' مینوں کوئی شوق نہیں سگے ماں پیو دے بارے پچھ پرتیت (پوچھ گچھ) کرنے کی۔ میں افتخار احمد عرف کھاری ہی چنگا۔ میرے دم نال فارم ہاؤس دیاں رونقاں قائم ہیں' کیوں چوہدری صاحب؟" اس نے ابرو چڑھاتے ہوئے چوہدری صاحب سے سوال کیا۔

چوہدری سردار کو قطعی توقع نہیں تھی' کھاری فلزا کی طنزیہ گفتگو کے جواب میں ایسی بھرپور تقریر جھاڑے گا۔ انہوں نے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ کھاری کے چہرے کا رنگ سرخ پڑ رہا تھا۔ نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے اور آنکھوں میں ایک عجیب سا جوش نظر آ رہا تھا۔

"اوئے شاباش ہے اوئے میرے پتر۔" انہوں نے اٹھ کر وفور محبت سے کھاری کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ "آج تو نے حق ادا کر دیا میری نیتوں کا' میرے خلوص کا' میرے احساس کا۔" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھا بیگم صاحب آپ نے۔" احسان مندی اسے کہتے ہیں' محبت کا جواب محبت سے دینا اور خلوص کو خلوص سمجھنا اسے کہتے ہیں۔ آپ کی مادی زندگی میں تو شاید ان چیزوں کی گنجائش نہ ہو مگر ہم سیدھے سادے دیہاتی لوگ اپنے بچوں کی تربیت کو اسی خمیر سے اٹھاتے ہیں۔"

"آئی ایم امپریسڈ۔ لیکن افتخار احمد! تم اب بھی نہیں سمجھ پائے کہ کس باپ کی اولاد ہو' بلینئر (ارب پتی) ہے تمہارا باپ اور تم اس فارم ہاؤس کے ایک ان پڑھ' معمولی اور ادنیٰ ملازم کی سی زندگی گزار رہے ہو۔"

"ترنگ" الفاظ ایک مرتبہ پھر نیزے کی انی کی طرح کھاری کے دل سے جا ٹکرائے اور اس کا دل زہر میں بجھے وار کی زد میں آکر کسی سیال کی طرح بہنے لگا۔

"دور مت جاؤ، بہت سارا مت سوچو۔ اگر تم سعد سلطان سے واقف ہو تو جان لو کہ تم اس کے سگے بھائی ہو۔" فلزا ظہور نے چوہدری صاحب کے چہرے پر پھیلے منت بھرے تاثرات کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"سعد سلطان۔" اب کے کھاری نے فلزا کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے سننے اور سمجھنے میں غلطی لگی ہو۔

"سعد... وہ لڑکا جو کچھ عرصہ پہلے ادھر فارم ہاؤس میں مہمان ٹھہرا تھا۔" فلزا نے مزید تفصیل سنائی۔

"سعد... سعد سلطان۔" کھاری کی نظروں کے سامنے وہ چہرہ گھوما۔ بندر کا تماشا دکھانے والا، میلے کا سائیں، ماہ نور باجی کا فرینڈ سعد سلطان جو اس کی شادی میں اسے اور رضوان الحق کو گیت سناتا تھا۔ سعد سلطان جو آپا رابعہ کو مطلوب تھا۔ سعد سلطان، جس کے باپ کی کہانی سے وہ خوب واقف تھا۔

سائیں، سائیں، سائیں... کھاری کے کان بجنے لگے اور ارد گرد مہیب سناٹا چھانے لگا۔ اس نے بے یقین نظروں سے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ چوہدری صاحب نے فلزا ظہور کے بیان کی تصدیق میں سر ہلایا۔

کھاری نے گردن موڑ کر فلزا ظہور کی طرف دیکھا، جو بے تاب نظروں سے اس کے رد عمل کی منتظر بیٹھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کھاری نے لکڑی کے اسٹول پر بیٹھے اپنے لرزتے وجود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پھر چشم زدن میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بھین جی۔" اس نے زیر لب کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے چوہدری صاحب اور فلزا ظہور نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔



"میں تمہاری کسی بھی بات کی تردید کروں گا نہ تائید، دنیا کے بہت سے رنگ دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہر انسان کو اپنی ترجیحات کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ملنا چاہیے اور ایک انسان کو کسی دوسرے انسان کی ترجیحات پر سوال اٹھانے اور بحث کرنے سے باز ہی رہنا چاہیے کیونکہ اس کی آزادی دوسرے انسان کی حدود سے باہر ہی ختم ہو جاتی ہے۔

سونا دیہ بلال! میری پیاری دوست! میں تہہ دل سے تمہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ تمہیں تمہاری منزل مل گئی۔ اس دعا کے ساتھ یہ مبارک باد قبول کرو کہ کاش! یہ منزل ہی تمہاری اصل منزل ثابت ہو اور تم کچھ عرصے بعد اس کے بارے میں کسی الجھاؤ، کسی تشکیک کا شکار نہ ہو جاؤ۔

میں ایک لاپروا، بے کار، غیر منظم سا انسان ہوں۔ ہو سکتا ہے چیزوں کے بارے میں میرا مشاہدہ بہت سطحی اور اوپری سا ہو، لیکن یقین کرو کہ میں نے تمہاری حالیہ میل کا ایک ایک لفظ دھیان سے پڑھا اور سمجھا ہے۔ مجھے اس کے کسی بھی لفظ پر اعتراض ہے نہ شک۔ ہاں اپنے بارے میں، میں یہ وضاحت ضرور کرنا چاہوں گا کہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے جہاں میں تقریباً "سب ہی مذاہب کے معبوز اور جموز سے، بہت اچھی طرح واقف اور مانوس رہا۔

وہاں مجھے اپنے بارے میں یقین ہے کہ مندروں سے اٹھتی گھنٹی کی آوازوں، اشلوک دہرانے اور بھجن پڑھنے کی موسیقیت بھی کبھی مجھے اپنی طرف نہیں کھینچ سکی تھی، شاید اس لیے کہ میں پیدائشی دہریہ ہوں۔ بچپن ہی سے میرا دل مذہب کے سکھائے صحیح اور غلط اصولوں کی غیر دلچسپ تفصیل سے الجھتا تھا۔ میری ماں مجھے اپنے سامنے بٹھا کر سمجھایا کرتی بھگوان مجھ سے کیا چاہتا تھا، اور میرا کیا کرنا بھگوان کو پسند نہیں تھا۔ گھر کے ایک کونے میں بنائے گئے چھوٹے سے پوجا پاٹ مندر کو جو گھر بھر کے لیے احترام کی جگہ تھی، میں نے ہمیشہ دل کو اکتا دینے والے کونے کی

حیثیت سے دیکھا۔

مندروں میں جا کر گھنٹیاں بجانے، پراتھنا کرنے اور جھوم جھوم کر بھجن پڑھنے سے مجھے ہمیشہ چڑ سی رہی۔ مٹی کی رنگی پتی بے جان مورتیوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھنا اور اپنے من کی آشاؤں کو بیان کرنا ہمیشہ ہی مجھے ایک انتہائی غیر دلچسپ عمل محسوس ہوا، میری یہ ہی فطرت مجھے مذہب سے دور اور دور، بہت دور لے جاتی گئی، آج جہاں میں ہوں اور جس طرح ایک آزاد فرد کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہوں۔ میرے دل کے اندر ایک عجیب سا سکون موجیں مارتا رہتا ہے کہ میں رسمی، دنیاوی قیود سے آزاد ہوں، میری زندگی میں مذہبی افکار کی کوئی گنجائش نہیں میرے صحیح اور غلط کے پیمانے وہ ہیں جو میں نے اپنے لیے خود وضع کیے ہیں کسی مذہبی طاقت کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں۔ لہٰذا آج بھی نہ تو مندروں سے اٹھتی گھنٹیوں کی آوازیں اور نہ ہی اشلوک و بھجن پڑھے جانے کی صداؤں نے مجھے کبھی مانوسیت کا احساس دیا ہے۔ میرے لیے ان آوازوں اور مسجد، کلیسا، گوردوارے وغیرہ وغیرہ سے سنائی دیتی آوازوں میں کوئی فرق نہیں۔

مجھے ان آوازوں اور مذہبی ثقافتوں سے ایک شدید قسم کی چڑ محسوس ہوتی ہے اور جہاں کبھی یہ آوازیں میرے کان میں پڑنے لگیں میرا دل وہاں سے دور بھاگ جانے کو چاہنے لگتا ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود میرا دل تمہارے لیے، بہت خوش ہے، تمہارے الفاظ میں موجود جوش اور خوشی کا احساس مجھے خوش کر دیتا ہے۔ کیونکہ ایک دوست کی حیثیت سے تم مجھے بہت عزیز ہو اور میں دوستوں کی خوشی میں خوش ہونے والا انسان ہوں۔"

نادیہ نے چندر شیکھر کی میل تفصیل سے پڑھی اور نظریں لیپ ٹاپ کی اسکرین سے ہٹا کر سامنے جمالیں۔ اس کی نظروں کے سامنے دیوار میں جڑی کھڑکی کے شیشوں پر سے پیچھے ہٹے ہوئے پردے تھے اور شیشوں سے پار باہر فضا میں آسمان سے گرتی برف کے گالے سارے میں اڑتے پھرتے تھے۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی اداسی اترنے لگی۔

چندر شیکھر، ایک بے منزل مسافر، ایک بے سمت راہی، اس کا عزیز دوست۔ اسے چندر شیکھر کے لیے اپنے دل میں ایک دکھ محسوس ہو رہا تھا۔

"کاش وہ سمجھ پاتا، کاش وہ اسے سمجھا پاتی۔" اس کے دل میں ہوک سی اٹھنے لگی تھی۔



"آئی ایم سوری مس! آپ کی ملاقات بلال صاحب سے نہیں ہو سکتی، آج تو بالکل بھی نہیں۔" بلال سلطان کی پرسنل سیکریٹری نے اپنے خوش رنگ لپ اسٹک سے سجے ہونٹ سکیڑتے ہوئے پیشہ ورانہ انداز میں ماہ نور سے کہا تھا۔

"دیکھیں، میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے، آج ہی کیا ابھی بالکل ابھی، یقین جانیے یہ ایک کاروباری نوعیت کی ملاقات ہرگز نہیں ہوگی یہ ذاتی ملاقات ہے اور بہت اہم ہے، پلیز آپ میری بات پر غور کیجیے، پلیز پلیز پلیز۔" ماہ نور نے بے قراری سے کہا۔

"باس کے پہلے سے طے شدہ پروگرام میں آج کے دن کسی فالتو ملاقات کے لیے ایک سیکنڈ بھی فارغ نہیں ہے۔ چاہے ملاقاتی کے لیے وہ کتنی ہی اہم ملاقات کیوں نہ ہو۔" سیکریٹری نے اس کی درخواست نظر انداز کرتے ہوئے اپنی نظریں فلیٹ اسکرین مانیٹر پر جمائے ہوئے جواب دیا تھا۔

"ایک سیکنڈ بھی کیسے نہیں۔" ماہ نور نے کہا "لنچ بریک تو لیتے ہی ہیں ناوہ۔ اور اس میں وہ فارغ ہی ہوتے ہیں یقیناً"۔

"آج ان کا لنچ بھی ایک فارن ڈیلیگیشن کے ساتھ طے ہے اور ڈنر بھی وہ ملائیشین قونصلیٹ میں کریں گے، آج وہاں کوئی ثقافتی تقریب منعقد ہو رہی ہے۔" سیکریٹری کا انداز انتہائی بے نیازانہ تھا۔

"افوہ!" ماہ نور نے ماتھے پر ہاتھ مارا 'اس وقت اسے اپنا آپ بری طرح بے بس محسوس ہو رہا تھا۔

"دیکھیں! ابھی صرف ایک دن پہلے میری ان سے ملاقات ہوئی تھی' جس میں انہوں نے مجھے پہلے سے دیے ہوئے بارہ سو سیکنڈز سے کہیں زیادہ وقت دیا تھا' آپ کو یاد ہو شاید۔" اس نے ایک اور حربہ آزماتے ہوئے کہا۔ "میں ابراہیم کے ساتھ یہاں آئی تھی' ابراہیم جو سعد سلطان کا دوست ہے۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے مس!" سیکریٹری نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا "لیکن ایک دن پہلے کے شیڈول اور آج کے شیڈول میں بہت فرق ہے۔ ایک دن پہلے انہوں نے خود بارہ سو سیکنڈز آپ کو دیے تھے۔ ان بارہ سو سیکنڈز کو آگے بڑھانا ان کی اپنی مرضی تھی۔ لیکن آج کے شیڈول میں ایک بھی سیکنڈ آپ کے نام نہیں ہے۔"

"آپ ان سے بات تو کر کے دیکھیں' انہیں میرے بارے میں بتائیں تو سہی۔ ہو سکتا ہے وہ آپ سے میرا ذکر سن کر مجھے ملاقات کے لیے بلا لیں۔"

"اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں اپنی اس جاب سے فائر کر دی جاؤں تو ٹھیک ہے' میں ان کو اطلاع کرنے کی کوشش کر کے دیکھ لیتی ہوں۔" سیکریٹری نے رکھائی سے کہا۔

"اوہ... نہیں۔" ماہ نور کو اچانک احساس ہوا کہ وہ اس لڑکی پر ضرورت سے زیادہ دباؤ ڈال رہی تھی۔ اسے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ وہ استقبالیہ کے پاس رکھے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں کوئی ایسا راستہ نہیں آ رہا تھا' جس کے ذریعے وہ فوری طور پر بلال سلطان تک پہنچ سکے۔ اس نے ایک دو بار ابراہیم کا نمبر ملانے کی کوشش کی لیکن اس کا فون بند جا رہا تھا۔ اس نے بے قرار نظروں سے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہ ایک ویل فرنشڈ' ویل ڈیکوریٹڈ ریسپشن روم تھا۔

"کبھی یہاں وہ بھی آتا ہو گا۔ یہیں اس کمرے میں کھڑے ہو کر کسی سے بات کرتا ہو گا۔ مین آفس میں جاتے جاتے لمحہ دو لمحہ یہاں بھی رکتا ہو گا۔" اس کی سوچ کی رو بھٹکنے لگی۔ "وہ... جسے میں نے اس وقت پایا جب وہ یہاں کہیں بھی نہیں ہے۔" ایک بار پھر وہی ہوک دل میں اٹھنے لگی۔

"مس رائنہ! باس کو انفارم کر دیں' میں واپس پہنچ گیا ہوں' انہوں نے شاید اپنا نمبر سائیلنٹ کیا ہوا ہے۔" اسی دم ایک دراز قد' کسرتی جسم والا شخص کمرے میں داخل ہوا۔

"اوہ مسٹر رازی! باس صبح سے تین بار آپ کے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔" سیکریٹری نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے انٹر کام کا نمبر دبایا۔

"وہ کہہ رہے ہیں کہ ٹھیک پچیس منٹ بعد آپ کو اندر بھجوا دوں۔" انٹر کام پر بات کرنے کے بعد اس نے آنے والے شخص سے کہا۔

"آہ... ہا!" وہ ماہ نور کے سامنے والے صوفے پر اپنی ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے آرام دہ پوزیشن میں بیٹھ گیا۔

"لگتا ہے خاصا لمبا سفر کر کے آئے ہیں رازی صاحب۔" سیکریٹری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی ایسا ویسا لمبا سفر آپ کو باس کا تو پتا ہی ہے نا۔" اس نے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد سرگوشی کے انداز میں کہا سیکریٹری نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا "مشن امپاسیبل پر بھیجتے ہوئے باس کوئی ساتھی بھی ساتھ نہیں بھیجتا اور کچھ نہیں انسان بات چیت ہی کر لیتا ہے۔ میرا تو منہ بھی خاموش رہ رہ کر تھک چکا ہے۔"

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا...!" سیکریٹری مسکرا کر بولی اور پرنٹر سے صفحے نکالنے میں مصروف ہو گئی۔

"نند پور سے آگے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر وہ گاؤں تھا جہاں سے میں ہو کر آیا ہوں۔ افوہ!" اس شخص نے خود کلامی کے سے انداز میں کہتے ہوئے سر ہلایا "ایک بور تجربہ تھا یہ" اس نے سیکریٹری سے کہا' جو اپنے کام میں مگن شاید اس کی بات سن بھی نہیں رہی تھی لیکن سامنے صوفے پر بیٹھی ماہ نور کے کان کھڑے ہو چکے تھے۔

"آپ بگن والا تک ہو کر آئے ہیں یا اس سے بھی آگے کہیں۔" اس نے ہوا میں تیر چلانے کے سے انداز میں کہا۔

"ب' بگن والا" وہ شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑانے کے بعد ماہ نور کی طرف دیکھنے لگا۔ "کیا میں نے یہ نام لیا' کیا یہ نام میرے منہ سے نکلا ہے؟" اس نے ماہ نور سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" ماہ نور کو لگا' تیر نشانے پر جا بیٹھا تھا "یہ تو میرا اپنا قیاس تھا۔"

"کیا آپ نے وہ علاقہ دیکھ رکھا ہے؟" وہ شخص متجسس ہوا۔

"نہ صرف دیکھ رکھا ہے بلکہ میں وہیں سے تعلق رکھتی ہوں۔" ماہ نور نے اسے ایک اور دھچکا پہنچاتے ہوئے کہا۔

"کیا واقعی؟" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ماہ نور والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آپ وہاں کب گئی تھیں آخری مرتبہ؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی گئی تھی' سعد سلطان کے ساتھ۔" ایک اور تیر چلا۔

"سعد سلطان کے ساتھ۔" وہ شخص اپنی جگہ سے دو انچ آگے کھسکا۔

"جی ہاں' وہاں میرے چچا سردار کے منہ بولے بیٹے کی شادی کی تقریب تھی' سعد سلطان بھی انوائیٹڈ تھا۔"

"او مائی گاڈ! آپ چوہدری سردار کو بھی جانتی ہیں۔" اب کے وہ شخص واقعی بوکھلا گیا۔

"کیوں نہیں جانوں گی وہ میرے والد کے سگے بھائی ہیں۔" ماہ نور نے بے نیازی دکھائی۔

"پھر تو آپ رابعہ کلثوم اور مولوی سراج سرفراز کو بھی جانتی ہوں گی۔" اس شخص نے چاروں طرف دیکھنے کے بعد پوچھا۔

"بالکل جانتی ہوں۔" ماہ نور نے کہا اور سوالیہ انداز میں اس شخص کی طرف دیکھنے لگی۔

"آپ وہاں کیا کرنے گئے تھے اور آپ ان سب لوگوں کو کیسے جانتے ہیں؟"

"مجھے باس نے وہاں بھیجا تھا' ان سب لوگوں کی خبر لانے۔" اس شخص نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"اوہ... تو یہ بات ہے!" ماہ نور نے بے اختیار کہا۔ "پھر لے آئے آپ خبر؟"

"وہی تو لے کر آ رہا ہوں۔" اس شخص نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "وہاں یہ سب لوگ موجود ہیں۔"

"پھر؟" ماہ نور نے ابرو چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"پھر تو پتا نہیں' یہ تو باس کو ہی پتا ہو گا کہ پھر کیا ہو گا۔" اس شخص نے کہا۔

"اگر آپ مجھے ایک فیور دیں اور مجھے بلال سلطان سے ملوا دیں تو میں آپ کو بگن والا اور وہاں کے مکینوں کے بارے میں کافی معلومات دے سکتی ہوں۔" ماہ نور نے ترپ کا پتا کھیلنے کی کوشش کی۔

"آپ باس سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟" اس نے مشکوک ہوتے ہوئے پوچھا۔

"سعد سلطان کے سلسلے میں ملنا ہے مجھے ان سے۔" ماہ نور نے کہا۔

"س... سعد سلطان!" وہ بلا ارادہ بلند آواز میں بولا اور پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے اپنی آواز نیچی کی "وہ تو غائب ہے کافی دنوں سے۔"

"میں جانتی ہوں۔" ماہ نور نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن پھر بھی مجھے اسی کے سلسلے میں ملنا ہے۔"

"ہوں!" اس نے اپنی ٹانگ پر دائیں ہاتھ کی انگلیاں بجاتے ہوئے سوچا "ٹھیک ہے" پھر وہ ماہ نور کی طرف دیکھتے

ہوئے بولا "میں کوشش کرتا ہوں کہ باس سے تمہاری ملاقات ہو جائے، لیکن پہلے تم مجھے وہ معلومات تو دو جو تمہارے پاس ہیں۔"

"ہاں دو۔" ماہ نور سیدھی ہو کر بیٹھی۔ بلال سلطان سے ملاقات کی امید پیدا ہونے نے اس کے اندر نئی توانائی سی بھر دی تھی۔



آپا رابعہ نے دو دن سے پانی میں بھگوئی مٹی کو دونوں ہاتھوں سے گوندھا اور پھر اس گندھی ہوئی مٹی کا ایک ٹکڑا لے کر اسے سورج کی روشنی میں دیکھا۔ مٹی میں ہوا کے بلبلے باقی رہ جانے سے ان کا بنایا چولہا خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

"اس کو مزید گوندھنے کی ضرورت ہے۔" انہوں نے مٹی کا وہ ٹکڑا دوبارہ گندھی مٹی میں ملاتے ہوئے سوچا اور ان کے دونوں ہاتھ دوبارہ مٹی گوندھنے میں مصروف ہوئے۔ اسی دم گھر کا بیرونی دروازہ ایک اونچی آواز کے ساتھ کھلا اور اس کے دونوں پٹ اپنی اپنی طرف کی دیوار سے جا لگے۔

"الٰہی خیر!" آپا رابعہ نے گھبرا کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھا "یہ کون آگیا۔" ان کا خیال تھا کہ آنے والا ہمسایوں کا کوئی بچہ ہو گا جس کی پتنگ یا گیند ان کی چھت پر آگری ہو گی مگر ان کی توقع کے خلاف آنے والا کھاری تھا جو اس سے پہلے جب بھی آیا، بڑے سلیقے اور قرینے سے گھر میں داخل ہوا تھا۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر مٹی میں سنے ہاتھ لیے اٹھ کر ڈیوڑھی کی طرف آئیں۔ کھاری ڈیوڑھی کے درمیان میں کھڑا تھا اور اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"خیر تو ہے؟" آپا رابعہ نے گھبرا کر پوچھا۔ کھاری کے پیچھے گھر کا داخلی دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور پھر پیچھے مڑ کر کھاری کی طرف دیکھا۔

"خیر کوئی نہیں بھین جی! خیر کوئی نہیں۔" اس نے پھولے سانس کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا۔

"اُفوہ ہوا کیا؟" آپا رابعہ نے مزید گھبراتے ہوئے کہا۔ "سعدیہ تو ٹھیک ہے نا!" ان کے ذہن میں فوری طور پر سعدیہ ہی کا خیال آیا۔

"سعدیہ نوں تے سے ہی خیراں ہیں بھین جی! مسئلہ تو سارا افتخار احمد عرف کھاری کے ساتھ ہو گیا ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہوا کیا ہے، آرام سے بیٹھو اور بتاؤ مجھے، ہوا کیا ہے۔" آپا رابعہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈیوڑھی کی سیڑھیوں کے نیچے بچھی چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"چور پھڑا گیا (چور پکڑا گیا) بھین جی۔" کھاری نے ان کی طرف دیکھا۔

"کون سا چور، کہاں چوری ہوئی۔" آپا رابعہ نے حیرت سے کہا۔

"دل کا چور۔" کھاری نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میرا باپ۔"

"اے ہے! کیا اول فول بک رہے ہو، کہیں بخار تو نہیں چڑھ گیا تمہارے دماغ کو؟" آپا رابعہ نے کھاری کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"او نہیں بھین جی!" اس نے زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو کوئی رپٹ کرائی نہ تھانے گیا پر میرا چور آپوں آپ ہی پھڑیا۔"

"کون ہے تمہارا چور، کس کی بات کر رہے ہو؟"

"اس دا نام بلال سلطان ہے بھین جی اور وہ سعد سلطان دا باپ ہے، آپ کو پتا ہے بھین جی! میرا باپ بھی وہی ہے۔ وہی ہے جس نے مینوں چوہے، کتے بلیاں دا کھاجا بننے کے لیے پھکوا دیا تھا۔" کھاری نے آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی کے ڈورے تیر رہے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہو تم کھاری؟" آپا رابعہ کو لگا ان کا اپنی سماعت پر سے یقین اٹھنے لگا تھا۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں بھین جی! بے شک چوہدری صاحب سے جا کر پوچھ لیں۔" کھاری نے انہیں یقین دلانے کے انداز میں سر ہلایا۔

"میں نہیں مانتی۔" آپا رابعہ نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ "بلال سلطان تمہارا باپ کیسے ہو سکتا ہے، وہ اتنا سفاک اور ظالم کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنی اولاد کو آوارہ جانوروں کا لقمہ بننے کے لیے یوں چھوڑ جائے۔"

"آپ نوں بھلیکا ہے بھین جی (آپ کو غلط فہمی ہے)۔" کھاری نے ہاتھ ہلایا۔ "اس نے اس پچھل پیری کو کہا تھا کہ مینوں بسوں دے اڈے پر پھینک جائے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے غالباً "فارم ہاؤس کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے کھاری تمہارے دماغ کو بخار چڑھ گیا ہے، تمہیں سرسام ہو گیا ہے شاید۔" آپا رابعہ نے اب کے اسے ڈپٹتے ہوئے کہا۔

"آپ چلو۔" کھاری نے ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چلو میرے ساتھ فارم ہاؤس پر، ساری کہانی، ساری حقیقت وہیں کھل جائے گی جا کر، آپ چل کر اس پچھل پیری نوں ملو تے سہی، وہ آپ نوں خود ہی بتائے گی کہ کیا ہوا تھا، کیا نہیں ہوا تھا۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کھینچنے لگا تھا۔

"اچھا دم تو لو۔" آپا رابعہ نے صورت حال کو سمجھنے کے لیے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"نہیں، ہن تسی میرے ساتھ چلو گے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "چھیتی نال برقعہ پہن لو اور میرے ساتھ چلو۔

چل پڑو بھین جی، اللہ دا واسطہ جے چل پڑو۔" آپا رابعہ کو جزبز ہوتے دیکھ کر وہ منتوں پر اتر آیا "او کیہندے نیں میں سعد صاب کے ابے کا بیٹا ہوں، تسی میرے نال چلتے نہیں، دسو میں کی کراں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"اچھا صبر کرو، میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔" آپا رابعہ کو کھاری کی باتوں سے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ

کیا کہہ رہا تھا' اس کی تسلی کی خاطر وہ اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"میرا دل کہتا تھا' تم دلہن بن کر بہت پیاری لگو گی۔"
"تمہارا دل میرے دولہا کے بارے میں کچھ نہیں کہتا تھا کیا؟"
"ہا ہا... اس کے بارے میں دل نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔"
"ہاں' جب ہی تو جھونک دیا مجھے' جدھر کو آگ کے شعلے لپکے۔"
"افوہ! اتنا دکھ ہو رہا ہے تمہیں؟"
"تو اور کیا' بس بھیانک شکل اور سرمہ لگی آنکھوں کا تصور کر کے ہی کانپ کانپ جاتی ہوں' سر پر چار خانے کا رومال باندھے اپنی طرف سے سنگھار کر کے آیا تھا نکاح پڑھوانے کم...."
"ہاں ہاں' کہہ دو کم بخت اس بے چارے کو' رک کیوں گئیں کہتے کہتے۔"
"برائی عادت کے تحت زبان پھسل جاتی ہے' کیا کروں' بہتیرا خود کو سنبھالتی ہوں مگر سنبھالا نہیں جاتا۔"
"یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ وہ کم بخت نہیں بلند بخت ہے' جس کا نکاح تمہارے ساتھ ہوا۔ تمہارا شوہر بن جانا بلند بختی کی دلیل ہے۔"
"ارے جاؤ' جاؤ.... میرا دل نہ بہلاؤ' میں سب جانتی ہوں' کتنا بلند بخت ہوا وہ مجھ سے نکاح کر کے' بات تک کرنی نہیں آتی' ہابڑیوں (ندیدوں) کی طرح کھانا کھاتا ہے' لگتا ہے نسلوں کا بھوکا ٹوٹا ہے' کھائے جاتا ہے کھائے جاتا ہے نہ نیت بھرتی ہے اس کی نہ پیٹ۔"
"بس کر دو بس' نیک عورتوں کو زیب نہیں دیتا شوہروں کی برائیاں کرنا' بہت ہو چکی اب اس کی برائی' توبہ کرو اور آئندہ اس کی عزت کرنا سیکھو' ورنہ اللہ ناراض ہو جائے گا تم سے۔"
"بس ایک یہ ہی دھمکی دے کر ڈرایا کرو مجھے' اللہ ناراض ہو جائے گا۔ جانتی ہو نا اس دھمکی کا اثر ہو کر رہے گا مجھ پر۔"
"اچھا اچھا' بس کرو اب اپنے شوہر نامدار کی باتیں اور مجھے اس بوتل سے کانجی کا گلاس بھر دو' جو بہن سکینہ نے بھجوائی ہے' عجیب سی پیاس لگ رہی ہے مجھے۔"
"بہن سکینہ کے گھر سے آئی چیز کھانے سے کتنی بار منع کیا ہے تمہیں' طیفے لاٹر کی ایجنٹ ہے وہ' جانتی بھی ہو اچھی طرح۔"
"کیا کیا شک اٹھتے ہیں تمہارے اندر' پھر کسی سے کوئی نہ کوئی تعلق تو ہو گا طیفے لاٹر کا محلے میں' اب کیا ہم ہر کسی سے تعلق توڑ لیں۔ چلو جا کر میرے لیے ایک گلاس بھر لاؤ۔"

"لو یہ لو... آیت الکرسی پڑھ کر پینا بہن!"
"تمہارے وہم' تمہارے شک' ارے دیکھو ذرا اسعد کو اٹھاؤ' یہ لڑکا جب سے گھٹنوں کے بل چلنے لگا ہے' ہر چیز پکڑ کر خود پر کھینچ لیتا ہے' لگتا ہے پھر خود پر کچھ گرا لیا اس نے۔"
"ہاں' تمہیں دیکھ کر آتی ہوں۔"
"ارے ارے ارے میرا منا' گر گیا تھا' آؤ میری جان میں تمہیں گود میں اٹھا لوں۔ نہ نہ رونا نہیں چلو تمہاری اماں کے پاس چلتے ہیں۔"
"ارے ارے یہ کیا ہوا' ہیں' ہیں۔ تمہارے ہاتھ سے گلاس کیسے چھوٹ گیا اور تم گر کیسے گئیں! ہائے میرے اللہ' یہ تو اوندھے منہ گری ہوئی ہے۔ ہائے کسے بلاؤں اس کے تو منہ سے خون چھوٹ رہا ہے۔ ہائے کوئی ہے۔ اسے پکڑو کوئی اسے اٹھاؤ.... کدھر گئے ہو سراج سرفراز.... دیکھو تو میری بہن کو کیا ہو گیا۔ ارے صرف پانچ منٹ

تو لگے تھے مجھے دوسرے کمرے سے جا کر بچہ اٹھانے میں۔ اتنی سی دیر میں یہ کیا ہو گیا میرے اللہ۔"
بچے کے رونے کی آوازیں' کسی کے سراسیمگی میں دوڑنے بھاگنے کی آوازیں۔

"میں نے کہا تھا کہ آج کوئی میٹنگ نہیں ہو گی پھر یہ لڑکی میرے آفس میں کیسے آگئی؟" بلال سلطان نے چلاتے ہوئے رائنہ کی طرف دیکھا جس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ رازی کے ساتھ وہ لڑکی بھی آفس میں چلی آئی تھی جسے وہ کب سے ٹکا سا جواب دے کر واپس چلے جانے کی تلقین کر رہی تھی۔
"سر! مجھے معلوم نہیں' یہ کیسے اندر چلی آئیں۔" رائنہ بیچاری کے پاس اپنے دفاع کے لیے الفاظ کم پڑنے لگے تھے۔
"تمہیں علم نہیں تھا.... اگر تمہیں علم نہیں تھا تو پھر سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔ تمہاری سیٹ پر کسی ایسے شخص کو بٹھاؤں جو ایسا لاعلم اور بے خبر نہ ہو کہ اس کے سامنے سے گزر کر کوئی بھی ایکس وائی زیڈ میرے آفس میں گھس آئے اور اسے خبر ہی نہ ہو۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ اونچی آواز میں چلائے تھے۔
"باس' میری بات۔" رازی نے آگے بڑھ کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔
"شٹ اپ رازی! میں نے تمہیں کچھ کہنے کے لیے کلیو دے دیا کیا کہ تم بولنے لگے۔" وہ الٹا رازی پر بھی برس پڑے۔
"آئی ایم ایکسٹریملی سوری سر! میں تو کب سے اس لڑکی کو بتا رہی تھی کہ آپ کا شیڈول کتنا ٹائٹ ہے' ملاقات کا کوئی چانس نہیں لیکن کچھ لوگ ہوتے ہی بڑے ڈھیٹ ہیں۔" رائنہ نے حقارت سے ماہ نور کی طرف دیکھا۔
ماہ نور نے غصے سے چکراتے سر کو قابو کرنے کی کوشش میں آنکھیں بند کر لیں۔ اسے لگا اس کا فشار خون بڑھ رہا تھا اور بڑھتے بڑھتے اتنا اونچا ہونے لگا تھا کہ اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جانے کے قریب تھیں۔ اتنی بے عزتی اور ایسی حقارت بھری نظریں عمر بھر بھی کسی کو اس پر ڈالنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔
"آپ ہیں کیا چیز؟" وہ بلال سلطان کے سامنے جا کر چلا کر بولی۔
"خود کو سمجھتے کیا ہیں آپ' فرعون ہیں یا نمرود ہیں آپ۔ سب پر یوں چلا رہے ہیں جیسے ان کی سانسوں کی ڈور بھی آپ کے ہاتھ میں تھمی ہے۔"
بلال سلطان نے دم بخود ہوتے ہوئے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو ان کے ذاتی ملازموں کی موجودگی میں ان پر چلا رہی تھی۔
"ہاں میں زبردستی گھسی ہوں آپ کے آفس میں' آپ کا آفس نہ ہوا نو گو ایریا ہو گیا۔ جس میں کسی کا داخل ہونا ایسے ہی ہے جیسے خود کو گولی کی زد پر رکھ کر گھس رہے ہوں.... میں نے سنا ہی تھا' آج دیکھ بھی لیا۔ خود کو اتنا ناقابل رسائی بنا کر بہ زعم خود آپ اپنا دفاع کر رہے ہیں لیکن آپ کے نامہ اعمال سے وہ سیاہ کرتوت دھل تو پھر بھی نہیں جائیں گے جو اس میں انمٹ سیاہی سے لکھے جا چکے۔"
"رازی.... کک ہر آوٹ" (اسے باہر نکال دو) بلال سلطان نے سرخ پڑتی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"I say kick her out at once"
"آپ مجھے کک آوٹ نہیں کر سکتے بلال صاحب۔" ماہ نور نے اپنی طرف پیش قدمی کرتے رازی پر ایک سخت نظر ڈالتے ہوئے کہا "آپ چاہیں بھی تو ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ میں وہ لڑکی ہوں جسے آپ کے بیٹے نے اپنے دل کی ملکہ بنایا اور جسے اپنے دل سے نکالنے کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔"
بلال سلطان ایک بار پھر دم بخود ہو چکے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صائمہ بشیر

یہ کیسا ہمسفر ہے

ناولٹ

سننے میں تو یہ آیا تھا کہ سبطین صاحب کا غصہ در و دیوار ہلا دیتا ہے مگر کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ یہ بندہ اپنے گھر میں پانی تک اپنی مرضی سے نہیں پی سکتا اور دیکھنے والوں نے کیا دیکھا۔ وہ ہم بتانے سے قاصر ہیں۔ آپ خود ہی دیکھ لیجیے۔

"ارے آپ پھر سے یہ بوتل اٹھائے پھر رہے ہیں ..... رکھیں اسے واپس..... میں نے سو دفعہ سمجھایا ہے کہ یہ والی بوتلیں میں نے ابھی بھری ہیں پہلے دوسری استعمال کریں پھر یہ تازہ پانی والی کی باری آئے گی۔"

ذکیہ بیگم نے جو سبطین صاحب کے ہاتھ میں پانی کی وہ بوتل دیکھی جو کہ کچھ دیر پہلے بھری گئی تھی تو ٹوکے بنا نہ رہ سکیں اور بے چارے سبطین صاحب کا ہاتھ بوتل کے ڈھکن پر سے لڑھک کے نیچے آگیا۔

"محب کی ماں! کیا فرق پڑتا ہے دونوں میں پانی ہی ہے نا؟" سبطین صاحب نے ہمیشہ کی طرح کمزور سا احتجاج کیا۔ جانتے وہ بھی تھے کہ پانی کے معاملے میں وہ پاکستان ہیں اور ان کی بیگم انڈیا۔

"بہت فرق پڑتا ہے۔ سارا دن میں پانی ابالتے اور پھر اسے ململ کے کپڑے سے گزار کر ٹھنڈا کر کے بوتلوں میں منتقل کرتی ہوں اگر آپ کریں نا تو پھر پوچھوں گی کہ کیا فرق پڑتا ہے۔" ذکیہ بیگم نے رٹا رٹایا جواب دیا۔

یہ اس گھر کی روز کی بحث تھی جسے اس گھر کے مکین سننے کے عادی تھے۔ سبطین صاحب نے گھر میں فلٹر پلانٹ لگوا کر دیا ہوا تھا لیکن ذکیہ بیگم کی وہمی اور صفائی پسند طبیعت کہ وہ فلٹر شدہ پانی کو بھی ابالے بغیر استعمال نہیں کرنے دیتی تھیں چونکہ یہ کام وہ خود سر انجام دیتی تھیں اس لیے اس بات کا رعب بھی جماتی تھیں اور پانی کی بوتلوں پہ مکمل کنٹرول رکھے ہوئے تھیں۔ سبطین صاحب اس معاملے میں بالکل بے بس تھے۔

"ویسے تو ریٹائرمنٹ کے بعد سے کبھی ٹل کے نہیں دیے ہر گھڑی دو گھڑی بعد پانی پینے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا میں یا امین پانی نہیں دے سکتے آپ کو جو احسان کرنے چلے آتے ہیں کچن میں۔" ذکیہ بیگم

سبطین صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ زیادہ ہی نڈر اور بے باک ہو گئی تھیں مجال ہے جو ان کو فارغ رہنے کا کوئی طعنہ دینے سے باز رہتی ہوں۔

"جتنی دیر میں تم یا وہ امین میری آواز سنتا ہے۔ اتنی دیر میں میں سبزی منڈی سے ہو آتا ہوں۔"

سبطین صاحب نے بھی طریقے سے جتا دیا کہ وہ مکمل "فارغ" نہیں ہیں بلکہ گھر کا سودا سلف سبزی وغیرہ وہی لاتے ہیں۔

"جو سبزی آپ لاتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ گھر



میں ہی رہا کریں۔" ذکیہ بیگم نے بڑبڑاتے ہوئے چائے کا پانی چولہے پر رکھا۔

"ہونہہ!" سبطین صاحب بھی جواب دیے بغیر کچن سے نکل آئے۔

ویسے تو گھر کے کاموں کے لیے امین نامی ملازم موجود تھا لیکن ذکیہ بیگم اپنے کچن کی راجدھانی کسی کے حوالے کرنے پر تیار نہیں تھیں۔ ان کی کوشش ہوتی کہ وہ خود ہی سب کام کریں تاکہ کم سے کم برتن، پانی اور گیس استعمال ہو جبکہ امین صرف نام کا ہی امین تھا ہر چیز میں خیانت کرنا اس کا کام تھا۔

"کیا ہوا ہے؟ صبح صبح آپ دونوں بھی نا بس۔۔۔" معوز آنکھیں ملتا ہوا کچن میں داخل ہوا۔

"ہم دونوں؟ یہ اپنی ماں سے پوچھو ہو سکتا ہے کہ "را" کی ایجنٹ ہے۔ جو پانی پر بند باندھے بیٹھی ہے۔" سبطین صاحب نے لاؤنج سے ہی آواز بلند کی ویسے بھی انہیں بحث کرنے کا بہت شوق تھا۔

"تو آپ نے کون سے بھاشا ڈیم بنائے ہوئے ہیں جو میں بچت نہ کروں۔ بیٹا! جتنا پانی تمہارا باپ ایک دن میں پی جاتا ہے۔ اتنے میں ہمارے محلے کی ساری ٹنکیاں بھر جائیں لیکن ان کا ٹینک نہیں بھرتا۔" بیگم نے پہلے سبطین صاحب کو للکارا اور پھر بیٹے کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

"اماں! پلیز آپ ہی چپ ہو جایا کریں۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا کہ یہ کیسے لوگ ہیں پانی جیسی معمولی چیز پر لڑتے ہیں۔" معوز نے التجا آمیز لہجے میں ماں سے کہا وہ اپنے شہر کا مشہور سرجن تھا لیکن گھر میں اس کی ایک نہ چلتی تھی۔

"معمولی؟ یہ تم جیسے بے قدرے لوگ ہی ہیں جن کی وجہ سے ہمارے ملک میں قحط سالی ہو جاتی ہے۔" ذکیہ بیگم افسوس سے بولیں۔

"بابا! آپ ہی چپ کر جایا کریں لیکن آپ کو بھی تو مزا آتا ہے روز روز کی بحث میں۔" معوز نے باپ کی طرف دیکھا۔

"نا خلف اولاد! باپ کو چپ کراتے ہو؟ کیا اسی دن کے لیے میں نے تمہیں پڑھا لکھا کر سرجن بنایا تھا۔۔۔ آج باپ گھر کیا بیٹھ گیا سب کو کاٹنے لگا ہوں۔" معوز کو مداخلت کافی مہنگی پڑی۔ وہ آہستگی سے معذرت کرتا اٹھ گیا۔



سبطین صاحب ایک ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ معوز جو کہ ڈاکٹر تھا اور دوسرا محب جو انجینئر تھا۔ سبطین صاحب شروع سے ہی انتہائی مطلق العنان مزاج رکھتے تھے۔ اپنے آپ کو ہی عقل کل سمجھتے اور کسی کی رائے تجویز کو خاطر میں نہ لاتے تھے جبکہ ذکیہ بیگم نارمل مزاج رکھتی تھیں اور اپنے بیٹوں کے زیادہ قریب بھی تھیں لیکن ایک واحد چیز جس پر وہ کوئی سمجھوتا نہ کرنے کو تیار تھیں۔۔۔ جی ہاں آپ اب تک سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ بتانے کی ضرورت نہیں۔

"ہائیں! یہ تازہ دہی ہے؟ مجھے تو یہ کل کا لگ رہا ہے۔" سبطین صاحب نے دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے دہی کا نوالہ لیا تو انہیں تھوڑی سی کھٹاس محسوس ہوئی۔

"ہاں تو اور کیا۔۔۔ اسے کیا باہر پھینک دیتی کہ آپ تازہ لے آئے ہیں۔" ذکیہ بیگم نے فوراً اعتراف کیا۔

"تو پھر تم نے ابھی خاص طور پر مجھے مارکیٹ بھیج کر دہی کیوں منگوایا تھا اگر ہماری قسمت میں کل کا پرانا دہی ہی تھا تاکہ کل بھی ہمیں باسی دہی ہی ملے کہیں غلطی سے ہماری زبان کو تازہ کا چسکا نہ پڑ جائے۔۔۔ کیوں؟ ٹھیک کہا نا میں نے؟" سبطین صاحب نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دے کر نوالہ پلیٹ میں پٹخا۔

"آپ کو تو رزق کی قدر ہی نہیں ہے۔ فریج میں چیز خراب تھوڑا ہی ہوتی ہے اور پہلا ختم ہو گا تو تازہ کھائیں گے نا۔" ذکیہ بیگم نے آرام سے جواب دیا۔

"ہاں تاکہ تب تک وہ بھی تازہ نہ رہے۔۔۔ ہک ہاہ بیگم! ساری زندگی گزر گئی ہماری تازہ چیز کو ترستے ہوئے

فروٹ ہے تو پہلے پرانا کھاؤ۔ تب نیا ملے گا، سالن ہے تو تازہ پکا کر فریج میں رکھ دیتی ہو اور باسی ہمارے آگے اور پانی۔۔۔ اس کا تو ذکر بھی نہ کرو۔۔۔ میں تو اماں مرحوم کے بعد سے تازہ کھانے کا ذائقہ ہی بھلا بیٹھا ہوں۔" سبطین صاحب نے آزردگی سے کہا اور کھانے لگے جبکہ ذکیہ بیگم کو تو "مرحومہ ساس" کے ذکر پر پتنگے لگ گئے۔

"ہاں ہاں۔ کریں یاد آپ اپنی اماں مرحومہ کو، ساری زندگی انہوں نے آپ لوگوں کو سوائے تازہ کھانے کھلانے کے اور کیا ہی کیا تھا نہ تن پہ اچھا کپڑا نہ پیروں میں جوتی، نہ ہی اپنا گھر بنا سکے آپ کے والد محترم اور نہ ہی کچھ اور جوڑا میں نے تو جب قدم رکھا تھا تو سوائے ننگی چارپائیوں اور ہر وقت کے پکتے تازہ کھانے کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا، دعائیں دیں مجھے بلکہ آپ کی سوہشتیں بھی میرا قرض نہیں اتار سکیں ٹکا ٹکا کر کے جوڑا میں نے، یہ گھر بنا میری وجہ سے اور آپ یاد کریں تازہ کھانے کو۔" ذکیہ بیگم خلاف توقع کچھ زیادہ ہی بول گئیں جس پر اب سبطین صاحب کا ردعمل شدید تر ہونا تھا۔ اس لیے محب نے فوراً سے پیشتر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

"پلیز اماں اور ابا! آپ لوگ ہم دونوں کی شادیوں کا خیال دل سے نکال دیں۔"

یہ جملہ اس موقع پر اتنا غیر متوقع تھا کہ دونوں ہی آپس میں لڑنے کے بجائے محب کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ہم آپ کی اولاد تو اس روز روز کے تماشوں کے عادی ہو چکے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ آنے والیاں بھی اس کو انجوائے کریں۔" محب نے انتہائی سنجیدگی سے وضاحت کی، یہ کہہ کر محب اٹھ کر چلا گیا جبکہ سبطین صاحب نے ایک غصیلی نگاہ بیگم پر ڈالی اور گلاس پٹخ کر کھڑے ہو گئے۔



"ویسے تو میرا کل والی بات کے بعد تمہیں مخاطب کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن مجبوری ہے، مرزا صاحب کا فون آیا تھا اور وہ بات آگے بڑھانا چاہ رہے ہیں۔" سبطین صاحب نے قدرے رکھائی سے منہ دوسری جانب رکھتے ہوئے کچن میں کھڑی اپنی بیگم کو مخاطب کیا۔

"اچھا؟ یہ تو خوشی کی خبر ہے۔" ذکیہ بیگم نے گرم جوشی سے کہا۔ ویسے بھی وہ کل والی بات بھلا چکی تھیں۔

"ہاں! اسی لیے تمہیں مخاطب کرنا پڑ رہا ہے کہ وہ آنا چاہ رہے ہیں لیکن میں اس سے پہلے چاہتا ہوں کہ تم محب سے پوچھ لو، ویسے بھی تم نے دونوں بیٹوں پہ اپنا قبضہ جمایا ہوا ہے وہ تم سے ہی اپنی بات کرنا پسند کرتے ہیں۔۔۔ مجھے تو تم نے ان کی نظر میں دو کوڑی کا کیا ہوا ہے۔" سبطین صاحب پھر پٹڑی سے اترنے لگے تھے لیکن ذکیہ بیگم نے فوراً بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی محب سے بات کرتی ہوں۔۔۔ ویسے تو اس نے سب کچھ "ہم" پہ ہی چھوڑ رکھا ہے۔" انہوں نے دانستہ 'مجھ' کے بجائے ہم کا استعمال کیا تاکہ کوئی بدمزگی نہ ہو۔ کل والی بات پہ وہ خود بھی خاصی شرمندہ تھیں، کیونکہ اس طرح کے سسرالی طعنے کم از کم ان کی ذات کا حصہ نہ تھے، سبطین صاحب کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل گئے تو انہوں نے فوراً محب کا نمبر ملایا۔

"میں نے کہا نا کہ میں شرمندہ ہوں۔۔۔ بس ویسے ہی منہ سے نکل گیا تم بالکل ٹینشن نہ لو۔ ان شاء اللہ جب گھر میں بہو ہو گی تو پھر ہم کیا نادان بچے ہیں جو اس کے سامنے اس قسم کی باتیں کریں؟ بالکل نہیں بیٹا! میں تمہیں یقین دلاتی ہوں ہاں نا! شکریہ بیٹا! اللہ تمہیں خوش رکھے۔" محب کو منانا آسان کام نہیں تھا پہلے ہی وہ مشکل سے شادی پر مانا تھا اور اب کل والی جھڑپ کے بعد تو اس نے صاف منع کر دیا تھا مگر ذکیہ

بیگم بھی اس کی ماں تھیں اسے منا کر ہی چھوڑا، دوسرا یہ رشتہ ذکیہ بیگم کو بالکل اپنے بیٹے کے مزاج سے مماثلت رکھتا ہوا لگتا تھا۔ اس لیے وہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں، محب کا مزاج قدرے خشک تھا اور لڑکی ڈاکٹر تھی ان کے خیال میں ڈاکٹر لڑکیاں بہت پریکٹیکل ہوتی ہیں۔ اس لیے سنجیدہ مزاج لڑکوں کے ساتھ اچھا گزارہ کرتی ہیں، محب کی رضامندی کے بعد اب وہ گرم جوشی سے شام کے مہمانوں کے لیے تیاری کرنے لگیں۔

"باجی! یہ گولڈن کناروں والے چمچ نکال لوں مہمانوں کے لیے؟" امین نے نئے چمچوں کا سیٹ نکال کر پوچھا۔

"تمہیں بڑی فکر ہے چمچوں کی۔۔۔ باقی سب کام یونہی پڑا ہے اور بس نئے برتنوں پر نظر رکھی ہوئی ہے کہ وہ نکال لوں۔" ذکیہ بیگم نے فوراً" اس کے ہاتھ سے نئے چمچوں کا سیٹ جھپٹا۔ "ایک تو میں جب سے یہ چمچ خرید کر لائی ہوں۔ اس بدبخت کو خفقان ہو گیا ہے کہ کب میں نکالوں اور استعمال کروں۔" ذکیہ بیگم کام کرتے ہوئے بلند آواز میں بڑبڑا بھی رہی تھیں۔

"کیا بات ہے والدہ محترمہ! اس وقت کون زیر عتاب ہے؟" مہوز نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کوئی نہیں بیٹا! تم سناؤ، کیسا جا رہا ہے ہسپتال؟ کوئی لڑکی وڑکی بھی اب پسند کر ہی لو۔" ذکیہ بیگم نے فوراً" ہی مطلب کی بات کی۔

"ارے والدہ! چھوڑیے ہسپتال کی لڑکیوں کو۔۔۔ مجھے نہیں کرنی کسی ڈاکٹر سے شادی، سب کی سب سنجیدہ اور خشک مزاج، ان سے تو صرف بیماریاں ہی ڈسکس کی جا سکتی ہیں، مجھے تو ایسی لڑکی چاہیے جو چھوٹی چھوٹی سی بات پہ ہنسے، کھلکھلائے، شوخ مزاج اور آرٹسٹک مائنڈڈ۔" مہوز نے تفصیلاً" اپنی ڈیمانڈز والدہ تک پہنچائیں جو وہ پہلے سے ہی جانتی تھیں اس لیے مسکرائیں۔

"ہاں ہاں میں جانتی ہوں۔ تب ہی تو یہ مرزا صاحب کی بیٹی والا پروپوزل تمہارے لیے نہیں کہا میں نے حالانکہ ان کا ارادہ تمہارے لیے تھا کہ لڑکی لڑکا دونوں ڈاکٹر ہوں تو اچھا ہے۔" ذکیہ بیگم نے بتایا۔

"ارے اماں! کہاں پھنسا رہی ہیں آپ بے چارے محب کو۔ اب وہ اتنا بھی بور نہیں ہے کہ آپ اس کی زندگی میں مزید خشکی بھر دیں۔ میں تو اپنے ساتھ کام کرنے والی ڈاکٹرز کو دیکھ دیکھ کر ہولتا رہتا ہوں کہ نہ جانے یہ کن بے چاروں کے نصیب پھوڑیں گی اور آپ ہیں کہ ایسی بہو گھر لانے کا سوچ رہی ہیں۔"

مہوز نہ جانے کیوں ڈاکٹر لڑکیوں سے سخت نالاں تھا شاید ہر وقت ان کے ساتھ کام کرتے کرتے اسے ان سے چڑ سی ہو گئی تھی اور وہ سب ڈاکٹر لڑکیوں کو ایک ہی ترازو میں تولتا تھا۔

"بیٹا جی! تم لے آنا اپنی مرضی کی لڑکی۔ فی الحال تو ہم محب کی اسی ڈاکٹر لڑکی سے بات پکی کر رہے ہیں اور محب بھی راضی ہے۔" ذکیہ بیگم نے بتایا۔

"اچھا! بے چارے محب صاحب" مہوز نے افسوس سے سر ہلایا اور باہر نکلنے لگا۔

"شام کو گھر میں ہی رہنا، مہمانوں نے آنا ہے۔" اماں نے پیچھے سے اطلاع دی۔



"شکر ہے ایک مرحلہ تو طے ہوا۔ محب صاحب کھونٹے سے بندھ گئے۔" سبطین صاحب نے شوخی سے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ مارا جبکہ "بیٹا" اپنے چہرے پر مستقل سنجیدہ تاثرات لیے ہی بیٹھا تھا۔

"ابھی کہاں، ابھی تو صرف بات پکی ہوئی ہے باقاعدہ رسم تو کچھ دن بعد کریں گے۔" اماں نے بھی بیٹے کی پیشانی چومتے ہوئے اسے بتایا۔ ابھی ابھی مہمان رخصت ہوئے تھے اور دونوں طرف کی باہمی رضامندی سے رشتہ طے پا گیا تھا۔

سب بہت خوش تھے مہوز بھی بھائی کو چھیڑ رہا تھا لیکن محب کا انداز ہمیشہ کی طرح لیا دیا سا ہی تھا وہ ایسا ہی تھا کسی بھی موقع پر غیر معمولی رد عمل نہ دکھانے والا یوں جیسے سب کچھ ایک روٹین میں ہی ہو رہا ہو۔

"او بھائی! اگر اس وقت میری شادی کا ذکر ہو رہا ہوتا تو میں بھنگڑے ڈال رہا ہوتا۔" مہوز نے خفگی سے محب کو دیکھا۔ جو اس سے سال بھر ہی بڑا تھا۔

"تم فکر نہ کرو برخوردار! جلد ہی تمہیں بھنگڑے ڈالنے کا موقع دیا جائے گا۔" سبطین صاحب نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا، یہ چائے کا تیسرا کپ تھا جو وہ مہمانوں کے جانے کے بعد سے پی رہے تھے۔

"پہلے کوئی لڑکی تو ملے اپنے مہوز کے مزاج کی۔" ذکیہ بیگم نے کہا تو سبطین صاحب معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

"لڑکی تو میں نے دیکھ رکھی ہے۔"

"تمہارا باپ تو سمجھو سٹھیا گیا ہے۔ اس عمر میں لڑکیاں دیکھتے پھر رہے ہیں۔" ذکیہ بیگم نے صدمے سے چور لہجے میں کہا تو سبطین صاحب گڑبڑا گئے۔

"ایک تو میں نے پٹھی مت (الٹی عقل) والی عورت سے شادی کر لی ہے۔ میں مہوز کے لیے لڑکی کی بات کر رہا ہوں اپنے لیے نہیں۔" محب اور مہوز دونوں ہی مسکرائے۔

"تو میں نے کب کہا کہ اپنے لیے میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں کہ آپ کا کیا کام؟ میں اور میرا بیٹا خود دیکھیں گے لڑکی آپ کیا جانیں۔" ذکیہ بیگم نے بھی انہی کی طرح جوابی حملہ کیا۔

"اچھا۔۔۔ یعنی میرا کیا کام؟ تم کر دو بے دخل مجھے آہستہ آہستہ ہر چیز سے کل کو کہو گی کہ میاں! تمہارا اس گھر میں کیا کام نکل جاؤ یہاں سے بھی۔" سبطین صاحب اپنی آواز میں رقت طاری کرنے کی کوشش کی جس کا کسی پر بھی کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ سب ہی ایسے جملوں کے عادی تھے۔

"ٹھیک ہے۔ مت دیکھو میری بتائی ہوئی لڑکی مگر یہ یاد رکھنا کہ سر پکڑ کر رو گے پچھتاؤ گے تم لوگ ایسی ہیرا لڑکی ہاتھ سے نکل جانے پر۔" سبطین صاحب نے اپنی جگہ سے اٹھتے اٹھتے ڈرامائی انداز میں کہا اور نکل گئے۔

"لو اب ڈال لو بھنگڑا۔" محب نے مہوز کو اشارہ کیا۔



امین کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اسٹیل کا کفگیر انتہائی زور سے لگا وہ یکدم اچھل کر پیچھے ہٹا تو ذکیہ بیگم قہر آلود نظروں سے اسے گھور رہی تھیں۔

"تو یہ مزے چل رہے ہیں۔۔۔ میں بھی کہوں کہ پانی اتنی جلدی کیسے ختم ہو جاتا ہے، میں سارا دن دیگچے پہ دیگچے ابالے جاؤں اور یہ نواب صاحب بوتل پہ بوتل چڑھائے جائیں۔ کیا ٹھاٹھ ہیں بھئی۔" ذکیہ بیگم نے غصے سے کہا جب کہ امین شرمندہ سا کھڑا تھا۔

"بیگم صاحبہ! قسم لے لیں جو میں ابلا پانی پیتا ہوں۔ وہ تو ابھی بے دھیانی میں۔"

"ہاں ہاں بے دھیانی میں۔۔۔ کبھی کوئی کام دھیان سے بھی کیا ہے؟ سب کچھ بے دھیانی میں ہی تو کرتے ہو۔" وہ بوتلوں کی تعداد گن رہی تھیں جو وہ دن میں کئی مرتبہ گنتی تھیں۔

"مجھے یہ بتاؤ، کیا تمہارے گھر میں ابلا پانی پیا جاتا ہے؟ نہیں نا تو جب وہاں تمہیں ہیضہ نہیں ہوا تو یہاں کیا مسئلہ ہے؟ بس مجھے تنگ کرنا ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔"

"غلطی ہو گئی بیگم صاحب!" امین منمنایا۔

"اچھا، اچھا اب جاؤ، دیکھو باہر بیل ہو رہی ہے۔" ذکیہ بیگم نے اسے کچن سے نکالا۔

"کبھی جو یہ شخص پہلی بیل پر گیٹ کھول دے۔" سبطین صاحب دروازے سے ہی بولتے آ رہے تھے اور امین سوچ رہا تھا کہ وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب وہ ان خبطی بڈھوں کے گھر میں ملازمت کے لیے

آیا تھا اب تو اس بات کو بھی کئی سال گزر چکے تھے اور وہ کچھ نہ کچھ سمجھوتا کر ہی چکا تھا۔

"اب کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ ایک گلاس پانی لے کر آؤ۔" سبطین صاحب نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے اگلا حکم صادر کیا۔

"رہنے دو تم' میں دیتی ہوں۔" ذکیہ بیگم نے امین کی پیش قدمی کو کچن میں کھڑے کھڑے روکا اور ناپ تول کر پانی گلاس میں ڈالنے لگیں' ساتھ ساتھ بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

"سارے جہاں کے پیاسے یہیں رہتے ہیں۔۔۔ پانی کے دشمن۔" پانی کا گلاس انہیں تھما کر واپس جانے لگیں تو سبطین صاحب نے روک لیا۔

"مہوز کی والدہ محترمہ! ذرا بیٹھیے۔" ذکیہ بیگم نے متعجب ہو کر ان کے لہجے پر غور کیا اور بیٹھ گئیں۔

"جی فرمائیے۔" ذکیہ بیگم نے بھی انہی کے انداز میں جواب دیا۔

"فرمانا کیا۔۔۔ عرض کرنا ہے کہ کل ہم مہوز کے لیے لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں۔" سبطین صاحب نے آرام سے کہا۔

"ہیں؟ یہ اچانک؟" سبطین صاحب نے فوراً" بات کاٹی۔

"اچانک نہیں' میں نے اس روز ذکر تو کیا تھا مگر تم لوگوں نے ذرا توجہ نہ دی میں انتظار میں ہی رہا کہ تم دوبارہ پوچھو گی مگر تم۔۔۔ خیر چھوڑو اب میں ضد اور انا میں اتنا اچھا رشتہ تو نہیں گنوا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے لڑکی والوں کو کہہ بھیجا ہے کہ کل ہم آرہے ہیں۔" سبطین صاحب نے تفصیلا" بتایا۔

"لیکن مجھے آپ کی پسند کی ہوئی لڑکی کا کوئی اعتبار نہیں آپ کو تو نظر بھی ٹھیک سے نہیں آتا نہ جانے اس دفعہ کسے پسند کر آئے ہیں لڑکی کی ماں کو یا باپ کو۔" ذکیہ بیگم نے طنزیہ پوچھا۔

اصل میں ایک دفعہ سبطین صاحب کا کوئی دوست انہیں اپنے ساتھ اپنے بیٹے کا رشتہ دیکھنے کے لیے لے گئے۔ واپسی پر سبطین صاحب لڑکی کی خوب صورتی اور اخلاق و اطوار کی تعریف کیے جا رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ لڑکی تو گھر میں تھی ہی نہیں اور سبطین صاحب لڑکی کی والدہ کو لڑکی سمجھ بیٹھے تھے' اس واقعے کے بعد سے ذکیہ بیگم اور ان کے بیٹے ڈر گئے تھے۔

"تم مہوز کو بھی ساتھ لے لینا' لڑکی والوں نے خود کہا ہے کہ لڑکا بھی آجائے اور دیکھ لے۔" سبطین صاحب نے تحمل سے ذکیہ بیگم کا طنز سنا اور تسلی کرائی۔

"چلو' یہ تو اچھی بات ہے۔" ذکیہ بیگم نے شکر کا سانس لیا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ مہوز کو منال اتنی پسند آئے گی۔ ماشاء اللہ بچی ہے تو بہت پیاری۔" ذکیہ بیگم نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا وہ لوگ تھوڑی دیر پہلے ہی منال کے گھر سے واپس آئے تھے' مہوز نے منال کو ایک نظر دیکھتے ہی اپنی والدہ کو بات پکی کرنے کا اشارہ دے دیا تھا سو یہ لوگ لڑکی کے ہاتھ پر پیسے رکھ آئے تھے۔

"اور تم سمجھتی تھیں کہ میں اپنے بیٹوں کی پسند نہیں جانتا۔ دیکھ لو دونوں لڑکیاں ہی میری پسند ہیں اور دونوں کیسی ہیرا بچیاں ہیں۔" سبطین صاحب نے فخر سے اپنی بیگم کو دیکھا۔

"ہاں یہ تو ہے مگر مہوز نے تو بہت ہی جلدی مچائی فیصلے میں' ابھی تھوڑا اور دیکھ لیتے۔۔۔ بہت جلد باز ہے بالکل آپ پر گیا ہے۔"

"ہاں میں بھی بڑا جلد باز تھا آج تک اسی جلد بازی کی سزا بھگت رہا ہوں' خسارہ ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔" سبطین صاحب نے جان کر آگ لگائی مگر ذکیہ بیگم لڑنے کے موڈ میں نہیں تھیں سو خاموشی سے چائے پینے لگیں۔



گھر میں دونوں بچوں کی اکٹھی منگنی کا خوش گوار سا ہنگامہ تھا آج کل تو سبطین صاحب بھی اپنی بیگم سے زیادہ چونچ نہیں لڑا رہے تھے اور پھر بالآخر فنکشن بھی اچھے سے ہوٹل میں بخیر و خوبی انجام پا گیا۔

منگنی والے دن مہوز بے تاب تھا۔ منال کا فون نمبر لینے کے لیے منال تو شاید جھجک میں تھی سو اس کی کزن نے خود ہی اسٹیج پر کھڑے کھڑے یہ فریضہ انجام دے دیا' دوسری طرف ثنا منتظر تھی کہ ابھی اس سے بھی کوئی ایسا مطالبہ کیا جائے گا مگر محب صاحب ٹس کے مس بیٹھے تھے بلکہ مسلسل اپنے آئی فون پر نہ جانے کون سی گتھیاں سلجھا رہے تھے۔ اسی طرح فنکشن ختم ہو گیا۔ منال ابھی تک اپنی کزن کو گھور رہی تھی جو اس کا سیل نمبر دے کر بڑی خوش تھی اور ثنا سوچ رہی تھی کہ اس کی ساری کزنز اور بہنیں نہ جانے کہاں مر گئی تھیں۔

"بیگم صاحبہ! اگر اجازت ہو تو میں پکوڑے تلنے کے لیے وہ نئی والی کڑاہی نکال لوں؟" امین نے ڈرتے ڈرتے ذکیہ بیگم کو مخاطب کیا۔

"کیوں؟ یہ تمہیں کیا کہتی ہے' اصلی ۔۔۔ اسٹیل کی کڑاہی ہے یہ' میری اماں نے فیصل آباد سے خصوصی طور پر میرے جہیز کے سارے برتن خریدے تھے۔" ذکیہ بیگم نے پیار بھری نظروں سے اپنے جہیز کی کڑاہی کو دیکھا جس کے کنڈے زمانہ ہوئے ٹوٹ کر گم ہو چکے تھے۔

امین نے بدمزا ہو کر کڑاہی کی طرف دیکھا اسے لگتا کہ اگر وہ موت کے کنویں میں سائیکل بھی چلاتا تو اتنا مشکل نہ ہوتا' جتنا اس کڑاہی میں کچھ تلنا مشکل تھا ایک تو اس کڑاہی کا سائز بہت چھوٹا تھا۔ ذرا سا چمچ مارتا تو کچھ اچھل کر باہر گر جاتا اور پھر کوئی کنڈا نہ ہونے کی وجہ سے اکثر ہی اس کا ہاتھ جل جاتا اور کڑاہی چولہے پر ادھر سے ادھر پھسلتی پھرتی تھی یوں جب بھی وہ اس میں کوئی چیز تلتا اسے سرکس کی گیند اچھالنے والا یاد آجاتا جس نے کسی بھی صورت گیند نیچے نہیں گرنے دینا۔

امین نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری اور رحم طلب نظروں سے اوپر دیکھا۔

"ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔۔۔ کام نہ کرنے کے دس بہانے، تم جیسوں کو کڑاہی بدلنے سے کچھ فرق نہیں پڑنے والا تم نے نئی والی کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا ہے مجھے دیکھو میں بھی تو اسی کڑاہی میں بڑے سے بڑا کام کرتی ہوں، تھوڑا وقت ہی زیادہ لگتا ہے نا مگر کام تو اعلا ہو جاتا ہے۔۔۔ یہ آج کل کی نان اسٹک کڑاہیاں تو بڑا ڈرامہ ہیں۔" ذکیہ بیگم نے بھرپور جواب دیا۔

"جی بیگم صاحبہ!" امین سمجھ چکا تھا کہ یہاں بحث کا کوئی فائدہ نہیں ہے سو کڑاہی میں گھی ڈالنے لگا، ذکیہ بیگم نے فاتحانہ انداز میں کڑاہی کی طرف دیکھا "آج تک ایک قطرہ گھی نہیں گرنے دیا میں نے نیچے اور امین نے ان کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا جہاں جا بجا جلنے کے نشان موجود تھے مگر وہ کہاں مانتیں کہ اس میں اس کڑاہی کا کوئی قصور ہے۔

☆☆☆

"اماں پلیز! اس میں حرج ہی کیا ہے اگر میں منال کو باہر لنچ پر لے جاؤں، ایک دوسرے کو سمجھنے کا بھی موقع مل جائے گا۔" مہوز نے ذکیہ بیگم کو مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

"بیٹا! میں تو سمجھ رہی ہوں مگر تمہارے والد صاحب نہیں مان رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لڑکی والے یہ پسند نہیں کریں گے دوسرا دو ماہ بعد تو تم لوگوں کی شادی ہو رہی ہے ایسی کیا مجبوری ہے۔" ذکیہ بیگم بیٹے کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتی تھیں مگر سبطین صاحب نے صاف جواب دے دیا تھا۔

"اور پھر تم لوگوں کی فون پر تو بات ہوتی ہی ہے اس کو کافی سمجھو۔" ذکیہ بیگم نے کہا تو مہوز سر کھجا کر رہ گیا اب وہ کیا بتاتا کہ فون پہ کیا بات ہوتی ہے نہ جانے منال کم گو تھی یا فی الحال جھجک میں، لیکن اسے لگتا کہ بس وہی بول رہا ہے اور دوسری طرف کوئی بت ہے جو بس ہوں یا ہاں کے علاوہ کچھ نہیں کہتا۔

☆☆☆

"کتنے دن ہو گئے ہیں منگنی کو مگر مجال ہے کہ تمہارے منگیتر صاحب کو تھوڑی شرم ہی آجائے کہ تمہیں ایک کال ہی کر لیں۔" ثنا کی کزن ہما نے اس کے زخموں پر نمک پاشی کی۔

"میں نے تو سنا تھا کہ انجینئر بہت رومانٹک ہوتے ہیں اور تمہارے کیس میں تو محب بھائی کو ایک عدد موبائل تو گفٹ کرنا ہی چاہیے تھا۔ آخر کو موبائل کمپنی میں کام کرتے ہیں۔" ہما کا خیال تھا کہ ثنا کی بات چیت چل رہی ہے محب کے ساتھ اسی لیے وہ کھوج رہی تھی۔

"سنا تو میں نے بھی یہی تھا اور اشعر بھائی کو ہی دیکھ لو۔ کتنے لونگ اور کیئرنگ ہیں۔" ثنا نے ہما کے میاں کے بارے میں کہا۔

ہما کی شادی کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا اور ثنا نے ہمیشہ اسے اشعر یہ اشعر وہ کرتے دیکھا تھا۔ اس لیے ثنا کے ذہن میں بھی شوہر کو لے کر ایسا ہی خاکہ تھا کہ محب بھی اشعر ہی کی طرح ہو گا لیکن محب نے منگنی کے بعد رابطے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ اس لیے ثنا تھوڑی بد دل سی ہو گئی تھی۔ اوپر سے ہما کے بار بار پوچھنے پر وہ چڑ سی گئی تھی۔ ثنا اور ہما کی بہت دوستی تھی ہما کی اپنے کلاس فیلو سے پسند کی شادی ہوئی تھی دونوں نے یونیورسٹی سے اکٹھے انجینئرنگ کی تھی ان کی مثالی محبت منگنی کے بعد اور پھر شادی کے بعد سے ثنا کے سامنے تھی، اشعر بھائی ہما کا ایسے خیال رکھتے تھے جیسے کسی نازک شہزادی کا خیال رکھا جائے ان ہی دنوں جب محب کا رشتہ آیا تو ثنا کے والدین جو کہ مہوز کا رشتہ چاہتے تھے ثنا نے انہیں تسلی دی تھی کہ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لڑکا ڈاکٹر ہو۔ ایسے میں اس کے ذہن میں اس کے ڈپارٹمنٹ کے تمام خوفناک ڈاکٹر آگئے اور اس نے جھرجھری لی۔

☆☆☆

"اف! اس شخص کو کیا اسپتال میں کوئی کام نہیں ہوتا۔۔۔ سارے جہان کا فارغ بندہ ہے یہ۔" منال نے مہوز کا نمبر دیکھ کر برا منہ بنایا مگر کیا کرتی کال تو اٹھانی ہی تھی۔

"السلام علیکم!" منال نے آہستہ سے کہا۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہیے منگیتر صاحبہ! سدا سکھی رہیں۔" مہوز نے ہمیشہ کی طرح بشاش لہجے میں اس کے سلام کا جواب دیا۔

"اور سنائیں کیا چل رہا ہے؟" مہوز نے ہی اگلی بات کی کیونکہ منال سے تو اسے ایسی کوئی امید نہ تھی۔

"بس کچھ خاص نہیں" منال کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ روز روز وہ کیا باتیں کرے۔

"لگتا ہے آپ مصروف ہیں۔" مہوز نے منال کے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی تھوڑی سی۔" منال نے جھٹ کہا۔

"اوہ چلیں۔۔۔ میں پھر کال کر لوں گا۔" مہوز نے بجھے دل سے کہا اور فون آف کر دیا۔

"ماشاء اللہ سے میری دونوں ہی بہویں بہت خوب صورت ہیں جو بھی رنگ پہنیں گی خوب جچے گا۔" ذکیہ بیگم نے بری کے جوڑوں کو ہینگروں میں لٹکاتے ہوئے پیار سے کہا۔

"اس پیار کو شادی کے بعد بھی قائم رکھنا ذکیہ بیگم! یہ نہ ہو کہ یہی بہویں تمہیں چڑیلیں لگنے لگیں۔" سبطین صاحب نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر لقمہ دیا۔

"کچھ خدا کا خوف کریں میں ایسی لگتی ہوں آپ کو۔" ذکیہ بیگم نے ہول کر پوچھا۔

"تو اور کیا؟ تم سے کیا بعید ان بے چاریوں پر بھی صاف پانی پینے کی پابندی لگا دو۔ پہلے ہی گھر کے بندوں کا پانی پینا تم سے برداشت نہیں ہوتا۔ دو نئے بندوں کا اضافی بوجھ کیسے برداشت کرو گی۔" سبطین صاحب نے اصل مسئلے کی نشان دہی کی۔

"ہاں، آپ تو پہلے ہی مجھ پر الزام تراشی شروع کر دیں۔ ابھی بہویں گھر میں آئی نہیں اور آپ چلے ہیں ان کی سائیڈ لینے۔"

"دیکھا۔ کیسے آگ لگی ہے تمہیں اسی لیے سمجھا رہا ہوں کہ ہاتھ ہولا رکھنا۔ مجھے تم سے کوئی خاص اچھی امید نہیں۔" سبطین صاحب بولے تو ذکیہ بیگم نے غصے سے کپڑے صوفے پر پٹخے۔

"اور مجھے بھی آپ سے کوئی اچھی امید نہیں ہے۔ جب ہر وقت ہی آگ لگانے والا گھر میں موجود ہو تو پھر کاہے کی فکر۔"

"ہاں تم گھما پھرا کے میرے گھر بیٹھنے کا طعنہ دے دیا کرو۔"

اور لاؤنج میں داخل ہوتے محب اور مہوز نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

اور پھر وقت کا پتا ہی نہ چلا کب شادی کے ہنگامے ختم ہوئے اور کب ڈاکٹر ثنا اور منال گھر میں شامل ہو گئیں نئی نئی شادی کے دن تھے ذکیہ بیگم کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ کون کون سی ڈش کھانے میں شامل کریں آخر کو ان کے دونوں لاڈلے بیٹے تھے اس لیے دونوں کی بیویاں بھی انہیں بہت پیاری تھیں۔

دوسری طرف سبطین صاحب جو ہمیشہ ہی اپنے بیٹوں کو ایک فاصلے پر رکھتے تھے انہوں نے ثنا اور منال سے دوستی گانٹھ لی خاص طور پر ثنا کے ساتھ تو ان کی بہت بنتی تھی۔ منال بھی بہت اچھی عادات کی مالک تھی۔ بیٹے خوش تھے تو ماں باپ بھی خوش تھے۔ دعوتوں کا سلسلہ بھی چند دن کے بعد کم ہو گیا اور زندگی روٹین پر آنے لگی۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ ہنی مون پہ گلگت جائیں۔ یہ قریب کی ساری جگہیں تو بہت ہی دفعہ کی دیکھی ہوئی ہیں۔" مہوز نے بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے منال سے پوچھا۔

"ہنی مون؟ اف ابھی یہ چھچھورپن بھی رہتا ہے۔"

"جی ہنی مون۔ کیا تمہارے ذہن میں کوئی اور پلان

ہے یا تمہیں کوئی اور جگہ دیکھنے کا شوق ہے تو بتاؤ۔" مہوز نے محبت سے منال کی طرف دیکھا۔

"نن، نہیں میں تو کہہ رہی تھی کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ روز تو کہیں نہ کہیں چلے جاتے ہیں پھر آپ کے ہسپتال کا بھی حرج ہو رہا ہو گا۔" منال نے سوچ سوچ کر کہا۔

"ارے! ہسپتال کی خیر ہے یہ دن زندگی میں دوبارہ تو نہیں آتے نا اور میں چاہتا ہوں کہ تمہارے دل میں بھی کوئی حسرت نہ رہ جائے" مہوز نے منال کو پاس بٹھاتے ہوئے کہا، ایسا نہیں تھا کہ منال کوئی خشک مزاج تھی بس اس کی سوچ بہت پریکٹیکل تھی وہ عام لڑکیوں کی طرح خواب نہیں دیکھتی تھی حقیقت میں رہنا پسند کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے فریش پھول بہت پسند ہیں۔" ثنا نے حسرت سے ٹی وی میں پھول دیکھتے ہوئے بتایا۔ یہ بات وہ شادی کے بعد سے دس بار بتا چکی تھی اور محب کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ یہ بات بار بار کیوں بتا رہی ہے۔

"ہوں۔۔۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ کو فریش پھول اچھے لگتے ہیں، باہر لان میں ابا نے بہت سے پھولوں والے پودے لگائے ہوئے ہیں آپ نے شاید دیکھے ہوں۔" محب نے اپنی نئی نویلی بیوی کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے بتایا تو ثنا کا دل چاہا وہ اپنا سر پیٹ لے۔

"جی دیکھے ہیں آئندہ انہیں ہی دیکھ کر خوش ہو لیا کروں گی۔" ثنا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا، وہ لیپ ٹاپ میں گم تھا اسے اپنی سہیلی کے ارشادات بھی یاد آ رہے تھے جو کہتی تھی "ہائے ثنا! تم تو اتنی پیاری ہو کہ تمہارا شوہر تو سارا دن اپنے کام چھوڑ کر بس تمہیں ہی دیکھتا رہے گا۔" یہ سہیلیاں بھی کبھی کبھی بندے کو زیادہ ہی آسمان پر چڑھا دیتی ہیں ثنا نے کروٹ بدلی اور کڑھنے لگی۔

"مہوز نے تو کل کی ٹکٹیں بک کرا لی ہیں گلگت بلتستان کی، تم لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟" سبطین صاحب نے محب اور ثنا کی طرف دیکھا اور ثنا نے امید بھری نظروں سے محب کو۔۔۔

"ابا! میری چھٹی تو اتنی لمبی نہیں ہے کہ میں ایسا کچھ بھی سوچوں پہلے ہی کافی چھٹی ہو گئی ہے آپ جانتے ہی ہیں میری کمپنی کو، وہ مجھے مزید چھٹی نہیں دیں گے۔" محب نے صاف جواب دیا تو ثنا کی شکل دیکھنے والی تھی جو منال اور مہوز کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔

"یار! یہ تو تم زیادتی کر رہے ہو بھابھی کے ساتھ، ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں شادی کو اور تمہیں آفس جانے کی پڑ گئی ہے۔" مہوز نے بھی محب کو سمجھایا۔

"نہ گلگت کہیں بھاگ رہا ہے اور نہ میں۔۔۔ ہم کچھ عرصے بعد چلے جائیں گے تم لوگ جاؤ انجوائے کرو میرا تو خیال ہے ثنا بھی یہی چاہتی ہے کہ ہم اب دوبارہ سے روٹین میں آ جائیں۔" محب نے دانستہ نرم نگاہوں سے ثنا کی طرف دیکھا تو اسے تائید میں سر ہلانا ہی پڑا۔

"بھئی، تم نے آفس جانا ہے تو سو دفعہ جاؤ مگر ہماری بیٹی کو فی الحال گھر میں ہی رہنے دو ابھی تو ہم نے اس کے ساتھ وقت ہی نہیں گزارا نوکری کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔"

سبطین صاحب نے محبت سے ثنا کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور ذکیہ بیگم تو سبطین صاحب کی شیرینی میں ڈوبے لب و لہجے پر ہی غور کرتی رہ گئیں کہاں وہ کرخت آواز جو ساری زندگی انہوں نے اپنے بیوی بیٹوں کے لیے رکھی اور کہاں یہ پھول برساتا لہجہ۔۔۔

اگلے دن سے محب نے آفس جانا شروع کر دیا اور مہوز وغیرہ ہنی مون پر چلے گئے، سبطین صاحب اور ذکیہ بیگم دل ہی دل میں ثنا اور اس کے گھر والوں سے شرمندہ تھے کیا تھا اگر محب بھی ثنا کو ہنی مون پہ لے جاتا، گلگت نہ سہی مری ہی سہی، اسی لیے وہ دونوں ضرورت سے زیادہ اس کی دلجوئی میں مشغول تھے ثنا نے بھی ٹھنڈی سانس بھر کر اس پر صبر کر لیا اور اپنی ساسوماں کے ساتھ کچن میں دل لگانے کا سوچا۔

"آنٹی آپ پلیز رہنے دیں میں بنا دیتی ہوں ہانڈی۔" ثنا نے کچن میں کام کرتی ذکیہ بیگم کو پیار سے کہا۔

"ارے نہیں بیٹا! آپ ابھی نئی ہو دو سرا پڑھائیوں میں کہاں کیا ہو گا آپ نے کوئی ایسا کام۔" ذکیہ بیگم نے نرمی سے اسے منع کیا۔

"آنٹی آپ مجھے انڈر اسٹیمنٹ کر رہی ہیں مجھے سب کچھ پکانا آتا ہے بلکہ مجھے تو ہمیشہ سے ہی کوکنگ کا بہت شوق رہا ہے۔" ثنا نے بھی اپنی قابلیت جھاڑی۔

"میں تو کہہ رہی تھی کہ منال آ جائے تو دونوں سے میٹھے کا مقابلہ کرواؤں گی۔" ذکیہ بیگم نے مزا لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں آنٹی! بہت مزا آئے گا اس کا مطلب ہے میں تیاری شروع کر دوں مقابلے کی۔" ثنا نے محظوظ ہو کر کہا ذکیہ بیگم کو اپنی بہو پر بہت پیار آیا جس نے محب کی بات کا کوئی ایشو نہیں کھڑا کیا تھا۔

ثنا نے بات کرتے کرتے گلاس لیا اور پانی والی بوتل سے پانی ڈالنے لگی۔ ذکیہ بیگم نے بے ساختہ ہی اس کے ہاتھ سے گلاس پکڑ لیا۔

"ارے بیٹا! لاؤ میں ڈال دوں پانی، تم نے مجھے کہا ہوتا۔" ثنا شرمندہ سی ہو گئی کہ اتنی معمولی سی بات کے لیے وہ اپنی ساس کو کیوں کہتی، مگر ساس صاحبہ کو احساس ہی نہ ہوا کہ کچھ عادات وقت کے ساتھ اتنی پختہ ہو جاتی ہیں کہ وہ یونہی سرزد ہو جاتی ہیں بغیر کسی ارادے کے، ثنا تو پانی پی کر کچن سے چلی گئی مگر امین کے لیے اپنی ہنسی کو کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا سو وہ بھی بہانے سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"ارے ارے یہ کیا کر رہی ہیں آپ، میں خود اپنے موزے اتار سکتا ہوں۔" محب جو آفس سے تھکا ہوا آیا تھا ابھی جوتے اتار کر بیٹھا ہی تھا کہ ثنا نے آگے ہو کر اس کے موزے اتارنے شروع کر دیے۔ محب کے لیے یہ حرکت انتہائی غیر متوقع تھی اسے واقعی ثنا سے ایسی تابعداری کی امید نہ تھی وہ جی بھر کر شرمندہ ہوا۔

"اس میں ایسی کیا بات ہے بیویاں اپنے شوہروں کے چھوٹے چھوٹے کام کرتی ہی ہیں۔" ثنا نے لگاوٹ سے کہا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحبہ! میں عام شوہروں جیسا نہیں ہوں۔ مجھے نہیں اچھا لگتا کہ بیوی یوں میرے آگے پیچھے پھرے یا اپنے آپ کو کمتر سمجھے۔" محب نے اسے آرام سے سمجھایا۔

"جی مجھے پتا ہے کہ آپ عام شوہروں جیسے نہیں ہیں۔" ثنا نے جل کر سوچا۔

"آپ پلیز مجھے صرف بیوی ہی سمجھیں، ڈاکٹر نہیں۔" ثنا نے پاس بیٹھتے ہوئے کہا جبکہ محب اپنا لیپ ٹاپ کھول چکا تھا "پتا ہے آنٹی کیا کہہ رہی ہیں۔۔۔؟"

ثنا نے بات میں ڈرامہ پیدا کرنے کے لیے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن دوسری طرف سے کسی نے نہ پوچھا کہ کیا کہہ رہی تھیں۔ موصوف کا دھیان مکمل طور پر لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھا۔ کچھ دیر وہ انتظار کرتی رہی کہ شاید محب کو احساس ہو جائے مگر ایسا نہیں ہوا ثنا نے اپنی سوتن کو غصے سے گھورا اور باہر نکل گئی۔

مہوز اور منال بھی واپس آ چکے تھے اور مہوز نے ہسپتال جانا شروع کر دیا تھا، منال نے بھی ایک دو جگہوں پر اپلائی کیا ہوا تھا اور جواب کا انتظار کر رہی تھی ثنا نے منال سے بھی بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر منال بہت لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی۔ زیادہ بات نہ کرتی تھی، سبطین صاحب دونوں بہوؤں کے ساتھ کبھی گھر کی سیٹنگ بدل رہے ہوتے کبھی لان میں نئے پودے لگا رہے ہوتے، خاص طور پر منال کے فائن آرٹس سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے اور ثنا تو ویسے ہی ان سرگرمیوں میں خوش رہتی تھی، ایسے میں ذکیہ بیگم کبھی کبھی سلگ اٹھتیں انہیں لگتا کہ ان کے شوہر نے ان کے خلاف بہوؤں کو اپنی سائیڈ کی پارٹی بنا لی ہے۔

ادھر دونوں بہوؤں کو مجرمانہ سا احساس ہوتا کہ ان کی بوڑھی ساس خود ہی کچن میں مصروف رہتی ہیں لیکن جب بھی دونوں ہاتھ بٹانے کا کہتیں تو وہ سہولت سے منع کر دیتی تھیں پھر منال کو ایک انٹرنیشنل اسکول سے کال آ گئی تو اس نے فوراً" جوائن کر لیا' محب نے مہوز سے کہا کہ اپنے ہسپتال میں ہی ثنا کو جاب دلوا دے جو سن کر ثنا سخت بدمزا ہوئی (سوچا تھا شادی کے بعد مزے کروں گی اس فضول زندگی سے جان چھوٹے گی مگر یہ مجھے دوبارہ پھنسوانے لگے ہیں) اس نے روتے پیٹتے اپنی ہاؤس جاب مکمل کی تھی اور اسی وقت تہیہ کیا تھا کہ کم از کم شادی کے بعد دو سال صرف عیاشی کرے گی۔ محب شاید اس کی فراغت سے تنگ تھا۔

"اچھی بات ہے ذرا مصروف ہو جائے ویسے بھی فارغ دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔" یہ بات محب نے خصوصی طور پر اس کو جلانے کے لیے کہی تھی اور وہ تو پہلے ہی جلی بھنی بیٹھی تھی اس نے سوچ لیا کہ کم از کم تین دن وہ محب سے بات نہیں کرے گی۔

"بھابھی! آپ کل میرے ساتھ ہاسپٹل چلیے گا میں آپ کو ایم ایس سے ملوا دوں گا آج کل ہمیں نئے ڈاکٹرز کی ضرورت ہے۔" مہوز نے ثنا سے کہا تو اس نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجالی "جی بہتر۔"

کمرے میں آ کر ثنا نے اپنی خفگی دکھانے کو چیزیں ادھر ادھر پٹخیں پھر واش روم کا دروازہ دھاڑ سے بند کیا محب جو سامنے نیوز چینل لگا کر بیٹھا تھا اور گود میں لیپ ٹاپ دھرا تھا اس کو شدید کوفت کا احساس ہوا' ثنا کا خیال تھا کہ جب وہ تھوڑی دیر بعد باتھ روم سے نکلے گی تو محب ضرور ہی پوچھے گا اور وہ مزید ناراضی دکھائے گی کم از کم ایک دن تو ضرور' مگر جب وہ باہر آئی تو محب کی نظریں سامنے ٹی وی پر' انگلیاں لیپ ٹاپ پر اور گردن سے فون اٹکائے وہ کسی ضروری بات میں مگن تھا۔

"کم از کم آج کی رات تو بات نہیں کروں گی۔" ثنا نے اپنے ناراض پروگرام میں پھر ترمیم کی محب کی کال لمبی ہی ہوئی جا رہی تھی ثنا نے نماز کی نیت باندھ لی جبکہ محب اب ایک کال کے بعد دوسری کال میں بزی تھا ثنا کے سلام پھیرنے تک وہ چار کالیں کر چکا تھا اور اب دوبارہ سے لیپ ٹاپ کے بٹن دبا رہا تھا یہ کام تو وہ فون سننے اور ٹی وی دیکھنے کے ساتھ بھی کر ہی رہا تھا۔ دعا مانگتے ہوئے ثنا نے دل ہی دل میں مزید جوڑ توڑ کی۔

"پوری رات نہ سہی تین چار گھنٹے تو مجھے اس شخص کو ٹف ٹائم دینا ہی ہو گا۔"

جائے نماز لپیٹتے ہوئے اس نے منتظر نگاہوں سے اپنے بے پروا شوہر کو دیکھا (نہ جانے کس کلاس فیلو کی بددعا لگی ہے میں نے بھی تو نہ جانے کتنوں کا دل توڑا تھا یقیناً" ان سب نے ہی مجھے جھولی بھر کر یہ دعا دی ہو گی جو ایسا ناقدرا شوہر ملا ہے) اب اسے بھوک ستا رہی تھی باقی سب رات کا کھانا جلدی کھا لیتے تھے محب چونکہ لیٹ آتا تھا سو وہ رات کا کھانا اکثر کمرے میں ہی لے آتی تھی۔ اس بندے کو تو پوری رات ان تین چیزوں کے ہمراہ کمرے میں بھوکا بند کر دو تو صبح تک یہ فریش ہی ہو گا لیکن میں بھی کم از کم ایک گھنٹہ تو نہیں بولوں گی۔

اس نے از خود ناراضی کا دورانیہ مزید کم کیا اور پھر پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کھانا لگاؤں آپ کے لیے؟" محب نے سر اثبات میں ہلایا تو ثنا پیر پٹختی باہر نکل گئی۔

صبح مارے باندھے ثنا مہوز کے ساتھ ہسپتال چلی گئی اور اگلے شاید اتنے بے تاب تھے کہ انہوں نے فوراً" سے پیشتر جوائن کرنے کو بھی کہہ دیا۔ ثنا بھی اب ذہنی طور پر تیار تھی۔ گھر رہ کر بھی اس نے دیکھ لیا تھا جب اس کے شوہر کے پاس اسے دیکھنے اس سے بات کرنے کی فرصت ہی نہیں ہے تو اسے کیا پڑی ہے کہ وہ سارا سارا دن گھر میں بے کار پڑی رہے' سو اس نے بھی آنے کا وعدہ کر لیا۔

"مبارک ہو آپ کو۔" شام میں محب کو مہوز کی زبانی اس کی جاب کا پتا چلا تو ڈھونڈتا ہوا کمرے میں آیا۔

"شکریہ۔" اس نے بجھی مسکراہٹ کے ساتھ

جواب دیا مگر محب نے دھیان نہ دیا۔

"ایک بات کہوں؟" ثنا نے محب کو اچھے موڈ میں دیکھ کر کہا۔

"جی ضرور۔" محب ٹی وی کا ریموٹ اٹھا رہا تھا۔

"آپ پلیز مجھے آپ نہ کہا کریں تم کہا کریں۔" اس سے پہلے کہ ٹی وی آن ہوتا ثنا نے جلدی سے کہا۔

"کیوں؟" محب چونکا۔

"کیونکہ آپ میں اجنبیت اور غیریت سی لگتی ہے اور تم بولنے سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔" یہ نئی پٹی بھی ثنا کو ہما نے پڑھائی تھی اسے جب پتا چلا کہ ثنا اور محب ایک دوسرے کو آپ جناب کرتے ہیں تو وہ حیران رہ گئی اور پھر اپنی داستانیں شروع ہو گئی کہ اشعر اور وہ کتنے بے تکلف ہیں اور یہ بے تکلفی اور اپنائیت تم کہنے سے بڑھ جاتی ہے اب ثنا ان ہی زریں خیالات کے زیر اثر بولی تھی اور محب حیران کا حیران کھڑا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ آپ کہنے سے رشتے میں دوری آتی ہے یہ رشتہ عزت کا بھی متقاضی ہے اور میں آپ کہہ کر عزت دیتا ہوں نہ جانے آپ کو اس میں اجنبیت کہاں سے نظر آ گئی۔" محب نے شاید ہی بیڈ روم میں کبھی اتنا لمبا جملہ بولا ہو ثنا تو بے ہوش ہونے کو تھی۔

"پھر بھی..... میں آپ سے عمر میں بھی چھوٹی ہوں۔" ثنا نے ٹھنک کر کہا۔

"اس سے فرق نہیں پڑتا کہ آپ کتنی چھوٹی ہیں بس مجھے کسی کو بھی تم کہہ کر مخاطب کرنا پسند نہیں بہتر ہو گا کہ آپ بھی ان فضول سوچوں کو دماغ سے نکال دیں۔" محب نے کہہ کر اپنا رخ ٹی وی کی طرف موڑ دیا۔ مطلب بات ختم۔

مہوز ہسپتال سے واپسی پر منال کے لیے لازمی گجرے یا پھول لے کر آتا تھا کچھ دن تو منال خاموش رہی مگر اس نے محسوس کیا کہ ثنا بہت غور سے اس کے گجروں کو دیکھتی ہے دوسرا اسے خود بہت ہی عجیب سا لگتا تھا وہ کوئی کم سن لڑکی نہیں تھی اور نہ ہی مہوز کسی کالج کا اسٹوڈنٹ مگر شاید ہر انسان کا مزاج دوسرے سے الگ ہی ہوتا ہے۔ نہ تمام ڈاکٹر خشک مزاج ہوتے ہیں اور نہ ہی تمام فائن آرٹس والے رومانٹک..... کم از کم ان کے معاملے میں تو بات بالکل الٹ تھی۔

"لگتا ہے آپ نے پھول والے سے کوئی ڈیل کی ہوئی ہے۔" منال نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"چلو تم ایسا ہی سمجھ لو لیکن ڈیل پھول والے سے نہیں تم سے کی ہوئی ہے چاہے دن ہو یا رات کا کوئی بھی پہر میں جب بھی گھر آؤں گا یہ ضرور لاؤں گا۔" مہوز نے پیار سے اپنی خوب صورت بیوی کو دیکھا۔

"اور تمہیں کیا پھول کاٹتے ہیں؟" مہوز نے اسے چھیڑا تو وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی وہ جانتی تھی کہ اگر وہ مہوز کی باتیں اپنی سہیلیوں اور کزنز کو بتائے تو وہ اس کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھیں گی مگر اسے یہ سب بہت ہی امیچور لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بیگم صاحبہ! یہ توپیں کب تک بند رہیں گی کافی دنوں سے گھر میں بڑا امن ہے یقین مانیں میرے تو کان ہی ترس گئے ہیں صاحب کی اونچی آواز سننے کو۔" امین نے پانی چھانتی ذکیہ بیگم سے کہا جب سے بیٹوں کی شادیاں ہوئی تھیں گھر کا ماحول ہی بدل گیا تھا کہاں چوبیس گھنٹے دھنا دھن بمباری ہوتی تھی اور کہاں مکمل سیز فائر۔

"ذرا آنے دو صاحب کو میں بتاتی ہوں تاکہ تمہارا تو کچھ انتظام ہو۔ نا تمہیں کاٹ رہا ہے یہ امن..... شکر کرو اوپر والے نے انہیں سیدھا راستہ دکھایا ہے ورنہ میرے دونوں بچے تو ہر وقت ہولتے رہتے تھے کہ نہ جانے ابا جان ان کی بیویوں کا بھی کیا حشر کریں گے۔"

"کیا سازشیں ہو رہی ہیں یہاں' مجھے بھی تو پتا چلے۔" اچانک ہی سبطین صاحب کی بلند آواز کچن میں پہنچی۔ وہ بھی جانتے تھے کہ اس وقت دونوں بہویں گھر پر نہیں تھیں۔

"کچھ نہیں۔ آپ اپنا کام کریں۔" ذکیہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

"بڑی زبردست خوشبوئیں آرہی ہیں۔ کیا پک رہا ہے خیر سے؟" سبطین صاحب نے لمبا سانس اندر کھینچا۔ ذکیہ بیگم جانتی تھیں کہ بھنا ہوا گوشت یا قیمہ ان کی کمزوری ہے سو فوراً" سے پیشتر کڑاہی کے اوپر ڈھکن ڈھک دیا، مبادا وہ بوٹیوں کا مطالبہ نہ کر بیٹھیں۔

"کچھ نہیں بن رہا۔ آپ جاکر باہر بیٹھیں۔ میں تھوڑی دیر میں کھانا لاتی ہوں۔" ذکیہ بیگم نے انہیں کچن سے ہٹانا چاہا۔

"ٹھیک ہے مگر کھانا وہی ہو جو ابھی بن رہا ہے۔" سبطین صاحب نے جاتے ہوئے تنبیہہ کی تو ذکیہ بیگم نے سنی ان سنی کردی، پھر انہوں نے پھرتی سے دو تازہ پھلکے بنائے اور امین کے ہاتھ سبطین صاحب کو بھجوائے۔

"یہ کیا؟ کل کی باسی دال..... لے جاؤ اٹھا کے مجھے نہیں کھانی، غضب خدا کا کوئی لحاظ خیال ہے اس عورت کو شاید ہی کسی نے اپنے مجازی خدا کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہو۔" سبطین صاحب مکمل طور اپنے پرانے لبادے میں واپس آچکے تھے۔

"ابھی دوسرا سالن پکا نہیں ہے۔ کیا کچا گوشت اتار کر آپ کے سامنے رکھ دیتی۔" یہ سراسر مبالغہ آرائی تھی ورنہ کھانے کی خوشبو بتا رہی تھی کہ سالن تیار ہے۔

"یہ باتیں تم اس سے کہو جس نے تمہارے ساتھ وقت نہ گزارا ہو میں تو تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں ذکیہ بیگم! میاں کو دال کھلاؤ اور بیٹوں کو بوٹیاں ہک ہاہ۔" سبطین صاحب نے آخر میں اپنی آواز میں رقت طاری کی۔

"آپ زیادتی کررہے ہیں سبطین صاحب! ساری زندگی نوکروں کی موجودگی میں بھی میں نے اپنے ہاتھوں سے تازہ روٹی بنا کر آپ کو کھلائی ہے کیونکہ مجھے پتا ہے آپ کو کسی اور کے ہاتھ کی روٹی پسند نہیں۔" ذکیہ بیگم نے احسان جتایا۔

"ہاں ..... ! تازہ روٹی اور باسی سالن ہونہہ۔" سبطین صاحب نے طنزیہ سر جھٹکا۔

"کہاں کا باسی سالن؟ ابھی کل تو پکایا ہے' ایک دن میں بھی کبھی باسی ہوا ہے سالن' بندے کو خدا خوفی ہونی چاہیے۔ ان لوگوں کو دیکھیں جنہیں یہ بھی میسر نہیں۔" ذکیہ بیگم نے مدبرانہ انداز میں کہا تو سبطین صاحب کو مانو آگ ہی لگ گئی۔

"ہاں جب اور کوئی جواب نہ بن پڑے تو پھر مجھے صومالیہ اور ایتھوپیا کی مثالیں دے کر چپ کروایا کرو' اگر تمہیں اتنی ہی خدا خوفی ہے تو پھر یہ گوشت قیمے بنا بنا کر ہمیں ترپاتی کیوں ہو مت بنایا کرو پھر ہم بھی اپنے دل کو سمجھالیں گے کہ ہم قحط زدہ ملکوں کے ساتھ مساوات قائم کررہے ہیں۔" سبطین صاحب جلے بھنے انداز میں گرجے۔

"حوصلہ رکھیں! مل جائے گا شام کو آپ کو بھی گوشت کا سالن' ماشاءاللہ سے فیملی بڑی ہوگئی ہے اگر ابھی آپ کو دے دوں تو رات کے لیے کیا بچے گا؟" ذکیہ بیگم نے واپس کچن کی راہ لی مطلب صاف ظاہر تھا کہ ابھی تو تازہ سالن ملنا ناممکن ہے اور یہ بات سبطین صاحب بھی جانتے تھے۔

"ایک بیٹا سرجن ہے اور دوسرا انجینئر مگر یہ عورت اپنی جوڑ توڑ سے باز نہیں آئی۔ چار دن پہلے میں آٹھ کلو چھوٹا گوشت لایا ہوں اور اس نے ان کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں بنا کر اپنی زنبیل (فریج) میں چھپادی ہیں۔" سبطین صاحب اب کھانا کھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ بڑبڑا رہے تھے ذکیہ بیگم نے کچن میں برتن دھوتے امین کے پاس پلیٹ پٹخی۔

"اب سکون آگیا تمہیں۔"

"منال بیٹا! ذرا سالن میری طرف کرنا آج تمہاری آنٹی نے تو کمال ہی کردیا ہے، بہت مزیدار بنا ہے یہ کھڑے مصالحے والا گوشت۔" سبطین صاحب نے دوسری دفعہ سالن کے ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ذکیہ بیگم جزبز ہوکر رہ گئیں۔ (جیسے پہلی دفعہ گوشت کھارہے ہیں)

"جی انکل! واقعی آنٹی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ

ہے۔" منال نے بھی دوبارہ سالن لیا اور ذکیہ بیگم تو بس ڈونگے کی بوٹیاں گن رہی تھیں انہیں نہیں لگتا تھا کہ محب کے لیے کچھ بچ پائے گا جب سبطین صاحب نے تیسری دفعہ ڈونگے کو اپنی طرف کھسکایا تو ذکیہ بیگم کا ضبط جواب دے گیا۔

"بس بھی کریں آپ کا بلڈ پریشر بڑھ جائے گا آپ کی صحت کے لیے کہاں ٹھیک ہے اتنا گوشت کھانا۔" بہو کی موجودگی کے خیال سے ذکیہ بیگم نے دھیمے انداز میں ٹوکا، سبطین صاحب بھی بیگم کی مجبوری اور بے چینی کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اور محظوظ ہو رہے تھے۔

"بھئی میں تو اتنا جانتا ہوں کہ کھانا نہ کھا کر کوئی مر سکتا ہے' کھا کر کوئی نہیں مرتا اور خاص طور پر جو میری آنتیں ہیں۔ ان کو سب سے زیادہ گوشت ہی موافق ہے اس لیے بیگم صاحبہ آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔" سبطین صاحب نے ڈونگے کی آخری بوٹی اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے فاتحانہ انداز میں بیگم کو دیکھا جو اب سوچ رہی تھیں کہ (آئندہ سے چند بوٹیاں پہلے سے ہی الگ رکھ لیا کروں گی پورا ڈونگا تو اس بندے کے سامنے رکھنا نری بے وقوفی ہے اور گوشت کی بھی ایک کے بجائے دو پوٹلیاں (پیکٹ) پکانے پڑیں گے ..... شوربا بھی تھوڑا پتلا رکھنا ہوگا ان کی جوڑ توڑ جاری تھی' مہوز کو بھی اپنی والدہ کے فکرمند چہرے کو دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔



ثنا ہسپتال کے لیے تیار ہو رہی تھی اور آئینے میں بار بار اپنا عکس دیکھ رہی تھی' محب اپنا لیپ ٹاپ بیگ میں سیٹ کر رہا تھا ویسے ہی اس نے ثنا کی طرف دیکھا تو چونک گیا ثنا بھی شیشے میں اسی کو دیکھ رہی تھی ریڈ کلر کے انارکلی فراک اور پاجامے میں وہ غضب ڈھا رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ محب آج تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکے گا' اب وہ منتظر نگاہوں سے محب کی طرف متوجہ تھی۔

"آپ ہسپتال ہی جارہی ہیں نا؟" بہت ہی فضول سوال تھا جس کا جواب اس کو پتا تھا۔

"ظاہر ہے اتنی صبح صبح اور کہاں جاسکتی ہوں۔" ثنا نے حیرت سے کہا۔

"میرا مطلب ہے یہ اتنی تیاری..... پلیز مائنڈ نہ کرنا لیکن اتنا تیار ہو کر ہسپتال جانا....." محب پھر رک گیا اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا بولے۔

"میری نئی نئی شادی ہوئی ہے اور یہ کوئی ایسا چمک دمک والا ڈریس بھی نہیں ہے۔" ثنا کے دل کو کچھ ہوا' کیا تھا جو جھوٹے منہ کوئی خوب صورت اچھا جملہ ہی بول دیتا۔

"آپ کی بات درست ہے مگر تیار ہونے کے لیے اور بہت سی جگہیں ہیں ڈاکٹر کو کم از کم ہسپتال میں صرف ڈاکٹر ہی لگنا چاہیے۔ کوئی چلتی پھرتی ماڈل نہیں۔" محب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ سر ہلاتی اندر چلی گئی اور براؤن رنگ کا سوٹ نکال لیا جو بالکل سادہ تھا' جب وہ میڈیکل کالج میں تھی تو اس کے ابو نے کہا تھا کہ "بیٹا! آپ اسٹوڈنٹ ہو اور اسٹوڈنٹ کو صرف اسٹوڈنٹ ہی لگنا چاہیے ماڈل نہیں۔" اس نے یہ بات گرہ سے باندھ لی اور کالج بہت سادگی سے جاتی تھی۔

"سوچا تھا کہ سارے فیشن شادی کے بعد کروں گی مگر یہاں تو ابو سے بڑھ کر میرے ابا جان صاحب بیٹھے ہیں۔" ثنا زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ نہ جانے ڈاکٹر بنا کر کون سے جنم کی دشمنی کی ہے میرے گھر والوں نے میرے ساتھ مجھ سے اچھی تو ایک اسکول ٹیچر ہوتی ہے جو روز تیار ہو کر اسکول جاتی ہے۔

"چلیں؟ اگر آپ نے کپڑے چینج کرلیے ہوں۔" محب نے ٹی وی کا ریموٹ رکھتے ہوئے پوچھا' محب کو اس کے جذبات اس کے دل سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس بات کا اسے یقین ہو چلا تھا۔



ثنا شام کو اپنے میکے آئی تھی۔ ہما نے فون کیا تھا کہ

میں آرہی ہوں لہٰذا تم بھی آجاؤ۔ اب دونوں سہیلیاں اکٹھی بیٹھی خوب گپیں لڑا رہی تھیں اور پرانے وقتوں کو بھی یاد کررہی تھیں۔

ثنا نے اپنے دل کی تمام الجھنیں اور حسرتیں ہما کے سامنے کھول کر رکھ دیں ہما چونک گئی۔ "تم نے یہ باتیں اتنے دن چھپائے رکھیں۔"

"تو کیا کرتی؟ کیا بتاتی میرے سسرال والے بہت ہی اچھے ہیں اور بظاہر محب میں بھی ایسی کوئی برائی نہیں کہ جو میں اپنے والدین کو بتاؤں۔ یہ تو چھوٹی چھوٹی محسوس کرنے والی باتیں ہیں۔ بے چاری لڑکیاں اپنے نازک دلوں پر کیا کیا سہتی ہیں۔ کاش ہمارے والدین کو پتا نہ چلے۔"

"یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں؟ بے وقوف ثنا! تمہارا شوہر تمہاری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اسے تم میں کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے اور تم کہہ رہی ہو۔ یہ چھوٹی باتیں ہیں، تم پتا کرو۔ یقیناً" تمہارے میاں کا کوئی چکر ہے یا پھر وہ کسی اور سے شادی کرنا چاہتا ہو گا۔ ماں باپ نے زبردستی تم سے کردی۔ اشعر کی مجال ہے جو وہ میرے ہوتے ہوئے کسی کی فون کال بھی لیں یا کوئی اور کام کریں یہ تو سراسر زیادتی ہے تمہارے ساتھ۔"

ہما نے ثنا کو تصویر کا وہ رخ دکھایا جو اس سے پہلے اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ بہت بوجھل دل کے ساتھ واپس آئی۔

آج تو مہوز نے حد ہی کردی تھی، چھوٹے موٹے پھولوں کے بجائے ایک بہت بڑا سرخ گلابوں کے بکے لے کر آیا تھا اور لا کر سب کے سامنے ہی قدرے جھک کر منال کو پیش کیا سب ہی اس وقت لاؤنج میں بیٹھے تھے منال کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں منہ چھپائے ساس سسر ایک طرف اسے تو اپنے جیٹھ اور جٹھانی سے بھی سخت شرم آرہی تھی۔ مہوز کے مقابلے میں محب بھائی کتنے ڈیسنٹ اور سوبر سے تھے۔ مگر مہوز تو نجانے کس مٹی کا بنا تھا۔ منال نے خفت سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ بکے لیا اور کمرے میں چلی گئی مہوز بھی کچھ دیر بیٹھ کر اندر چلا گیا تو ثنا بھی جھٹکے سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔ محب پہلے ہی اندر جانے کو پر تول رہا تھا۔

"کیا ضرورت تھی آپ کو یہ تماشا کرنے کی۔" منال نے چڑ کر پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تماشا؟" مہوز حیران پریشان تھا۔

"تو اور کیا؟ آپ اگر یہ پھول نہ لائیں تب بھی مجھے پتا ہے کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں پھر ان ڈراموں کی کیا ضرورت ہے۔"

دوسری طرف ثنا کا ضبط جواب دے چکا تھا سرخ گلاب اس کی کمزوری تھے اور آج تک محب نے کبھی بکے تو کیا ایک گلاب کا پھول بھی اسے لا کر نہ دیا تھا۔

"کیا آپ اس شادی سے خوش نہیں ہیں؟" محب کے اندر داخل ہوتے ہی ثنا نے کہا لاوا تو اس کے اندر کب سے پک رہا تھا۔

"کیا مطلب؟ خوش نہیں ہوں؟ اس سوال کا مطلب؟" محب نے ابرو اٹھائے۔

"ظاہر ہے جو لوگ خوش ہوتے ہیں۔ وہ اظہار بھی کرتے ہیں کبھی باہر گھما پھرا کر اور کبھی پھول وغیرہ لا کر۔"

"آپ واقعی ڈاکٹر ہیں نا؟ مجھے کبھی کبھی شک ہوتا ہے، آپ کی ڈگری چیک کرنی پڑے گی۔" محب نے بات کو ہلکے رنگ میں کرتے اسے چھیڑا۔

"آپ ہر چیز میں میری ڈاکٹری کو کیوں لے آتے ہیں؟ آپ کو اپنا ڈاکٹر بھائی نظر نہیں آتا آخر کوئی تو بات ہے جو آپ مجھ پر توجہ نہیں دیتے۔" ثنا تڑخ کر بولی۔

"دیکھیں ثنا! مجھے یہ فضول قسم کے اظہار محبت اور چونچلے بالکل بھی پسند نہیں۔" محب نے ثنا کو یوں بگڑتے دیکھ کر دھیمے لہجے میں سمجھایا۔

"آپ کو یہ چیزیں فضول لگتی ہیں؟" ثنا نے حیرت سے محب کو دیکھا۔

"ہاں یہ سب ڈرامے۔" دوسری طرف منال مہوز سے الجھ رہی تھی "پلیز مجھے یہ ڈرامے بالکل پسند نہیں آپ میچور ہو جائیں۔"

"ڈرامے؟" مہوز نے دکھ سے کہا۔

"ڈرامے؟" ثنا نے بھی دکھ سے پوچھا۔

"چونچلے؟" مہوز بولا۔

"چونچلے؟" ثنا کی آواز آئی۔

"ٹین ایج حرکتیں؟" مہوز اور ثنا کی آواز نکلی۔

دونوں کے کمروں سے تقریباً" ایک جیسی آوازیں اور ایک جیسے الفاظ سنائی دے رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

ذکیہ بیگم کو گھر کی فضا کچھ بوجھل سی لگی ان کے بیٹے بہوؤں میں سے تو کسی نے ان پر ظاہر نہیں کیا مگر مہوز کا بجھا چہرہ انہیں بہت کچھ سمجھا گیا "یا اللہ! انہیں میرے گھر کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔" گھبرا کر وہ لاؤنج کے صوفے پر ٹک گئیں جہاں سبطین صاحب اخبار پڑھ رہے تھے۔

"السلام علیکم! میں ہسپتال جارہا ہوں ہوسکتا ہے رات دیر سے آؤں۔"

مہوز نے عجلت میں سلام کیا اور بغیر کسی کی طرف دیکھے باہر نکل گیا منال تو ویسے ہی صبح اسکول چلی گئی تھی تھوڑی دیر بعد ہی محب بھی باہر آیا ذکیہ بیگم نے اس کے چہرے سے اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر محب کی شکل بالکل نارمل تھی نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا ان کا یہ بیٹا کسی بات کا تاثر شکل پہ نہیں آتا تھا۔

محب نے سکون سے ناشتہ کیا اور چلا گیا۔

ایک ثنا تھی جو کہ دن کے گیارہ بجے تک کمرے سے باہر نہ آئی، وہ لڑکی تھی اور لڑکیاں سب کچھ برداشت کرسکتی ہیں اپنے شوہر کی بے توجہی نہیں۔ ساڑھے گیارہ بجے ثنا کمرے سے نکلی تو اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ہینڈ کیری بھی تھا ذکیہ بیگم کو ہول سا اٹھا۔

"انکل! آپ مجھے امی کی طرف چھوڑ آئیں گے۔" ثنا کی شکل سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ روئی ہے۔

"خیریت بیٹا؟ کیا ہوا ہے؟ محب نے کچھ کہا ہے؟" سبطین صاحب نے گھبرا کر ثنا کے سر پر پیار کیا ذکیہ بیگم بھی پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"نہیں انکل! وہ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں اس لیے۔" اسے اچھا نہیں لگا کہ وہ اپنی بات ان لوگوں کو بتائے اتنی عقل تو اس میں تھی۔

"بیٹا! اگر کوئی مسئلہ ہے تو ہمیں بتاؤ ہم یہاں مل بیٹھ کر حل کرلیتے ہیں۔" ذکیہ بیگم نے پیار سے ثنا کو کہا۔

"نہیں آنٹی! کوئی مسئلہ نہیں ہے میری بس طبیعت تھوڑی ٹھیک نہیں آپ پریشان نہ ہوں میں جیسے ہی ٹھیک ہوں گی واپس آجاؤں گی۔" ثنا نے زبردستی مسکراتے ہوئے ان کی تسلی کرائی۔

"ٹھیک ہے بیٹا! کوئی بات نہیں تم جب تک رہنا چاہو وہاں رہ لو وہ بھی تو تمہارا اپنا گھر ہے۔" سبطین صاحب نے ذکیہ بیگم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ثنا کو لے کر باہر چلے گئے۔

شام کو محب واپس آیا تو کچھ دیر ماں کے پاس بیٹھ گیا ذکیہ بیگم نے ثنا کے جانے کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ سبطین صاحب نے سختی سے کہا تھا کہ بچوں کو اپنے معاملات خود حل کرنے دو تاہم نے مداخلت نہیں کرنی۔

بیڈ روم میں گیا تو ثنا کو نہ دیکھ کر کچھ عجیب سا ہوا۔ واپس آکر ماں سے پوچھا تو انہوں نے اس کے جانے کا بتایا۔ محب کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں پوری رات وہ لیپ ٹاپ پر کام کرتا رہا صبح اتوار تھا وہ دن چڑھے تک سوتا رہا۔

دوسری طرف منال سخت پریشان تھی۔ اس نے شادی کے بعد سے اب تک کبھی مہوز کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ رات وہ دو بجے واپس آیا تھا اور صبح بھی ہسپتال چلا گیا۔ اس نے منال سے بات تک نہ کی۔

ثنا کی امی اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئیں مگر وہ کیا بتاتی۔ اسے پتا تھا۔ اس کی ان شکایتوں کو ہما کے علاوہ کوئی نہیں سمجھ سکتا اچانک ہی اس کا دل گھبرایا تو وہ ڈرائیور کے ساتھ ہما کے گھر آگئی، ابھی وہ بیل پر ہاتھ رکھنے ہی لگی تھی کہ اندر سے کسی مرد کی آواز آئی۔

"سارا سارا دن بس سیر سپاٹے کراتا رہوں تو خوش رہتی ہو..... کبھی تمہیں احساس نہیں ہوا کہ میں تھکا

ہوا ہوں مجھے سکون چاہیے' گھر کا کھانا چاہیے اور اگر شادی کے بعد بھی مجھے روز روز باہر کے کھانے ہی کھانے تھے تو کیا ضرورت تھی مجھے یہ عذاب مول لینے کی۔" بلاشبہ یہ آواز اشعر بھائی کی تھی۔

"تو نہ کرتے مجھ سے شادی اور خود ہی کہتے تھے کہ میں تو شادی کے بعد تمہیں شہزادی کی طرح رکھوں گا۔" ہما نے بھی بگڑ کر کہا۔

"پردہ پڑ گیا تھا عقل پہ۔ میری اور کیا نہیں کرتا میں تمہارے لیے مگر کسی چیز کی حد ہوتی ہے تم تو مجھے اپنا ملازم سمجھ بیٹھی ہو لوگوں کی بیویاں ان کو سکون پہنچاتی ہیں کہ ہمارا شوہر باہر سے تھکا ہارا آیا ہے اور میڈم آگے تیار کھڑی ہوتی ہیں کہ باہر لے چلو چھ ماہ ہونے کو آئے ہیں شادی کو اور تمہارے لاڈ ہی ختم نہیں ہو رہے۔" اشعر کی جلی بھنی آواز آرہی تھی اور جواب میں ہما بھی مسلسل بول رہی تھی۔

ثنا نے ڈرائیور کو اشارہ کیا رکنے کا اور واپس گاڑی میں بیٹھ گئی' انجانے میں وہ ہر وقت محب کا اشعر سے موازنہ کرتی تھی آج اشعر کی خوش اخلاقی کا بھید کھلا تو محب اتنا برا نہ لگا 'یقیناً" ہما مبالغہ آرائی سے کام لیتی تھی۔ اپنے لو میرج کے فیصلے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے وہ دنیا جہان کی خوبیاں اشعر کے ساتھ منسوب کرتی رہی اور ثنا اپنی سیدھی سادی فطرت کے باعث سب سچ سمجھتی رہی ورنہ شوہر کوئی آسمانی مخلوق نہیں ہوتا کہ جسے غصہ نہ آئے اور نہ ہی وہ ہر وقت بیوی کے ناز نخرے اٹھا سکتا ہے' اپنے کمرے میں آکر ثنا خاموشی سے لیٹ گئی اس نے سوچا وہ امی سے کہے گی کہ وہ ہما کے گھر گئی ہی نہیں راستے سے ہی آگئی ورنہ امی ہما کو بتا دیں گی اور وہ بالکل نہیں چاہتی تھی کہ ہما کا بھرم ٹوٹے

محب کی کوئی کال نہیں آئی تھی۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ سوچتے سوچتے وہ کب سوئی اسے نہیں پتا چلا۔

☼ ☼ ☼

دو دن ہو گئے تھے مہوز رات کو لیٹ گھر آتا تھا اور منال سے بات تو کر لیتا تھا مگر انتہائی سرد لہجے میں' منال کو کہاں عادت تھی اس سلوک کی' مہوز نے اسے اتنا لاڈ' پیار اور مان دیا تھا کہ اب اس کا خشک رویہ منال کو اندر تک کاٹ رہا تھا۔

"اگر مرد انا میں آجائے تو عورت کو اپنے آپ کو بالکل نیچے لے آنا چاہیے کیونکہ مرد اپنے آپ کو مرد ثابت کرنے کے لیے کسی بھی انتہا تک جا سکتا ہے اور عورت تو ہمیشہ جھک کر ہی اپنے عورت ہونے کے مرتبے پر پہنچ پاتی ہے۔" منال کے کانوں میں اپنی والدہ کی نصیحت ٹکرائی' کچھ سوچ کر اس نے اپنے موبائل سے مہوز کا نمبر ملایا دو تین بیل بجانے کے بعد ایک نسوانی آواز ابھری۔

"اوہ سر تو آپریشن میں مصروف ہیں آپ کچھ دیر بعد کال کرلیں۔" نرس نے یہ کہہ کر موبائل آف کر دیا پیچھے سے کسی لڑکی کے مہوز کے ساتھ ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں' منال کا دل لرز گیا پہلی دفعہ اسے احساس ہوا کہ اس کا شوہر جس شعبے میں ہے وہاں پر کتنی ترغیبات موجود ہیں اگر ایک نرس اپنے سرجن کا موبائل فون سننے کی مجاز ہے تو پھر اور کیا کیا کچھ ہو سکتا ہے وہ شدید خوف زدہ ہو گئی اس نے تو مہوز کی محبت کو فار گرانٹڈ لے لیا تھا وہ کیوں بھول گئی تھی کہ اگر مرد کو گھر میں محبت اور توجہ نہ ملے تو پھر وہ باہر رستے تلاش کر لیتا ہے' اسے آج مہوز کی واپسی کا انتظار تھا۔

ثنا نے موبائل اٹھایا تو محب کی دو مسڈ کالز تھیں کچھ دیر وہ سوچتی رہی پھر اس نے کال بیک کر دی۔

"کہاں ہیں آپ؟ یوں مجھے بتائے بغیر۔۔۔ اچھا خیر ایسا کریں کہ پانچ منٹ میں تیار ہو جائیں۔ میں راستے میں ہوں پہنچ رہا ہوں۔" محب نے عجلت میں اس کا کوئی بھی جواب سنے بغیر فون رکھ دیا۔

"یہ بندہ بہت چالاک ہے۔ جانتا ہے کہ میں ناراض ہو کر آئی ہوں مگر منانے پر اپنا ٹائم نہیں ضائع کرے گا۔" ثنا نے بدگمانی سے سوچا مگر اندر ہی اندر اس کی کال پر خوش بھی تھی۔

جلدی جلدی تیار ہو کر وہ نیچے آئی تو محب لاؤنج میں

ثنا کے والدین کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا ثنا نے نوٹ کیا کہ اس کے والدین بہت ہی مطمئن اور خوش نظر آرہے تھے یقیناً" وہ اندر سے پریشان تھے یوں بیٹی کے آجانے پر محب بھی خوب خوش اخلاقی دکھا رہا تھا (خلاف معمول) چائے پیتے ہی محب نے اجازت چاہی اور ثنا بھی اپنا بیگ لے کر پیچھے پیچھے باہر آگئی۔

راستے میں اچانک ہی محب بولا "ہاں جی! اور سناؤ سب ٹھیک ہے نا؟"

ثنا جو اس کو جواب دینے ہی والی تھی چپ کی چپ رہ گئی ایسا بھی کب پہلی بار ہوا تھا' شروع میں تو ثنا کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ محب کے ایک کان میں ہینڈ فری اس طرح سے فٹ ہے جیسے پیدائشی کوئی چیز ساتھ جڑی ہو' اکثر ثنا کو خوش فہمی ہوتی تھی کہ محب نے اسے کچھ کہا ہے مگر پھر عقدہ کھلتا کہ وہ فون پر بات کر رہا ہے' ابھی بھی ایسا ہی ہوا محب نے پورے راستے فون پر ہی بات کی (نہ جانے کیا کیا خوش فہمیاں پال لی تھیں تھوڑی سی دیر میں) ثنا نے پھر اپنا خون جلانا شروع کر دیا تھا۔

گاڑی رکی تو ثنا سمجھی کہ شاید گھر آگیا ہے مگر اسے شدید حیرت ہوئی وہ لوگ ریزاہٹ کی پارکنگ میں تھے۔

"چلو اترو شاباش۔" محب عجلت میں کہہ کر گاڑی لاک کرنے لگا تو وہ بغیر کسی تاثر کے گاڑی سے اتر آئی' دل ہی دل میں حیران پریشان تھی اس کایا پلٹ پر' ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر محب نے مینو کارڈ ثنا کی طرف بڑھایا اور پھر ایک کال سننے لگا (تو میری زندگی یوں گزرے گی) ثنا نے محب کو بات کرتے دیکھ کر سوچا کہ اچانک محب بولا۔

"اچھا سنو ایک گھنٹہ مجھے کوئی کال نہ کرے۔ میں اپنی فیملی کے ساتھ ہوں اگر کوئی ضروری بات ہوئی تو میسج کر دینا اوکے؟" یہ کہہ کر محب نے کال کاٹ دی اور ثنا کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں جناب! کیا کیا شکایات ہیں آپ کو مجھ غریب سے؟" محب نے ہاتھ تھوڑی کے نیچے رکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ کیا شکایت ہونی ہے۔۔۔ شکر ہے آج مجھے پورا جملہ بولنے کا موقع تو ملا ہے ورنہ میری بات ابھی شروع ہی ہوتی ہے تو آپ کی کال آجاتی ہے۔" ثنا نے نہ نہ کرتے بھی شکایت لگا ہی دی۔

"دیکھو ثنا! آپ ایک بہت ہی اچھی لڑکی ہو میں جانتا ہوں کہ آپ کی کیا توقعات ہیں شاید ہر لڑکی کی ہوتی ہیں اپنے شوہر سے اور یقیناً" میری بھی کچھ غلطیاں ہوں گی مگر سب سے بڑی غلطی جانتی ہیں کیا ہے؟"

"کیا؟" ثنا نے ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا۔

"میری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ میں نے تمہیں آرام سے سکون سے کبھی بھی اپنے شعبے کے بارے میں نہیں سمجھایا نہ شادی سے پہلے بتا سکا اور نہ بعد میں میرا خیال تھا کہ تم خود چونکہ ڈاکٹر ہو۔ اس لیے تم میری پروفیشنل مصروفیات کے ساتھ جلدی سمجھوتا کر لو گی مگر کم از کم مجھے تمہیں یہ سب بتانا چاہیے تھا' دیکھو میں ٹیلی کمیونیکیشن انجینئر ہوں۔ ایک ڈاکٹر اپنی ڈیوٹی آف کر کے سو سکتا ہے' ایک جرنلسٹ بھی اپنی شفٹ کے بعد سو سکتا ہے مگر ٹیلی کام والے جس ایریا کو serve کرتے ہیں۔ وہ نہیں سو سکتے کیونکہ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں دن کے وقت اتنا فون استعمال نہیں ہوتا جتنا کہ رات کو ہوتا ہے اور ہمیں چوبیس گھنٹے بہترین سروس فراہم کرنی ہوتی ہے اوپر سے یہ ملٹی نیشنل کمپنی والے بندے کا رگڑا نکال دیتے ہیں۔"

ثنا خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی اس کے فرشتوں کو بھی پتا ہوتا کہ ڈاکٹروں سے زیادہ مصروف لوگ بھی ہوتے ہیں تو وہ ضرور اس رشتے پر غور کرتی۔

"ابھی تو تم بہت خوش قسمت ہو کہ میری دو سال پہلے پروموشن ہو گئی ہے اور اب صرف آفس کا کام ہوتا ہے ورنہ جب میں جونیئر تھا تو اس شہر اور آس پاس کے علاقے کا کوئی ایسا ٹاور نہیں ہے۔ جس پر میں نہیں چڑھا۔ اکثر تو پوری پوری رات کسی ٹاور پر گزاری ہے' اب جو لوگ مجھے فون کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ ٹاور کے اوپر سے ہی کر رہے ہوتے ہیں اگر اس وقت میں موبائل آف کر دوں یا ان کو ہدایات نہ دوں تو ان بے

چاروں کا کیا بنے گا۔" آخر میں محب نے مسکرا کر کہا اور ثنا کو لگا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔

"ہاں! میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ جب تمہارے ساتھ ہوں تو کم از کم ایک گھنٹے کے لیے اپنے ساتھیوں کو ٹاور میں لٹکا رہنے دوں۔"

"یہ تو زیادتی نہیں ہے ایک انسان کے ساتھ کہ وہ دن رات کام کرے۔" ثنا نے اپنی فکر چھوڑ کر محب کے تھکے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"ہاں ہے تو اصل میں کمپنی والے ایک اور بندہ ڈھونڈ رہے ہیں تاکہ کام کا بوجھ تقسیم ہو جائے۔" محب نے کہا۔

"ہوں تو اصل بات یہ ہے جو سب سے آخر میں بتائی ہے کہ جناب دو بندوں کے حصے کا کام اکیلے انجام دے رہے ہیں۔" ثنا نے دل ہی دل میں سکھ کا سانس لیا اور دوسرے بندے کے جلدی ملنے کی دعا کی۔

"ایک بات تو بتائیں۔" ثنا کو پھر کچھ یاد آیا۔

"جی فرمائیں۔" محب نے پزا کا ٹکڑا اٹھایا۔

"کیا نیوز چینل دیکھنا بھی آپ کے کام کا حصہ ہے؟" ثناء کی شکایتیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔

"اوہ... وہ' وہ تو یار بس کبھی کبھی کا شوق ہے۔" محب نے ہوا میں مکھی اڑائی "کبھی کبھی؟" ثنا کی آنکھیں پھٹی۔

"ہاں نا ایک سائیکالوجسٹ کے مطابق مرد جب تھکا ہارا گھر آتا ہے تو سب سے زیادہ سکون چینل سرچنگ سے پاتا ہے۔"

"یہ یقیناً" اس سائیکالوجسٹ کی اپنی خواہشات ہوں گی لیکن بہرحال آپ کو مجھے اتنی غلط باتیں نہیں سنانی چاہیے تھیں' یہ چوچلے' ڈرامے اور پتا نہیں کیا کیا۔" ثنا کا دل مچل رہا تھا کہ وہ روٹھی رہے اور محب عام شوہروں کی طرح اسے منائے۔

"ہاں میں کچھ سخت بول گیا تھا مجھے اس کا احساس ہے اور پھر تم دو دن گھر سے غائب رہ کر اس کی سزا بھی تو دے ہی چکی ہو۔" محب نے اسے گہری نظروں سے دیکھا تو ثنا گڑبڑا گئی' جب کوئی اظہار کے معاملے میں اتنا کنجوس ہو تو پھر اس کا کوئی ایک خوب صورت لفظ ہی سارے گلے شکوے دھو دیتا ہے ثنا بھی اب ڈھل کر مکمل صاف ہو چکی تھی۔

"اور پلیز یار! میں مہوز کی طرح بہت رومانٹک نہیں ہوں' میرے پروفیشن میرے شوق اور میرے مزاج ہر چیز کے ساتھ چلنا ہو گا کیونکہ تم ایک اچھی لڑکی ہو اور تمہارے لیے یہی اہم ہونا چاہیے کہ میں صرف اور صرف تمہارا ہوں۔" محب نے ثنا کی پلیٹ میں پزا ڈالتے ہوئے کہا تو ثنا نے آسودگی سے سر ہلا دیا۔ ویسے بھی ہما کے گھر کا چکر لگانے کے بعد اس کا دماغ ٹھکانے پر آچکا تھا اور وہ اپنے خوابوں کی دنیا سے باہر آچکی تھی۔



"بیگم صاحبہ! آپ کیوں پانی ابال ابال کر اپنی جان ہلکان کرتی رہتی ہیں ایک سے ایک صاف پانی کی بوتلوں کے برانڈ آچکے ہیں گاڑیاں خود گھروں میں ہفتے بھر کی بوتلیں چھوڑ جاتی ہیں اور آپ کو روپے پیسے کی کیا کمی۔" امین نے ذکیہ بیگم کو پانی کا دیگچہ چولہے پر رکھتے دیکھ کر کہا۔

"ہاں چاہے وہ پانی انہوں نے گٹر سے بھر کر ہی ڈالا ہو تمہارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ وہ صاف پانی ہے جہاں ہر چیز میں ملاوٹ ہے وہاں کیا پانی میں نہیں ہو گی۔" ذکیہ بیگم نے چولہا جلاتے ہوئے کہا۔

"مگر بیگم صاحبہ...!" امین بولنے لگا تو ذکیہ بیگم نے بات کاٹی۔

"ارے ہم انسانوں کا اپنا کیا دھرا ہے سب کچھ' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "پانی کا قطرہ بھی ضائع نہ کرو چاہے دریا کے کنارے پر بیٹھے ہو" ہماری ماؤں نے تو ایک لوٹے سے وضو کیا اور ایک بالٹی سے اچھی طرح نہا لیا۔ یہ آج کل کے بچے پانی کا شاور کھولتے ہیں تو بند کرنا بھول جاتے ہیں دو دو گھنٹے نہاتے ہی رہتے ہیں' گاڑی کیا دھلتی ہے پائپ سے پوری گلی ہی دھو ڈالتے ہیں بے برکتی کیسے نہ ہو زندگی

کے وسائل کی قدر ہی نہیں ہے۔ بے دریغ لٹائے جاؤ صاف پانی کو بہت ہی قیمتی چیز ہے مگر جس طرح سے استعمال ہو رہا ہے تو پھر قحط کے زمانے خدانخواستہ دور نہیں... تم لوگ سب میری کنجوسی کا مذاق اڑاتے ہو نا میں جانتی ہوں مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' میرے لیے اللہ کے وسائل چاہے وہ پانی ہو خوراک ہو یا کوئی بھی رزق' اس کی قدر ہے میں چیزوں کو ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ سبطین صاحب مجھے گوشت کے اوپر کیا کیا نہیں سنا جاتے مگر تم خود بتاؤ کبھی ایسا ہوا ہے کہ ہم بیٹھ کر گوشت اڑا رہے ہوں اور تمہیں میں دال دوں؟! اتنی خدا خوفی تو ہے ہی مجھ میں۔" ذکیہ بیگم نے لمبا سانس لیا۔

"جی اس بات کا تو میں گواہ ہوں کہ آپ نے کبھی مجھے اپنے گھر سے الگ نہیں سمجھا۔" امین بھی دل سے بولا۔

"بات صرف میانہ روی کی ہے جب سے ہم نے میانہ روی چھوڑی ہے ہر چیز سے برکت اٹھ گئی ہے۔" ذکیہ بیگم نے افسوس سے سر ہلایا۔

"آنٹی! مجھے ڈونٹس فرائی کرتے ہیں کس میں کروں؟" منال نے آج مہوز کی پسند کے ڈونٹس بنائے تھے اب اس کے آنے سے پہلے فرائی کرنا چاہ رہی تھی۔

"یہ لیں جی منال بی بی!" امین نے جلدی سے وہ تاریخی کڑاہی نکال کر سامنے کی' ذکیہ بیگم نے جھٹ وہ منال کے آگے سے اٹھالی اور نیچے کیبنٹ سے نئی نکور کنڈوں والی نان اسٹک کڑاہی نکال کر چولہے پر رکھ دی امین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں' وہ کچھ بولنے لگا مگر ذکیہ بیگم نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

منال جب ڈونٹس فرائی کر کے چلی گئی تو امین اپنی کھدبد کو مزید نہ روک سکا۔

"بیگم صاحبہ! یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ تو کہتی تھیں کہ آپ کی اس کڑاہی سے اچھی کوئی کڑاہی ہو نہیں سکتی۔"

"ہاں تو نہیں ہو سکتی نا... کیونکہ وہ میری ماں کی نشانی ہے وہ کڑاہی مجھے تو اپنی جان سے پیاری ہو سکتی

ہے، مگر میں اسے اپنی بہوؤں کے سر پر کیوں ٹھونسوں اتنی پاگل نہیں ہوں میں اور تم کیا اپنے صاحب کو جانتے نہیں وہ تو اسی موقع کے انتظار میں ہیں کہ میں کسی بہو کے ساتھ کوئی زیادتی کروں اور وہ گھر میں معرکہ شروع کریں۔"

امین اپنی بیگم صاحبہ کی سمجھ داری پر عش عش کر اٹھا۔

رات کے کھانے پر سب ہی اکٹھے تھے اور بہت ہی خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا جا رہا تھا سبطین صاحب بھی خوب چہک رہے تھے۔ سب افراد خانہ کو اکٹھے دیکھ کر سبطین صاحب نے سوچا کہ کچھ ضروری باتیں بھی بچوں سے کر لی جائیں۔

"بھئی مجھے تم لوگوں سے چند باتیں کرنی ہیں۔"

سب ہی کھانا چھوڑ کر متوجہ ہو گئے۔

"دیکھو میرے بچو! اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی ہر چیز توازن کے ساتھ پیدا کی ہے' انسانی جوڑے بھی اسی توازن کا حصہ ہیں اکثر مرد اور عورت بہت مختلف مزاج کے حامل ہوتے ہیں مگر ایک بہترین زندگی گزارتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ اگر دونوں ہر بات میں ایک سے ہوں تو وہ چیز اپنی انتہا کو پہنچ جائے جیسے مثال کے طور پر اگر ایک زیادہ بولتا ہو اور دوسرا بھی زیادہ بولنے لگے تو پھر سنے گا کون؟ اگر ایک کا دل تھوڑا سخت ہوتا ہے تو دوسرے کا تھوڑا نرم یوں چیزیں متوازن ہو جاتی ہیں اور ایک دوسرے کی خامیاں بھی چھپ جاتی ہیں۔ میں اور تمہاری ماں بالکل مختلف مزاج کے لوگ ہیں مگر میں دل سے مانتا ہوں کہ میرے مزاج کے ساتھ اس نے بہت سمجھوتا کیا ہے اور میں فطرتاً جتنا فضول خرچ تھا اگر یہ بھی ایسی ہی ہوتی تو ابھی ہم اس گھر میں نہ بیٹھے ہوتے' سو اللہ بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔ ایک دوسرے کی خوبیوں کو سراہو اور خامیوں کو نظر انداز کرو' ایک دوسرے کا لباس بن جاؤ۔" سب نے ہی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"اب ایک اور انتہائی سنجیدہ بات کرنی ہے مجھے تم سب سے' دیکھو! یہ گھر اور گھر کی ہر چیز تم لوگوں کی ہے جو چاہے کرو جہاں چاہو بیٹھو ہاں مگر یہاں تم لوگوں نے صرف اور صرف اپنی ماں کی مرضی سے چلنا ہے یہ بات ذہن میں رکھنا۔" سبطین صاحب نے ذکیہ بیگم کو دیکھتے ہوئے بات مکمل کی تو ذکیہ بیگم گڑبڑا گئیں۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ" وہ سخت گھبرا گئیں اس بات پر بہوؤں کے موڈ خراب بھی ہو سکتے تھے۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں یہ دونوں اب اس گھر کا حصہ ہیں انہوں نے تو اب یہیں رہنا ہے کہیں جانا نہیں تو پھر کتنے دن ڈرامہ چل سکتا ہے۔ اچھا ہے کہ انہیں بھی عادت ہو جائے۔ کیوں بچو! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔" سبطین صاحب نے ہمیشہ کی طرح کسی کی پروا نہ کرتے ہوئے جو سوچا بول دیا۔

مہوز اور محب نے گھبرا کر اپنی بیویوں کو دیکھا تو وہ دونوں ہی مسکرا رہی تھیں کیونکہ اس بات کا احساس انہیں شروع دن سے ہی ہو گیا تھا۔

"آنٹی! آپ فکر نہ کریں۔ میں پانی ابال دیا کروں گی اور ثنا بوتلیں بھر دیا کرے گی۔"

"مگر جی بوتلوں کی گنتی تو بیگم صاحبہ خود ہی کیا کریں گی آپ جو مرضی کریں۔" امین نے بھی لقمہ دیا تو سب ہنسنے لگے۔

آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ذکیہ بیگم ہر چیز پر سمجھوتا کر سکتی ہیں مگر ایک چیز پر نہیں...... جی جی بتانے کی ضرورت نہیں۔





تری زمیں ترا آسماں برائے فروخت
مجھے تو لگتا ہے سارا جہاں برائے فروخت

بلک رہے ہیں مرے سامنے مرے بچے
میں لکھ رہا ہوں مکاں پر مکاں برائے فروخت

ضعیف کوزہ گرا زندگی بخیر یہ کیوں
لکھا ہوا ہے نیا خاک دان برائے فروخت

اسے نصیب کا لکھا ہی جانیے ورنہ
کہاں وہ یوسف کنعاں کہاں برائے فروخت

میں تھک گیا ہوں بغاوت کی جنگ لڑتے ہوئے
سواب یہ تیر، یہ تیغ و سناں برائے فروخت

دمشق والے اُدھر منتظر ہیں اور ادھر
مری سپاہ، مرا کارواں برائے فروخت

میثم علی آغا

بے وجہ تحفظ کی ضرورت بھی نہیں ہے
ایسی میرے اندر کوئی عورت بھی نہیں ہے

ہاں ان کو بھلا ڈالیں گے اک عمر پڑی ہے
اس کام میں ایسی کوئی عجلت بھی نہیں ہے

کس منہ سے گلہ ایسی نگاہوں سے کہ جن میں
پہچان کی اب کوئی علامت بھی نہیں ہے

میری بھی تو ماضی کی بہت سی ہیں کتابیں
پر ان کو پلٹنے کی تو فرصت بھی نہیں ہے

کچھ تم سے گلہ اور کچھ اپنے سے کہ مجھ کو
ہر حال میں خوش رہنے کی عادت بھی نہیں ہے

شمسہ شکیل



پیغام،

نئے سال کی صبح کے سورج

جو جاؤ اُدھر

تو اُن سے کہنا کہ تمہارے

تمام عمر کے دُکھ

اپنے نام کرنے کا سمجھوتا کر کے

خوشیوں کی روپہلی کرنوں سمیت

کوئی محوِ انتظار ہے

ثمینہ اکرم

عمر گزری تو یہ خیال آیا
کتنے دُکھ تھے کہاں سنبھال آیا

اس سے پہلے کہ خاک ہو جاتا
میں زمانے پہ خاک ڈال آیا

سنگ تھا تو کوئی دراڑ نہ تھی
آئینہ بن گیا تو بال آیا

پہلے تو ٹھیک ہی گزرتی تھی
جب عروج آیا، تب زوال آیا

ایک لمحے نے روک رکھا ہے
سالہا سال سے نہ سال آیا

پھر میرا وار دیکھنا باقی
میری غیرت کا جب سوال آیا

باقی احمد پوری



شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جب تم کسی آدمی کو دیکھو کہ اسے دُنیا سے بے رغبتی اور کم گوئی دی گئی ہے تو اس سے قریب ہوا کرو کیونکہ وہ حکمت کی باتیں کرتا ہے۔"

(ابن ماجہ)

عربی زبان،

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق طوفان نوح کے بعد کشتی نوح سے اُترنے والے افراد کی تعداد اسی تھی۔ روئے زمین کے یہ سب باسی تھے جنہوں نے خود اور بعد میں اُن کی اولادوں نے دُنیا کو نئے سرے سے آباد کیا۔ یہ بہتر زبانیں بولتے تھے۔ بعدازاں قدرت نے انہیں ایک نئی زبان سے روشناس کرایا۔ یہ تہترویں زبان تھی اور اس زبان کو ہم آج عربی زبان کے نام سے جانتے ہیں۔

سندھ،

حضرت نوح علیہ السلام کے تیسرے بیٹے حام کے دس بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک بیٹے کا نام سندھ تھا۔ اس نے سندھ کو آباد کیا۔

سندھ کے دو بیٹے تہت اور ملتان تھے۔ ان میں سے تہت نے سندھ کا شہر ٹھٹھہ اور ملتان نے پنجاب کا شہر ملتان آباد کیا۔

بلند ہمتی،

نظام الملک کی وفات کے دن قریب آئے تو اس نے اپنے بیٹے کے لیے وصیت نامہ لکھا۔

اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا۔

"بلند ہمتی کو اپنا شیوہ بناؤ۔ کیونکہ ہمت جدوجہد کا سبب ہے۔ اور جدوجہد کے سائے میں دولت و اقبال کی پرورش ہوتی ہے۔"

تین سبب،

عبداللہ بن طاہر کی اولاد میں کسی شخص سے دریافت کیا گیا کہ تمہارے خاندان سے حکومت جاتے رہنے کا سبب کیا تھا۔

اس نے جواب دیا۔ "راتوں کو شراب پیتے تھے، دن چڑھے تک سوتے تھے اور اپنا کام نااہلوں کے سپرد کر دیتے تھے۔"

دُور اندیشی،

ایک دُور اندیش نوجوان نے ناول نگاری پر طبع آزمائی کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں اس پر سات ماہ کا کمرے کا کرایہ تھا اور محلے کے دُکان داروں کا کافی اُدھار چڑھا ہوا تھا۔

"آخر تم کرایہ اور دیگر ڈیوز کب دو گے؟" مالک مکان نے تنگ آ کر پوچھا۔

"بہت جلد۔" مستقبل کے مصنف نے جواب دیا۔ "میرا پبلشر مجھے رقم بھیجنے ہی والا ہے۔"

"کیا اس نے اشاعت کے لیے تمہارا ناول پسند کر لیا ہے؟" مالک مکان نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

"پسند کیسے کرے گا۔ ابھی تو میں نے ناول ختم ہی نہیں کیا۔" مصنف نے بے نیازی سے کہا۔

"تو کیا ابھی لکھ رہے ہو؟" قدرے مایوسی سے مالک مکان نے پوچھا۔

"نہیں... ابھی تو میں نے شروع بھی نہیں کیا۔" مصنف کو بھی اچنبھا ہوا۔

"تو کب شروع کرو گے؟" مالک مکان نے بدقت غصہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

"جب بھی کوئی اچھا سا پلاٹ ذہن میں آجائے گا اور لکھنے کے لیے حالات موزوں میسر ہوں گے۔" نوآموز مصنف نے نہایت اطمینان و سکون سے جواب دیا۔

الماس تنویر۔ ہزارہ

شکایت،

ایک عورت نے ڈاک خانے فون کیا۔

"آپ کا نیا ڈاکیا میرے کتے کو تنگ کر رہا ہے اور"

ڈاک خانے کے سپروائزر نے پوچھا "محترمہ! آپ کا کتا کہاں ہے؟"

"وہ باغ میں درخت کے نیچے کھڑا بھونک رہا ہے۔" عورت نے جواب دیا۔

"اور ڈاکیا کہاں ہے؟"

"وہ درخت کے اوپر ہے۔" ان محترمہ نے جواب دیا۔

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

مسلمانوں کا امیر،

حضرت سائب بن اقرع کو حضرت عمر نے مدائن کا گورنر بنایا۔ ایک مرتبہ وہ کسریٰ کے ایوان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی نظر دیوار پر بنی ہوئی ایک تصویر پر پڑی جو اپنی انگلی سے ایک جگہ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ حضرت سائب فرماتے ہیں۔ میرے دل میں خیال آیا کہ یہ کسی خزانے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ چنانچہ میں نے اس جگہ کو کھودا تو بہت بڑا خزانہ وہاں سے نکل آیا۔ میں نے حضرت عمر کو خط لکھ کر اس واقعہ کی اطلاع دی۔ اور یہ بھی لکھا کہ یہ خزانہ اللہ تعالیٰ نے میری محنت سے مجھے دیا ہے۔ اس میں کسی مسلمان نے میری مدد نہیں کی ہے۔ (لہٰذا یہ خزانہ میرا ہونا چاہیے) حضرت عمر نے جواب میں لکھا "بے شک یہ خزانہ ہے تو تمہارا لیکن تم مسلمانوں کے امیر ہو، اس لیے اس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دو۔"

سوال،

میرے ہاتھ میں کتاب ہے
اور
میرے کندھے پر بندوق
میں جا رہا ہوں درس گاہ کی طرف
میری ماں
دامن پھیلائے دعا کرتی ہے
خوف زدہ ہو کر میری سلامتی کی
اس طرح سے کچھ
جیسے اس کا بیٹا مقتل کی سمت چلا ہو
اُف خدایا
میں تاریخ کے کس موڑ پر کھڑا ہوں!

ندا، فضہ۔ کراچی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں،

- حسن ایک تنہائی کی سلطنت ہے، جسے جاہ و حشم کی ضرورت نہیں۔ (بوعلی سینا)
- دنیا میں اس سے زیادہ کوئی چیز سخت نہیں کہ تمہاری کسی سے دشمنی ہو۔ (ابوالحسن)
- جو عقل مند سے لڑے وہ عزت کی توقع نہ رکھے۔ (سعدی)
- قیمتی مشورے محض قیمت وصول کرنے کے لیے ہوتے ہیں اور صحیح مشورے ناراضی مول لینے کے لیے۔ (جارج سنتیانہ)
- طنز وہ آئینہ ہے جس میں دیکھنے والا اپنے سوا ہر کسی کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ (سوئفٹ)
- وہ آدمی عظیم ہے جو اپنا کام چلانے کے لیے دوسروں کے دماغوں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (پیاٹ)

- ذہانت گفتگو کا نمک ہے۔ (ہیزلیٹ)
- بے محل ہنسنا، غیرضروری گفتگو کرنا اور غلط جگہ بیٹھنا بے وقوفی ہے۔ (بیومانٹ)
- نیک وہ عمل ہے جو لوگوں سے بے نیاز ہو کر کیا جائے۔

نمرہ، اقراء۔ کراچی

بھید،

ہر دکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدمی پر اپنا ایک راز کھول دیتی ہے۔ بودھ گیا کی چھاؤں تلے بدھ بھی ایک دکھ بھری تپسیا سے گزر رہے تھے، جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا۔ آنکھیں کنوئیں کی تہ میں بے نور ہوئیں اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈوری اٹکی رہ گئی تو گوتم بدھ پر بھی ایک بھید کھلا تھا۔ جیسا اور جتنا اور جس کارن آدمی دکھ بھوگتا ہے ویسا ہی بھید اس پر کھلتا ہے۔ نروان ڈھونڈنے والے کو نروان مل جاتا ہے اور جو دنیا کی خاطر کشٹ اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی۔ آب گم)

ہری مرچیں،

☆ کیا شادی جنت کا دروازہ ہے؟
• جی ہاں! باہر جانے کا...!
☆ انسان اپنی بے وقوفی پر کب خوش ہوتا ہے؟
• شادی کے دن...!
☆ کیا زبانی لڑائی میں عورت سے کوئی جیت سکتا ہے؟
• جی ہاں! دوسری عورت۔
☆ طلاق کی سب سے بڑی وجہ کیا ہے؟
• شادی۔
☆ دنیا کی خطرناک ترین پولیس کون سی ہے؟
• بینڈ باجے والی۔ ان کا قید کیا ہوا عمر بھر رہا نہیں ہوتا۔
☆ جج ملزم کے باپ سے "تم نے اپنے بیٹے کی تربیت اچھی نہیں کی۔"
• باپ۔ "تربیت تو اچھی کی تھی پھر بھی کم بخت نہ جانے کس طرح پکڑا گیا۔"
☆ باپ، بیٹے سے۔ "جب میں چھوٹا تھا تو جھوٹ نہیں بولتا تھا۔"
• بیٹا۔ "تو ابا جان آپ نے یہ کام کب سے شروع کیا...!"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

میڈ کلاؤ،

اٹلی میں میڈ کلاؤ بڑا سخت قسم کا یہودی تھا۔ اس کی کوئی تیرہ چودہ منزلہ عمارت تھی۔ صبح جب میں یونیورسٹی جاتا تو وہ رات کا بارش کا پانی وائپر سے نکال رہا ہوتا۔ اور فرش پر ٹاکی لگا رہا ہوتا تھا۔ یا سڑک کے کنارے جو پٹڑی ہوتی ہے اسے صاف کر رہا ہوتا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ ایسا کیوں کرتے ہیں اتنے بڑے آدمی ہو کر؟"

اس نے کہا "یہ میرا کام ہے۔ کام بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

اس نے کہا "یہ انبیائے کرام کی صفت ہے جو انبیاء کے دائرے میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ وہ چھوٹے کام ضرور کرے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بکریاں چرائی تھیں اور ہم یہودیوں میں بکریاں چرانا اور اس سے متعلقہ پیشے یعنی اون کا کام موجود ہے۔" اس نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا جوتا خود گانٹھتے تھے۔ قمیص کا پیوند خود لگاتے۔ کپڑے دھوتے۔ راستے سے جھاڑ جھنکار صاف کر دیتے تھے۔ تم کرتے ہو؟

(اشفاق احمد زاویہ چھوٹا کام سے اقتباس)

نوال افضل گھمن۔ گجرات



خالدہ جیلانی



دردہ بٹ ___ ڈسکہ

میں تیرے ملنے کو معجزہ کہہ رہا تھا
تیرے بچھڑنے کا سانحہ بھی کمال گزرا
ہراس، بارود، موت شب خون کا خوف
نہ پوچھ کتنی اذیتوں میں یہ سال گزرا

آمنہ اُجالا ___ ڈہرکی

یہ خنک رات، یہ نئے سال کا پہلا لمحہ
دل کی خواہش ہے محسن کہ اب کوئی یاد آئے

ثمینہ یاسمین ___ میانوالی

رستے پہ عمر کی میرا پاؤں پھسل گیا
اک اور سال پھر میرے ہاتھوں نکل گیا
کیا جیت تھی جو ہار کے رتھ پہ سوار تھی
میں اپنے پاؤں تلے خود کو کچل گیا

ثمینہ تنویر ___ ملتان

یوں لگا مجھ کو نئے سال کا پہلا لمحہ
زرد شیشے پہ کوئی پھول گرا ہو جیسے

صبا طارق ___ ڈاہرانوالہ

جس دیس کے کوچے کوچے میں افلاس آوارہ پھرتا ہے
جو دھرتی بھوک اگلتی ہو اور درد فلک سے گرتا ہو
اُس دیس کی مٹی برسوں سے یہ دکھ جگر پر سہتی ہے
اور اپنے دیس کے لوگوں کو نیا سال مبارک کہتی ہے

ثمینہ اکرم ___ کراچی

سردیوں کا موسم ہے برفیلی ہوائیں ہیں
سالِ نو آچکا، جنوری کی شامیں ہیں
اُداسیوں میں لیے ہوئے ماہ و سال گزرے ہیں
چلے آؤ کہ صدیوں سے ترسی ہوئی نگاہیں ہیں

نمرہ، اقرأ ___ کراچی

مجھ سے بچھڑ گیا جو گئے سال کی طرح
اس کا بھی حال ہوگا میرے حال کی طرح
آیا نہیں وہ رہ گئے رستے سجے، ہوئے
یہ سال بھی گزر گیا ہر سال کی طرح

رخسانہ جمیل ___ شیخوپورہ

جنوری کی سردیوں میں ایک آتش داں کے پاس
گھنٹوں تنہا بیٹھنا، بجھتے شرارے دیکھنا
جب کبھی فرصت ملے تو گوشۂ تنہائی میں
یادِ ماضی کے پرانے گوشوارے دیکھنا

عائشہ عمران ___ لاہور

نہ جانے کیا ہوا ہے سال بھر میں
دیا روشن کہ مدھم ہو گیا ہے
ہمیں معلوم ہے اتنا کہ ایک سال
ہماری عمر سے کم ہو گیا ہے

صبا نور شاہی ___ ڈوگہ

ہونٹ وہ باتیں کر نہیں پاتے
جو آنکھوں کے رنگ کرتے ہیں
چُپ چاپ گم صم رہنے والے
اپنے آپ سے جنگ کرتے ہیں

ارم کمال ___ فیصل آباد

میرے لفظوں پہ حاوی ہے تمہارے ہجر کا موسم
میری غزلیں، میری نظمیں میرے اشعار روتے ہیں
دسمبر کی حسین شامیں زمیں پر جب اترتی ہیں
میرے چھوٹے سے کمرے میں تیرے اقرار روتے ہیں

رضوانہ شکیل راؤ ___ لودھراں

اب کے کچھ ایسی تدبیریں کرتے ہیں
مل کے اک شہرِ محبت تعمیر کرتے ہیں
خزاں کی اُجاڑ شامیں نہ آئیں اگلے سال
اس بہار رُت کو زنجیر کرتے ہیں

امبر گل ___ جھڈو (سندھ)

ریل گاڑی میں مسافر کی نظر سے جیسے
رات کے وقت کوئی شہر گزر جاتا ہے
اس طرح وقت کے دریائے رواں سے ایک سال
جیسے گزری ہے کوئی لہر، گزر جاتا ہے

ثمرین اکرام ___ میرپور خاص

مجھ سے بچھڑ گیا جو گئے سال کی طرح
اُس کا بھی حال ہوگا میرے حال کی طرح
آیا نہیں وہ رہ گئے رستے سجے سجائے
یہ سال بھی گزر گیا ہر سال کی طرح

عنوی اکرم ___ لیاری کراچی

مسئلے تو پچھلے سال کے اپنی جگہ رہے
سب سوچتے رہے کہ نیا سال آگیا
خوشیاں جو بانٹتا تو کوئی نئی بات تھی
گزرا ہوا یہ سال بھی عمریں بڑھا گیا

مہر گل ___ کراچی

اب کیوں اُداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

حنا خورشید ___ وعولہ

برسوں سجاتے رہے ہم کردار کو مگر
کچھ لوگ بازی لے گئے صورت سنوار کر

عذرا، اقصیٰ ناصر ___ کراچی

الوداع کہتی ہوئی رُت میں اکیلے رہ گئے
ٹہنیوں پر چند سوکھے پات بنتے رہ گئے
گھل گئی تیری جدائی کے دکھی موسم کی برف
راستوں پر یاد کے ذرے چمکتے رہ گئے



امت الصبور

خواتین کی ڈائری

لاریب کی ڈائری سے

یہ سچ ہے کہ باہر کے موسم اندر کے موسم کے تابع ہوتے ہیں تبھی تو ایک بار باہر کا موسم خوشگوار ہونے کے باوجود ریڈیو پر جب یہ خوبصورت نظم سنی تو دل کے اندر وہی اداسی اور ویرانی سرائیت کر گئی جو اس نظم میں ہے۔ پریزنٹر کے لہجے کا آتار چڑھاؤ، آواز کی گمبھیرتا، برستا موسم اور رات کا پچھلا پہر، کچھ بھی تو قابل فراموش نہیں۔

ہوا تھمی تھی ضرور لیکن وہ شام جیسے سسک رہی تھی
کہ زرد پتوں نے آندھیوں کو عجیب قصہ سنا دیا تھا
کہ جس کو سن کر تمام پتے سسک رہے تھے، بلک رہے تھے
جانے کس سانحے کے غم میں شجر جڑوں سے اکھڑ چکے تھے
بہت تلاشا ہم نے تم کو
ہر ایک رستہ، ہر ایک وادی
ہر ایک پربت، ہر ایک گھاٹی
مگر کہیں سے خبر نہ آئی
تو یہ کہہ کر ہم نے دل کو ٹالا، ہوا تھمے گی تو دیکھ لیں گے
ہم اس کے رستوں کو ڈھونڈ لیں گے
مگر ہماری یہ خوش خیالی
جو ہم کو برباد کر گئی تھی
ہوا تھمی تھی ضرور لیکن
بڑی ہی مدت گزر چکی تھی
ہمارے بالوں کے جنگلوں میں
سفید چاندی اتر چکی تھی
فلک پہ تارے نہیں رہے تھے، گلاب پیارے نہیں رہے تھے
وہ جن سے بستی تھی دل کی بستی
وہ لوگ سارے نہیں رہے تھے
مگر یہ المیہ تھا سب سے بالاتر
کہ ہم تمہارے نہیں رہے تھے
کہ تم ہمارے نہیں رہے تھے
ہوا تھمی تھی ضرور لیکن بڑی ہی مدت گزر چکی تھی

امبر گل کی ڈائری سے

گہری سرد، یخ بستہ راتوں میں کسی کی یاد کے ساتھ سارے دکھ جاگ اٹھتے ہیں۔ تاجدار عادل کی یہ غزل اس کی غماز ہے۔

یاد بھی اب کے آیا ہے وہ، جاگ اٹھی ہے خواہش بھی
تازہ دکھ اور سرد ہوا ہے، سال کی پہلی بارش بھی

ہجر کا اب دستور نیا ہے، سارے لوگ بتاتے ہیں
زخم چھپانا اچھا نہیں ہے، زخموں کی آرائش بھی

عشق کرو تو عشق کو سمجھو، اپنا حال تو ایسا ہے اب
جاگ رہی ہیں نیند کی آنکھیں، ہار گئی ہے کوشش بھی

سب سے ملتے رہتے ہیں، اور کوئی نہیں اب بھاتا ہے
پہلے پہل جب بچھڑے اس سے، دل میں تھی گنجائش بھی

جانے کیسے راز کا واقف، جانے کیسا بھید تھا وہ
میرے حق میں کوشش جس کی، میرے خلاف سازش بھی

ہجر کی ساعت دونوں میں، کیا سوچ سمجھ کر آئی تھی
جو ہاتھ کی میرے شدت تھی، اور اس کے ہاتھ کی لرزش بھی

سارہ چوہدری کی ڈائری سے

دل کے اپنے قاعدے، قانون ہوتے ہیں، وہاں دوسرا کوئی نظام نہیں چلتا۔ سعداللہ شاہ کی یہ غزل آپ کی نذر۔

اپنا مزاج کار بدلنے نہیں دیا
دل نے کوئی نظام بھی چلنے نہیں دیا

اے ماہتاب حسن ہمارا کمال دیکھ
تجھ کو کسی بھی رنگ میں ڈھلنے نہیں دیا

نظروں سے اپنی آپ ہی گرتے گئے ہم
اے عشق تو نے ہم کو سنبھلنے نہیں دیا

تھوڑی سی وضع داری تو اس دل کے واسطے
تو نے تو اس دل میں وہم بھی پلنے نہیں دیا

تہذیب اپنی کی ہے محبت نے سعدیوں
اس دل کو ہم نے حد سے نکلنے نہیں دیا

سعدیہ ریاض کی ڈائری سے

مجید نظامی کی یہ نظم میں نے راحت جبیں کے ناول میں پڑھی تھی اور تب سے یہ میرے دل پر نقش ہو چکی ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔

یہ تمہیں بتا دوں میں، چاہتوں کے رشتے میں پھر گرہ نہیں لگتی
لگ بھی جائے تو اس میں، وہ کشش نہیں رہتی
ایک پھیکا پھیکا سا، رابطہ تو ہوتا ہے، تازگی نہیں رہتی
روح کے تعلق میں روشنی نہیں ملتی
بات وہ نہیں رہتی، دوستی نہیں رہتی
لاکھ بار مل کر بھی دل نہیں ملتے
ذہن کے جھروکوں میں، یاد کے دریچوں میں
تتلیوں کے رنگوں میں پھول نہیں کھلتے
اس لیے میں کہتا ہوں، اس طرح کی باتوں میں احتیاط کرتے ہیں
اس طرح کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں



نادرہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

آمنہ سلیم... گجرات

ٹائٹل بلاشبہ پرفیکٹ ہوتا اگر ماڈل کے ہاتھوں پر بھی تھوڑی سی توجہ دی جاتی۔ "کرن کرن روشنی" میں بہت ہی خوب صورت احادیث کا چناؤ کیا گیا (ہمیشہ کی طرح) اور ثناء مرزا سے ملاقات ان کہے ہی پوری ہو گئی جو کہ اچھی رہی۔ "بن مانگی دعا"۔ "ماہ تمام" وہی گھریلو سیاست کے لڑائی جھگڑے۔ "سحر عترت" بہت سحر انگیز تحریر تھی۔ معوذ تین کسے کہتے ہیں؟ پلیز ضرور بتایئے گا۔ "گانٹھ" سبق آموز تحریر ہے۔ "نمرہ رحمان" کا لکھا مضمون پڑھ کر سچ میں آنکھیں نم ہو گئیں۔ باقی افسانے بس سو سو تھے۔ مکمل ناول "ہمیں اس کا یقین ہے" آغاز میں ہی اختتام کا پتا چل گیا۔ لیکن پھر بھی سارا پڑھ ڈالا اور اینڈ ٹھیک ہمارے اندازے کے مطابق ہی ہوا۔ "ثوبیہ صفدر" کے بارے میں پڑھ کر دل افسردہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے (آمین)۔

"شام کی چائے" کی تمام ڈشنز لاجواب تھیں۔

ج۔ آمنہ! ماڈل کے ہاتھوں میں ہمیں تو کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ ماڈل کے ہاتھوں پر توجہ دینے سے کیا مراد ہے آپ نے وضاحت نہیں کی۔ سورۃ فلق اور سورۃ اخلاق کو معوذ تین کہتے ہیں۔

نزہت ناز۔ اقراء بتول... جھنگ

جس تحریر نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا' وہ میمونہ صدف کی "سحر عترت" ہے۔ بہت اچھی اور عمدہ تحریر تھی۔ پہلے پہل پڑھتے ہوئے تھوڑا ڈر لگا خاص طور پر کنزی کو اپنا گھر نظر نہ آنا اور سونیا کا ماریا اور صفیہ کو دیکھنا لیکن اینڈ پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ آج کل یہ چیز ہمارے معاشرے میں عام ہو چکی ہے ہمیں اپنے اللہ پر یقین کو مضبوط کرنا چاہیے۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ ماڈل کے میک اپ' ڈریس اور بیٹھنے کا انداز سب کچھ اچھا لگا۔ "شعاع" میں خواتین کے شمارے کی ایک جھلک دیکھ کر سائرہ رضا کے ناول "اب کر میری رفوگری" کا شدت سے انتظار تھا۔ ثوبیہ صفدر کے بارے میں پڑھنے لگے۔ خاصی زندگی سے بھرپور لڑکی لگی لیکن آگے کلثوم ہدایت کی تحریر' بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ اوہ میرے خدا۔ دکھ کا شدید حملہ ہوا اور کچھ لمحوں تک ساکت بیٹھی رہ گئی۔ زندگی کس قدر بے یقین ہے جیتے جاگتے' بھاگتے دوڑتے' امنگوں سے بھرپور دلوں کو لمحوں میں مٹی کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ثوبیہ کی مغفرت فرمائے اور اس کے والدین اور خاندان کو صبر عطا فرمائے۔
(آمین)

افسانے تمام زبردست اور سبق آموز تھے خاص طور پر دیا شیرازی کا ملیت پسند اور عظمیٰ افتخار کا "گانٹھ" بہت اچھا لگا۔ عنیزہ سید شکر ہے کچھ تو سامنے لائیں لیکن حیرت کا شدید جھٹکا لگا یہ پڑھ کر کہ کھاری بلال سلطان کا بیٹا ہے۔ فلزا ظہور اور کھاری کی ملاقات کیسی ہوگی؟ اور کھاری کا ردعمل؟ انتظار۔ انتظار... اگلی قسط کا۔ خیر "ماہ تمام" بھی اچھی تھی شکر ہے تقی کا نکاح شفا سے ہو گیا۔

لیکن عمیر کے دکھ کا پڑھ کر دکھ لگا۔ "بن مانگی دعا" اچھی جا رہی ہے۔ کچھ کہانی آگے بڑھے گی تو پتا چلے گا لیکن صالحہ اور امتیاز کے ماضی کا پڑھ کر مزا آیا۔ نازیہ جمال کا ناول "ہمیں اس کا یقین ہے" اچھا تھا لیکن ٹاپک پرانا تھا۔ کاملیت پسند پڑھتے ہوئے "جنت کے پتے" کے جہان کی بات سو فیصد سچ لگی کہ انسان کو دوسرے کی مشکل کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تو وہ اس کی جگہ پر کھڑا نہ ہو۔ مستقل سلسلے بہت اچھے تھے۔ ہمارے گھر ٹی وی نہیں ہے لیکن انٹرویوز پھر بھی شوق سے پڑھتی ہوں۔

ج۔ نزہت اور اقراء خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ پچھلے ماہ میمونہ صدف کا ناول طوالت اختیار کر گیا جس کی بنا پر سائرہ رضا کا ناول شامل نہ کر سکے۔ اس ماہ سائرہ رضا کا ناول شامل ہے۔

حیا فاطمہ... بہاول پور

اس دفعہ کا ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ افسانوں میں گانٹھ تنقید اور کاملیت پسند بہت اچھے لگے۔ خاص طور پر گانٹھ کا موضوع بہت اعلا تھا۔ ماہ تمام میں تقی کا شفا سے نکاح نہیں ہونا چاہیے تھا۔

مکمل ناول ہمیں اس کا یقین ہے ویسے تو اچھا تھا لیکن عورت کو اتنا کمزور بھی نہیں دکھانا چاہیے تھا۔ "میری خاموشی کو بیاں ملے" میں ثوبیہ کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائیں۔
(آمین)

ج۔ پیاری حیا! تقی اور شفا کا نکاح کیوں نہیں ہونا چاہیے تھا؟ ہمارے خیال میں تو ساہر کی سازشوں کا اس سے بہتر جواب ہو ہی نہیں سکتا تھا جس لڑکی سے وہ اتنی شدید نفرت رکھتی تھی' جسے وہ تباہ کرنا چاہتی تھی وہ اس کے عزیز بھائی کی بیوی بن گئی۔

مکمل ناول ہمیں اس کا یقین ہے' میں عورت کو کمزور نہیں دکھایا گیا' عورت کمزور ہوتی بھی نہیں ہے بس۔ حالات اسے بے بس کر دیتے ہیں۔

حرام عاصم... نامعلوم شہر

سب سے پہلے میں اس ناول کی تعریف کرنا چاہوں گی جس نے میری زندگی بدل دی' وہ ہے "مصحف" پہلے تو میں بس قرآن پاک کو ثواب حاصل کرنے اور مردوں کی مغفرت کروانے والی کتاب سمجھتی تھی۔ لیکن یہ ناول پڑھنے کے بعد میرے اندر قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور اب میں قرآن سمجھ کر پڑھ رہی ہوں۔ اب ایک اور کہانی بھی ایسی پڑھی جس نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا' وہ ہے دسمبر کے شمارے میں شائع ہونے والی میمونہ صدف کی کہانی "سحر عترت" اس کہانی کا موضوع بھی بہت اچھا تھا۔ واقعی آج کل لوگ خاص طور پر عورتیں اپنی پریشانیوں کے حل کے لیے غیر اللہ سے مدد لیتی ہیں اور اپنی آخرت خراب کرتی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ یہ رائٹرز بہت خوش قسمت ہیں جب ان کی لکھی ہوئی کوئی اچھی بات کوئی قاری اپنی زندگی میں شامل کرتا ہے تو وہ ان کے لیے صدقہ جاریہ کا باعث بنتی ہے۔ میری تربیت میں خواتین ڈائجسٹ کا بڑا ہاتھ ہے۔ میں الہدیٰ انٹرنیشنل کی طالبہ بھی ہوں۔

ج۔ پیاری حرا! بلاشبہ کہانیوں کا انتخاب کرتے ہوئے ہمارے پیش نظر یہی بات ہوتی ہے کہ کہانی میں کوئی مثبت پیغام ہو' کوئی مقصد ہو لیکن اس کام میں ہماری قارئین بھی برابر کی حصہ دار ہیں۔ وہ ان تحریروں کو پسند کرتی ہیں جس سے ہماری حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ آپ کا خط پڑھ کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی ہے۔ قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنا اور اسے آگے بڑھانا صدقہ جاریہ ہے۔

کائنات عابد... دسویہ فیصل آباد

ٹائٹل گرل بہت پیاری لگ رہی تھی افسانوں اور ناول کی بات ہو جائے تو سب ہی بہت زبردست تھے۔ عفت آپی کا ناول بہت زبردست ہے' لیکن ہم رویحا گل اور ازمیر بٹ کو بھی بہت مس کر رہے ہیں۔ جلدی سے ان سے بھی ملاقات کرا دیجیے۔ جس ناول نے خط لکھنے پر مجبور کیا "سحر عترت" ہے کیا شاہکار ناول تھا۔ شمعون کا کردار بہت زبردست لگا اور وہ نمو باجی' ان کی باتیں بہت ہی پیاری لگیں سیدھی دل میں اتر گئیں۔ نازیہ جمال کا ناول بھی بہت اچھا لگا لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ہر ہیروئن کو اتنا خوب صورت کیوں دکھاتے ہیں۔ کیا وہ لڑکیاں محبت نہیں کر سکتیں جو خوب صورت چہرہ نہیں رکھتیں مگر خوب صورت دل تو رکھتی ہیں نا۔ "ماہ تمام" بہت اچھا جا رہا ہے'

شفا بے چاری تو بے ضرر سی لڑکی ہے، پتا نہیں سماہر کے دل سے اس کے لیے نفرت کب ختم ہوگی۔ "روشن حرف وہ سارے" میں نصیر الدین نصیر کی غزل اتنی پیاری لگی کہ حد نہیں اور "میری خامشی کو بیان ملے" پڑھ کر فوراً ثوبیہ کے لیے دعا کی۔

ج۔ پیاری کائنات! پہلی بات تو یہ کہ ہمارے ہاں شائع ہونے والی تحریروں میں ساری لڑکیاں خوب صورت نہیں ہوتیں۔ بہت سی عام شکل کی ہوتی ہیں اور یہ بالکل ضروری نہیں کہ خوب صورت لڑکیوں سے ہی محبت کی جائے جو لوگ خوب صورت دل رکھتے ہیں اکثر محبت انہیں ہی ملتی ہے، وہ لوگ جو اچھے دل کے نہیں ہوتے ان کے خوب صورت چہروں سے ہم وقتی طور پر متاثر ہو سکتے ہیں انہیں پسند کر سکتے ہیں لیکن محبت نہیں کر سکتے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

نخبہ اکرم گاؤں گولیکی۔۔۔ ضلع گجرات

میں خواتین، شعاع کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ میری تربیت میں شعاع اور خواتین کا بڑا حصہ ہے اس نے مجھے بہت کچھ سکھایا، میں اتنی سمجھ دار تو نہ تھی جتنا مجھے اس رسالہ نے بنادیا۔ میرے گھر میں میری بڑی آپی سعدیہ اور بڑے بھائی وسیم رضا بھی ڈائجسٹ پڑھتے ہیں آپی اور بھائی کی اکثر لڑائی ہو جاتی تھی فرحت اشتیاق کے ناول "متاع جاں ہے تو" پہلے پڑھنے کے لیے

پیاری نخبہ! آپ نے ہمیں خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ خواتین ڈائجسٹ اتنے عرصہ سے پڑھ رہی ہیں تو خط لکھنے میں اتنی تاخیر کیوں؟

فرحت اشتیاق کو آپ جلد ہی پڑھ سکیں گی۔

سدرہ شہزادی خان۔۔۔ ڈیرہ پٹھاناں والہ ہرنپور

خواتین ڈائجسٹ اس دور کا بہترین ادبی شمارہ ہے۔ کرن کرن روشنی میں چھوٹی چھوٹی باتیں جن کا خیال ہم نہیں رکھتے۔ کتنی بڑی غلطیاں اور گناہ کبیرہ بن جاتی ہیں، پڑھ بے اختیار اپنی ان غلطیوں کی معافی مانگی۔ "جور کے تو کوہ گراں تھے ہم" کہانی بہت سستی کا شکار ہے کچھ تیزی لائیں۔ ناولٹ میری پیاس پرانا موضوع تھا، لیکن اچھی کاوش تھی۔ افسانے بھی بس ٹھیک تھے۔ "بن مانگی دعا" پہلی قسط ہی سے شاندار اور جاندار ہے۔ مکمل ناول دونوں ٹھیک تھے۔ زیادہ پسند کوئی نہیں آیا۔

میرا پسندیدہ ترین ناولٹ ماہ تمام ایک بار پھر بازی لے گیا۔ شفا اور تقی کی جوڑی خوب بنے گی، مگر آمنہ جی اس بار تقی کچھ سنجیدہ سا پیچ لیے ہوئے تھا۔ اس کو چلبلا رہنے دیجیے پلیز۔ ایک گزارش اور پلیز زیادہ لکھا کریں۔ ابھی کہانی میں ڈوبے ہی تھے کہ کہانی ختم یہ تو ناانصافی ہے۔

مستقل سلسلے بہت ہی اچھے تھے۔ خبریں وبریں اچھا تھا۔ روشن حرف وہ سارے میں علامہ اقبال کی غزل پڑھ کر اچھا لگا۔ کوئٹہ مرکز کی اداکارہ شائستہ صنم کا انٹرویو بھی شامل کریں۔

ج۔ پیاری سدرہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

فرزانہ رانی۔۔۔ گجرات

مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ کہاں سے شروع کروں۔ اپنا ساتھ خواتین کے ساتھ یا اب اپنی بچیوں کا ساتھ جو خواتین سے جڑ گیا ہے۔ اس ماہ جب میری بیٹی نے کہا کہ ماما رسالہ کب آنا ہے تو مجھے اپنا وہ وقت یاد آگیا جب میں نے خواتین پڑھنا شروع کیا تھا۔ میں ساتویں میں تھی اور کوئی مجھے رسالہ خرید کر نہیں دیتا تھا اور میں گلی میں جو روڑھی والا سوکھی روٹیاں لینے آتا تھا اس سے خرید کر پڑھتی تھی۔ شادی کے بعد میں نے باقاعدہ منگوانا شروع کیا اور چودہ سالوں میں ایک بھی ماہ ناغہ نہیں کیا اور نہ کوئی شمارہ ضائع کیا۔ سب اپنے پاس سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں، میں نے اپنی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو خواتین کی کہانیاں پڑھ کر سنوارا ہے اور ماشاء اللہ ایک مثالی زندگی گزار رہی ہوں۔

اس ماہ کا رسالہ پڑھا۔ تمام کہانیاں اور سلسلے اچھے لگے۔ سب سے زیادہ "ماہ تمام" اور "بن مانگی دعا" اچھے لگے اور افسانوں میں عظمیٰ افتخار کا "گانٹھ" بہت سبق آموز تھا۔ عنیزہ سید کا "جور کے تو کوہ گراں تھے ہم" بہت اچھا مگر سلو جارہا ہے۔ ماہ نور کو جلدی جلدی سعد سے ملوادیں۔

سدرہ جی کا "میری پیاس" بھی اچھا ہے۔ "ماہ تمام" کے لیے آمنہ جی کو مبارک باد پیش کرتی ہوں جنہوں نے اتنا اچھا ناول لکھا۔

"کرن کرن روشنی" بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اسے پڑھ کر ایمان میں تازگی بھر جاتی ہے۔

ج۔ پیاری فرزانہ! ایک طویل عرصہ کے بعد آپ کا خط ملا، بہت خوشی ہوئی۔ ہمیں وہ وقت بھی یاد ہے جب آپ ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے خط لکھ کر تبصرہ کرتی تھیں۔ خواتین ڈائجسٹ کے سلسلوں میں آپ ضرور حصہ لیں۔ اپنا انتخاب خط کے لفافے میں ہی بھجوادیں۔ علیحدہ لفافے کی ضرورت نہیں۔

شبانہ کوثر، مصباح، رومانہ، یاسمین۔۔۔ نور جمال شمالی

ٹائٹل اچھا لگا۔ سب سے پہلے "میری خامشی کو بیاں ملے" میں ثوبیہ صفدر کے بارے میں پڑھ کے بہت دکھ ہوا۔ اللہ ثوبیہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں۔ آمین۔

"جور کے تو کوہ گراں تھے ہم" عنیزہ جی بہت خوب صورتی سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ میرا ایک اندازہ تو درست ہوگیا کہ کھاری فلزا ظہور کا بیٹا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ انکشاف بھی ہوا کہ سعد کا بھائی بھی ہے کھاری۔ "بن مانگی دعا" جوں جوں آگے بڑھ رہا ہے مزید اچھا ہوتا جارہا ہے۔ ویل ڈن عفت جی۔ "ماہ تمام" میں شفا اور تقی کے نکاح کا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سماہر کی بے حسی پر بہت غصہ آتا ہے، دکھ بھی ہوتا ہے۔ اس ماہ کے شمارے میں میمونہ صدف کی تحریر "سحر عترت" بہت ہی زبردست تحریر رہی۔ ٹاپ پہ رہی یہ تحریر "سحر عترت"۔ اور دوسرے نمبر پہ "ہمیں اس کا یقین ہے" نازیہ جمال کی تحریر یہ بھی بہت شاندار رہی۔ حالات جیسے بھی ہوں اللہ پر یقین رکھنا چاہیے۔ "کاملیت پسند" بھی اچھی تحریر رہی۔ "گانٹھ" بھی زبردست تحریر رہی۔ حنا بٹ کا افسانہ "تنقید" بھی اچھا لگا۔ خاتون کی ڈائری سے حبیبہ صفدر کی انتخاب کردہ منیر نیازی کی غزل بہت پسند آئی۔ مس غزالہ، مصباح، رخسانہ، مس سعدیہ، تبسم، سعدیہ نورین، ردا، زینت، امرینہ، سمیرا، عاطفہ، عظمیٰ، بینش، ثمرین بینش، ریحانہ سب ٹیچرز کو سلام اور ڈھیر ساری دعائیں۔

ج۔ شبانہ، مصباح اور رومانہ! آپ کی خصوصی فرمائش پر آپ کی استادوں کے نام شامل ہیں۔ لیکن یہ سلسلہ آپ کی آرا کے لیے ہے۔ اس لیے ہم درخواست کریں گے کہ کوئی اور بہن ہم سے اس طرح کی فرمائش نہ کریں خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شفق راجپوت۔۔۔ گوجرہ

سب سے پہلے میں نے اپنا موسٹ فیورٹ "جور کے تو کوہ گراں تھے ہم" پڑھا زبردست۔ لوجی! میں سمجھتی تھی سعد کی ماں "رابعہ" ہے، مگر یہ تو نیا انکشاف ہوا اس بار۔ اس ایک کہانی کو پڑھ کے میں بہت دن کچھ اور نہیں پڑھ پاتی۔ ایسا جکڑتے ہیں اس کے لفظ اپنے سحر میں۔

ج۔ پیاری شفق! خط لکھنے کا شکریہ۔ امتحان سے فارغ ہو کر تفصیلی تبصرہ کیجیے گا۔ منتظر ہیں۔

خدیجہ عطا، مریم عطا، رقیہ عطا، نبیلہ عثمان۔۔۔ منگروٹھہ شرقی

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، خواتین سے دوستی

کرلی۔ یوں ہماری اصلاح میں بڑا ہاتھ خواتین کا بھی ہے۔ پورا مہینہ بڑی بے صبری سے ہم سب اس کا انتظار کرتی ہیں، لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم دیہات میں رہتے ہیں۔ اس لیے یہ پندرہ سے پہلے تو نہیں ملتا خط کیسے لکھیں۔ خیر آتے ہیں اس ماہ کی تحریروں طرف۔ جوں ہی شمارہ ہاتھ میں آیا فوراً "اپنی فیورٹ کہانی "جور کے تو کوہ گراں تھے ہم" پڑھی اس بار بہت سی گرہیں کھلی ہیں۔ اس کے علاوہ ناول "ہمیں اس کا یقین ہے" کا پلاٹ پرانا تھا یعنی روایتی جیسے دوسری مصنفین لکھتی ہیں اس لیے پسند نہ آیا۔ اس ماہ جو ناول نمبر لے گیا وہ تھا "سحر عترت" ویل ڈن میمونہ صدف اتنی اچھی تحریر کے لیے اور منفرد موضوع کے لیے بے شک خدا پر مکمل یقین سے ہی ہم مشکلات سے نجات پاسکتے ہیں۔ ہماری آپ سے درخواست ہے پلیز پلیز جادو کے موضوع پر قرآنی آیات، احکام الٰہی اور احادیث مبارک کو سلسلہ "کرن کرن روشنی" میں تفصیل سے بیان کریں۔ افسانوں میں سب سے اچھا افسانہ "گانٹھ" اور "تنقید لگا۔

ج۔ خدیجہ، مریم، رضیہ اور نبیلہ! ہمیں احساس ہے کہ پرچا آپ کو دیر سے ملتا ہے۔ آپ ہمیں دوسرے سلسلوں کے لیے انتخاب بھجوادیں وہ ہم آئندہ ماہ شامل کرسکتے ہیں خطوط کے لیے اگر آپ اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتی ہیں تو میسج کرسکتی ہیں اگر آپ کے پاس سیل فون ہے تو ہمیں اپنی رائے میسج کرکے بتا دیں نمبر یہ ہے۔

0345-2852056

نام نہیں لکھا۔۔۔ کراچی

خط لکھنے کی وجہ ہے "سحر عترت" بہت بہت شاندار ناول تھا ایسے ناول ہر ماہ رسالے میں ہونے چاہئیں۔ "سحر عترت" نے ہمارے دل میں اللہ پر توکل اور یقین پختہ کیا ہے۔

"بن مانگی دعا" میں اب آہستہ آہستہ رازوں سے پردہ اٹھ رہا ہے۔ لو اس ناول میں دلچسپی اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ہمیں اس کا یقین ہے اچھا ناول تھا۔ "ماہ تمام" اب اچھے موڑ پر آیا ہے، ساحر کی بازی اسی پر الٹ پڑ گئی۔

"میری خامشی کو بیاں ملے" میں ثوبیہ صفدر کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس کی باتوں میں اس کا شوخ چنچل اور پیارا سا روپ ہمیں نظر آرہا تھا، مگر یہ کیا ہوا۔ اتنی اذیت بھری موت پہلے تو مجھے یقین ہی نہ ہوا کہ ثوبیہ کے ساتھ ایسا دکھ بھرا واقعہ ہوا ہے۔ میری بیاض سے میں مجھے ارم احمد کا شعر بہت پسند آیا ہے۔ اس دفعہ ٹائٹل بہت پسند آیا ہے۔

ایک کہانی کا پتا کروانا ہے۔ کہانی کے کردار تیمور عزی اور عائشہ تیمور کے بھتیجا، بھتیجی آغا جان جو ہیروئن کی شادی تیمور سے کرواتے ہیں، تیمور کی منگیتر اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس بھاگ جاتی ہے۔ جس کی پہلے سے بیٹی ہوتی ہے۔ جو ہیروئن ہے تیمور کی منگیتر اور اس کے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے تو ان کی بیٹی آغا جان کو ملتی ہے، ہیروئن کے چچا اس کی جان کے دشمن ہوتے ہیں، وہ چاہتے کہ ہیں کہ ان کے بھائی کی جائیداد اسے ملے۔ اس کی جان کو خطرہ ہوتا ہے تو آغا جان تیمور سے ہیروئن کی شادی کروادیتے ہیں۔ تیمور انتقاماً" نکاح کرلیتا ہے اور اسے دوسرے شہر اپنے گھر دوست کی بہن کے نام سے تعارف کرواتا ہے۔ اگر قارئین میں سے کسی کو پتا ہو تو اس ناول کا نام بتادیں۔ پچھلے دس سالوں سے میں اس کہانی کی تلاش میں ہوں، مگر مجھے اس کا نام نہیں پتا چل سکا۔

ج۔ پیاری بہن! آپ نے خط شائع کرانے کے لیے اتنا اصرار کیا ہے۔ کہانی کے بارے میں پوچھا ہے۔ جس کی آپ کو پچھلے آٹھ سال سے تلاش ہے، لیکن ایک بہت بڑی غلطی بھی کرگئی ہیں۔ اپنا نام نہیں لکھا۔ آپ کے شدید اصرار پر آپ کا خط شائع کررہے ہیں۔

کسی بہن کو یہ کہانی یاد ہو تو ہمیں خط لکھ کر یا فون کرکے بتادیں۔

خنسا، محی الدین لوہاراں والا کھوہ

میں فورتھ کلاس میں تھی جب سے میں نے خواتین ڈائجسٹ کو پڑھنا شروع کیا اور اب ماشاء اللہ سے II FSC میں ہوں۔ خواتین کے تمام ناولز بہت ہی اچھے ہیں۔ خواتین کی تمام رائٹرز ہی بہت زبردست لکھتی ہیں کہ کوئی جواب ہی نہیں۔ آپی سدرہ سحر عمران آپ کوئی اچھے سے ناول کے ساتھ واپس آئیں۔۔۔۔ آپی مجھے آپ سے ملنے کی شدید خواہش ہے اور میں نے ایک تجویز دی تھی کہ ٹائٹل ہوتا تو زبردست ہے، لیکن بعض گھرانوں میں اپنی تصویروں کی بنا پر اسے بے ہودہ خیال کیا جاتا ہے۔۔۔۔ پلیز اگر ہو سکے تو ضرور غور کیجیے گا اور نایاب جیلانی آپ بھی کہاں چھپی بیٹھی ہیں۔

ج۔ پیاری خنساء! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ نایاب جیلانی آپ کے لیے ناول لکھ رہی ہیں۔ آپ جلد ہی ان کی تحریر پڑھ سکیں گی۔ اتنی طویل مدت بعد خط لکھا اور اتنا مختصر۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

اقراء M ۔۔۔۔ گوجرانوالہ

نگہت سیما کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی اور ان کی تحریر "زمین کے آنسو" بہت ہی اچھی تھی، لیکن ایک بات نے مایوس کیا کہ احمد رضا کو اس کے ماں باپ سے ملایا نہیں۔ خیر مجھے نثار حسن عائشہ خان اور انیقہ انا کے خط اور کہانیوں پر تبصرہ بہت اچھا لگتا ہے۔ "بن مانگی دعا" پہلی قسط سے اچھا لگا اور میرا خیال ہے کہ ابیہا معیز کی بیوی کی حیثیت رکھتی ہے۔ میمونہ صدف نے جس موضوع کو اجاگر کیا ہے یہ واقعی ہمارے معاشرے کا حصہ ہے، نازیہ جمال کی تحریر بھی اچھی تھی، لیکن مجھے ایمل پر غصہ آیا جو اتنی آسانی سے اپنی تنخواہ اپنی بھابھی کے ہاتھ میں رکھ دیتی ہے۔ باقی کہانی اچھی تھی۔ خواتین بھائی تو لاکر نہیں دیتا، لیکن چھوٹے (کام کرنے والے) کو کہتی ہوں تو وہ اچھا باجی کہہ کر لادیتا ہے اور وہ بھی پاپا سے چھپا کر اپنی قمیص میں پھر سوچتی ہوں کہ یہی خوب صورتی ہے چھپا کر پڑھنے میں بھی اپنا مزہ ہے سردیوں میں لحاف میں چھپا کر اور گرمیوں میں چھت پر ٹارچ جلا کر میری کافی ساری بہنیں مجھ سے متفق ہوں گی۔

ج۔ پیاری اقراء! چھپا کر پڑھنے میں بھی آپ کو مزہ آتا ہے تو بہت اچھی ہے یہ حالات سے سمجھوتے کی ایک اچھی مثال ہے جو لوگ حالات سے سمجھوتا کرلیتے ہیں وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی میں آسانیاں اور خوشیاں دے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رداجی۔۔۔ جام پور

اس ماہ کے شمارے میں "کرن کرن روشنی" ان کے دیکھے سے جو ثنا مرزا سے ملاقات، رنگا رنگ سلسلہ، میری بیاض سے، خاتون کی ڈائری، فارس صاحب کا انٹرویو، خبریں وریں، روشن حرف وہ سارے، ہمارے نام سب پسند آیا۔ "میری خامشی کو بیاں ملے" میں ثوبیہ صفدر کے بارے میں پڑھ کر آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ زندگی کی بے ثباتی کا شدت سے احساس ہوا۔ خواتین ڈائجسٹ میں کچھ بھی ایسا نہیں جو مجھے پسند نہ ہو، لیکن "میری بیاض سے" اور "ہمارے نام" مجھے بہت پسند ہے۔ "ہمارے نام" میں قارئین کے تنقیدی، طنزیہ اور تعریف سے بھرے خطوط کے جو آپ کھٹے میٹھے جوابات دیتی ہیں انہیں پڑھ کر بے حد لطف آتا ہے اور "میری بیاض سے" میں قارئین کے منتخب کردہ مصروں وغیرہ معروف شعراء کے شعروں سے شعری سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوتا ہے۔

ج۔ رداجی! آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ صرف خواتین کے سلسلوں پر تبصرہ کیا ہے آپ نے۔ آپ کی یہ انفرادیت ہمیں اچھی لگی، لیکن ہم دیگر تحریروں کے بارے میں بھی آپ کی رائے جاننا چاہیں گے۔ آئندہ تفصیلی تبصرہ کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

☼

سرورق کی شخصیت

میک اپ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ موسیٰ رضا

من کے موتی کی دکھیاری ماں

یاسرہ رضوی سے ملاقات

شاہین رشید

شوبز کی فیلڈ میں دراصل وہی باصلاحیت فنکار ہے جو گلیمر اور مرکزیت کو بالائے طاق رکھ کر ہر وہ کردار کرے جو پرفارمنس سے بھرپور ہو۔ یہ نہ دیکھے کہ یہ کردار اس کی عمر سے بڑا ہے یا چھوٹا۔ اس کردار میں وہ کتنی خوب صورت لگ سکتی ہے اور "یاسرہ رضوی" اس بات کی بالکل پروا نہیں کرتیں کہ وہ اسکرین پہ کیسی لگیں گی۔ انہیں تو بس یہ خیال رہتا ہے کہ مجھے پرفارم کیسے کرنا ہے اور حقیقت کا رنگ کیسے بھرنا ہے۔

یاسرہ رضوی کو آج کل آپ "من کے موتی" اور "مجازی خدا" میں دیکھ رہے ہیں۔ دونوں ڈراموں میں ان کے کردار بہت مختلف ہیں۔ ایک مشرقی عورت اور دوسری مغربی عورت ـــــ اور مزید کیا کیا کرنے کی خواہش ہے۔ اس کے لیے آپ ان کا انٹرویو پڑھیں۔

"کیسی ہیں یاسرہ ـــــ آپ کا نام بہت یونیک سا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، بس شوٹ میں مصروف تھی اور میرے نام کا مطلب مددگار کے ہیں اور میری زندگی واقعی دوسروں کی مدد کرتے ہی گزری ہے۔ اپنے لیے تو میں بہت کم جی ہوں۔"

"آج کل آپ کے دو سیریلز "من کے موتی" اور مجازی خدا" چل رہے ہیں۔ دونوں میں آپ کے کردار بہت مختلف ہیں۔ آپ کو کون سا کردار پرفارم کرنا اچھا لگ رہا ہے؟"

"مجھے دونوں میں پرفارم کرنا اچھا لگ رہا ہے۔ "مجازی خدا" میں کام کر کے مجھے زیادہ اچھا لگ رہا ہے اور میں بہت خوش بھی ہوں کیونکہ وہ سو فیصد ایک مختلف کردار ہے اور یہ انڈر اسٹینڈ کرنا بہت ضروری ہے کہ ایک فنکار کی بہ ذات خود اپنی کوئی شخصیت نہیں ہے، اس وقت جب وہ سیٹ پر ہوتا ہے۔ ایک کردار کو اس کے مکمل لوازمات کے ساتھ پورا کرنا ایک فنکار کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ لہٰذا کردار بھی اسی خوشی سے کروں گی، جتنا "من کے موتی" میں دکھیاری ماں کا کر رہی ہوں۔"

"دکھیاری ماں کچھ زیادہ دکھیاری نہیں ہو گئی؟ اور پھر دلچسپ بات کہ گود کی بچی کبھی چھ ماہ کی دکھا دی جاتی ہے اور کبھی ایسی جیسے ابھی پیدا ہوئی ہے؟"

"بس کیا کر سکتے ہیں۔ وہ ایک کردار ہے۔ جیسی کہانی ہو گی، اسی طرح پرفارم کرنا ہو گا اور بچی کبھی چھوٹی اور کبھی بڑی ہو جاتی ہے والا سوال آپ کو ڈائریکٹر سے کرنا پڑے گا ہم ایک دن میں اتنے سین کر رہے ہوتے ہیں کہ ہر چیز پہ ہماری نظر نہیں جا رہی ہوتی۔ کبھی کبھی وہی بچہ دستیاب نہیں ہو پاتا۔"

"حقیقت میں آپ کیسی ہیں۔ "من کے موتی" کی طرح سمپل یا مجازی خدا، کی طرح ماڈرن یا وراثت" کی طرح تھوڑی سی چالاک مکار؟"

قہقہہ "چالاک و مکار تو میں بالکل بھی نہیں ہوں چالاکی اگر آتی ہوتی تو زندگی تھوڑی آسان ہو جاتی۔ البتہ میں سمپل بھی ہوں اور میں نے چونکہ امریکا سے اور انگلینڈ سے تعلیم حاصل کی ہے تو میں تھوڑی ماڈرن بھی ہوں۔ میرے والدین نے مجھے ہیومن ریسورس مینجمنٹ کے لیے مشی گن یونیورسٹی امریکا



بھیجا، پھر ابلاغ عامہ کی ڈگری کے لیے برطانیہ بھیجا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں پاکستان آگئی۔ ویسے پاکستان میں ہی میرا بچپن اور میرا سب وقت گزرا۔ اس لیے میری شخصیت اور مغرب کا مکسچر ہے۔ اس طرح میرے اندر بہت سے کردار بستے ہیں۔"

"مجازی خدا" میں آپ بڑی مہارت سے سگریٹ پی رہی ہوتی ہیں تو کیا عادت ہے آپ کو؟"

"اس کے لیے میرے خیال سے عادت ہونا ضروری نہیں ہے۔ میرے والد صاحب چین اسموکر ہیں۔ میں انہیں بچپن سے دیکھتی چلی آ رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ سگریٹ کس طرح پی جاتی ہے۔"

"یاسرہ! آپ نے باہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی تو پھر باہر رہنے کو ترجیح کیوں نہیں دی۔ پاکستان واپس کیوں آگئیں؟"

"اس لیے کہ میرا گزارا نہیں ہے اپنے ملک سے باہر۔ میں پاکستان سے باہر نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ میں بنیادی طور پر ایک رائٹر ہوں اور میں نے تھیٹر کے لیے بحیثیت رائٹر اور ڈائریکٹر اپنا کام شروع کیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ آرٹ کی کوئی باؤنڈریز نہیں ہوتیں لیکن جو آرٹ الفاظ سے جڑا ہوتا ہے۔ اس کی باؤنڈری لینگوئج ہوتی ہے۔ چونکہ میں اردو میں ہی لکھنا پسند کرتی ہوں۔ اردو میں ہی اداکاری کرتی ہوں تو میرے لیے پاکستان سے بہترین کوئی جگہ نہیں ہے اور پھر مجھے جو انسپائریشن ملتی ہے، وہ اپنی ہی کہانیوں اور اپنے ہی کرداروں سے ملتی ہے۔"

"تھیٹر کے لیے لکھا بھی اور ڈائریکٹ بھی کیا۔ ٹی وی کے لیے کچھ لکھنے اور ڈائریکٹ کرنے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں۔ میں فلم لکھوں گی بھی اور ڈائریکٹ بھی کروں گی۔ ٹی وی پہ تو بس اداکاری ہی کروں گی۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے اور میں بہت انجوائے بھی کر رہی ہوں۔ چونکہ ٹی وی کے لیے کافی مصروفیات ہیں تو فی الحال ٹی وی کے لیے کچھ اور کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔"

"آپ نے کہا کہ آپ کے اندر ہر لڑکی اور ہر رول چھپا ہوا ہے مگر خود سے کیا دل چاہتا ہے کہ کیا پرفارم کروں؟"

"جب سے میں نے ٹی وی پہ کام شروع کیا ہے، تب سے میری تو کوئی آرزو ہی نہیں رہی ہے۔ اپنے دو سالہ کیریر میں میں نے بہت اچھا وقت گزارا ہے کیونکہ مجھے بہت زیادہ ورائٹی آفرز ہوئی ہیں۔ میں نے ماڈرن ماں کا رول بھی کیا ہے، جو تعلیم یافتہ بھی ہے اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے اور ایسی ماں کا رول بھی کیا ہے جو تکلیف میں گھری ہوئی ہے اور جس کے پاس خرچ کرنے کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں۔ پھر وراثت میں ایک زمیندارنی کا کردار بھی ہے اور ایک فلمساز کا کردار بھی کیا ہے۔ تو ایسی کوئی خواہش نہیں ہے کہ یہ کردار ملے یا وہ ملے۔"

"ڈرامہ سائن کرتے وقت کیا دیکھتی ہیں۔ اسکرپٹ، رائٹر، ڈائریکٹر یا کاسٹ؟"

"میں پہلے اسکرپٹ دیکھتی ہوں، پھر اپنا کردار دیکھتی ہوں اور میں نے تو ابھی تک بہت کم لیڈنگ رول کیے ہیں۔ مجازی خدا میں بھی میرا لیڈنگ رول نہیں ہے بلکہ سپورٹنگ رول ہے مگر مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے کردار کرنا ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ لیڈ والے کو بہت کام کرنا پڑتا ہے اس کے سین زیادہ ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ محنت ہوتی ہے جو کہ مشکل کام ہے تو میں کوشش کرتی ہوں کہ میرا کردار سپورٹنگ ہی ہو۔"

"دیگر کیا مصروفیات ہیں آپ کی اور تھیٹر کیسا چل رہا ہے؟"

"مجازی خدا ابھی مکمل کروایا ہے۔ نیا سیریل "چنگاری" کچھ ہی ماہ میں آن ایر ہو جائے گا۔ "من کے موتی" کے ختم ہونے کے بعد میں نے دو تین ماہ کا بریک لیا تھا اور اب جس وقت آپ سے بات کر رہی ہوں میں "ملکہ عالیہ" کے سیٹ پر ہوں اور یہ 2014ء میں آن ایر آئیں گے۔ تھیٹر فی الحال چھوڑا ہوا ہے کیونکہ دو سال سے میں نے اپنا میڈیم چینج کیا ہوا ہے۔ ٹی وی بہت زیادہ ٹائم مانگتا ہے ٹی وی کے ساتھ کسی اور میڈیم کو ٹائم دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"کس رول کو اپنے لیے یادگار کہیں گی۔ کس ڈرامے میں اپنا رول مشکل لگا اور کس رول کو پرفارم کرنا مشکل لگا؟"

"میں نے ابھی ہم ٹی وی کے لیے ایک ٹیلی فلم کی ہے جس کا نام "مٹی کی گڑیا" اس میں میں نے گوٹھ (گاؤں) میں کھلونے بیچنے والی کا کردار کیا ہے، جس کو کتا کاٹ لیتا ہے اور میڈیکل کی سہولت نہ ہونے پر اس کو ایک بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ شہود علوی ہیں۔ اس کردار کے لیے مجھے بہت زیادہ ریسرچ کرنی پڑی۔ باقی تو سب ٹھیک رہا۔"

"گاؤں میں کئی لوگوں سے ملیں۔ کیسا لگا؟"

"ملنا کیا جی...... ہر سین پر گوٹھ کے لوگ گھیرا بنا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور یوں سمجھیں کہ میرے تھیٹر اور ٹی وی کا اکٹھا تجربہ ہو گیا کہ سین کے اینڈ پہ تالیاں بجانا اور داد دینا اور یہ ایک ایسی ریکارڈنگ تھی جو اوڈینس کے ساتھ کروانی پڑی۔"

"بہتر کیا لگتا ہے آپ کو سوپ سیریل یا پھر ٹیلی فلم؟"

"مجھے ٹیلی فلم زیادہ پسند ہے کیونکہ ایک سٹنگ میں ایک مکمل ڈرامہ آپ دیکھ لیتے ہیں۔ آج کل کا جو ٹرینڈ ہے۔ لوگوں کی جو زندگی ہے اور جتنی افراتفری ہے تو ایک نشست والا ڈرامہ ہی بہتر رہتا ہے اور میں رائٹر بھی نوے منٹس کی ہی ہوں۔ اس لیے مجھے ٹیلی فلم ہی اچھی لگتی ہے۔ جو لوگ ریگولر ٹی وی دیکھتے ہیں انہیں سوپ اچھے لگتے ہیں۔ دیکھنے کے حساب سے لوگوں کے مختلف مزاج ہیں۔"

"ہر طرح کے رول کرنے کی صلاحیت ہے آپ میں رومانٹک رول ملیں تو؟"

"میں رومانٹک رول میں تھوڑا شرما جاتی ہوں۔ تھوڑی ان ایزی ہو جاتی ہوں، کیونکہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ رومانس کیسے کرنا ہے۔ لیکن کر لیتی ہوں۔ جتنی ڈیمانڈ ہوتی ہے یا جتنا ہمارے ٹی وی کے لیے ریکوائرڈ ہوتا ہے اتنا تو کر ہی لیتی ہوں۔ عام طور پر میں ری ٹیکس نہیں دیتی لیکن رومانٹک رول میں ری ٹیکس ہو جاتے ہیں کیونکہ مجھے ہنسی آجاتی ہے۔"

"شوبز میں آمد کیسے ہوئی تھی اور امید تھی کامیابی کی؟"

"آمد اس طرح ہوئی کہ جب میں کراچی آئی تو میری دوست کا چھوٹا بھائی "اے اینڈ بی" پروڈکشن میں کام کر رہا تھا اور میں سمجھتی ہوں کہ مجھے کام کرنے کے مواقع دینے کا سہرا بھی انہی کے سر جاتا ہے۔ میری دوست کے چھوٹے بھائی نے میرا ذکر کیا۔ میرا پورٹ فولیو جو انٹرنیٹ پہ تھا، وہ دکھایا۔ انہیں پسند آیا اور انہوں نے مجھے ایک کردار کے لیے بلا لیا اور ایک کردار کے بعد پھر مجھے ایک کے بعد ایک کی آفرز آنی شروع ہو گئیں۔"

"آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ فلم لکھیں گی بھی اور ڈائریکٹ بھی کریں گی فلم ... تو کام نہیں کریں گی کیا؟"

"اصل میں میں کیمرے کے پیچھے کام کرنے میں دلچسپی رکھتی ہوں، اداکاری کا پورا فریم دیکھنا چاہتی ہوں میوزک کرنا چاہتی ہوں۔ اس کا ساؤنڈ دیکھنا چاہتی ہوں پورے سین اپنے سامنے ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کی نوک پلک سنوارنا چاہتی ہوں۔"

"اتنے ڈرامے بن رہے ہیں، کیا لوگوں پر ان کا اثر ہوتا ہے اور آج کل کے ڈراموں سے کیا آپ مطمئن ہیں؟"

"اثر ہوتا ہے یا نہیں اور ان کے ذریعے سے انقلاب آسکتا ہے یا نہیں، اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ لوگ اب بہت مختلف طریقے سے سوچتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ دور بہت بدل گیا ہے۔ لوگ فلم اور ٹی وی کی طرف تفریح کے لیے جانا چاہتے ہیں فلم اور ٹی وی کے ذریعے انقلاب لانا مشکل ہے اب لوگوں کے اردگرد اتنے مسائل ہو گئے ہیں کہ ___ ٹیلی وژن لوگوں کے لیے محض فینٹسی بن گیا ہے۔ اب لوگ ٹی وی ڈراموں میں مسائل دیکھتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ ہاں لیکن خواتین کے مسائل کا تو ٹرینڈ تو ابھی بھی ہے اور "من کے موتی" اس لیے پاپولر ہوا کہ اس میں ہر عورت کو اپنی کہانی نظر آتی ہے۔"



"اس قسم کے ڈرامے زیادہ پاپولر کیوں ہوتے ہیں؟"

"کتھارسس کی وجہ سے۔ کیونکہ جب عورت کسی کردار کے ساتھ رو پڑتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ جو آنسو وہ ویسے نہیں نکال سکتی، وہ اس وقت نکال لیتی ہے اور اس وقت اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ اعتراض بھی نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ڈرامے پہ رو رہی ہے جبکہ در حقیقت وہ اپنے دکھوں پر رو رہی ہوتی ہے اور اسی لیے اس طرح کے ڈرامے خواتین میں مشہور ہو جاتے ہیں۔"

"اب آپ اپنا کچھ فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟"

"فیملی بیک گراؤنڈ کچھ یوں ہے کہ میرے والدین صحافی ہیں۔ والد کا نام سید ابرار علی رضوی اور والدہ شہناز چھتاری۔ بڑا بھائی بھی صحافی ہے کاشف رضوی اس کا نام ہے اور چھوٹا بھائی فوٹوگرافر ہے۔ اس کا میری ہی فیلڈ سے تعلق ہے۔ میں اسلام آباد میں 15 نومبر 1982ء کو پیدا ہوئی۔"

"شادی ___ آپ بھی یہ کہیں گی جو کام سب کر

رہے ہیں میں کیوں کروں؟"

"میں اسے ضروری نہیں سمجھتی۔ جو لوگ شادی کرتے ہیں' ان کی اپنی کئی وجوہات ہوتی ہوں گی۔ میرے پاس کوئی وجہ ہی نہیں ہے شادی کرنے کی۔ میری زندگی ماشاء اللہ بہت بھرپور گزر رہی ہے۔ میرے اردگرد بہت سے لوگ ہیں جنہیں میری ضرورت ہے اور میں کچھ کام کرنا چاہتی ہوں۔ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کو بہت "فوکس" چاہیے ہوتا ہے مثلاً" میں پاکستان فلم انڈسٹری کے بارے میں بہت سیریس ہوں اور اپنے بھائی کو Cine فوٹوگرافی کرانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اس انڈسٹری کے لیے کچھ کرے۔ میرا ایک کزن ساؤنڈ پڑھنے باہر جارہا ہے اور ہم بہت جلد اپنی ایک ٹیم بنائیں گے اور اس انڈسٹری کے لیے ان شاء اللہ بہت کام کریں گے۔ فلم کا جو دائرہ ہے۔ وہ بہت بڑا ہے۔ فلم ہمارے ملک میں بہت سے روزگار کے مواقع فراہم کرسکتی ہے اور ہمارے نظریات کو ملک سے باہر بہت بہتر طریقے سے پہنچا سکتی ہے۔ مجھے بہت کام کرنے ہیں۔ اگر میں شادی کروں گی تو اس بندے کو ٹائم نہیں دے پاؤں گی تو پھر کیوں اس کی زندگی خراب کروں۔"

"امور خانہ داری سے کتنا لگاؤ ہے؟"

"میں ہر کام کرلیتی ہوں۔ جھاڑو' پونچھا' دھونا' چائے' ہانڈی روٹی۔ سب کام کرلیتی ہوں اور یہ سب کام میری ماں نے مجھے بہت بچپن میں سکھا دیے تھے میری امی کہتی ہیں کہ خواہ مرد ہو یا عورت' اس کو یہ سارے کام آنے چاہییں میں چھ یا سات سال کی تھی تو میری امی نے مجھ سے آٹا گوندھوانا شروع کردیا تھا اور میں نے پھر روٹی بھی پکانی شروع کردی تھی۔ ہانڈی کی تیاری میں بھی امی سب کام مجھ سے کرواتی تھیں اور سکھاتی بھی تھیں۔ سو جب میں امریکا گئی تو مجھے کھانا پکانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔"

"ماشاء اللہ آپ اچھی برقرار ہیں۔ لیکن کبھی خیال آیا کہ ایک دبلی پتلی سی اداکارہ کہلواؤں؟"

قہقہہ۔۔۔ "میں نے جب سے شوبز شروع کیا ہے تب سے اب تک میں نے 45 پاؤنڈ وزن کم کیا ہے۔ اگر آپ میرا شروع کا کام نکال کر دیکھیں اور میرے فیس بک پر ہی جائیے تو آپ دیکھیں گی کہ میں نے پہلا کردار "خالہ چکلالہ" کا کیا تھا اور اس میں میرا وزن 83 کے جی تھا اور اب میرا وزن ہے 61 کے جی۔"

"اس انٹرویو کے ذریعے آپ کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"چونکہ یہ انٹرویو خواتین ڈائجسٹ میں چھپے گا تو میرا ایک پیغام اس ملک کی خواتین کے لیے ہے کہ "مجھے پتا ہے کہ کھانا پکانا' گھر سنبھالنا' بچے پالنا بہت مشکل کام ہے اس میں ٹائم بھی لگتا ہے اور یہ بہت زیادہ ذمہ داری کا کام ہے لیکن اگر انسان چاہے تو پورے دن میں سے اپنے لیے کچھ وقت ضرور نکال سکتا ہے اور اس وقت میں کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو اس ملک کا شہری سمجھتے ہوئے سوچیں کہ اور کیا ذمہ داریاں ہیں جو آپ پوری کرسکتے ہیں اس ملک کے لیے۔۔۔۔ اس پورے معاشرے میں آپ کا کیا کردار ہے۔ اس کے لیے تھوڑا وقت نکالیں۔ اگر پورے دن میں نہیں تو ہفتے میں کچھ وقت نکالیں۔ چاہے وہ محلے کے بچوں کو بلا کر محلے کی صفائی کرنا ہو' چاہے بچوں کو پڑھانے کا کام ہو۔۔۔ کوئی ایک قدم ضرور اٹھائیں۔ کوئی ایک قدم جو اس ملک کی خوب صورتی اور مفاد کے لیے ہو۔۔۔ آپ میرا سارا انٹرویو دیں نہ دیں مگر یہ پیغام ضرور دیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے یاسرہ رضوی سے اجازت چاہی۔



میری خامشی کو بیاں ملے

ادارہ

کوثر خالدہ۔۔۔ جڑانوالہ

1 ۔ میکے کا نام تھا صالحہ کوثر ولد اللہ رکھا۔ سسرالی کوثر خالدہ ہے۔ پچاسویں سالگرہ یعنی سلور جوبلی گزر چکی۔ تین سال قبل شوہر وفات پاگئے ماہ دسمبر میں۔ یوں ہمارے لیے بھی دسمبر جدائی کا ماہ ٹھہرا۔

بچپن و جوانی سنجیدہ و متین گزرا۔ زمین کے آنسو والی سمیرا کی طرح پانچویں جماعت میں ہم بھی نیلی چڑیا بنتے تھے۔ اب چھوٹے بچوں کی ٹیوشن ٹیچر ہیں۔ اللہ نے زندگی کے ہر موڑ پر کامیابی عطا کی۔

ماں' باپ غریب اور سسرال امیر تھا۔ رشتے میں شوہر ماموں لگتے تھے۔ چھٹی میں تھی جب میرا رشتہ مانگ گیا۔ نویں میں منگنی اور دسویں کے رزلٹ کے بعد ایک دن امی نہ تھیں۔ پھپھو زاد اور چچا زاد دو بہنیں تھیں کہ اچانک منگیتر صاحب وارد ہوئے۔ دونوں کزنز دوسرے کمرے میں چھپ گئیں۔ پکارتے رہے' نہ آئیں اور ہم نے تن تنہا انہیں ڈیل کیا۔ شش و پنج میں پڑ گئے۔ پہلے تو ماموں کہتے تھے اب کیا کہیں۔ پھر بنا القاب ہی مختصر گفت و شنید رزلٹ کے بارے ہوئی۔

وہ آنولہ کا تحفہ لائے تھے دے کر چلے گئے۔ ساتھ ہی ہمارا دل بھی لے گئے۔ یہ تھی پہلی ملاقات۔

2 ۔ "دوست وہ جو بے غرض محبت کرے۔" ملی دارالاطفال لاہور نزد ڈیف اسکول' میڈم نے آٹو گراف دیا تھا اور ہم اسی پر عمل پیرا ہونے کی کوشش میں لگے رہے عمر بھر۔ تمام ٹیچرز اور دوستوں کے آٹو گراف دل پر لکھے ہیں۔ ایک دشمن قسم کی سہیلی صدیقہ کا یہ آٹو گراف۔ "اللہ تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے" میرے مقصد حیات کے تعین کی گواہی کے لیے کافی ہے۔ میری زندگی کا مقصد آپ کو اس شعر سے پتا لگ جائے گا۔

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

دوستوں کی رائے میں ہم "ہرفن مولا" اور "وسیع القلب" مانے جاتے ہیں۔ دشمنوں کی رائے ہے کہ ہم ڈھنگ سچ بولتے ہیں اور بحث و تکرار کے سند یافتہ ہیں۔

ماں کہتی ہے۔ ویسے تو بڑی عالموں جیسی باتیں کرتی ہو مگر اپنے بچوں کی فکر نہیں کرتیں۔ قارئین کرام! آپ جانتے ہیں جس نے اپنا ہر کام اللہ کی ذات اقدس پر چھوڑ رکھا ہو اسے قطعاً "کوئی فکر نہیں ہوتی۔ محنت ماں سے ملی توکل باپ سے۔ امی کو ابا جی کی کم کمائی پر اعتراض ہوا کرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ابا جی نے مجھے قرآن کھول کر ایک لائن کا ترجمہ پڑھایا تھا۔ "اور تمہیں آزمایا جائے گا۔ اولاد کی کمی سے' پھلوں کی کمی رزق کی کمی سے" تب سے میں ابا جی کی ہم نوا ہوں اور رہوں گی۔

آواز اونچی اور دہشت والی ہے۔ مگر سب نہیں کہتے۔ خاص کر اجنبی لوگ جب کہتے ہیں آپ کی بولی میٹھی ہے تو مجھے حیرانی بھی ہوتی ہے۔

3 ۔ رسالوں سے واسطہ 40 سال قبل کا ہے۔ خواتین جب ملا پڑھ لیا۔ کسی بھی کہانی کی ہر اچھی بات انسپائر کرتی ہے۔

4 ۔ میں باقاعدہ سالگرہ کے اتنی خلاف ہوں' جس میں لوگوں کو بلا کر تحفے وصول کیے جاتے ہیں کہ جب میرا بیٹا عمر سال کا ہوا تو پھپھو نسرین اور تایا اسلم کی خواہش تھی کہ سالگرہ رچائیں' تو میں نے کہا کہ جب بھائی جان اسلم کے بیٹا ہوگا تو آپ ایسی سالگرہ کرلینا۔ (کی بھی تھی)

اور پھر میری بحث کے بعد فیصلہ ہوا کہ سالگرہ کرلی جائے۔ مگر صرف ہمسائیوں کے بچے بلا کر انہیں پھل اور مٹھائی وغیرہ کھلا کر۔

☼



خبریں وبیگی

صباسحر

لگی رہیں میرا

اداکارہ میرا کو خبروں میں رہنے کا فن خوب آتا ہے۔ کبھی وہ پتی ڈھونڈتی ہیں، کبھی منگنی کرتی اور توڑتی ہیں اور کبھی انگریزی بول کر وہ لوگوں کی توجہ حاصل کرتی ہیں۔ اب میرا نے شہرت حاصل کرنے کے لیے ایک نیا مشن شروع کیا ہے۔ وہ اپنی والدہ کے نام پر ایک ٹرسٹ اسپتال بنا رہی ہیں جس کی فنڈنگ کے لیے وہ پچھلے دنوں امریکا گئی ہوئی تھیں اور وہاں انہوں نے اپنے ہونے والے سسرالیوں کی مدد سے ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے اکٹھے کیے اور اسے لے کر وہ اپنے منگیتر کے ہمراہ جب پاکستان واپس پہنچیں تو مختلف سوالوں کے جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

کیپٹن نوید میرے دوست ہیں (ہائیں! منگیتر سے دوست؟) اور وہ اس وقت تک شادی نہیں کریں گی جب تک اسپتال مکمل نہ کرلیں" (یہ یقیناً" کیپٹن نوید کے والد کی فرمائش، خواہش یا حکم ہوگا فنڈنگ میں مدد کے لیے) وہ عمران خان اور ابرار الحق کی طرح کا ایک اسپتال بنانا چاہتی ہیں۔ (لگی رہیں میرا)

وینا ملک کی شادی

وینا ملک نے شادی کرلی ہے (ہے ناں حیرانی کی بات) اسد بشیر خٹک، وینا ملک کے ابا کے دوست کے بیٹے ہیں (ہائے کاش! میرا کے ابا کے بھی کوئی دوست ہوتے جن کا بیٹا......) جن کا کاروبار دبئی اور امریکا میں پھیلا ہوا ہے۔ وینا ملک کے والدین ان دنوں دبئی میں مقیم ہیں کیونکہ ان کی والدہ بیمار ہیں اور ان کا علاج دبئی میں ہو رہا ہے۔ اسی لیے وینا ملک اور اسد بشیر خٹک نے جلدی شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ دبئی کی ایک عدالت میں ان کے نکاح کی تقریب انتہائی سادگی کے ساتھ انجام پائی جس میں دونوں گھرانوں کے قریبی لوگوں نے شرکت کی۔

وینا ملک کا کہنا ہے کہ "میں اسد بشیر کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھنے پر بہت خوش ہوں۔ شادی کے بعد ان کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی آئی ہے (مثلاً"؟) میں اس وقت اپنے آپ کو دنیا کی خوش نصیب لڑکی سمجھ رہی ہوں" (یہ خیالات کیا اسد بشیر کے بھی ہیں؟)

دوسری طرف وینا ملک کے شوہر اسد بشیر کا کہنا ہے





کہ "میں تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے شادی کی مبارک باد دی اور ہم مستقبل قریب میں عمرہ کرنے جائیں گے۔ (وینا اور عمرہ؟)

خواب

اداکار عمر شریف نے بیک وقت پانچ فلموں کی تیاری شروع کردی اور ان دنوں وہ ان کا پیپر ورک کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے ملک کی فلم انڈسٹری کو اتنا مضبوط کردیں کہ بھارتی فنکار ہماری فلموں میں چھوٹے چھوٹے کردار مانگنے کے لیے بھی سفارش لگوا رہے ہوں۔" آپ نے دیکھا پانچ فلموں پر ایک ساتھ کام کرنے کا اثر......)

قناعت

پی ٹی وی کا ایک کردار زکوٹا جن۔ جس نے اپنے وقت پر توجو شہرت حاصل کی سو کی۔ آج تک وہ کردار لوگ بھول نہ سکے۔ اس کردار کو کرنے والے اداکار منا لاہوری بھارت کے متعلق کہتے ہیں۔ "مجھے بھارت جانے کا کبھی کوئی شوق نہیں رہا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں فن کار کی پذیرائی نہیں ہوتی۔" (لو جی! لو یہ پورا پاکستان مطلب پاکستان کے فنکار......) "میرے خیال میں ہمارے ملک میں عزت دولت شہرت سب کچھ ہے (کاش منا لاہوری جیسی سوچ ہر پاکستانی کی ہو) ہمیں اپنے ملک میں رہ کر ہی کام کرنا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ ہم فنکاروں میں اتفاق و قناعت نہیں ہے ورنہ اس ملک میں سب سے زیادہ فنکار ہی کھا رہا ہے۔ اس کے باوجود اس کا خرچا پورا نہیں ہوتا۔" (منا بھائی! وعدہ کریں۔ بھارت سے پیشکش آنے پر بھی اپنے اس بیان پر قائم رہیں گے!)



مبارک باد

چلیے جناب! ایک اور شادی ہوگئی۔ پاکستان کی سپر ماڈل اور اداکارہ شیری شاہ نے گزشتہ دنوں بہت خاموشی سے شادی کرلی۔ خاموشی یوں کہ شوبز سے کوئی بھی اس شادی میں مدعو نہیں تھا۔ ان کے شوہر کا نام ڈاکٹر ملک انور اعوان ہے۔ تاہم ابھی تک وہ تصویروں کی حد تک متعارف ہوئے ہیں۔ بذات خود وہ ابھی تک کسی شو میں نہیں آئے نہ ہی ان کے بارے میں کسی کو زیادہ



معلومات ہیں۔ شوبز کے لوگ اس شادی پر خوش بھی ہیں اور وہیں انہیں شکایت بھی ہے کہ انہیں مدعو نہیں کیا گیا۔ (شیری ابھئی ایسی بھی کیا پردہ داری!)

کچھ ادھر ادھر سے

★ "عبدالقادر کو پھانسی تاریخی غلطی ہوگی جس پر تاریخ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ میں بنگلہ دیش کی سپریم کورٹ کے اس فیصلے پر شدید تحفظات کا اظہار کرتا ہوں۔"

(ملا عبدالقادر کی پھانسی سے چند گھنٹے قبل ترک وزیراعظم طیب اردگان کا حسینہ واجد کو فون)

★ نیند کی کمی صحت کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اگر آپ روزانہ معمول سے ایک گھنٹہ زیادہ سوئیں تو اس سے ہارٹ اٹیک کا خطرہ 33 فیصد کم ہو جاتا ہے۔

ٹوپی میں ماتھے کی جگہ پر موجود نشان محراب سے آیا ہے اور مسجد کی محراب تصور جہاد کی علامت ہے۔"

(بینا شاہ۔۔۔ ڈان نیوز)

"بلاول بھٹو کو سندھ کلچر سے اتنی وابستگی کا مظاہرہ تو کرنا چاہیے تھا کہ وہ اس تقریب میں سندھی ٹوپی اور اجرک پہنتے۔ حد تو یہ ہے کہ تقریر بھی انگریزی زبان میں کی گئی۔"

(شاہ نواز فاروقی۔۔۔ فرائی ڈے اسپیشل)

☆ جب سے پاکستان بنا ہے، بلا آگر دودھ پی جاتا ہے۔ نواز شریف قابو میں آئے "بلے" کو نہ چھوڑیں۔ ہم "بلے" کو انجام تک پہنچانے میں ان کے ساتھ ہیں۔ ملک کے منتخب وزیراعظم کو ہتھکڑیاں لگانا مذاق نہیں۔

(آصف علی زرداری)

☆ مشرف کا معاملہ اب عدالت میں ہے سو عدالت کو اپنا کام کرنے دیا جائے۔ زرداری صاحب اس "بلے" کو بریت کا سرٹیفکیٹ دلانے مولانا فضل الرحمن اور اسفندیار ولی کے ہمراہ نواز شریف کے پاس گئے تھے۔ اسے گارڈ آف آنر دے کر رخصت کرنے میں بھی ان کی مفاہمانہ پالیسی کا ہاتھ تھا۔

(عرفان صدیقی۔۔۔ نقش خیال)

☆ زرداری صاحب بتائیں کہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد کس بلے نے آکر دودھ پیا۔

(سابق آمر پرویز مشرف)

وہ آپ کے گھر، دکان اور کاروبار کو آگ لگوا سکتے ہیں۔ آپ کی بہن، بیوی اور بچوں کو اغوا کروا سکتے ہیں۔ اگر آپ ضرورت سے زیادہ سرپھرے ہیں اور قانون، انصاف اور ایمان داری کی باتیں کرتے ہیں تو وہ بااثر لوگ آپ کے سر میں گولیوں کی بوچھاڑ کروا سکتے ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو کراچی کی سانس بند کروا سکتے ہیں۔ ان کے لیے کراچی والوں نے ایک محاورہ بنایا ہے "وہ راضی تے جگ راضی۔"

(امر جلیل۔ سب جھوٹ)

☆

آپ کا باورچی خانہ

شیریں ظفر

ایک خاتون خانہ کی زندگی کی بنیادی اکائی ہے اس کا کچن۔ تمام کا تمام بجٹ اسی کچن پر ٹکا ہے۔ (تنخواہ یا ماہانہ خرچ سمجھ لیں) جب پہلی تاریخ آئی ہمارا خرچا جناب والا نے ہاتھ پر رکھا تو پہلے تیاری کی سوکھا راشن اکٹھا کرنے کی۔ مسالہ جات، چاول، چینی، آٹا، دالیں اور اب تو بچوں کی چوائس کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے تو (بسکٹ، نمکو، نوڈلز میکرونی اور چکن کیوبز، جام، چکن سپریڈ، شہد، Sucral اور مایونیز اور جوس جیسے آئٹم بھی کچن شاپنگ کا لازمی حصہ ہیں خیر ہماری اور ہمارے جیسی خواتین کی زندگی تو کچن اور باقی اخراجات کو بیلنس کرنے میں ہی گزرتی ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ صرف شوہر ہی نہیں اگر باقی رشتہ داروں اور اپنے ہی بچوں کے دل میں جگہ بنانی ہے تو بھی راستہ معدے سے ہی ہو کر گزرتا ہے۔

1۔ چونکہ میرے ہسبینڈ پولیس آفیسر ہیں، ان کا تو تبادلہ آئے روز کسی نئے شہر ہو جاتا ہے تو میں بچوں کے ساتھ اکیلی رہتی ہوں۔ کام میں ہاتھ بٹانے اور ہماری تنہائی کے خوف کو دور کرنے کے لیے صاحب نے ایک اٹھارہ بیس برس کا لڑکا ملازم رکھ دیا ہے (جو عرصہ پانچ سال سے ہمارے ساتھ ہی ہے) جو کہ مالی اور سودا سلف لانے کا کام کرتا ہے، کچن میں بھی ہیلپ کروا دیتا ہے) تو کھانا سراسر میرے، بچوں کی چوائس کا بنتا ہے۔ ناشتا میں کسی روز نوڈلز، کسی دن بریڈ جام، کسی دن پراٹھا انڈا، دوپہر میں سالن روٹی یا رائس (پلاؤ یا بریانی) پکائے جاتے ہیں۔ تین بچوں کی چوائس کی وجہ سے کہ میرا بیٹا چکن یا مٹن کھاتا ہے اور بیٹیاں بار بار کہتی ہیں "مما بوٹی نہ ڈالیں پلیٹ میں۔" مما کدھر جائیں۔ سو ہمیشہ گوشت اور سبزی یا دال ملا کر پکاتے ہیں، بیٹا شوربہ گوشت (بوٹی) کھاتا ہے اور بیٹیاں شوربہ اور سبزی کھاتی ہیں (ہے نا کتنا پرابلم)

2۔ میرے مہمان ہیں تو گنتی کے چند رشتہ دار، بھائی، بھابھی، پھپھو اور چند ایک دوست کزن مگر ہمیشہ فون کریں گے، باجی آج کیا پکایا ہے؟ باجی کو بھی معلوم ہے سو ان کی پسند کی چیزوں کے نام جلدی سے گنوا دیتی ہیں اور وہ آنے کا وقت بتا کر فون بند۔ ہمارے گھر میں سب کو بریانی بہت پسند ہے۔ بریانی جھٹ پٹ بنالیتے ہیں اور رائتہ۔ بس محفلیں جم جاتی ہیں بچوں کا کھیل کود، میری اور بھائی بھابھی کی گپ شپ کولڈ ڈرنکس کے بغیر تو اب کھانے کا رواج رہا ہی نہیں۔

3۔ آج کل کچن بڑے خوب صورت اور قیمتی ہوتے ہیں۔ تو بھائی ان کو گندا رکھنا مشکل ہے، ویسے بھی آدھا دن وہیں گزرتا ہے مکھی اور کاکروچ سے پاک، صاف ستھرے سلیب اور کیبنٹ، فریج بھی صاف بدبو سے پاک، سنک کی صفائی، یہاں تک کہ گلاس اور چائے کے کپ دھونے کے صابن لیکوئڈ اور صابن کی ٹکیاں الگ بنائی ہیں کہ ان برتنوں کو باقی برتنوں کے ساتھ ملا کر دھویا جائے تو ان سے ایک ہیک سی آتی ہے۔ جس پر سب ناک منہ چڑاتے ہیں، سو سمٹا سمٹا صاف کچن جب جاؤ مزے سے کھانا بناؤ۔

4۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں اور خاص مواقع جیسے کہ ہمارے صاحب چھٹی پر آئے ہوں سو اسپیشل ناشتا بنانا ضروری ہے اور اگر عام روٹین کے دن ہوں تو کچن اور لاؤنج کے درمیان بھاگ دوڑ مچی ہوتی ہے۔ ناشتا میں بچے دودھ ہی پیتے ہیں اور لنچ باکس میں پراٹھا انڈا یا کباب یا بریڈ جام پھر کسی دن نوڈلز کھالیتے ہیں تو لنچ باکس میں برگر (جی ہاں برگر لے کر جاتے ہیں) گھر میں

بھی آپ چکن برگر بہت جلد اور بہت ہی مزے کا بنا سکتے ہیں جس کی ترکیب کچھ یوں ہے۔

چکن برگر

چکن کا قیمہ	ایک کلو
آپ آدھا کلو بھی لے سکتے ہیں۔	
پیاز	ایک درمیانی (چوپ کرلیں)
ہری مرچ	دو عدد (چوپ کی ہوئی)
ہرا دھنیا	چھوٹی گٹھی (باریک کاٹ لیں)
نمک	حسب منشا
لال مرچ (کٹی ہوئی)	آدھا کھانے کا چمچہ
سوکھا دھنیا (ثابت)	آدھا چائے کا چمچہ
سفید زیرہ (بھنا ہوا)	ایضاً
ایک لیموں کا رس	ایضاً
لہسن ادرک کا پیسٹ	ایک چمچہ
ایک عدد انڈا	

ترکیب:

تمام اشیا کو قیمہ میں مکس کرلیں۔ اگر گھر میں چاپر موجود ہے تو اس میں ایک بار پھر مکس اور چاپ کرلیں۔ ورنہ تمام اشیا بہت باریک کوٹ کر شامل کریں۔ ہاتھ کی ہتھیلی پر قیمہ لے کر بڑے سائز کی ٹکیہ بنا کر توے پر ہلکے ہلکے فرائی کریں۔ ایک جانب سے پک کر سرخ ہوجائے تو پلٹ دیں۔ بن لے کر درمیان سے کاٹ لیں فریش بن لیں۔ اس پر مایونیز لگا میں ٹماٹر اور کھیرے کے قتلے اور پیاز کے لچھے سیٹ کریں۔ فرائی کی ہوئی ٹکیہ رکھیں بن کا دوسرا حصہ جما کر تیز چھری کے ساتھ کاٹ لیں بچوں کے ساتھ بڑوں کو بھی بہت پسند آئے گا۔ ساتھ میں فنگر چپس فرائی کرلیں اور اپنی پسند کے کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔ یہ برگر اگر آپ کسی ٹی پارٹی میں بنائیں تو بھی بہت مزا دیں گے اور اگر ڈبل روٹی کے سلائس کے ساتھ بنائیں تو سینڈوچ کے طور پر بھی چل جائیں گے۔

5 ۔ باہر کھانے کا رواج بہت تیزی سے معاشرے میں پرورش پا گیا ہے۔ بات بے بات مواقع نکالے جاتے ہیں۔ باہر کھانا کھانے کے اور کھانے باہر سے گھر منگوا کر کھانے کے سو وقت کی دھارا میں ہم بھی بہہ رہے ہیں۔ (جب خان صاحب آئے ہوں) حالانکہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کک کے ہاتھ کے یا باہر سے کھا کھا کر تھک چکا ہوں اپنے ہاتھ سے کچھ پکا کر کھلاؤ ہم دونوں تو مل بیٹھنا چاہتے ہیں۔ مگر میرے بچے اپنے پاپا کو باہر لے ہی جاتے ہیں۔

اصل میں رزق خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ آپ اپنے رزق سے جب انجوائے کرسکتے ہیں۔ جب آپ کے اپنے آپ کے قریب ہوں۔ صحت مند ہوں۔ آپ کی مالی حالت آپ کو اپنی لذت کام و دہن کو تسکین پہنچانے میں مددگار ہو کیا دن تھے۔ جب ہم چھوٹے ہوتے تھے۔ دادی اماں، ابو امی اور ہم بہن بھائی ہماری پیاری پھپھو ہم سب مل کر رہا کرتے تھے۔ میری دادی اماں پھر پھپھو اور اب امی اور ابو کی ڈیتھ نے تو سارا خانوادہ ہی توڑ دیا ہے۔ سب اپنے اپنے گھروں والے اور بچن والے ہوگئے۔ اب پتیلے بھر بھر سالن یا پلاؤ نہیں بنتے۔ ورنہ گرمیوں میں ٹینڈے کدو یا توری، کریلا یا اروی گوشت میں پکایا جاتا تھا۔ آم ٹھنڈے کرکے کھاتے تھے اور لسی کے مگ چڑھائے جاتے تھے۔ گرمیوں کی خوبصورتی سب لوڈ شیڈنگ نے کھالی ہے۔ سردیوں میں امی شلجم، کچنار اور سوہانجنا کو بھی بناتی تھیں۔ سوپ کا پتیلا چڑھتا تھا۔ بیسنی روٹی سردیاں گرمیاں کئی بار بناتے تھے۔ گرمیوں میں چٹنی اور لسی کے ساتھ، سردیوں میں مکھن کے ساتھ سوہن حلوے کی کڑاہی، بیسن کا حلوہ، گاجر کا حلوہ، پیٹھے کا حلوہ امی لازمی بناتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کی کھیر آج بھی نہیں بھولتی۔ اب نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ کھانے نہ وہ لذتیں۔ تمام لوگ اپنے اردگرد رہنے والے خوبصورت رشتوں کا احترام کریں۔ ان کی زندگی اور اپنی خوشیوں کے لیے دعا کریں۔ یہ سب سے بڑی ٹپ ہے۔ خوبصورت لمحات سے بھری زندگی کا شکر گزاری اپنالیں۔



موسم سرما کے کھاجے

صباسحر

موسم سرما کا استقبال سردیوں کے مخصوص روایتی پکوان کے ساتھ کیجیے۔ غذائیت، ذائقے اور بجٹ کو پیش نظر رکھ کر منتخب کی ہوئی تراکیب حاضر خدمت ہیں۔ آزمائیے اور سرما کے دنوں کو مزے دار بنائیے۔

سرسوں کا ساگ، مکئی کی روٹی

اجزا:

سرسوں کا ساگ	ایک کلو
پالک	آدھا کلو
بتھوا	ایک گڈی
پیاز	ایک عدد
مکھن	دو کھانے کے چمچے
مکئی کا آٹا	آدھا کپ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:

ساگ، پالک اور بتھوا خوب اچھی طرح دھو کر خشک کرکے باریک کاٹ لیں اور بغیر پانی کے ہلکی آنچ پر ایک چمچہ تیل، ہری مرچیں اور ایک انچ ادرک کے ٹکڑے کے ساتھ پکالیں۔ پانی خشک ہوجائے تو ٹھنڈا کرکے باریک پیس لیں۔ پتیلی میں تیل گرم کرکے پیاز، لہسن ادرک پیسٹ، زیرہ، ثابت سرخ مرچ اور آدھا کپ ٹماٹو پیسٹ ڈال کر خوب بھونیں۔ ہلدی، سرخ پسی مرچ کے ساتھ پسا ہوا ساگ بھی ڈال دیں۔ مکئی کا آٹا تھوڑے سے پانی میں گھول کر شامل کریں اور اچھی طرح بھون کر دس منٹ کے لیے دم لگادیں۔ پیش

کرتے وقت مکھن ڈال دیں۔

مکئی کی روٹی کے لیے دو کپ مکئی کا آٹا' ایک کپ گندم کا آٹا مکس کرلیں' پھر ایک چمچہ قصوری میتھی' باریک کٹی سبز مرچ' کلونجی' باریک کٹی ایک پیاز' تیل اور نمک ملا کر نیم گرم پانی سے گوندھ لیں۔ ایک گھنٹے بعد پیڑے بنا کروہ بھی دس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پھر ہلکا ہلکا گھی لگا کر پکالیں۔

چکن کارن سوپ

اجزا:

چکن	آدھا کلو
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
انڈے کی سفیدی	دو عدد
پیاز	ایک عدد
لہسن کے جوے	چار عدد
مکئی کے دانے	ایک پیالی
اجینو موتو ر سیاہ مرچ	آدھا آدھا چائے کا چمچہ
نمک ر تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:

چکن میں لہسن' پیاز اور نمک کے ساتھ دس کپ پانی ملا کر ابال لیں۔ یہاں تک کہ پانی چار کپ رہ جائے پھر یخنی الگ رکھ لیں اور گوشت کے ریشے کرلیں۔ ساس پان میں دو کھانے کے چمچے تیل میں مکئی کے پسے ہوئے دانے ڈال کر بھونیں پھر یخنی' کالی مرچ' اجینو موتو اور چکن کے ریشے اور آدھا چمچہ چینی ڈال کر دھیمی آنچ پر آدھا گھنٹہ پکائیں۔ کارن فلور ہلکا سا توے پر بھون کر شامل کردیں۔ سوپ گاڑھا ہونے لگے تو انڈے کی سفیدی اچھی طرح پھینٹ کر ڈال دیں۔ مزے دار چکن کارن سوپ تیار ہے۔

اسپائسی مچھلی مسالا

اجزا:

مچھلی	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
لیموں کا رس	چار کھانے کے چمچے
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
جائفل جاوتری	ایک ایک چٹکی
ثابت سرخ مرچ	آٹھ عدد
نمک ر تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:

مچھلی کو نمک اور لیموں کا رس ملا کر رکھ دیں۔ لونگ' الائچی اور ثابت مرچ اور جائفل جاوتری کو توے پر بھون کر پیس لیں اور ادرک اور ہرا دھنیا کے ساتھ گرائنڈ کرلیں۔ پیاز براؤن کرکے نکال لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کرکے پسا مسالا ڈالیں۔ مچھلی کے ٹکڑے رکھیں۔ تھوڑا سا بھون کر ہلکی آنچ کردیں۔ لیموں کا رس اور براؤن پیاز ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔ مزے دار مچھلی مسالا تیار ہے۔

گاجری زردہ

اجزا:

گاجر	ایک کلو
کھویا	ایک کپ
ابلے ہوئے چاول	چار کپ
چینی	چار کپ
پسا کھوپرا	آدھا کپ
گھی	ڈیڑھ کپ

ترکیب:

گھی میں الائچی کڑکڑائیں پھر کش کی ہوئی گاجر ڈال دیں۔ ذرا نرم ہوجائے تو کھویا اور چینی بھی ڈال دیں۔ گاڑھا ہونے پر اتار لیں۔ اب الگ پتیلی میں ابلے ہوئے چاولوں اور گاجر کے آمیزے کی تہہ لگائیں۔ درمیان میں پسا ہوا کھوپرا اور کترے ہوئے بادام لیتے

بھی ڈال دیں۔ دودھ کا چھینٹا لگا کر دم پر رکھ دیں۔ پیش کرتے وقت مکس کرلیں۔

مکس ویجی ٹیبل سالن

اجزا:

آلو	تین عدد
گاجر	پانچ عدد
گوبھی	ایک بڑا پھول
مٹر	دو کپ
میتھی	دو گڈی
بینگن ر پیاز	دو' دو عدد
نمک ر تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:

تمام سبزیاں کاٹ کر تیل میں ہلکا سا فرائی کرکے نکال لیں۔ پھر اسی تیل میں پیاز سنہری کریں۔ باریک کٹے ہوئے ٹماٹر' لہسن ادرک پیسٹ' پسا گرم مسالا' سرخ مرچ' نمک اور آدھا چمچہ ثابت دھنیا ڈال کر بھونیں' مسالا یکجان ہوجائے تو سبزیاں ڈال کر ہلکے ہاتھ سے بھونیں پھر تھوڑا سا پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر چھوڑ دیں۔ گرم گرم تندوری روٹی یا چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

سردیوں کی خاص سوغات مٹر بے حد فائدہ مند سبزی ہے۔ مٹر خون پیدا کرتا ہے۔ جسم کو فربہ کرتا ہے۔ جگر کے لیے مقوی ہے۔ آنتوں کو نرم رکھتا ہے۔ بلغم ختم کرتا ہے۔ ہڈیوں اور جوڑوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ قبض کشا ہے۔ سردیوں کی یہ سبزی اب تقریباً سارا سال ہی دستیاب رہتی ہے مگر اسے محفوظ کرتے وقت خیال رکھیں کہ ہمیشہ تازہ مٹر خریدیں۔ پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر فریز کریں۔ حسب ضرورت نکال کر واپس فریز کردیں۔ زیادہ دیر باہر نہ رکھیں۔

مٹر سے کافی ساری ڈشز تیار کی جاتی ہیں۔ مٹر پلاؤ' آلو مٹر' مٹر کا سالن' حتیٰ کہ چائنیز کھانوں اور سوپ میں بھی مٹر کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ یہاں ہم مٹر کی ایک چھوٹی مگر مزے دار سی ترکیب پیش کررہے ہیں۔

مٹر کو فرنچ فرائز کی طرح فرائی کرلیں۔ ٹشو پیپر پر نکال کر اضافی چکنائی جذب کریں' پھر نمک اور چاٹ مسالا چھڑک کر شام کی چائے پر لطف اٹھائیں۔

کشمیری چائے

اجزا:

سبز چائے	دو چائے کے چمچے
دودھ	ایک کپ
چینی	حسب ذائقہ
میٹھا سوڈا	دو چٹکی
جائفل جاوتری	ایک ایک چٹکی

ترکیب:

دو کپ پانی ابالیں۔ ابال آنے پر سبز پتی ڈال کر درمیانی آنچ پر کم از کم دس منٹ پکائیں۔ میٹھا سوڈا ڈال کر مزید پانچ منٹ پکائیں۔ جب رنگت سرخ ہوجائے تو چولہے سے اتار لیں۔ ڈیڑھ کپ ٹھنڈا پانی شامل کرکے آہستہ آہستہ پھینٹیں۔ پھر دودھ' چینی' پسی الائچی' پسے بادام' چٹکی بھر نمک' دو عدد لونگ اور جائفل جاوتری مکس کرکے دم پر رکھ دیں۔ مزید ذائقے کے لیے دو چمچے فریش کریم بھی شامل کرسکتی ہیں اور کپ میں چند قطرے لیموں کے بھی ڈال سکتی ہیں۔



عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

مسز شکیلہ بھٹی

عدنان بھائی! میں ایک متوسط گھرانے کی پڑھی لکھی عورت ہوں۔ اللہ کے فضل سے خاوند بہت اچھے ہیں۔ ماشاء اللہ تین بچے ہیں کوئی معاشی مشکل بھی نہیں۔ لیکن میں ہروقت سوچتی رہتی ہوں۔ میری سب سے بڑی بیماری یہی ہے اور یہ میری بچپن کی عادت ہے۔ اگر کسی کو بیمار دیکھ لوں یا سن لوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں خود بھی بیمار ہوگئی ہوں۔ رسالوں اخباروں اور ٹی وی غرضیکہ جہاں دیکھو.... بیماری کا چرچا خاص طور پر دل کی بیماری اور بلڈ پریشر سن کر اب تو میرا برا حال ہوگیا ہے۔ ہروقت سوچوں میں گم رہتی ہوں کہ پتا نہیں مجھے یہ بیماری ہے یا وہ بیماری ہے۔

مجھے بچوں کی پیدائش سے پہلے بلڈ پریشر کی شکایت رہی ہے۔ میری چھوٹی بچی کی پیدائش کے دوران بھی مجھے یہ شکایت ہوگئی تھی۔ آخری مہینے میں جس ڈاکٹر سے میں علاج کرتی ہوں وہ ہمیشہ ہی مجھے بہت ڈراتی رہی ہے کہ اب بچہ نہ پیدا کرنا ورنہ تمہاری زندگی کو خطرہ ہے۔ بچہ پیدا ہونا یا نہ ہونا یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ اب تو اس ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے میرا برا حال ہوجاتا ہے بلکہ کسی بھی ڈاکٹر کے پاس جاؤں تو دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اور دل چاہتا ہے کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ لیکن مجبوری ہوتی ہے۔ بچوں کو بھی اکثر میرے شوہر ہی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتے ہیں۔ میری سب سے چھوٹی بچی کی پیدائش پر کیس بالکل نارمل تھا لیکن ڈاکٹر نے مجھے بہت پریشان کیا تھا۔ اب اس بیماری والی بات کسی صورت بھی میرے دماغ سے نہیں نکلتی۔ دل اور دماغ ہروقت پریشان رہتے ہیں۔ میں اپنے گھر پر اکیلی رہتی ہوں۔ دو بچے اسکول چلے جاتے ہیں۔ چھوٹی بچی گھر پر رہتی ہے۔ سب لوگ کہتے ہیں کہ سوچا نہ کرو۔ میں اپنے دل میں عہد کرلیتی ہوں کہ اب نہیں سوچوں گی۔ لیکن پھر سوچنا شروع کردیتی ہوں۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ کبھی خود ہی رونا شروع کردیتی ہوں۔ میری عمر تقریباً 29 سال ہے۔ سوچتی ہوں ابھی سے یہ حال ہے تو آگے جاکر کیا بنے گا۔

ج۔ میں آپ کو یہ مشورہ تو نہیں دے سکتا کہ پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ کیونکہ کوئی بھی شخص اپنی مرضی سے پریشان نہیں ہوتا اور نہ ذہنی تناؤ اور دباؤ کے تحت زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے۔ تاہم خوف سے چھٹکارا حاصل کرنا ذہنی اور جسمانی صحت کے نقطہ نظر سے نہایت ضروری ہے۔

1۔ آپ تیز چہل قدمی کریں۔

2۔ کوئی جسمانی ورزش کریں۔ ذہن، جسم اور روح کی صحت مندی کے لیے بہت مفید ہے۔

3۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی معقول اور مستند ڈاکٹر سے بھی مشورہ کرلیں۔ ٹانک اور چند دنوں کے لیے مسکن دوائیں بھی فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہیں۔ لیکن اصل علاج جسمانی ورزش اور تیز چہل قدمی ہے۔

سلمٰی پروین۔۔۔ لاہور

میرے منگیتر بیرون ملک ہوتے ہیں۔ رشتہ لینے ان کی امی اور بہن آئی تھیں۔ انہوں نے تصویر دکھائی تھی اور کہا تھا کہ وہ تین سال کے کانٹریکٹ پر باہر گئے ہیں واپس آئیں گے تو شادی کرلیں گے۔ تصویر میں وہ قبول صورت نظر آرہے تھے۔ گھر والوں نے مناسب چھان بین کی۔ ہمارے ایک چچا باہر ہوتے ہیں، وہاں سے بھی پتا کروایا جب ہر طرح سے مطمئن ہوگئے تو ہاں کردی۔ منگنی کے بعد میرا ان سے فون پر رابطہ رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتے۔ کئی بار باتوں میں باتوں میں کہا کہ شرعی رشتہ کے بغیر وہ بات چیت کرنا جائز نہیں سمجھتے۔ ان کے خیالات جان کر میں نے بھی

خاموشی اختیار کرلی۔ عید یا سالگرہ وغیرہ پر مبارک باد کے لیے مختصر سی بات ہوتی بس۔

اب تین سال بعد وہ واپس آئے تو امی نے ان کی دعوت کی۔ انہیں دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ گہرا سانولا رنگ چہرے پر چیچک کے داغ اور سب سے بڑی بات کہ ان کا قد بہت چھوٹا ہے۔ میرا شمار دراز قد لڑکیوں میں ہوتا ہے۔ میں نے انہیں دیکھنے کے بعد رشتے سے انکار کردیا جس پر امی سخت ناراض ہوئیں۔ ان کا کہنا ہے کہ منگنی توڑنے کی تو سب باتیں بنائیں گے آگے رشتہ میں مسائل ہوں گے۔ ویسے بھی مردوں کی شکل و صورت کون دیکھتا ہے۔ پڑھا لکھا برسرروزگار لڑکا ہے۔ یہ کافی ہے۔ میرا دل کسی صورت نہیں مانتا۔ کیا کروں....؟

ج۔ اچھی بہن! آپ نے اس کی تصویر دیکھی اور اپنے ذہن میں ایک خوب صورت تصویر بنالی کچھ لوگ واقعی تصویر میں بہت خوب صورت نظر آتے ہیں جبکہ اصل میں اتنے اچھے نہیں ہوتے۔ انڈیا کی ایک اداکارہ جس کی خوب صورتی کے چرچے تھے پاکستان آئی تو سب بڑے ذوق و شوق سے اسے دیکھنے گئے اور دیکھ کر شدید مایوس ہوئے کہ وہ اپنی تصویر کے برعکس تھی۔ آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ آپ اپنی جگہ درست ہیں اور آپ کی والدہ بھی غلط نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اتنی خوبیوں کے ہوتے ہوئے صرف ظاہری شکل و صورت کی بنا پر انکار کرنا عقل مندی نہیں۔ شادی کے بعد ویسے بھی شکل و صورت کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ پسند محبت صرف قبولیت کا نام ہے۔ کچھ لوگ جنہیں ہم پہلی نظر میں ریجیکٹ کردیتے ہیں آہستہ آہستہ دوسری خوبیوں کی بنا پر ہمیں اچھے لگنے لگتے ہیں۔ جو بھی فیصلہ کریں بہت سوچ سمجھ کر کریں۔ ممکن ہو تو اسے ایک بار اور دیکھ لیں۔ ممکن ہے پہلی بار دیکھنے پر وہ آپ کو جتنا برا لگا اتنا برا نہ لگے۔ اگر پھر بھی دل نہ مانے تو رشتہ ختم کردیں لیکن عدنان بھائی تو یہی سمجھتے ہیں کہ دل کے فیصلے عموماً غلط ہی ثابت ہوتے ہیں۔

سنجیدہ۔۔۔ کوٹ چٹھہ

دو سال پہلے میری شادی دور کے رشتہ داروں میں ہوئی۔ شوہر دوبئی میں کام کرتے تھے۔ وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر آئے تھے۔ جھٹ پٹ رشتہ طے ہوا اور شادی ہوگئی۔ شادی کے دو ہفتہ بعد وہ واپس چلے گئے۔ ابھی میرے ہاتھوں کی مہندی بھی ٹھیک سے نہ اتری تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو جانا بھی نہیں تھا، لیکن مجبوری تھی۔ دل پر صبر کی سل رکھ لی۔ فون پر ان سے رابطہ تھا۔ بچی کی پیدائش پر بھی انہیں فون کیا، لیکن انہیں چھٹی نہ مل سکی اور پھر ایک دن ان کی وفات کی خبر آگئی۔ مجھ پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی میری بچی اس وقت چھ ماہ کی تھی عدت تک میں سسرال میں رہی۔ عدت کے بعد سسرال والوں کا رویہ بدلنے لگا۔ میرے شوہر کا جو پیسہ ان کی کمپنی سے ملا تھا۔ وہ ان ہی کے پاس تھا۔ بچی کے دودھ کے لیے بھی میں پریشان رہتی تھی۔ میرے والد کا انتقال ہوچکا ہے۔ میکے میں صرف ایک بھائی اور ماں ہے۔ بھائی شادی شدہ ہے اس کی مالی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ میں دو دن کے لیے میکے جاتی ہوں تو بھابھی کی تیوری پر بل پڑجاتے ہیں۔ مستقل رہنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایک چھوٹے سے شہر میں ملازمت کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میری تعلیم بھی زیادہ نہیں ہے۔ میٹرک کیا تھا تو شادی ہوگئی۔ امی خود بیٹے کی محتاج ہیں۔ انہوں نے دبے لفظوں میں دوسری شادی کی بات کی، لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ بچی کو سسرال والوں کو دے دو دوسرے کی اولاد کوئی نہیں پالے گا۔ میں اپنی بچی کو نہیں چھوڑ سکتی۔

ج۔ اچھی بہن! آپ کا مسئلہ واقعی افسوس ناک ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ سوتیلی ماں کے بارے میں کتنی کہانیاں ہیں۔ اسے عموماً "برا" سمجھا جاتا ہے، لیکن عورت پھر بھی اپنے شوہر کے بچوں کو پال لیتی ہے۔ ان کو پکا کر کھلاتی ہے۔ ان کے کام ان کی دیکھ بھال کرتی ہے، لیکن شوہر بیوی کے ایک بچے کو بھی نہیں برداشت کرسکتا اگرچہ پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں ہر مرد وسیع القلب بھی ہوتے ہیں، لیکن زیادہ تر یہی دیکھنے میں آیا ہے۔ آپ کی دوسری شادی کی صورت میں ممکن ہے بچی کو سسرال والے بھی رکھنے پر راضی نہ ہوں اس لیے آپ کو خود ہمت کرنا پڑے گی آگے پڑھنے کی کوئی صورت ممکن ہو تو کہیں داخلہ لے لیں یا گھر پر پڑھ کر پرائیویٹ امتحان دے لیں۔ اس طرح آپ کو کسی اسکول میں جاب مل سکتی ہے۔ دوسری شادی کے لیے آپ صاف صاف کہہ دیں کہ آپ اپنی بچی کو نہیں چھوڑیں گی۔ بچی کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ چکا ہے۔ اب ماں بھی چھن جائے تو یہ ظلم ہوگا۔

☆

بیوٹی بکس

امت الصبور

زینب علی..... علی پور چٹھہ

س : باجی میری جلد بہت خشک ہے۔ سردیوں میں تو اس پر خاص طور پر سفید دھبے سے پڑ جاتے ہیں۔ چہرہ بالکل بے رونق اور مرجھایا ہوا نظر آتا ہے۔ میں گاؤں میں رہتی ہوں۔ میرے بال بہت خشک ہیں اور سردیوں میں خاص طور پر خراب ہو جاتے ہیں۔ کوئی اچھا سا گھریلو نسخہ بتائیں۔

ج : آپ صابن کا استعمال کم سے کم کریں۔ خصوصاً" خشک موسم میں گلسرین آمیز صابن استعمال کریں۔ یہ صابن کافی مہنگے ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اپنے استعمال کے لیے گھر میں صابن بنالیں۔ یہ خشک جلد کے لیے بہت مفید ہے۔ ترکیب لکھ رہی ہوں۔

عام منہ دھونے کا صابن ۲۰۰ گرام
ناریل کا تیل ۲۰۰ گرام

نہانے کے عام صابن کو تھوڑا سا کھولتا ہوا پانی ڈال کر اچھی طرح پگھلا لیں۔ جب یہ اچھی طرح پگھل جائے تو اس میں ناریل کا تیل گرم کر کے آہستہ آہستہ ملائیں۔ اس مرکب کو آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے تک ایک ہی سمت میں ہلاتے رہیں۔ ٹھنڈا ہونے پر یہ مرکب جم جائے گا۔ اب اپنی مرضی سے ٹکڑوں میں کاٹ کر استعمال کریں۔ خشک جلد کے لیے یہ صابن بے حد مفید ہے۔ اس سے بال بھی دھوئیں بالوں کی خشکی رفع ہو جائے گی۔

روزانہ رات کو چہرے پر زیتون کا تیل لگائیں اور بغیر منہ دھوئے سو جائیں۔ آپ کے چہرے پر چمک پیدا ہو جائے گی۔

بالائی اور شہد ایک ایک چمچہ لے کر ملا لیں اور دن میں ایک بار چہرے پر اچھی طرح مالش کریں۔ رنگ بھی نکھر آئے گا اور چہرے پر چمک بھی پید ہو جائے گی۔

ماریہ علی..... گجرات

س : میری عمر تیس سال ہے لیکن آنکھوں کے نیچے کی جلد پھول گئی ہے۔ جس کی بنا پر میں اپنی عمر سے بہت زیادہ نظر آتی ہوں۔ کوئی ایسا نسخہ بتائیں کہ میں اس سے نجات حاصل کر سکوں؟

ج : اسے آنکھوں کے نیچے تھیلیاں بننا کہتے ہیں۔ عموماً" یہ موروثی ہوتی ہیں۔ ان کے ظاہر ہونے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ گردوں اور پیشاب کے انفیکشن کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے' آنکھوں کے اردگرد کی جگہ بہت نازک ہوتی ہے' اس میں لچک بھی کم ہوتی ہے اس لیے یہ جلد پھول جاتی ہے۔ آپ ڈاکٹر سے مشورہ ضرور کریں تاکہ اگر کوئی انفیکشن ہو تو اس کا علاج ہو سکے۔

چائے اور کافی کا استعمال کم کر دیں۔ پانی زیادہ سے زیادہ پیئیں۔ روزانہ کم از کم سولہ گلاس پیئیں۔ صبح سویرے گرم پانی میں لیموں کا رس ملا کر پیئیں۔ آنکھوں کے گرد کوئی بھاری کریم نہ لگائیں۔

ایک آلو لے کر اچھی طرح دھوئیں پھر اس کے باریک قتلے کاٹ کر آنکھوں پر رکھیں۔ اس سے کافی فرق پڑے گا۔

کھیرے کا رس لگانے سے بھی یہ تھیلیاں کم ہو جاتی ہیں۔ البتہ اگر یہ موروثی ہیں تو صرف کاسمیٹک سرجری سے ہی ختم ہو سکتی ہیں۔